سنہ ۴۶ء
دیال پرنٹنگ پریس دہلی
میں باہتمام لالہ ایشور دیال چھپی

قلعہ احمد نگر

کے

اُن رفیقوں اور ساتھیوں کے نام

جو

۹؍اگست سنہ ۴۲ء سے ۲۸؍مارچ سنہ ۴۵ء تک

میرے ساتھ قیدِ فرنگ میں رہے۔

پیش لفظ

یہ کتاب میں نے ۱۹۴۴ء کے اپریل میں قلعۂ احمد نگر کے قید خانے میں شروع کی اور پانچ مہینے بعد ستمبر میں ختم کی۔ میرے جیل کے بعض ساتھیوں نے ازراہِ عنایت کتاب کا مسودہ پڑھا اور کچھ قیمتی مشورے دئے۔ میں نے جیل میں ہی کتاب پر نظرِ ثانی کی، ان مشوروں سے فائدہ اٹھایا اور کتاب میں کچھ اضافے کئے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان میں سے کوئی صاحب بھی میرے خیالات کے ذمہ دار نہیں ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ حضرات میری رائے سے متفق ہوں، لیکن مجھے ان حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے اس لئے کہ اس بحث اور گفتگو کی وجہ سے مجھے خود ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کا مختلف پہلوؤں کے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت میں مدد ملی۔ جیل خانہ تھوڑے دن رہنے کے لئے بھی کوئی خوش گوار جگہ نہیں، پھر جب قید کی مدت اتنی لمبی ہو تو زندگی مصیبت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جو غیر معمولی دل و دماغ اور وسیع انسانی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، جن کے قلب و نظر کی وسعت کو وقت کے شدید جذبات نے بھی متاثر نہیں کیا تھا۔

میرے گیارہ رفیق تھے اور یہ سب مل کر ہندوستان کا ایک دلچسپ مرقع پیش کرتے تھے۔ وہ اپنے اپنے رنگ میں نہ صرف ہندوستانی سیاست کے بلکہ قدیم اور جدید علم و فضل کے غرض ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان میں تقریباً ہندوستان کی کل موجودہ زبانوں ــــ ہندی، اردو، بنگالی،

گجراتی، مرہٹی، تیلیگو، سندھی، اُڑیہ ــ اور مختلف کلاسیکی زبانوں، سنسکرت، پالی، عربی، فارسی، کے جاننے والے موجود تھے۔ اور ان میں سے بعض ان زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے۔ میں علم کے اس بیش بہا ذخیرے سے، اپنی محدود استعداد کے مطابق، بے تکلف، فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یوں تو میں اپنے سبھی رفیقوں کا ممنون ہوں لیکن ان میں خاص طور پر قابل ذکر مولنا ابوالکلام آزاد، جن کی وسیع معلومات میرے لئے مسرت اور حیرت کا باعث ہوتی تھی، گووند بلبھ پنت، نریندر دیو اور محمد آصف علی ہیں۔

اس کتاب کو لکھے ہوئے سوا سال گذر چکا ہے اور اس لئے کتاب کے بعض حصے ابھی سے پرانے ہو گئے ہیں اور اس درمیان میں بہت سی نئی باتیں ہوئی ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس میں کچھ ترمیم اور اضافہ کروں لیکن اس خواہش کو روکنا پڑا۔ سچ پوچھئے تو میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جیل کے باہر زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں کچھ لکھنے یا سوچنے کی فرصت کہاں۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا اسی کو دوبارہ پڑھنا تک میرے لئے مشکل تھا۔ یہ مسودہ میرے جیل سے رہا ہونے کے بعد ٹائپ ہوا۔ ٹائپ شدہ مسودہ پڑھنے کی مجھے فرصت نہ تھی اور اس سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی تھی۔ میری بیٹی اندرا اس آڑے وقت میں کام آئی اور اس نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ یہ کتاب اب اسی شکل میں آپ کے سامنے ہے جیسی میں نے جیل میں لکھی تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ہاں آخر میں میں نے خاتمے کے طور پر چند سطریں اور بڑھائی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم دوسرے مصنف اپنی تصنیف کے متعلق کیا احساس رکھتے ہیں لیکن میں جب اپنی کوئی پہلے کی لکھی ہوئی کتاب پڑھتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت گذرتی ہے۔ یہ کیفیت اس وقت اور شدید ہوتی ہے جب وہ

کتاب جیل کی انوکھی اور گھٹی ہوئی فضا میں لکھی گئی ہو اور میں اسے جیل کے باہر نکل کر پڑھوں۔ میں اپنی تحریر کو پہچان تو لیتا ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی ایسے شخص کی جانی پہچانی تحریر پڑھ رہا ہوں جو مجھ سے بہت قریب ہے مگر پھر بھی مجھ سے مختلف ہے۔ شاید یہ اس تبدیلی کی نشانی ہے جو میرے اندر ہو چکی ہے۔

اس کتاب کے متعلق بھی میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ ہے تو یہ میری لیکن جیسا میں اب ہوں اس کے لحاظ سے اسے پوری طرح اپنی نہیں کہہ سکتا، یہ میری کسی پچھلی شخصیت کی یادگار ہے جو کچھ دن رہ کر مٹ گئی اور اب اس کی صرف یاد ہی یاد باقی ہے۔

آنند بھون، الہ آباد — جواہر لال نہرو

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان

چھٹا باب

نئے مسائل

صفحہ	عنوان
۴۹۳	۸ - ذاتوں کا نظریہ اور عمل، مشترک خاندان
۵۰۸	۹ - بابر اور اکبر، ہندوستانی بننے کا عمل
۵۱۴	۱۰ - میکانکی ترقی اور تخلیقی قوتوں میں یورپ اور ایشیا کا فرق
۵۲۴	۱۱ - مشترکہ تہذیب کی نشو و نما
۵۳٦	۱۲ - اورنگ زیب کی رجعت، ہندو قومیت کا نشو و نما، شیواجی
۵۴۲	۱۳ - اقتدار کے لئے مرہٹوں اور انگریزوں کی کشمکش، انگریزوں کی جیت
۵۴۵	۱۴ - تنظیم اور طریق کار میں ہندوستان کی پستی اور انگریزوں کی برتری
۵٦۰	۱۵ - رنجیت سنگھ اور جے سنگھ
۵٦٦	۱٦ - ہندوستان کا اقتصادی پس منظر، انگلستان کی زندگی کے دو پہلو

پہلا باب

احمد نگر کا قلعہ

۱- ۲۰ مہینے

قلعہ احمد نگر - ۱۳ اپریل ۱۹۴۴ء

جس دن ہم لوگ یہاں لائے گئے تھے اور میری نویں میعاد قید شروع ہوئی تھی اسے ۲۰ مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ یہاں پہونچ کر ہم نے دیکھا تھا کہ آسمان پر پھیلتی ہوئی تاریکی کے پردے میں پہلی رات کا چاند ہمیں جھک کر سلام کر رہا ہے یعنی یہ چڑھتے چاند کے پندرھواڑے کا پہلا دن تھا۔ اس کے بعد ہر چاند رات مجھے یاد دلاتی ہے کہ میری قید کا ایک اور مہینہ گذر گیا۔ پچھلی مرتبہ بھی میری قید کی میعاد دیوالی کے بعد چاند رات ہی کو شروع ہوئی تھی۔ یوں تو چاند ہمیشہ سے قید خانے میں میرا رفیق رہا ہے، لیکن اتنے دن کی واقفیت کے بعد ہم ایک دوسرے سے اور زیادہ مانوس ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ دنیا کتنی حسین ہے، زندگی کا دریا کیوں کر چڑھتا اُترتا ہے، روشنی اور تاریکی، موت اور حیات کس طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ چاند نت نئے رنگ بدلتا ہے اور اور پھر جیسا تھا ویسے ہی رہتا ہے۔ میں نے اُسے ہر حال اور ہر رنگ میں دیکھا ہے، شام کے دھندلکے میں، رات کے سناٹے میں اور پچھلے پہر جب صبح کی آہٹ

آنے والے دن کا مژدہ لاتی ہے۔ چاند سے دنوں اور مہینوں کے شمار میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک وہ نظر آتا ہے اس کی شکل اور جسامت سے اچھا خاصا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مہینے کی کون سی تاریخ ہے۔ یہ ایک سیدھی اور سہل تقویم ہے (اگرچہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد اس کی تصحیح کی ضرورت ہوتی ہے)۔ اور کسانوں کو جو کھیت میں کام کرتے ہیں اس کے ذریعے سے زمانے کے گذرنے اور موسم کے بدلنے کا اندازہ کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

ہم نے یہاں تین ہفتے اس طرح گذارے کہ ہمیں باہر کی دنیا کی کچھ خبر نہ تھی نہ کسی سے ملاقات، نہ خط و کتابت، نہ اخبار نہ ریڈیو۔ ہمارا یہاں ہونا بھی سرکاری راز تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہماری نگرانی کرنے والے افسروں کے سوا اور کوئی اس سے واقف نہیں۔ مگر بس ایسا ہی راز تھا کہ سارا ہندوستان جانتا تھا کہ ہم لوگ کہاں ہیں۔ پھر اخباروں کے آنے کی اجازت ہو گئی اور چند ہفتے بعد قریبی رشتہ داروں کے خطوط کی جو گھریلو معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ملنا جلنا اس ۲۰ مہینے کے عرصے میں بالکل موقوف رہا۔

اخبار میں خبریں بڑی کتر بیونت کے بعد دی جاتی تھیں پھر بھی ہمیں اس لڑائی کا جو آدھی سے زیادہ دنیا کو تباہ کر رہی تھی اور اپنے ہندوستانی بھائیوں کی حالت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی جاتا تھا۔ ہمیں اپنے بھائیوں کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ ان میں سے بیسیوں ہزار بغیر عدالتی تحقیقات کے جیل میں یا نظر بندوں کے کیمپ میں پڑے ہیں، ہزاروں گولی سے اڑا دیے گئے ہیں، ہزاروں اسکولوں اور کالجوں سے نکال دیے گئے

ہیں۔ پورے ملک میں ایک طرح کا مارشل لا جاری ہے، سارے دیس پر خوف اور دہشت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ بیسیوں ہزار آدمی جو ہماری طرح بغیر عدالتی تحقیقات کے قید تھے ہم سے کہیں بدتر حال میں تھے۔ ملاقات کا کیا ذکر ہے ان کے پاس اخبار اور خط تک نہیں آتے جاتے تھے اور کتابیں بھی کبھی کبھار ہی ملتی تھیں۔ بہت سے صحت بخش غذا نہ ملنے سے بیمار ہو گئے تھے۔ کچھ پیارے بھائی بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں دنیا سے گذر گئے تھے۔

اسی ہندوستان میں ہزارہا جنگی قیدی تھے جس میں سے اکثر اٹلی کے تھے۔ ہم ان لوگوں کی حالت کا اپنے بھائیوں کی حالت سے مقابلہ کرتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان لوگوں سے جنیوا کے دستور کے مطابق سلوک ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے قیدیوں اور نظر بندوں کو کس حالت میں رکھا جائے اس کے لئے نہ کوئی دستور تھا نہ قاعدہ نہ قانون سوائے ان ہنگامی احکام کے جو ہمارے برطانوی حکمران وقتاً فوقتاً صادر فرمائیں۔

۲ ✓ - قحط

✓ قحط آپہنچا ایسا بھیانک، ایسا شدید، ایسا ہیبت ناک کہ بیان سے باہر ہے۔ ملابار میں، بیجاپور میں، اوڑیسہ میں اور سب سے زیادہ بنگال کے زرخیز صوبے میں روزانہ ہزاروں مرد، عورتیں، بچے فاقوں مر رہے تھے۔ وہ کلکتے کے اونچے محلوں کے سامنے دم توڑ رہے تھے، اُن کی لاشوں سے بنگال کے بے شمار گانوؤں کے کچے جھونپڑے اور دیہات کی سڑکیں اور کھیت پٹے پڑے تھے۔ ساری دنیا میں انسان

مر رہے تھے اور ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ان کی موت عام طور پر فوری ہوتی تھی، بہادروں کی سی موت ایک مقصد کے لیے، ایک غرض کے لیے، ایسی موت جو ہماری موجودہ دنیا کے سلسلۂ واقعات کی ایک منطقی کڑی تھی یعنی اس زندگی کا جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہو چکی تھی دفعتہً ختم ہو جانا۔ لیکن یہاں ہندوستان میں موت کا نہ کوئی مقصد تھا، نہ منطقی ضرورت، نہ طبیعی جبر۔ یہ محض انسان کی نا اہلی اور بے دردی کا کرشمہ تھا، یہ اس کی اپنی بلائی ہوئی، آہستہ آہستہ رینگنے والی، ہیبت ناک بلا تھی جس میں اچھائی کا کوئی پہلو بھی نہ تھا۔ زندگی گھل گھل کر موت میں جذب ہو رہی تھی — سوکھے ڈھانچوں میں کچھ کچھ سانس اٹکا ہوا اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے موت جھانکتی ہوئی۔ اس لئے اس کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسی ناگوار باتوں کا تحریر یا تقریر میں ذکر کرنا بدتمیزی میں داخل تھا۔ اگر کوئی ایسا کرے تو کہا جاتا تھا کہ وہ دوسروں کی مصیبت کا تماشا بنا کر دکھاتا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان میں ارباب حکومت جھوٹی خبریں دیتے تھے۔ مگر لاشوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے وہ بیچ میں آ کر راستہ روک لیتی ہیں۔

اِدھر بنگال کے لوگ دوزخ کی آگ میں بھن رہے تھے اور اُدھر حکام بالا دست فرماتے تھے کہ زمانۂ جنگ کی خوش حالی کی بدولت ہندوستان کے بہت سے حصوں میں کاشتکار کے پاس کھانے کا سامان افراط سے موجود ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ خرابی دراصل صوبائی خود مختاری کی وجہ سے ہے۔ حکومت ہند ہو یا وزیر ہند کا محکمہ دونوں آئینی آداب کا اس درجہ لحاظ رکھتے ہیں کہ صوبوں کے معاملات میں مطلق دخل نہیں

دے سکتے، حالانکہ اسی آئین کو وائسرائے اپنے ذاتی غیر محدود اختیارات سے روزمرہ سیکڑوں احکام اور ضوابط جاری کر کے کبھی معطل کر دیتے ہیں، کبھی توڑ ڈالتے ہیں، کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور کبھی بدل دیتے ہیں۔ اس آئین سے مراد ہے ایک فرد واحد کی جابرانہ حکومت جو ہندوستان میں کسی شخص کے آگے جواب دہ نہیں، جس کو اتنے اختیارات حاصل ہیں کہ دنیا کے کسی ڈکٹیٹر کو نہیں۔ اس آئین کو چلانے والے حکومت کے مستقل ملازم، خصوصاً سول سروس اور پولیس کے لوگ ہیں، جو گورنر کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہ گورنر وائسرائے کا ایجنٹ ہے اور وزیروں کو، اگر وہ موجود بھی ہوں، جب چاہے بے تکلف نظر انداز کر سکتا ہے۔ وزیر اچھے ہوں یا برے، اسی وقت تک رہ سکتے ہیں جب تک گورنر کی مرضی ہو اور ان کی یہ مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کریں یا سول سروس اور پولیس سروس کی رائے میں دخل دیں حالانکہ یہ ان کے ماتحت سمجھی جاتی ہیں۔

خدا خدا کر کے کچھ ہوا، کچھ امداد پہنچائی گئی مگر لاکھوں مر چکے تھے، نہ جانے دس لاکھ یا بیس لاکھ یا تیس لاکھ۔ کسی کو خبر نہیں کہ ان ہولناک مہینوں میں کتنے آدمی فاقے کی یا بیماری کی نذر ہو گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کتنے اور ہڈیوں کے ڈھانچے، لڑکے لڑکیاں اور چھوٹے چھوٹے بچے اس وقت مرتے مرتے بچ گئے مگر ان کی بازی ہاری گئی، ان کے جسم اور ان کی روحیں شل ہو کر رہ گئیں، اور اب تک قحط اور بیماری کا خوف اس سرزمین پر منڈلا رہا ہے۔

پریسیڈنٹ روزولیٹ کی چہار گونہ آزادی میں احتیاج سے

آزاد ہونا بھی داخل تھا لیکن دولت مند انگلستان اور اس سے زیادہ دولت مند امریکہ کو اس جسمانی بھوک کی کوئی پروا نہیں ہوئی جس سے ہندوستان میں لاکھوں آدمی مر رہے تھے، اسی طرح جیسے انھوں نے اس روحانی پیاس کی کوئی پروا نہیں کی تھی جس سے ہندوستان والے مدت سے تڑپ رہے ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ روپیے کی تو ضرورت نہیں ہے، اور کھانے کا سامان بھیجنے کے لئے جنگی ضرورتوں کی وجہ سے جہاز نہیں ملتے۔ لیکن ہر چند کہ حکومت نے رکاوٹیں ڈالیں اور بنگال کی ہولناک مصیبت کو کم کر کے دکھانا چاہا پھر بھی انگلستان اور امریکہ کے مردوں اور عورتوں نے، جن کے دل میں درد کی تڑپ، جن کے سینے میں محبت کی حرارت تھی ہماری مدد کی۔ ان سے بڑھ کر چین، آئرستان کی حکومتوں نے، باوجودیکہ ان کے وسائل بہت کم تھے اور وہ اپنی اپنی مشکلوں میں مبتلا تھیں، سیر چشمی سے ہماری مدد کی اس لئے کہ ان کو خود قحط اور مصیبت کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور وہ اندازہ کر سکتی تھیں کہ ہندوستان کے جسم اور روح پر کیا گذر رہی ہے۔ ہندوستان کا حافظہ بہت قوی ہے مگر وہ اور کچھ یاد رکھے یا نہ رکھے دوستی اور مہربانی کے اس سلوک کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

۴۔ جمہوریت کی خاطر جنگ

ایشیا، یورپ اور افریقہ میں، بحر الکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند کے وسیع علاقے میں، جنگ اپنے ہولناک مظاہر کے ساتھ جاری ہے۔ کوئی سات برس سے چین کی جنگ، ساڑھے چار برس سے یورپ اور افریقہ کی جنگ، اور دو برس چار مہینے سے عالمگیر جنگ فسطائیت اور نازیت اور

ان کی تسخیرِ عالم کی کوششوں کے خلاف۔ اس زمانہ جنگ میں سے تین سال میں نے یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر قید خانے میں گذارے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ فسطائیت اور نازیت کے ابتدائی زمانے میں میرا اور صرف میرا ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں اور بہت سے لوگوں کا، کیا خیال تھا۔ چین میں جاپان کی جارحانہ پیش قدمی کا ہندوستان پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس کی اور چین کی دوستی، جو قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے پھر تازہ ہو گئی۔ حبش میں اٹلی کی دراز دستیاں دیکھ کر ہمارا دل پھٹ گیا۔ چیکوسلوواکیہ کے ساتھ جو بے وفائی کی گئی اس نے ہمیں رنج اور غصّے سے بے تاب کر دیا۔ جمہوری اسپین کا نہایت استقلال سے دادِ شجاعت دینے کے بعد شکست کھانا میرے لئے اور مجھ جیسے اور بہت سے لوگوں کے لیے ایک المناک واقعہ تھا۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود ہم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔

فسطائیوں اور نازیوں کے جارحانہ حملے اور ان کی بے ہودگی اور بے دردی، یہ چیزیں بھی کچھ کم ہولناک نہ تھیں، لیکن ان سے بھی زیادہ ہمیں ان اصولوں سے دہشت تھی جن کے وہ قائل تھے اور جن کا وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتے تھے، اور ان نظریوں سے نفرت تھی جن کے سانچے میں وہ اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ یہ ان عقیدوں کے بالکل برعکس تھے جو ہم آج رکھتے ہیں اور ہمیشہ سے رکھتے آئے ہیں اور اگر ہمارا قومی حافظہ کام نہ بھی دیتا اور ہم اپنی روایات کو بھول بھی جاتے، تو وہ سختیاں جو خود ہمارے ملک پر تہذیب کے بھیس

میں کی گئیں، اس کے لئے کافی تھیں کہ ہمیں نازیوں کے اصولوں، ان کے فلسفۂ زندگی اور نظریۂ ریاست کی حقیقت سے آگاہ کردیں اس لئے کہ ہماری قوم بھی ایک مدت سے انھیں اصولوں کا اور اسی طریقۂ حکومت کا مزاحکہ رہی تھی۔ غرض ہمارے ملک میں فسطائیت اور نازیت کے خلاف فوری اور شدید ردّعمل شروع ہوگیا۔

مجھے یاد ہے کہ مارچ ۱۹۳۶ء کی ابتدا میں سینور مسولینی نے مجھے بڑے اصرار سے ملنے کے لئے بلایا تھا اور میں نے انکار کردیا تھا۔ برطانیہ کے بہت سے سربرآوردہ مدبّر جو اٹلی کی جنگ میں شامل ہونے کے بعد مسولینی کو بُرا کہنے لگے اُس زمانے میں اس کا ذکر محبت اور تعریف کے ساتھ کرتے تھے اور اس کے طریقِ حکومت کے مداح تھے۔

دو سال بعد میونک کی کانفرنس سے پہلے گرمیوں کے موسم میں نازی حکومت نے مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی اور یہ پیام بھیجا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم نازیت کے مخالف ہو مگر پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ تم خود آکر جرمنی کے حالات کا مطالعہ کرو۔ چاہے تم ہمارے مہمان کی حیثیت سے آؤ یا اپنے طور پر، چاہے اپنا نام ظاہر کرو یا نہ کرو، تمھیں پوری آزادی ہوگی کہ جہاں جی چاہے جاؤ۔ مگر میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کردیا۔ اس کے بجائے میں چیکوسلوواکیہ گیا یعنی اس "دور دراز" ملک میں جس کے بارے میں اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا تھا۔

میونک کی کانفرنس سے پہلے میں برطانوی کابینہ کے بعض ارکان

سے اور انگلستان کے دوسرے ممتاز سیاست دانوں سے ملا اور میں نے ان کے سامنے فسطائیت اور نازیت کے خلاف اظہار رائے کی جرائت کی۔ میں نے یہ دیکھا کہ میرے خیالات انھیں کچھ پسند نہیں آئے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے اور اس میں بہت سی مصلحتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

جس زمانے میں چیکوسلوواکیہ کا افسوسناک واقعہ پیش آیا میں نے فرانس اور برطانیہ کی پالسی کے جو مظاہرے سوڈیٹن لینڈ، لندن، پیرس اور جنیوا میں جہاں اس وقت لیگ اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، دیکھے۔ ان سے مجھے بڑی حیرت اور کوفت ہوئی۔ تالیفِ قلوب کے الفاظ اس پالیسی کے لیے بہت نرم ہیں۔ اس کی تہ میں صرف ہٹلر کا خوف ہی نہیں بلکہ اس کی خوشامد اور تعریف بھی تھی۔

اب تقدیر کی نیرنگی دیکھیے کہ اِدھر میں اور میرے ہم خیال قید خانے میں زندگی کاٹ رہے ہیں اور اُدھر فسطائیت اور نازیت کے خلاف جنگ چھڑی ہوئی ہے اور اکثر حضرات جو ہٹلر اور مسولینی کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے اور چین میں جاپان کی دراز دستی کی حمایت کرتے تھے، آزادی، جمہوریت اور فسطائیت کی دشمنی کے علم بردار ہیں۔

ہندوستان نے جو رنگ بدلا ہے وہ بھی اتنا ہی حیرت انگیز ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی حکومت کے "حاشیہ نشین" سرکاری آدمی ان لفظوں کو دُہراتے ہیں جن سے ان کے خیال میں ان کے ولی نعمت خوش ہوں گے۔ تھوڑے دن پہلے یہ حضرات ہٹلر اور مسولینی کے گن گاتے تھے اور انھیں آسمان پر چڑھاتے تھے اور

سوویٹ یونین کو سراسر لعنت کے قابل سمجھتے تھے۔ مگر اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔ یہ عمائدین حکومت بہ بانگ دہل فسطائیت اور نازیت کی مخالفت کا اعلان کرتے ہیں اور دبی زبان سے جمہوریت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں مگر اس طرح جیسے کسی دور دراز منزل کا۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ حالات کا رخ بدل جاتا تو یہ لوگ کیا کرتے۔ مگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے، ظاہر ہے جس کسی کی حکومت ہوتی اُسے خوش آمدید کہتے ہار پہناتے اور سپاس نامے پڑھ کر سناتے۔

برسوں پہلے سے میرے دل و دماغ پر آنے والی جنگ کا اندیشہ چھایا ہوا تھا۔ میں اُسی کے بارے میں سوچتا تھا، اسی کے متعلق تقریریں کرتا تھا، مضمون لکھتا تھا اور اپنے ذہن کو اس کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میری آرزو تھی کہ ہندوستان اس زبردست کشمکش میں دل و جان سے شریک ہو اس لیے کہ میں سمجھتا تھا لڑائی اعلیٰ اصولوں کی خاطر لڑی جائے گی اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کی اور ساری دنیا کی حالت میں بڑا انقلاب ہو جائے گا۔ اس وقت تک مجھے یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان کے لیے کوئی فوری خطرہ ہے یعنی اس پر حملہ ہونے کا کوئی امکان ہے۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ ہندوستان جنگ میں پوری طرح حصہ لے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ آزاد ملک ہو اور دوسروں کے ساتھ برابر کا شریک ہو۔

یہ رویہ تھا ہندوستان کی سب سے بڑی انجمن نیشنل کانگریس کا جو اس سارے عرصے میں نازیوں اور فسطائیوں کی اسی شدت سے مخالفت کرتی رہی جیسے سامراجیوں کی۔ اُس نے جمہوری اسپین اور

چیکوسلوواکیہ کی حمایت کی اور شروع سے آخر تک چین کی طرفدار رہی۔

یہی کانگریس دو سال سے خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے ہیں۔ صوبوں کی کونسلوں کے کانگرسی اراکین، صدر اور وزرا، بلدیوں کے کانگرسی میئر اور چیرمین، غرض ساری کانگریس جیل میں ہے۔

اور جنگ جاری ہے۔ وہ جنگ جو جمہوریت کے لیئے "اٹلانٹک چارٹر" کے لیئے اور چہار گونہ آزادی کے لیئے لڑی جا رہی ہے۔

۴۔ قید کا زمانہ۔ عمل کا ولولہ

قید میں زمانے کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ حال کا تو وجود ہی نہیں ہوتا اس لیئے کہ نہ کوئی حس باقی رہتی ہے نہ کوئی احساس جو اُسے بے جان ماضی سے جدا کر سکے۔ یہاں تک کہ باہر کی چلتی پھرتی، مرتی جیتی دنیا کی چیزیں بھی خواب کی طرح بے حقیقت، ماضی کی طرح بے تغیر، بے حرکت معلوم ہوتی ہیں۔ خارجی معروضی زمانہ غائب ہو جاتا ہے، داخلی موضوعی حس کچھ مدھم سی باقی رہ جاتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی تخیل اسے جھنجوڑ کر حال کی نیند سے چونکاتا ہے اور ماضی یا مستقبل کو جیتی جاگتی حقیقت بنا کر دکھاتا ہے۔ یوں بھی ہم بہ قول اوگست کونت کے مردوں کی طرح ماضی کے کفن میں لپٹے رہتے ہیں، مگر قید خانے میں خاص طور پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے بھوکے پیاسے جذبات کو ماضی کی یاد یا مستقبل کے تصور سے تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماضی میں ایک عجیب سکون اور دوام پایا جاتا ہے۔ وہ تغیر

سے بری ہے اور موقلم کی تصویر یا کانسے اور مرمر کے مجسمے کی طرح ابدیت کی شان رکھتا ہے۔ حال کے طوفان و ہیجان سے اس کے وقار و تمکین میں خلل نہیں پڑتا اور وہ ہماری بے چین روح اور شوریدہ دماغ کو اپنے زمیں دوز مقبرے میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں امن وامان کا دور دورہ ہے اور ایک خاص روحانی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ماضی سرد اور بے جان ہے، جب تک ہم اس کا رشتہ موجودہ زندگی کی کشمکش سے اور اس کے پیچیدہ مسائل سے نہ جوڑیں۔ یہ ایک طرح کا خالص آرٹ ہے اس میں وہ احساس کی شدت اور عمل کا ولولہ جسے زندگی کا سرمایہ کہنا چاہیئے مفقود ہے۔ احساس اور ولولے کے بغیر رفتہ رفتہ امید اور قوت کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں، زندگی کی سطح پست ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وجود عدم میں جذب ہوجاتا ہے، ہم ماضی کے بندے ہوکر رہ جاتے ہیں اور اس کا جمود ہم میں سرایت کرجاتا ہے۔ ذہنی موت کا یہ عمل قید خانے میں اور بھی آسان ہوجاتا ہے جہاں ہم جیل کی روزمرہ زندگی میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

پھر بھی ماضی ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اُسی کا دیا ہوا ہے۔ ہم خود اس کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ماضی کو نہ پہچانیں اور اس کی روح کو اپنے اندر محسوس نہ کریں تو حال کو نہیں پہچان سکتے۔ ماضی کو حال سے ربط دینا اور مستقبل سے ملانا، اس کے بے ربط اجزا کو رد کردینا اور اس ترکیب سے فکر و عمل کے لئے جان دار اور متحرک مواد حاصل کرنا، اسی کا نام زندگی ہے۔

ہر زندہ عمل ہمارے وجود کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔ فرد کی ساری پچھلی زندگی بلکہ جماعت کی ساری تاریخ سے وہ زمین تیار ہوتی ہے، جس کے اندر سے عمل کا یہ خاص لمحہ پھوٹتا ہے۔ اجتماعی حافظے کے نقوش، وراثت ماحول اور تربیت کے اثرات، لاشعوری ہیجانات، بچپن سے اب تک کے خیالات، تصورات اور افعال، کچھ عجیب طریقے سے مل جل کر اس نئے عمل کو وجود میں لاتے ہیں اور پھر یہ خود مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ ایک حد تک، شاید بہت بڑی حد تک اس کا تعین کرتا ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب ان چیزوں میں جبر کا قانون کارفرما ہے۔

آربندو گھوش نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حال "ایک لمحہ ہے کسی پاک دامن دوشیزہ کی طرح معصوم"۔ یہ زمانے کی تلوار کی تیز دھار ہے جو ماضی کو کاٹ کر مستقبل سے جدا کر دیتی ہے۔ یہ دفعتاً پیدا ہوتی ہے اور آناً فاناً معدوم ہو جاتی ہے۔ جملہ تو خوب ہے مگر آخر اس سے مطلب کیا ہے؟ یہ دوشیزہ مستقبل کے پردے سے نکل کر عریانی معصوم کا جلوہ دکھاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے آلودہ اور پژمردہ ماضی بن جاتی ہے۔ کیا ہم اس کے دامنِ عصمت کو آلودہ کر دیتے ہیں یا دراصل وہ کوئی دوشیزہ نہیں بلکہ ماضی کی داشتہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اختیار اُس معنی میں جس میں فلسفی اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں وجود رکھتا ہے یا دنیا میں محض جبر ہی جبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ واقعات کا سلسلہ جو فرد کو متاثر اور اکثر مجبور کر دیتا ہے اس کے بہت سے افعال کو متعین کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ خود وہ تقاضائے عمل جو اس کے اندر

سے پیدا ہوتا ہے اور ارادہ مختار کہلاتا ہے جبر کا نتیجہ ہو۔ شوپن ہاور نے
کہا ہے انسان جو چاہے کر سکتا ہے لیکن چاہنا اس کے اختیار میں نہیں۔
(جبر محض کا عقیدہ لازمی طور پر عمل کو معطل کر دیتا ہے اور انسان جیتے جی
مر جاتا ہے۔ میرا سارا احساس زندگی اس عقیدے کے خلاف بغاوت
کرتا ہے اگرچہ ممکن ہے کہ یہ بغاوت بھی گذشتہ واقعات کا لازمی نتیجہ ہو۔)
عام طور پر میں اپنے دماغ کو ان فلسفیانہ یا مابعدالطبیعی مسائل
میں نہیں اُلجھاتا جو کسی طرح حل نہیں ہو سکتے۔ بعض اوقات قید خانے
کی طویل خاموشی میں، بلکہ کبھی کبھی عین جوشِ عمل کی حالت میں اس قسم
کے خیالات مجھ پر ایک دم سے لوٹ پڑتے ہیں اور ایک بے تعلقی کی
کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ مجھے زندگی کی مکروہات سے ایک تسکین
سی محسوس ہوتی ہے مگر عموماً میں عمل اور فکر عمل میں محو ہوتا ہوں اور
جب عمل کی راہ روک دی جائے تو اپنے خیال میں عمل کی تیاری
کرتا رہتا ہوں۔

ایک مدت سے عمل کا تقاضا میرے دل میں فکر سے جدا نہیں ہوتا
بلکہ خود عمل فکر کے سلسلے کی ایک کڑی بن جاتا ہے۔ شاذونادر کوئی لمحہ ایسا
بھی آجاتا ہے کہ ان دونوں میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فکر عمل میں آکر
تکمیل کو پہنچتی ہے اور عمل فکر کو حقیقت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ وجود
کے اس لمحے میں مجھے بھرپور زندگی کا، بصیرت اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔
مگر ایسے لمحے ہمیں کم میسر آتے ہیں بہت ہی کم۔ زیادہ فکر کی نے عمل سے
بالعموم کی لے فکر سے بڑھ جاتی ہے اور ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے
کی کوشش ناکام رہتی ہے۔ برسوں پہلے ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب

مہینوں میرے دل میں جذبات کا دریا چڑھا رہتا تھا اور میں عمل کی رَو میں بہتا چلا جاتا تھا۔ جوانی کے وہ دن اب بہت دور نظر آتے ہیں، کچھ تو اس لیے کہ اتنے برس بیت گئے مگر زیادہ تر اس وجہ سے کہ اُس زمانے اور اِس زمانے کے درمیان تجربے اور فکر کا دریائے شور حائل ہو گیا ہے۔ اب وہ اگلا سا ولولہ نہیں رہا، امنگوں کا بے پناہ جوش دھیما پڑ گیا اور احساسات اور جذبات ایک حد تک قابو میں آ گئے۔ فکر کا بوجھ اکثر رکاوٹ بن جاتا ہے اور اس دل میں جہاں یقین کا راج تھا شبہہ سر اُٹھانے لگتا ہے۔ شاید یہ عمر کا تقاضا ہے یا زمانے کی ہوا کا اثر ہے۔

تاہم اب بھی عمل کی دعوت میرے نفس کی گہرائیوں میں ایک ہیجان برپا کر دیتی ہے اور تھوڑی دیر فکر سے الجھنے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں پھر وہی "جذبۂ بے اختیار شوق" جاگ اُٹھے جو خطروں سے کھیلتا ہے اور موت کا منہ چڑاتا ہے۔ مجھے موت کی تمنا تو نہیں مگر اس سے ڈرتا بھی نہیں۔ میں زندگی کی نفی یا ترک کا قائل نہیں۔ مجھے زندگی سے محبت تھی اور اب تک ہے۔ میں اپنے رنگ میں اس سے لطف اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں اگرچہ اب میرے پیروں میں بہت سی غیر محسوس بیڑیاں پڑ گئی ہیں۔ اس محبت کی وجہ سے میں زندگی کا پرستار بن کر نہیں رہ گیا بلکہ اس سے کھیلتا ہوں اور اس کے کنارے کھڑا باہر جھانکتا رہتا ہوں۔ اسی لیے ہم دونوں ایک دوسرے کی اور زیادہ قدر کرتے ہیں۔ شاید مجھے ہوا باز ہونا چاہیے تھا تاکہ جب میرا جی زندگی کی سست روی اور بے کیفی سے اُکتا جاتا تو میں بادلوں کی تند و پرشور فضا میں گھس جاتا اور اپنے دل میں کہتا،

"میں نے سب کچھ دل کی ترازو میں تول کر دیکھ لیا
گذرے ہوئے سال اکارت
اور آنے والے سال بے کار
ایک پلڑے میں یہ زندگی دوسرے میں یہ موت ہے" ۱

۱۵ - ماضی کا تعلق حال سے

اس عمل کے تقاضے نے، زندگی کا مزا عمل کی شکل میں چکھنے کی خواہش نے میری ساری فکر اور جد و جہد کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ مسلسل فکر بھی، قطع نظر اس کے کہ وہ خود ایک قسم کا عمل ہے، آئندہ عمل کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ وہ محض فکر نہیں جو عمل اور زندگی سے بے تعلق خلا میں جھولا کرتی ہے۔ یہ ماضی کو حال کی یعنی ہنگام عمل کی تمہید، مستقبل کو حال کا تتمہ، اور ان تینوں کو ایک دوسرے سے متعلق اور وابستہ جانتی ہے۔

میری قید خانے کی زندگی بھی، جو بظاہر بے عمل معلوم ہوتی تھی، خیال اور احساس کے ذریعے سے آنے والے مفروضہ عمل سے وابستہ ہے اور اس طرح مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی حقیقت ہے ورنہ وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی اور مجھے جینا دوبھر ہو جاتا۔ جب میرے لیے عمل کی راہ رک جاتی ہے تو میں ماضی کی یاد سے دل بہلاتا ہوں اور چونکہ خود میرے تجربے میں ایسے واقعات آ چکے ہیں جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور خود مجھے بھی اپنے دائرے کے اندر ان واقعات کی تشکیل میں تھوڑا بہت حصہ لینے کا موقع ملا ہے اس لیے میں آسانی سے

تاریخ کا تصور ایک جان دار حقیقت کی حیثیت سے کر سکتا ہوں جس کا میں بھی ایک جز ہوں۔

مجھے تاریخ سے دیر میں سابقہ پڑا اور وہ بھی اس طریقے سے نہیں کہ اُن واقعات کا مطالعہ کرتا اور ان سے نتیجے نکالتا جنھیں میری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب تک میں یہ کرتا رہا تاریخ میری نظر میں ایک بے معنی چیز تھی۔ مابعد الطبیعی نظریات سے یا آئندہ زندگی کے مسائل سے مجھے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ شوق سائنس سے، روزمرہ کے واقعات سے اور موجودہ زندگی کے مسائل سے تھا۔

فکر، جذبے اور ارادے کے ایک معجون مرکب نے جس کا مجھے محض دھندلا سا شعور تھا، مجھے عمل پر اُبھارا اور عمل نے میرے اندر مزید فکر کا شوق اور اپنے زمانے کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ چونکہ اس زمانے کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں اس لئے میں نے ماضی پر تحقیق کی نظر ڈالی اور ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہا جن سے حال کے سمجھنے میں مدد ملے۔ اس حالت میں بھی جب میں پچھلے واقعات اور گذرے ہوئے لوگوں کے خیال میں محو ہو جاتا تھا اور مجھے یہ خبر نہ رہتی تھی کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں، حال کا تصور برابر میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ماضی کے قبضے میں ہوں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ آج سارا ماضی میرے تصرف میں ہے۔ گذشتہ تاریخ موجودہ تاریخ میں جذب ہو جاتی تھی اور ایک زندہ حقیقت بن جاتی تھی جو راحت و الم کے احساسات سے

وابستہ تھی۔

جہاں ماضی حال بن جاتا تھا وہاں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ حال پیچھے ہٹتے ہٹتے بہت دور چلا جاتا تھا اور ماضی کی طرح پتھر کی بے حس و حرکت مورت بن کر رہ جاتا تھا۔ عین شدت عمل کی حالت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی گذرا ہوا مرحلہ ہے جسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہوں۔

یہی ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی خواہش تھی جس کی وجہ سے میں نے اب سے بارہ سال پہلے ("تاریخ عالم کی ایک جھلک") اپنی بیٹی کے نام خطوط کے پیرائے میں لکھی۔ میں نے یہ کتاب سرسری طور پر سیدھے سادے اسلوب میں لکھی تھی اس لئے کہ میرا خطاب ایک کم سن لڑکی سے تھا۔ اس کی تہ میں وہی تحقیق اور تلاش کی لگن تھی۔ مجھ پر مہم جوئی کا شوق غالب تھا اور میں پرانے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک ایک کر کے تاریخ کی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ جیل میں فرصت ہی فرصت تھی۔ مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ کوئی ضروری کام ہے جسے ایک مقررہ مدت کے اندر ختم کرنا ہے۔ اس لئے جب جی چاہتا تھا تیزی سے قدم بڑھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا تھا رک جاتا تھا تاکہ تاثرات دل میں اچھی طرح بیٹھ جائیں اور ماضی کی سوکھی ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھ جائے۔

یہی تحقیق کی دھن تھی۔ اگرچہ اس کا دائرہ اپنے زمانے اور جانے بوجھے لوگوں تک محدود تھا، جس نے آگے چل کر مجھ سے ("میری کہانی") لکھوائی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس بارہ سال میں بہت کچھ بدل گیا ہوں۔ مجھ میں غور و فکر کا مادہ بڑھ گیا ہے۔ شاید پہلے کے مقابلے میں کچھ توازن اور تجرد، طبیعت میں قدرے سکون و اطمینان پیدا ہو گیا ہے۔ اب المناک واقعات کا مجھ پر اتنا شدید اثر نہیں ہوتا، دل میں ہیجان کم پیدا ہوتا ہے اور کم دیر تک رہتا ہے حالانکہ المناک واقعات اس زمانے میں پہلے سے کہیں زیادہ ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یا صرف یہ بات ہے کہ اعصاب سخت ہو گئے ہیں۔ یہ محض کہولت کا اثر، قوت حیات کا انحطاط، جوشِ زندگی کی کمی ہے یا اس کا نتیجہ ہے کہ مدتوں قید خانے میں رہنے سے زندگی کا چڑھا ہوا دریا رفتہ رفتہ اتر گیا ہے، خیالات کے جھونکے آکر گذر جاتے ہیں اور ذہن کی سطح پر محض خفیف سے ہلکورے چھوڑ جاتے ہیں۔ افکار اور آلام کا مارا ہوا دل فرار کی ترکیبیں ڈھونڈھتا ہے، حواس صدمے سہتے سہتے بے حس ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا رنج و مصیبت کے بوجھ میں اس قدر دبی ہوئی ہے کہ تھوڑی سی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف ایک چیز ہے جسے کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ یہ عزم ہے کہ ہم ہر حال میں ہمت اور وقار کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں گے اور ان آدرشوں کو نہ چھوڑیں گے جن کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔

کچھ دن ہوئے کسی نے کہا تھا "موت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے"۔ بات تو صحیح ہے مگر کہنے کا انداز عجیب ہے۔ اس پیدائشی حق سے نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ ہم خود ہی کوشش کرتے

ہیں کہ جہاں تک ہوسکے اس حق کو بھول جائیں اور جتنے زیادہ عرصے تک ممکن ہو اس کے استعمال سے بچے رہیں۔ پھر بھی جملہ نیا اور دلچسپ ہے۔ جو لوگ زندگی سے اس قدر نالاں ہیں ان کے لئے نجات کی راہ ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ جب چاہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ اگر ہمیں زندگی پر قابو نہیں موت پر تو اختیار ہے۔ یہ ایک دل خوش کن خیال ہے جس سے بے بسی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

۶ - زندگی کا فلسفہ

چھ سات برس ہوئے امریکہ کے ایک ناشر نے مجھ سے فرمائش کی کہ ایک مجموعے کے لئے جو میں مرتب کر رہا ہوں اپنے فلسفۂ زندگی پر ایک مضمون لکھ دو۔ مجھے یہ خیال پسند آیا لیکن میں اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا اور جتنا زیادہ غور کرتا تھا اتنی ہی طبیعت اس سے بھاگتی تھی۔ آخر میں نے وہ مضمون نہیں لکھا۔

مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میرا فلسفۂ زندگی کیا ہے۔ چند سال پہلے اس موضوع پر لکھنے میں اتنا تامل نہ ہوتا۔ اس وقت تک میرے خیالات اور مقاصد واضح تھے، مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ پچھلے چند سال میں ہندوستان، چین، یورپ اور دنیا کے سبھی ملکوں میں ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے طبیعت کو الجھن اور پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ مستقبل مبہم اور تاریک نظر آتا ہے اور اس کا واضح نقشہ جو میرے ذہن میں تھا وہ مٹ گیا ہے۔

بنیادی مسائل کے بارے میں جو مشکلات اور شبہات میں محسوس

کرتا تھا ان سے فوری عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی البتہ جوش عمل کچھ کم ہو جاتا تھا۔ اب وہ جوانی کی سی کیفیت نہیں رہی تھی جب میں تیر کی طرح نشانہ پر جا پہنچتا تھا، یعنی اس مقصد کے سوا جو میرے سامنے ہوتا تھا ہر چیز کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ پھر بھی میری عملی جدوجہد جاری تھی اس لئے کہ میری فطرت عمل کا تقاضا کرتی تھی اور یہ عمل میرے نصب العین سے حقیقی یا خیالی ہم آہنگی رکھتا تھا۔ لیکن سیاسیات سے میری طبیعت ہٹتی جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا سارا تصور زندگی بدل رہا ہے۔

جو نصب العین اور جو مقاصد پہلے میرے پیش نظر تھے وہی اب بھی تھے۔ مگر اب ان کی وہ شان نہیں رہی تھی۔ جوں جوں اُن کی طرف بڑھتا تھا ان کی وہ آب و تاب جو دل کو حرارت اور بدن کو قوت بخشتی تھی ماند پڑتی جاتی تھی۔ یوں تو اکثر بدی کو نیکی پر فتح حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک صورت یہ ہے کہ جو چیز پہلے حق معلوم ہوتی ہو وہ مسخ ہو کر باطل نظر آنے لگے۔ کیا انسانی فطرت اتنی بُری ہے کہ جب تک وہ صدیوں الم اور مصیبت کے مکتب میں تربیت نہ پائے اس میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوگی کہ انسان کو لالچ، ظلم اور فریب سے بالاتر کر دے۔ کیا اس عرصے میں اس کو بدلنے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں یا آئندہ ہوں گی ان کا ناکام رہنا یقینی ہے؟

کیا ذرائع اور مقاصد باہم اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے اور غلط ذریعہ اختیار کرنے سے کام میں خلل پڑ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے؟ لیکن اگر صحیح ذریعہ کمزور اور خود غرض انسانی فطرت کی طاقت سے باہر ہو تو کیا کیا جائے؟ ترکِ عمل

کے تو یہ معنی ہیں کہ ہم نے ناکامی کا اقرار کر لیا اور بدی کے آگے سر جھکا دیا۔ اور عمل کے معنی اکثر یہ ہوتے ہیں کہ کسی قسم کی برائی سے مصالحت کرلیں اور اس مصالحت کے ناگوار نتائج برداشت کریں۔ میں ابتدا میں مسائلِ زندگی کو کم و بیش سائنس کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا اُس رجائیت کے رنگ میں جو سائنس پر انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے شروع میں چھایا ہوا تھا۔ فراغت اور آرام کی زندگی، قوتِ عمل اور خود اعتمادی کی وجہ سے یہ رجائیت کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔ مشربِ انسانیت (Humanism) کا ایک مبہم سا تصور مجھے مرغوب تھا۔

مذہب خواہ وہ ہندویت ہو یا اسلام، بودھیت یا عیسائیت، جس شکل میں میں نے معقول اور ذی ہوش افراد تک کو اسے ماننے اور برتتے ہوئے دیکھا، میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ میرے نزدیک وہ وہم پرستانہ اعمال اور اذعانی عقائد سے وابستہ تھا اور جس طریقے سے وہ مسائل زندگی کو حل کرنا چاہتا تھا وہ سائنس کے طریقے سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں ایک طرح کی سحر پرستی، ایک غیر تنقیدی خوش اعتقادی اور فوق العادۃ قوتوں پر اعتماد پایا جاتا تھا۔

تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ مذہب انسانی فطرت کی ایک شدید ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ساری دنیا میں لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کا کام کسی نہ کسی مذہبی عقیدے کے بغیر نہیں چل سکتا۔ متعصب، تنگ نظر اور ظالم انسانوں کے ساتھ ساتھ مذہب نے بہترین عورتیں اور مرد بھی پیدا کئے ہیں۔ اُس نے انسانی زندگی کو بہت سی قدروں سے آشنا کیا اور گو ان میں سے بعض قدریں آج کل بے کار بلکہ مضر ہیں، لیکن

بعض ایسی بھی ہیں جن پر اب تک اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ اگر مذہب کے
وسیع معنی لئے جائیں تو یہ شعور انسانی کے نامعلوم علاقوں سے تعلق رکھتا
ہے، یعنی اس اقلیم سے جو آج کل کے ثبوتی طبیعی علم کی حدود سے باہر ہے۔
ایک طرح سے دیکھئے تو مذہبی عرفان بھی ثبوتی علم کے سلسلے کی ایک مزید
کڑی ہے لیکن مذہب اور سائنس کے طریقے بالکل الگ الگ ہیں اور
ان کے موضوع بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ظاہر
ہے کہ کائنات کے نامعلوم خطے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے
ہیں اور سائنس اپنے شاندار انکشافات کے باوجود ان سے ناواقف ہے،
اگرچہ وہ ٹٹولتی ہوئی ان کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ غالباً یہ بات بھی ہے
کہ سائنس کا معمولی طریقہ جو وہ مرئی دنیا اور عمل حیات کے مشاہدے میں
استعمال کرتی ہے غیر مرئی عالم کے نفسی، جمالیاتی، روحانی اور اسی طرح
کے دوسرے عناصر کے لئے موزوں نہیں ہے۔ زندگی صرف انھیں چیزوں
تک جنھیں ہم دیکھتے، سنتے اور چھوتے ہیں، اسی مرئی دنیا تک جو زمان و مکان
کے اندر معرض تغیر میں ہے، محدود نہیں ہے۔ اس کی حد بار بار ایک غیر مرئی
دنیا سے جا ملتی ہے جس کے عناصر شاید زیادہ پائدار ہیں یا ممکن ہے اتنے
ہی ناپائدار ہوں۔ بہرحال جس شخص میں فکر کا مادہ ہے وہ اس غیر مرئی عالم
کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سائنس ہمیں زندگی کے مقصد کے بارے میں بہت کم بتاتی ہے بلکہ
سچ پوچھئے تو کچھ بھی نہیں بتاتی۔ وہ اپنی حدود کو وسیع کر رہی ہے اور ممکن
ہے کہ بہت جلد اس دنیا کو جو غیر مرئی کہلاتی ہے تسخیر کر لے اور ہمیں وسیع ترین
معنی میں مقصد حیات کے سمجھنے میں مدد دے۔ یا کم سے کم اتنی بصیرت

بخش دے کہ انسانی زندگی کے اسرار ہم پر روشن ہو جائیں۔ سائنس اور مذہب کے پرانے جھگڑے نے اب ایک نئی شکل اختیار کی ہے یعنی سائنس کا طریقہ جذباتی اور مذہبی واردات کے مشاہدے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔

مذہب تصوف، مابعدالطبیعیات اور فلسفے کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے صوفی گذرے ہیں جن کی سیرت بہت دل کش ہے اور جنھیں ہم آسانی سے یہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے کہ انھوں نے اپنے نفس کو دھوکا دیا ہے مگر تصوف ذ‌ہنگ معنی میں مجھے بالکل پسند نہیں۔ میری نظر میں یہ ایک بے شکل، نرم اور لجلجی چیز ہے۔ وہ کوئی ٹھوس اور شدید ضابطۂ نفس نہیں سکھاتا بلکہ قوائے ذہنی کو معطل کر دیتا ہے اور واردات قلب کے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ واردات زندگی کے اندرونی اور پراسرار گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے لیکن اکثر خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

مابعدالطبیعیات اور فلسفے سے مجھے مقابلتاً زیادہ لگاؤ ہے۔ اس میں گہرے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور منطق اور استدلال سے کام لیا جاتا ہے، اگرچہ اس کی بنیاد ایسے مقدمات پر قائم ہے جو بدیہی سمجھ لیے گئے ہیں۔ وہ سب لوگ جن میں غور کرنے کا مادہ ہے مابعدالطبیعیات اور فلسفے کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر کائنات کے بہت سے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ بعض قوموں کو ان علوم سے زیادہ شوق ہوتا ہے اور مختلف زمانوں میں ان کو مختلف درجے کی اہمیت حاصل رہی ہے۔ قدیم زمانے میں یورپ میں بھی اور ایشیا میں بھی اس بات پر بہت زور دیا جاتا تھا کہ داخلی زندگی خارجی دنیا سے برتر ہے۔ اس کا

لازمی نتیجہ مابعد الطبیعیات اور فلسفے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عہد حاضر کا انسان خارجی اشیا میں ڈوبا ہوا ہے مگر وہ بھی کسی شدید حادثے یا ذہنی الجھن کے وقت عام طور پر فلسفیانہ غور و فکر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کوئی نہ کوئی مبہم یا واضح فلسفہ زندگی رکھتا ہے۔ اگرچہ اکثر لوگ بے سوچے سمجھے وہی عام تصورات اختیار کر لیتے ہیں جو اُن کے ماحول اور ان کے زمانے میں مقبول ہیں اور بہت سے لوگ مابعد الطبیعی نظریات کو اپنے آبائی مذہب کے ایک جز کے طور پر مانتے ہیں۔ مجھے مابعد الطبیعیات سے کوئی خاص رغبت نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو مجھے مبہم خیال آرائی سے کچھ وحشت سی ہے۔ اس کے باوجود بعض اوقات قدیم اور جدید فلسفیوں کے مابعد الطبیعی سلسلۂ افکار کا مطالعہ میرے ذہن کو مسحور کر لیتا ہے۔ مگر میں اس سے کبھی مانوس نہیں ہوا اور ہمیشہ میں نے اس طلسم کے ٹوٹنے کے بعد اطمینان کا سانس لیا۔

دراصل مجھے جو کچھ دلچسپی ہے وہ دوسری دنیا اور آئندہ زندگی سے نہیں بلکہ اس دنیا اور اس زندگی سے ہے۔ مجھے نہیں معلوم آیا روح کوئی چیز ہے یا نہیں اور مرنے کے بعد باقی رہتی ہے یا نہیں رہتی۔ یہ مسائل بجائے خود اہم ہیں لیکن مجھے ان کی ذرا بھی فکر نہیں۔ جس ماحول میں میں نے تربیت پائی ہے اس میں لوگ روح (یا یوں کہیے کہ آتما) اور آئندہ زندگی، کرم اور پنر جنم کے عقائد کو بے چون وچرا مانتے ہیں۔ مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا ہے اور ایک حد تک میں ان مفروضات کی طرف مائل ہوں۔ ممکن ہے کہ روح ہو اور جسم کے مرنے کے بعد باقی رہتی ہو۔ یہ نظریہ بھی کہ انسان کے اعمال علت و معلول کے

قانون کے پابند ہیں خاصا معقول معلوم ہوتا ہے اگرچہ جب علت اولیٰ کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بڑی مشکل پڑ جاتی ہے اور جب روح کا وجود مان لیا جائے تو پھر جنم کا نظریہ بظاہر قرین عقل ہے۔ مگر میں ان میں سے کسی مفروضے کو یا کسی اور نظریے کو مذہبی عقیدے کے طور پر نہیں مانتا۔ یہ محض قیاس آرائیاں ہیں اس نامعلوم دنیا کے بارے میں جس کی ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ان کا میری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خواہ یہ آگے چل کر صحیح ثابت ہوں یا غلط، میرے لئے دونوں باتیں یکساں ہیں۔

روحیت اور اس کی حاضرات اور روحوں کا ظہور یہ سب چیزیں مجھے مہمل سی معلوم ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ مظاہر روح اور اسرار بعد مرگ کی تحقیق کا ایک بے تکا طریقہ ہے۔ عام طور پر یہ اس سے بھی بدتر صورت اختیار کرتی ہے یعنی اس کے ذریعے سے ان خوش اعتقاد لوگوں کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو ذہنی تکلیف سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ممکن ہے ان مظاہر روح میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہو لیکن ان کے مشاہدے کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ میرے خیال میں بالکل غلط اور جو نتائج اکا دکا شہادتوں سے نکالے جاتے ہیں سراسر ناقابل قبول ہیں۔

جب میں دنیا پر نظر ڈالتا ہوں تو اکثر مجھے سربستہ اسرار اور نامعلوم گہرائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کو سمجھنے کی کوشش کروں، ان اسرار کا محرم بنوں اور ان سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ لیکن اس کی میرے نزدیک ایک ہی راہ ہے

اور وہ سائنس کا طریقہ ہے یعنی معروضی مشاہدے کا۔ اگرچہ یہ میں جانتا ہوں
کہ حقیقی معروضیت ناممکن ہے۔ اگر معروضی یا داخلی عنصر ناگزیر ہے تو یہ اور
بھی زیادہ ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے سائنٹفک طریق کے ذریعے
سے اُسے محدود کر دینا چاہئے۔ میں نہیں جانتا کہ اُس پُراسرار وجود کو جس کا
ہمیں احساس ہوتا ہے کیا کہا جائے۔ میں اسے خدا نہیں کہوں گا اس لئے
کہ خدا کے مفہوم میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جن کا میں قائل
نہیں۔ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا کا یا کسی نامعلوم برتر قوت کا
تصور اس طرح کروں کہ وہ انسانی صفات سے متصف ہے اور ہمیشہ اس
پر تعجب ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ یہ تصور رکھتے ہیں۔ خدا کی ہستی کو ذات
سے تعبیر کرنا مجھے عجیب و غریب چیز معلوم ہوتی ہے۔ ذہنی حقیقت سے
میں وحدت وجود کے تصور کو ایک حد تک سمجھ سکتا ہوں اور ویدانت
کے فلسفۂ لاثنویت کی طرف مائل ہوں اگرچہ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں
اس کی باریکیوں اور گہرائیوں کو سمجھتا ہوں اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ
محض ذہنی ادراک کافی نہیں۔ لیکن ویدانت اور اس قسم کے دوسرے نظریات
کی اُن مبہم اور بے شکل قیاس آرائیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے جو نامحدود
کے متعلق کی جاتی ہیں۔ فطرت کی وسعت اور اُس کا تنوع مجھے بہت
متاثر کرتا ہے اور میرے اندر ایک روحانی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ قدیم ہندوستانی یا یونانی فطرت پرستی کی فضا اگر دیوتاؤں
کے تصور سے خالی ہوتی تو میں اس سے مانوس ہو سکتا تھا۔

زندگی کا اخلاقی تصور میرے لئے بڑی کشش رکھتا ہے اگرچہ منطقی
حیثیت سے اس کو صحیح ثابت کرنا مجھے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی کا

صحیح ذرائع پر زور دینا مجھے پسند آیا اور میرے خیال میں ہماری عمومی زندگی کو ان سے جو برکات حاصل ہوئیں ان میں یہ بہت بڑی برکت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال نیا نہیں لیکن ایک اخلاقی اصول کو عمومی زندگی میں اتنے بڑے پیمانے پر استعمال کرنا یقیناً ایک نئی چیز ہے۔ اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ دراصل ذرائع اور مقاصد ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے بلکہ ایک جسم نامی کی طرح باہم وابستہ ہیں۔ آج کل کی دنیا میں جو صرف مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے اور ذرائع کو نظر انداز کر دیتی ہے ذرائع پر اس قدر زور دینا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس نے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے۔

مارکس اور لینن کے مطالعے نے میرے ذہن کو بہت متاثر کیا اور اس کی وجہ سے میں تاریخ کو اور موجودہ واقعات کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ تاریخ اور معاشرتی ارتقا کے طویل سلسلے میں ایک معنویت، ایک ترتیب نظر آنے لگی اور مستقبل کی تاریکی ایک حد تک دور ہو گئی۔ سوویٹ یونین کے عملی کارنامے بھی بڑے شاندار ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ روس کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی یا میری سمجھ میں نہیں آئی اور اس میں ابن الوقتی اور قوت پرستانہ سیاست کا بہت گہرا رنگ دکھائی دیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ممکن ہے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا وہ جذبہ جو وہاں ابتدا میں موجود تھا اب کسی حد تک مسخ ہو گیا ہو، مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ انقلاب روس نے انسانی

سماج کو ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا، اس میں وہ ولولہ پیدا کر دیا جو کسی
کے دبائے نہیں دب سکتا اور اس "نئے تمدن" کی بنیاد قائم کر دی جس کی تعمیر
ہونے والی ہے۔ میں اس قدر انفرادیت پسند واقع ہوا ہوں اور شخصی آزادی
کا اس قدر دل دادہ ہوں کہ مجھے حد سے زیادہ تنظیم اچھی نہیں لگتی۔ پھر بھی یہ مجھے
ایک صریحی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک پیچیدہ اجتماعی نظام میں انفرادی آزادی
کو محدود کرنا ضروری ہے اور شاید فرد کو حقیقی آزادی اسی طرح حاصل ہو سکتی
ہے کہ اجتماعی زندگی پر اس طرح کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ چھوٹی آزادیوں
کو اکثر بڑی آزادی پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ مارکسی فلسفے کی بہت سی باتوں کو میں
آسانی سے قبول کر سکتا ہوں، مثلاً ذہن اور مادے کی وحدت، مادے کا
حرکیاتی تصور، جدلیات کا یہ نظریہ کہ تغیرات کے سلسلے میں ارتقا اور طفرے،
عمل اور ردِ عمل، علت اور معلول، اثبات نفی اور ترکیب کا قانون کار فرما
ہے۔ یہ فلسفہ مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتا اور بہت سے سوالوں کا جو
میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں جواب نہیں دے سکتا۔ غیر محسوس طور پر میرا
ذہن ایک تصوری نقطۂ نظر، جو ویدانت کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے، اختیار
کر لیتا ہے۔ مجھے مارکسی فلسفے سے جو اختلاف ہے وہ ذہن اور مادے میں
فرق کرنے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا تعلق اُس حقیقت سے ہے جو ان دونوں
کے ماورا ہے۔ اس کے علاوہ میں ہر چیز کو اخلاقیات کے پس منظر میں دیکھتا
ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی نقطۂ نظر تغیر پذیر ہے یعنی ذہنی نشو و نما اور
تہذیبی ارتقا پر منحصر ہے۔ یہ ہر زمانے کے ذہنی ماحول کے سانچے میں ڈھلتا
رہتا ہے۔ لیکن اس کی تہ میں کچھ اور بھی ہے۔ بعض بنیادی رجحانات یا اصول جو
بڑی حد تک پائدار ہیں۔ غرض میرے ذہن میں مختلف خیالات نے ایک عجیب

الجھن پیدا کر دی جسے عقلی طور پر نہ سمجھا سکتا ہوں اور نہ سلجھا سکتا ہوں۔ میرا عام رجحان یہ ہے کہ ان بنیادی مسائل پر جن کا حل کرنا میری طاقت سے باہر ہے زیادہ غور کروں بلکہ اپنی فکر کا مرکز زندگی کے عملی مسائل کو بناؤں اور وہ بھی فوری اور محدود حیثیت سے، یعنی اس وقت کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ کائنات کی حقیقت کچھ بھی ہو، اور ہم اسے کلی یا جزوی طور پر سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، اس کے وسیع امکانات موجود ہیں کہ علم انسانی میں اضافہ کیا جائے چاہے یہ علم محض موضوعی کیوں نہ ہو، اور اس سے روزمرہ کی زندگی اور اجتماعی تنظیم کی اصلاح و ترقی کا کام لیا جائے۔

قدیم زمانے میں بعض لوگوں میں یہ رجحان تھا، اور ایک حد تک اب بھی ہے، کہ عقدۂ کائنات کے حل کرنے میں محو ہو جائیں۔ اس سے ان کی توجہ موجودہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کرنے سے ہٹ جاتی ہے اور جب وہ کائنات کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتے تو مایوس ہو کر بے عملی اور سہل انگاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا اپنی تسکین کے لیے کوئی اذعانی عقیدہ اختیار کر لیتے ہیں۔ معاشرتی خرابیوں کو، جن میں سے بہت سی یقیناً دور کی جا سکتی ہیں "گناہ آدم" فطرت انسانی کی یا نظام اجتماعی کی ناتغیر پذیری، یا (ہندوستان میں) پچھلے جنموں کے اٹل اثرات کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح انسان عقلی اور علمی طرز خیال کو چھوڑ کر، لاعقلیت، اوہام پرستی، غیر معقول اور غیر منصفانہ تعصبات اور رسوم کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عقلی اور علمی طرز خیال سے بھی ہمیشہ کام نہیں چلتا۔ بے شمار عوامل اور علاقے واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی تشکیل کرتے ہیں، اور ان سب کا سمجھنا ناممکن ہے۔ پھر بھی ہم یہ کوشش کر سکتے ہیں

کرکے ان اہم قوتوں کو جو ان واقعات میں کارفرما ہیں چن لیں اور خارجی مادی حقیقت کا مشاہدہ کرکے تجربے اور مشق کے ذریعے غور کرتے، سنبھلتے، ٹٹولتے علم کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اس مقصد کے لئے مذکورہ بالا حدود کے اندر مارکس کے فلسفے کا عام طرز خیال بہت کارآمد نظر آتا ہے اس لئے کہ وہ سائنس کے موجودہ علم سے کم و بیش مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن اس طرز خیال کو اختیار کرنے کے بعد بھی اس کے نتائج سے اور گذشتہ اور آئندہ واقعات کی تعبیروں سے مجھے تشفی نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ مارکس نے اجتماعی زندگی کی نشو و نما کا جو تجزیہ کیا تھا وہ بظاہر بالکل صحیح تھا۔ لیکن آگے چل کر بہت سے واقعات ایسے پیش آئے جو مستقبل قریب کے بارے میں اس کے اندازے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ لینن نے ان واقعات کو ملحوظ رکھ کر مارکس کے نظریے میں ترمیم کی۔ اس کے بعد کچھ اور زبردست تغیرات ہوئے، یعنی فسطائیت اور نازیت وغیرہ کا ظہور۔ علم صنعت کی روز افزوں ترقی اور سائنس کی نئی تحقیقات کے عملی نتائج کی بدولت دنیا کا نقشہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے اور نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

غرض میں نے اشتراکی نظریے کے بنیادی اصول تو قبول کر لئے لیکن میں ان جزوی اختلافات کے چکر میں نہیں پڑا جو اس نظریے کے ماننے والے آپس میں رکھتے ہیں۔ میں ہندوستان کی اشتراکی جماعتوں کی اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ وہ اپنی قوت کو نظری مسائل کی باریکیوں پر لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتی ہیں۔ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ زندگی بہت پیچیدہ ہے اور جہاں تک ہم اسے اپنے موجودہ علم

کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں منطقی ترتیب سے خالی ہیں اس لئے وہ کسی بندھے ٹکے نظریے کے چوکھٹے میں نہیں سما سکتی ۔

میرے نزدیک حقیقی مسائل وہ ہیں جو ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں :۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی ، ساز ہستی کی ہم آہنگی ، فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا توازن ، افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کی درستی ، نوع انسانی کا روز بروز بلند تر اور برتر مدارج پر فائز ہونا ، جماعت کی مسلسل نشوونما ، فرد کی پیہم ترقی ۔ ان مسائل کے حل کرنے میں سائنس کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے یعنی مشاہدے کا علم صحیح کا ، غور و فکر اور استدلال کا طریقہ ۔ ممکن ہے کہ حق کی تلاش میں یہ طریقہ ہمیشہ کام نہ دے سکے ، اس لئے کہ آرٹ ، شاعری اور روحانی واردات کے بعض پہلو بظاہر کسی اور دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور سائنس کے معروضی طریقوں کی دسترس سے باہر ہیں ۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ وجدان کو اور عرفان حقیقت کے دوسرے طریقوں کو ایک سرے سے رد نہ کر دیں ۔ خود سائنس میں ان سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کسی حالت میں ہمیں اس صحیح معروضی علم کے لنگر کو نہ چھوڑنا چاہیئے جو عقل اور تجربے اور عمل کی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے ، اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیئے کہ کہیں ہم تفکر کے اُس بحر بے پایاں میں ڈوب کر نہ رہ جائیں جو زندگی کے مسائل سے اور انسانوں کی ضرورتوں سے بے نیاز اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے ۔ زندہ فلسفہ وہ ہے جو موجودہ مسائل سے تعلق رکھتا ہے ۔

ممکن ہے کہ ہم عہد حاضر کے لوگ جو اپنے کارناموں پر اس قدر نازاں ہیں بالکل اسی طرح اپنے زمانے کے پابند ہوں جیسے عہد وسطیٰ

کے انسان اپنے عہد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ہم اس فریب نفس میں مبتلا ہوں جس میں ہم سے پہلے دوسرے گرفتار رہ چکے ہیں کہ صرف ہمارا ہی طریق فکر صحیح ہے اور وہی حقیقت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ بہرحال اگر یہ قید ہے تو ہم اس قید سے آزاد نہیں ہو سکتے اور اگر یہ فریب ہے تو اس فریب کو دور نہیں کر سکتے۔

پھر بھی مجھے یہ یقین ہے کہ سائنس کے طریق تحقیق نے انسانی زندگی میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہے جو دنیا کی تاریخ میں آج تک نہیں ہوا تھا اور اس سے بھی بڑے انقلاب کی راہ ہموار کر دی ہے۔ امید ہے کہ یہ راہ ہمیں اس حقیقت تک پہنچا دے گی جو آج تک ہماری دسترس سے باہر سمجھی جاتی رہی ہے۔ سائنس کے صنعتی کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ اس کی یہ صلاحیت کہ وہ انسانی معیشت کی تنگی کو فراغت سے بدل دیتی ہے، اظہر من الشمس ہے، اور یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ وہ بہت سے مسائل کو جو اب تک صرف فلسفے کا موضوع بحث سمجھے جاتے تھے، حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ زمان و مکان کے مرکب تصور اور مقدار برق کے نظریے نے عالم طبیعی کا سارا نقشہ بدل دیا ہے۔ مادے کی حقیقت، جو ہر فرد کی ساخت عناصر کے قلب ماہیت اور برق و حرارت کے ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کے متعلق جدید ترین تحقیقات نے انسانی علم کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اب انسان عالم طبیعی کو اپنے آپ سے جدا نہیں سمجھتا۔ انسانی تقدیر فطرت کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی نظر آتی ہے۔ خیالات کی اس نئی رو نے جو سائنس کی بدولت پیدا ہوئی ہے سائنس داں کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا ہے جس کی سرحد عالم مابعد الطبیعی

سے مل جاتی ہے۔ ایک ہی نظریے سے یہ لوگ مختلف اور بعض اوقات متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو نظام کائنات میں وحدت نظر آتی ہے اور ان کے نزدیک یہ کارخانہ ایک مقررہ قانون کے ماتحت چل رہا ہے جس میں اتفاق کو دخل نہیں۔ بعض اور لوگ، جیسے برٹرنڈ رسل، یہ کہتے ہیں کہ "ملتبی فلسفی، پارمینڈیس کے زمانے سے لے کر اب تک اس کے قائل رہے ہیں کہ دنیا ایک وحدت ہے۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا یہ خیال مہمل ہے"۔ اس نے ایک اور مقام پر لکھا ہے "انسان ان اسباب کی پیداوار ہے جنھیں اپنے مقصد کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس کی ابتدا اور نشو و نما، اس کی امیدیں اور اندیشے، اُس کے میلانات اور عقائد محض جوہر فرد کے اتفاقی اجتماع کا نتیجہ ہیں"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ طبعیات کی جدید ترین تحقیقات نے بڑی حد تک فطرت کی بنیادی وحدت کو ثابت کر دیا ہے۔ "یہ عقیدہ کہ سب اشیاء ایک جوہر سے بنی ہیں، اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب سے انسانی فکر کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ شرف ہمارے زمانے کو حاصل ہے کہ اس نے تاریخ میں پہلی بار وحدت فطرت کو محض ایک بے بنیاد عقیدے یا لاحاصل آرزو کے طور پر نہیں بلکہ سائنس کے ایک اصول کے طور پر قبول کیا ہے، جو روشن ترین اور واضح ترین ثبوت پر مبنی ہے"[۵۱]۔

ایشیا اور یورپ میں یہ عقیدہ مدت سے چلا آ رہا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنس کے جدید ترین نتائج تحقیق کا ویدانت کے نظریہ

---

[۵۱] "طبعیات کی نشاۃ ثانیہ"۔ از کارل۔ کے۔ ڈیرو، مطبوعہ نیویارک ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۰۱۔

لاثنویت کے بنیادی تصورات سے مقابلہ کیا جائے تو بہت کچھ مشابہت نظر آتی ہے۔ وہ تصورات یہ تھے:۔ ساری کائنات ایک ہی جوہر سے بنی ہے جس کی صورت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قوتوں کی مجموعی مقدار ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے اور اشیاء کی توجیہ خود ان کی فطرت سے ہوتی ہے چنانچہ کائنات کی توجیہ کے لئے کسی خارجی وجود کی ضرورت نہیں۔ مندرجہ بالا قول سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات خود اپنی اندرونی قوت سے نشو و نما پاتی ہے۔

سائنس اس بات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتی کہ یہ مبہم خیال آرائیاں کس نتیجے پر پہنچائیں گی۔ وہ صحیح مشاہدے اور تجربے کی مدد سے ترقی کی راہوں پر صحیح قدم بڑھا رہی ہے، علم کے دائرے کو وسعت دے رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کو بدل رہی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کائنات کے اسرار سربستہ کو حل کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ بہرحال وہ اپنے مقررہ راستے پر چلتی رہے گی اس لئے کہ اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ فی الحال وہ فلسفے کے اس سوال کو نظرانداز کر دے گی کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ کیوں ہوتا ہے! بلکہ صرف یہی پوچھتی رہے گی کہ کیسے ہوتا ہے؟ اس دوسرے سوال کا جواب پاکر وہ زندگی کو وسعت دے گی اور اس کی معنویت میں اضافہ کرے گی اور ممکن ہے پہلے سوال کے حل کرنے میں بھی ایک حد تک مدد دے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس گتھی کو کبھی نہ سلجھا سکیں، کائنات کا راز بدستور راز سربستہ رہے، زندگی بدستور نیکی اور بدی کا مجموعہ، کشمکش کا سلسلہ، مخالف اور متضاد رجحانات کا معجون مرکب رہے۔ یا شاید ایسا ہو کہ ہماری

کی یہ ترقی جو اخلاقی اصولوں اور ضابطوں سے بے تعلق ہے، اُن بدنفس اور خود غرض لوگوں کے ہاتھ ہیں، جو دوسروں کو اپنا محکوم بنانا چاہتے ہیں غیر محدود قوت اور مہلک آلات دے دے، اور اس طرح خود ہی اپنے عظیم الشان کارناموں کو برباد کردے۔ اس کا ایک نمونہ ہمیں موجودہ واقعات میں دکھائی دے رہا ہے اور اس جنگ کی تہ میں روح انسانی کی اندرونی کشمکش نظر آرہی ہے۔

یہ روح انسانی بھی عجیب و غریب چیز ہے! اپنی بے شمار کمزوریوں کے باوجود انسان ہر زمانے میں اپنی جان کو اور ان سب چیزوں کو جنھیں وہ عزیز رکھتا ہے، اپنے نصب العین پر، حق یا ایمان یا ملک یا عزت پر، قربان کرتا رہا ہے۔ نصب العین چاہے بدل جائے مگر قربانی کا یہ جوش اسی طرح باقی رہتا ہے۔ اس ایک خوبی کی وجہ سے ہم انسان کی بہت سی خامیوں سے چشم پوشی کر سکتے ہیں اور اس کی طرف سے کبھی ناامید نہیں ہوتے۔ آلام و مصائب کے ہجوم میں اس نے اپنی عظمت کو اور اس ایمان کو جو وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں پر رکھتا ہے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ فطرت کی زبردست قوتوں کا کھلونا ہے۔ اُس کی حیثیت اس عظیم الشان کائنات میں ایک ذرے سے زیادہ نہیں اور اس کے باوجود اس نے عناصر کی بے پناہ قوتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے ذہن کی مدد سے، جو انقلاب کا گہوارہ ہے، ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کوئی اور دیوتا ہو یا نہ ہو انسان میں یقیناً ایک دیوتا کی شان نظر آتی ہے مگر اسی کے ساتھ ایک شیطان کی بھی۔

مستقبل تاریک اور غیر معین ہے مگر ہم اس کا راستہ تھوڑی دور تک دیکھ سکتے ہیں اور اس پر ہمت اور استقلال سے قدم بڑھا سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کا کوئی حادثہ روح انسانی کو، جو بے شمار خطروں پر غالب آچکی ہے، مغلوب نہیں کر سکتا اور یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی اپنی ساری برائیوں کے باوجود حسن اور مسرت سے خالی نہیں، اور اگر ہم راز سے واقف ہوں، تو طلسماتِ فطرت کی سیر سے ہمیشہ لطف اٹھا سکتے ہیں۔

حکمت اور کیا ہے؟ یہی سعی انسانی
یہی لطفِ ربانی جو حسن اور عظمت سے معمور ہے۔
خوف سے آزاد رہ کر جینا اور انتظار کی گھڑیاں گننا،
نفرت کے حملے کو ہاتھ اٹھا کر روکنا۔
تو پھر ہم کیوں نہ حسن کی ابدی محبت میں محو رہیں؟[۱]

۷۔ ماضی کا بوجھ

میری قید کا اکیسواں مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سلسلہ جاری ہے اور تھوڑے دن میں دو سال پورے ہو جائیں گے۔ ایک اور سال گرہ مجھے یہ یاد دلانے کے لیے آ رہی ہے کہ میں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں۔ پچھلے چار سال سے میری سال گرہ احمد نگر اور دہرہ دون میں قید خانے میں ہوتی رہی ہے اور پچھلی میعادوں کے دوران میں

---

[۱] یوریپڈیس کے ڈراما "بیکس" کا کورس۔

بارہا ہو چکی ہے مجھے اس کا شمار یاد نہیں رہا۔

پچھلے اکیس مہینوں میں مجھے اکثر کچھ لکھنے کا خیال آیا۔ ایک طرف جی چاہتا تھا کہ لکھنا شروع کر دوں مگر دوسری طرف ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ میرے دوستوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ جس طرح میں نے پہلے قید میں کتابیں لکھی ہیں اس بار بھی ضرور لکھوں گا اس لئے کہ میری عادت سی ہو گئی ہے۔

پھر بھی میں نے کچھ لکھا نہیں۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ بغیر کسی مقصد کے ایک کتاب گھسیٹ ڈالوں۔ لکھنا تو آسان تھا مگر ایسی کتاب لکھنا مشکل تھا جو کسی قابل ہو۔ ایسی چیز لکھنے سے کیا فائدہ کہ جتنے دن میں جیل میں رہوں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور میرا مسودہ رکھے رکھے باسی ہو جائے۔ مجھے آج یا کل کے لئے نہیں لکھنا تھا بلکہ ایک نامعلوم زمانے کے لئے شاید ایک بعید مستقبل کے لئے۔ اس میں بھی شبہ تھا کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ کبھی شائع ہو سکے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو زمانہ میں جیل میں گذاروں گا وہ جنگ کے گذرے ہوئے دور سے بھی زیادہ پُر آشوب اور ہنگامہ خیز ہو گا۔ شاید ہندوستان میدان جنگ بن جائے گا یا یہاں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

اور اگر ہم ان سب خطروں سے محفوظ رہیں تب بھی آنے والے زمانے کے لئے لکھنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت موجودہ مسائل ختم ہو جائیں اور نئے مسائل پیدا ہو جائیں۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ جنگ عظیم بھی ویسی ہی ہے جیسی اور لڑائیاں، صرف اتنا فرق ہے کہ یہ زیادہ وسیع پیمانے پر بڑی جا رہی ہے۔

جس دن سے جنگ شروع ہوئی بلکہ اس سے پہلے سے، میرے ذہن پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ ایک انقلاب عظیم ہونے والا ہے اور ایک نئی دنیا بسنے والی ہے چاہے وہ موجودہ دنیا سے بہتر ہو یا بدتر۔ ایسی حالت میں میری ناچیز کتاب کی جس میں ایک گئے گذرے زمانے کا ذکر ہوگا کیا وقعت ہوگی۔

یہ خیالات مجھے ستاتے تھے اور لکھنے سے روکتے تھے اور ان کی تہ میں، میرے ذہن کے تاریک گوشوں کے اندر، ان سے زیادہ اہم سوالات تھے جن کا جواب دینا میرے لئے مشکل تھا۔

اسی قسم کی الجھنیں اور دقتیں مجھے پہلے قید کے دوران میں اکتوبر ۱۹۴۰ء سے دسمبر ۱۹۴۱ء تک پیش آئی تھیں۔ اس زمانے کا بڑا حصہ میں نے دہرہ دون جیل میں اپنی اسی پرانی کوٹھری میں گذارا تھا جس میں چھ سال پہلے "میری کہانی" لکھنی شروع کی تھی۔ دس مہینے تک طبیعت لکھنے پر نہیں جمی اور میں اپنا وقت پڑھنے میں اور باغبانی کے مشغلے میں صرف کرتا رہا۔ آخر کار میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ "میری کہانی" کے سلسلے کو آگے بڑھاؤں۔ چند ہفتے تک میں بڑی تیزی سے مسلسل لکھتا رہا۔ کام ختم نہ ہونے پایا تھا کہ دفعتاً اپنی چار سال کی میعاد سے بہت پہلے رہا کر دیا گیا۔

اچھا ہوا کہ میں مجوزہ کتاب کو ختم نہ کر سکا۔ اگر وہ ختم ہو جاتی تو شاید میں کسی ناشر کو چھاپنے کے لئے دے دیتا۔ اب دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی کام کی نہیں۔ اس کا بڑا حصہ باسی اور بے مزہ ہے۔ جن واقعات کا اس میں ذکر ہے ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

بعد کے ہنگامہ خیز واقعات نے ان کا نقش مٹا دیا ہے اور لوگ انھیں قریب قریب بھول چکے ہیں۔ مجھے بھی ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ جو کچھ ذہن میں رہ گیا ہے وہ میرے ذاتی تجربات ہیں جن کا اثر مجھ پر اب تک باقی ہے:۔ بعض اشخاص اور واقعات سے میرا تعلق، ہندوستان کے عوام سے جو کثرت میں وحدت کا حیرت انگیز منظر پیش کرتے ہیں، میرا سابقہ، بعض نفسی کیفیتیں، رنج والم کے حملے اور وہ تسکین اور مسرت جو ان پر غالب آنے سے حاصل ہوئی، عمل کا کیف وسرور۔ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان کو کچھ نہیں لکھنا چاہیئے۔ اسے اپنی اندرونی زندگی سے، اپنے احساسات اور خیالات سے، جو قریبی تعلق ہوتا ہے وہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ مگر خود اس کے لیئے یہ شخصی اور غیر شخصی تعلقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اس کی سیرت کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اس کا رویہ زندگی کے ساتھ، اپنے ملک کے ساتھ اور دوسری قوموں کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔

دوسرے قید خانوں کی طرح احمد نگر کے قلعے میں بھی میں نے باغبانی شروع کر دی۔ ہر روز، ہر موسم میں، یہاں تک کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی میں کئی گھنٹے پھولوں کے لیے کیاریاں بنانے میں صرف کرتا تھا۔ زمین بہت خراب اور پتھریلی تھی۔ اس میں ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا جن میں بعض قدیم عمارات بھی شامل تھیں ملبہ پڑا تھا، اس لئے کہ یہ تاریخی مقام ہے جہاں بہت سی لڑائیاں لڑی جاچکی ہیں اور بہت سی درباری سازشیں ہو چکی ہیں۔ یہ تاریخ کچھ ایسی پرانی نہیں اور ہندوستان کی مجموعی تاریخ میں کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتی۔

مگر اس کا ایک واقعہ یادگار ہے۔ یہ ایک حسین عورت چاند بی بی کی بہادری کا کارنامہ ہے، جو ایک مدت تک قلعہ کو اکبر کے حملے سے بچاتی رہی۔ آخر وہ ایک اپنے ہی آدمی کے ہاتھ سے ماری گئی۔

جب ہم نے اس زمین کو کھودنا شروع کیا تو ہمیں پرانی فصیل کے آثار ملے۔ یہ وہ عمارتیں تھیں جو زمین کے اندر دفن ہو گئی تھیں۔ ہم اور آگے نہیں کھود سکتے تھے، نہ تو حکومت ہمیں آثار قدیمہ کی کھدائی کی اجازت دیتی اور نہ ہمارے پاس اس کا سامان تھا۔ ایک بار ہمیں ایک دیوار پر جو غالباً کسی ڈیوڑھی کی تھی ایک خوبصورت کنول کا پھول پتھر پر کندہ نظر آیا۔

مجھے یاد آگیا کہ دہرہ دون جیل میں ہم نے ایک اور چیز دریافت کی تھی جو اتنی دل خوش کن نہ تھی۔ تین سال ہوئے مجھے اپنی کوٹھری کے سامنے چھوٹے سے صحن میں کھودتے کھودتے پرانے زمانے کی ایک عجیب نشانی ملی۔ زمین کی سطح سے بہت نیچے دو نوک دار لکڑیاں برآمد ہوئیں۔ یہ ایک پرانی سولی کے حصے تھے جس سے تیس چالیس سال پہلے کام لیا جاتا تھا۔ ایک مدت سے یہ جیل پھانسی گھر نہیں رہا تھا اور سولی کے نشان جو آسانی سے مٹائے جا سکتے تھے مٹا دیئے گئے تھے۔ اب ہم نے اس کی بنیادوں کو کھود ڈالا تھا اور میرے ساتھ کے سب قیدی جو اس میں شریک تھے بہت خوش تھے کہ آخر ہم نے اس منحوس چیز کو نکال پھینکا۔

اب میں نے پھاوڑے کو رکھ کر قلم اٹھا لیا ہے۔ شاید جو کچھ میں اب لکھوں گا اس کا وہی انجام ہو جو دہرہ دون جیل کے ناتمام مسودے

سکا ہوا تھا۔ میں موجودہ زمانے کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں لکھ سکتا، جب تک مجھے عمل کے ذریعے اس کا تجربہ حاصل کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ حال کا واضح تصور مجھے تبھی ہوتا ہے جب عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور اُس وقت میں اُس پر بے تکلفی اور روانی سے لکھ سکتا ہوں۔ قیدخانے میں وہ مجھے ایک دھندلے سے سایے کی طرح نظر آتا ہے جسے میں ہاتھ سے پکڑ نہیں سکتا، بلا واسطہ حس کے طور پر محسوس نہیں کرسکتا۔ میرے لئے وہ صحیح معنوں میں حال نہیں رہتا مگر یہ بھی نہیں کہ ماضی بن جائے اس لئے کہ اس میں ماضی کا سا جمود اور سکون نہیں ہوتا۔

میں یہ بھی نہیں کرسکتا کہ آیندہ کے بارے میں پیش گوئی کرنا شروع کردوں۔ یوں تو میرا ذہن اکثر زمانے کا پردہ اٹھا کر مستقبل کا چہرہ دیکھنے کی اور اُسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ محض دور از کار تخیلات ہیں۔ مستقبل غیر معین اور نامعلوم ہی رہے گا اور کبھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پھر ہماری امیدوں پر پانی نہ پھیر دے گا اور انسانیت کے خواب کو غلط نہ ثابت کردے گا۔

اب صرف ماضی رہ جاتا ہے مگر میں ماضی کے واقعات پر مورخ یا محقق کی طرح علمی انداز میں نہیں لکھ سکتا نہ مجھ میں اس کی قابلیت اور مشق ہے، نہ میرے پاس اس کا سامان ہے اور نہ مجھے اس کا شوق ہے۔ ماضی مجھے اُسی وقت دباتا ہے یا اُبھارتا ہے جب وہ موجودہ زمانے پر اثر انداز ہوتا ہے، جب وہ جیتے جاگتے حال کا ایک جز بن جاتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو وہ سرد اور خشک، بے جان اور بے کیف ہوکر رہ جاتا ہے۔

میں اس کے متعلق اسی طرح لکھ سکتا ہوں جیسے میں نے پہلے لکھا ہے یعنی اُسے اپنے زمانے کے خیالات اور جدوجہد سے ربط دے کر، اور اس طرح تاریخ نویسی، بقول گوئٹے کے، انسان کے سر سے ماضی کے بوجھ کو کچھ ہلکا کردیتی ہے۔ میرے خیال میں یہ عمل تحلیل نفسی سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کا موضوع فرد نہیں بلکہ جماعت یا یوں کہئے کہ ساری انسانیت ہے۔

ماضی کی اچھائیوں اور برائیوں کا بوجھ اس قدر بھاری ہے کہ لوگ اس سے دب کر رہ جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کا دم گھٹنے لگتا ہے، خصوصاً وہ لوگ جو ایسی قدیم تہذیبوں کے حامل ہیں جیسی چین یا ہندوستان کی۔ نٹشے کہتا ہے "نہ صرف گذری ہوئی صدیوں کی عقل ودانش کے بلکہ اُن کی وحشت اور دیوانگی کے سوتے بھی ہمارے اندر پھوٹ پڑتے ہیں، ماضی کا وارث ہونا بڑی خطرناک چیز ہے۔"

میرا ورثہ کیا ہے؟ وہ سب کچھ جو بنی نوع انسان نے لاکھوں برس میں حاصل کیا، وہ سب دکھ جو اس نے سہے ہیں، وہ سب خوشیاں جن سے اس نے لطف اٹھایا ہے، اس کے فتح کے نعرے اور شکست کی تلخیاں، انسان کی وہ عظیم الشان مہم جو اب سے مدتوں پہلے شروع ہوئی تھی اور اب تک جاری ہے۔ یہ وہ میراث ہے جو مجھ میں اور دنیا کے سب انسانوں میں مشترک ہے۔ مگر ہم ہندوستانیوں کا ایک مخصوص ورثہ بھی ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ بلا شرکت غیرے ہمارا ہے، اس لئے کہ ایسی کوئی چیز نہیں جو ساری نوع انسانی میں مشترک نہ ہو مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم سے ایک خاص تعلق رکھتا ہے، ہمارے گوشت

پوست میں سمایا ہوا ہے۔ ہم جو کچھ ہیں اس کی بدولت ہیں اور جو کچھ ہوں گے اسی کی بدولت ہوں گے۔

اس مخصوص ورثے کا تصور اور اسے موجودہ حالات سے ربط دینے کا خیال میرے ذہن پر چھایا ہوا ہے اور اسی کے متعلق میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوع اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس پر قلم اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ میں اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال سکتا ہوں، مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ تاریخ نگاری کا حق ادا کر رہا ہوں بلکہ میری کوشش محض اس خیال سے ہے کہ شاید مجھے اس سے کوئی فائدہ پہنچے، میرا ذہن صاف ہو جائے اور فکر و عمل کی آئندہ منزلوں کو طے کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

لازمی طور پر میرا نقطۂ نظر اکثر شخصی ہوگا۔ میں ہر چیز کو اس طرح لکھوں گا کہ یہ خیال میرے دل میں کیوں کر پیدا ہوا، اس نے کیا شکل اختیار کی اور میرے عمل پر کیا اثر ڈالا۔ اس سلسلے میں بعض ذاتی تجربات کا بھی ذکر آئے گا جنھیں اصل موضوع سے کچھ تعلق نہیں مگر انھوں نے میرے ذہن کو اور اس نقطۂ نظر کو جس سے میں زیر بحث مسائل کو دیکھتا ہوں متاثر کیا ہے۔ ہم جو رائے ملکوں اور قوموں کے متعلق قائم کرتے ہیں وہ بہت سی چیزوں پر مبنی ہے، ان میں ہماری ذاتی واقفیت ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم کسی ملک کے لوگوں کو ذاتی طور پر نہ جانتے ہوں تو ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی زندگی انوکھی اور ہماری زندگی سے مختلف ہے۔

جہاں تک خود اپنے ملک کا تعلق ہے ہماری ذاتی واقفیت بے شمار لوگوں سے ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے ذہن میں اپنے ہم وطنوں کی بہت سی تصویریں یا ان کی ایک مرکب تصویر بن جاتی ہے۔ میرا ذہن بھی اسی طرح کا تصویر خانہ ہے۔ بعض چہرے زندگی سے معمور، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری طرف دیکھتے ہیں اور مجھے زندگی کے بعض اہم ترین واقعات یاد دلاتے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اگلے زمانے کی باتیں ہیں جنھیں میں نے کسی قصے میں پڑھا ہے۔ کچھ اور صورتیں ہیں جن کے ساتھ پرانی رفاقت اور دوستی کی یاد جو زندگی کو خوش گوار بناتی ہے وابستہ ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار چہرے عوام کے، ہندوستانی مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہیں جو مل جل کر میری طرف دیکھتے ہیں اور میں اس راز کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جو ان لاکھوں کروڑوں آنکھوں میں پوشیدہ ہے۔

میں اس کہانی کو ایک ایسے باب سے شروع کروں گا جس میں صرف ذاتی واقعات کا ذکر ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جس زمانے میں "میری کہانی" کا آخری باب لکھا گیا اس کے بعد کے مہینے میں میری طبیعت کا کیا رنگ تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں ایک اور آپ بیتی لکھ رہا ہوں، اگرچہ یہ ضرور ہے کہ شخصی عنصر کی جھلک آپ کو اکثر مقامات پر نظر آئے گی۔

عالمگیر جنگ جاری ہے، میں یہاں احمد نگر کے قلعے میں ایک قیدی کی حیثیت سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ ایسے زمانے میں جبکہ ایک خوفناک جدوجہد دنیا کو تہ و بالا کر رہی ہے میرے لئے عمل

کی راہ بند کر دی گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے وہ بلند حوصلے اور عظیم الشان منصوبے یاد آتے ہیں جو برسوں سے میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اور میں جھنجلا کر رہ جاتا ہوں۔ میری کوشش یہ ہے کہ اس جنگ کو غیر شخصی نقطۂ نظر سے دیکھوں، گویا یہ ایک مظہرِ قدرت، ایک حادثۂ فطرت، ایک زبردست زلزلہ یا سیلاب ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی لیکن رنج و الم، نفرت اور ہیجان سے محفوظ رہنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت بھی نہیں۔ فطرت کے قہر و غضب کے اس ہولناک مظاہرے کے آگے میری ذاتی مشکلیں اور خود میری ذات بے حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔

مجھے وہ الفاظ یاد ہیں جو گاندھی جی نے ۸ اگست کی اس تاریخی شام کو کہے تھے "اگرچہ آج دنیا کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے لیکن ہمیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صاف اور پُرسکون نظروں سے دیکھنا چاہیے۔"

دوسرا باب

باڈن وائلر۔ لوزان

ا۔ کملا

۴ستمبر ۱۹۳۵ء کو میں دفعتہً الموڑے کے جیل سے رہا کر دیا گیا اس لئے کہ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور، جرمنی کے بلیک فارسٹ میں باڈن وائلر کی صحت گاہ میں مقیم تھیں۔ میں موٹر اور ریل سے سفر کر کے دوسرے دن الہ آباد اور اسی روز سہ پہر کو ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کراچی، بغداد، قاہرہ ہوتا ہوا اسکندریہ پہنچا۔ وہاں سے برنڈزی تک میں نے بحری طیارے میں اور برنڈزی سے سوئٹزرلینڈ کے شہر بال تک ریل میں سفر کیا۔ الہ آباد سے روانہ ہونے کے پانچویں دن اور الموڑہ جیل سے رہا ہونے کے چھٹے دن میں باڈن وائلر پہنچ گیا۔

کملا کے چہرے پر میں نے وہی اگلی سی مسکراہٹ پائی مگر انھیں اتنی زیادہ کمزوری اور شدید تکلیف تھی کہ زیادہ باتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ شاید میرے آنے کا کچھ اچھا اثر پڑا اس لئے کہ ان کی طبیعت اگلے دن اور اس کے بعد کئی روز تک کچھ بہتر رہی لیکن حالت بدستور نازک تھی اور وہ روز بروز گھلتی چلی جا رہی تھیں۔ میں کسی طرح ان کی موت کا خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دیتا تھا اور اس دھوکے میں کہ ان کی طبیعت

سنبھل رہی ہے اور اگر وہ اس بحران سے نکل جائیں تو بالکل اچھی ہو جائینگی ڈاکٹر بھی جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، میری امید بندھاتے تھے۔ بظاہر فوری بحران گذر گیا اور وہ اُسے جھیل گئیں مگر وہ اس قابل کبھی نہیں ہوئیں کہ دیر تک گفتگو کر سکیں۔ ہم کچھ تھوڑی دیر باتیں کرتے اور میں جیسے ہی ان پر تکان کے آثار دیکھتا فوراً رک جاتا۔ کبھی کبھی میں ان کو کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے ایک پرل بک کی پیاری زمین تھی۔ وہ شوق سے سنتی تھیں مگر مجھے بہت آہستہ آہستہ پڑھنا پڑتا تھا۔

روز صبح اور سہ پہر کو میں اپنے ہوٹل سے جو قصبے کے اندر تھا، سینے ٹوریم جاتا تھا اور چند گھنٹے ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دل میں نہ جانے کتنی باتیں تھیں جو میں ان سے کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے ضبط سے کام لینا پڑتا تھا۔ کبھی ہم گذرے ہوئے زمانے کا، بیتی ہوئی صحبتوں کا اور اپنے مشترک دوستوں کا جو ہندوستان میں تھے ذکر کرتے اور کبھی آئندہ کے متعلق منصوبے باندھتے کہ یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ باوجود اپنی نازک حالت کے وہ مستقبل کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھیں روشن اور جاندار تھیں اور چہرہ عام طور پر بشاش رہتا تھا۔ اکا دکا کوئی دوست ان کی مزاج پرسی کو آتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ ان کی ظاہری حالت اس کی توقع سے بہت بہتر ہے۔ وہ ان روشن آنکھوں اور مسکراتے ہوئے چہرے سے دھوکا کھا جاتے تھے۔

خزاں کی طویل شامیں میں ہمیشہ اپنی قیام گاہ پر اپنے کمرے میں گذارتا تھا۔ کبھی کبھی کھیتوں میں یا جنگل میں ٹہلنے کو چلا جاتا تھا۔ کملا کی

سینکڑوں تصویریں ان کی بھرپور اور گہری شخصیت کے سینکڑوں پہلو ایک ایک کرکے میرے ذہن میں آتے تھے۔ ہمارے بیاہ کو تقریباً بیس برس گزر چکے تھے مگر اب بھی مجھے اکثر ان کی ذہنی اور روحانی خصوصیات میں کوئی نہ کوئی نئی چیز نظر آجاتی تھی۔ میں ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے واقف تھا اور آخر کے چند سال میں میں نے ان کو سمجھنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ میں اس کوشش میں ناکام نہیں رہا پھر بھی کبھی کبھی یہ شبہ پیدا ہوجاتا تھا کہ میں واقعی انھیں سمجھ سکا ہوں یا نہیں۔

بعض اوقات جب میں ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے ان کے اندر سے کوئی اجنبی جھانک رہا ہے۔

انھوں نے تھوڑا بہت پڑھ لیا تھا مگر باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ ان کا ذہن اعلیٰ تعلیم کے سانچے میں نہیں ڈھلا تھا۔ جب وہ ہمارے ہاں ایک بھولی بھالی لڑکی کی حیثیت سے آئیں تو بظاہر ان کے اندر نفسیاتی الجھنوں میں سے جو آج کل عام ہیں کوئی چیز نہ تھی۔ ان کے چہرے پر لڑکپن کا انداز کچھ نہ کچھ ہمیشہ باقی رہا لیکن پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک ایسی گہرائی اور جوبن پیدا ہوگیا کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ان ساکن چشموں کے اندر سے طوفان اُمڈ رہا ہو۔ وہ جدید طرز کی لڑکیوں میں سے نہ تھیں اور ان کی سی عادتیں اور بے چینی طبیعت نہیں رکھتی تھیں پھر بھی انھوں نے جدید فیشن بڑی آسانی سے اختیار کرلیے۔ دراصل ان کے اندر ایک ہندوستانی بلکہ کشمیری لڑکی کی روح تھی جو خودداری اور زودحسی، بچپن اور سیان پن، سادہ لوحی اور دانشمندی کا مجموعہ تھی۔ جن لوگوں کو وہ جانتی نہیں تھیں یا پسند نہیں کرتی تھیں اُن

سے الگ الگ رہتی تھیں لیکن جن کو جانتی اور پسند کرتی تھیں ان کے سامنے
بے تکلفی سے دل کھول کر ہنستی بولتی تھیں۔ وہ لوگوں کے متعلق بہت
جلد رائے قائم کر لیتی تھیں اور یہ رائے بعض اوقات غلط فہمی اور
بے انصافی پر مبنی ہوتی تھی مگر وہ محبت اور نفرت کے معاملے میں اپنے
وجدان کی پیروی کرتی تھیں۔ ان میں زمانہ سازی نام کو نہ تھی۔ اگر وہ
کسی شخص کو ناپسند کرتی تھیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی تھی۔ وہ
اس کو چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کرتی تھیں اور اگر کرتیں بھی تو
غالباً کامیاب نہ ہوتیں۔ ان کا سا خلوص میں نے بہت کم لوگوں میں
دیکھا ہے۔

۲۔ ہماری شادی اور اس کے بعد کا زمانہ

مجھے اپنی شادی کے بعد کا زمانہ یاد آرہا تھا۔ ان دنوں انتہائی
محبت کے باوجود میں اُن کو کچھ بھول سا گیا تھا اور بہت سی باتوں میں
اس رفاقت کو جس کی وہ مستحق تھیں نہیں نبھاتا تھا۔ اس وقت میرے
سر پر ایک بھوت سا سوار تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس مقصد کے
لئے جو میرے پیش نظر تھا وقف کر دیا تھا۔ میں ایک خیالی دنیا میں رہا
کرتا تھا اور سچ مچ کے انسانوں کو جو میرے گرد و پیش موجود تھے،
بے حقیقت پرچھائیاں سمجھتا تھا۔ میں ہر وقت اپنے کام میں جتا رہتا
اور اپنے مقصد کی فکر میں ڈوبا رہتا۔ میری ساری طاقت اسی میں صرف
ہو جاتی اور اتنی سکت نہ رہتی کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کر دوں۔
لیکن دراصل میں انھیں بالکل نہیں بھولا تھا اور پھر پھر کر ان

کے پاس اس طرح آتا تھا جیسے کشتی کسی محفوظ ساحل کی پناہ لیتی ہے۔ جتنے دن میں ان سے دور رہتا میرے دل کو ان کی یاد سے تسکین رہتی اور میں بڑے شوق سے واپسی کا انتظار کرتا۔ اگر وہ میری تسکین اور تقویت کے لئے موجود نہ ہوتیں اور میرے تھکے ہوئے جسم اور دماغ کو تازگی نہ بخشتیں تو مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکتا۔

[مجھے تو ان سے جو کچھ ملا میں نے لے لیا لیکن میں اس کے بدلے انھیں اس زمانے میں کچھ بھی نہ دے سکا۔ میں اپنا فرض پورا کرنے سے قاصر رہا اور اس کا جو اثر ان پر اس زمانے میں پڑا وہ غالباً ہمیشہ باقی رہا۔ اپنی انتہائی خودداری اور زود حسی کی وجہ سے انھوں نے مجھ سے کبھی مدد کی التجا نہیں کی اگرچہ جتنی مدد ان کی میں کر سکتا تھا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی یہ آرزو تھی کہ قومی تحریک میں بطور خود حصہ لیں اور محض اپنے شوہر کی تابع مہمل ہی بن کر نہ رہ جائیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنی نظروں میں اور دنیا کی نظروں میں اپنے وجود کو کارآمد ثابت کریں۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے ان کے جذبات کا اور ان کی آرزوؤں کا کوئی احساس نہ ہوا۔ اس کے علاوہ مجھے اکثر جیل جانا پڑتا اور میں ان سے دور رہتا یا وہ بیمار رہتیں ٹیگور کے ناٹک کی چترا کی طرح وہ زبانِ حال سے مجھ سے کہتی تھیں "میں چترا ہوں۔ نہ تو کوئی دیوی ہوں جس کی پوجا کی جائے اور نہ کوئی حقیر پتنگا ہوں جسے دامن سے جھٹک دیا جائے۔ اگر تم خطرے اور جانبازی کی راہ میں مجھے اپنے ساتھ رکھو، اگر تم اپنی زندگی کے عظیم الشان فرائض میں مجھے شریک کرو تب تمھیں میری اصلی شخصیت کا پتہ چلے گا۔" لیکن

وہ یہ باتیں الفاظ میں ادا نہیں کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں نے مجھے یہ پیام پہنچایا۔

۱۹۳۰ء کے ابتدائی مہینوں میں مجھے ان کی خواہش کا اندازہ ہوا اور ہم دونوں نے مل کر کام کرنا شروع کیا۔ اس تجربے سے مجھے عجیب مسرت حاصل ہوئی۔ کچھ عرصے تک ہم ایک نازک مرحلے سے گذرتے رہے اس لئے کہ مطلع پر بادل چھا رہے تھے اور قومی تحریک کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ یہ مہینے ہمارے لئے بہت خوش گوار تھے مگر افسوس کہ وہ بہت جلد گذر گئے۔ شروع اپریل میں سارے ملک میں سول نافرمانی اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے سختیاں شروع ہوگئیں اور میں پھر جیل پہنچ گیا۔

ادھر ہم مرد جیل میں تھے اور اُدھر یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ ہماری عورتوں نے آگے بڑھ کر تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یوں تو پہلے بھی کچھ عورتیں تحریک میں شامل تھیں مگر اب تو ان کا ایک دریا سا امڈ آیا جس سے نہ صرف برطانوی حکومت بلکہ خود ہم لوگ حیرت میں رہ گئے۔ یہ عورتیں جن میں اونچے متوسط طبقے کی خواتین جو اپنے گھروں میں پرامن زندگی گذارتی تھیں، کسان اور مزدور عورتیں، غرض امیر اور غریب سب ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے اور پولیس کی لاٹھیاں کھانے میدان میں آگئیں۔ ان کی جرأت وہمت سے زیادہ تعجب اس قوت تنظیم پر تھا جس کا انھوں نے ثبوت دیا۔

میں اس دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جب نینی جیل میں ہمیں یہ خبر پہنچی۔ ہمارے دل میں ایک جوش پیدا ہوا اور ہم ہندوستان کی عورتوں پر فخر کرنے لگے۔ ہم آپس میں اس کا ذکر نہیں کرتے تھے کیونکہ ہمارے دل

بھر آئے تھے اور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

کچھ دن بعد میرے والد بھی نینی جیل میں ہم لوگوں کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں جو ہمیں اب تک معلوم نہ تھیں۔ وہ سول نافرمانی کی تحریک کے لیڈر تھے اور انھوں نے عورتوں کی ان سرگرمیوں کی جو سارے ملک میں عام تھیں بالکل ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ وہ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور انھیں یہ پسند نہ تھا کہ جوان اور بوڑھی عورتیں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پر ماری ماری پھریں اور پولیس سے مقابلہ کریں۔ لیکن انھوں نے لوگوں کے مزاج کا اندازہ کرلیا اور کسی عورت کو یہاں تک کہ اپنی بیوی بیٹیوں اور بہو کو بھی اس سے روکا نہیں۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ سارے ملک میں عورتوں نے جس مستعدی، بہادری اور قابلیت کا ثبوت دیا اس سے انھیں بڑی حیرت اور مسرت ہوئی۔ خصوصاً اپنے خاندان کی لڑکیوں کا ذکر وہ محبت اور فخر سے کرتے تھے۔

میرے والد کے حکم سے ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو یوم آزادی کی سال گرہ منائی گئی اور سارے ملک میں "یاد دہانی کی تحریک" پاس کی گئی۔ پولیس نے ان جلسوں کی ممانعت کر دی اور بہت سے جلسے درہم برہم کر دیے گئے۔ میرے والد نے بستر علالت پر پڑے پڑے یہ سارا انتظام کیا تھا۔ یہ ایک زبردست کارنامہ تھا اس لئے کہ نہ تو ہم اخباروں سے کام لے سکتے تھے، نہ ڈاک سے، نہ تار سے، نہ ٹیلیفون سے اور نہ باضابطہ چھاپے خانوں سے۔ اس کے باوجود مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر اس وسیع ملک میں اس سرے سے اس سرے تک یہاں تک کہ دور افتادہ دیہات میں بھی یہ تجویز مقامی زبانوں میں پڑھ کر سنائی گئی اور منظور کی گئی۔ اس کے دس دن بعد

میرے والد کا انتقال ہو گیا۔

تجویز بہت لمبی تھی۔ اس کا ایک حصہ ہندوستان کی عورتوں کے متعلق تھا "ہم ہندوستان کی عورتوں کی خدمت میں تحسین وعقیدت کا ہدیہ پیش کرتے ہیں جو اپنی مادر وطن کی مصیبت کی گھڑی میں اپنے گھروں کی پر امن چار دیواری سے نکل کر قومی لشکر کی پہلی صف میں مردوں کے دوش بدوش آکھڑی ہوئیں تاکہ جنگ کی مصیبتوں میں اور فتح کی خوشی میں اُن کے ساتھ برابر کی شریک ہوں ......"

اس معرکے میں کملا نے بڑی بہادری سے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت جبکہ الہ آباد کے سارے جانے بوجھے کارکن جیل میں تھے شہر میں قومی تحریک کی تنظیم کا سارا بوجھ اس ناتجربہ کار لڑکی کے کندھوں پر تھا۔

والد کی آخری بیماری اور موت نے ہم دونوں کو پھر ملایا۔ ہماری ملاقات رفاقت اور دوستی کی ایک نئی شان سے ہوئی۔ چند مہینے بعد جب ہم اپنی لڑکی کے ساتھ اپنی پہلی اور آخری تعطیل کو بسر کرنے سیلون گئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم نے ایک دوسرے کو نئے سرے سے پہچانا۔ وہ سارا پچھلا زمانہ جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارا تھا محض ایک تمہید تھا اس نئے اور گہرے تعلق کا۔

ہم بہت جلد واپس آگئے اور میں پھر کام میں مصروف ہو گیا اور کچھ دن بعد جیل چلا گیا۔ اس کے بعد نہ ہم کو ساتھ ساتھ تفریح کرنا نصیب ہوا نہ کام کرنا بلکہ ساتھ رہنے کا موقع بھی صرف تھوڑے دن کے لئے دو دو سال کی قید کی دو میعادوں کے درمیان ملا۔ اس دوسری میعاد کے ختم ہونے سے پہلے کملا بستر مرگ پر تھی۔

فروری ۱۹۳۴ء میں جب میں کلکتے سے جاری کیے ہوئے وارنٹ کے ذریعے سے گرفتار کیا گیا تو کملا ہمارے کمرے میں گئیں تاکہ میرے لیے کچھ کپڑے لائیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے ان سے رخصت ہونے گیا۔ یکبارگی وہ مجھ سے چمٹ گئیں اور بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ یہ ان کے لیے ایک غیر معمولی بات تھی اس لئے کہ ہم دونوں نے اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیا تھا کہ جیل خانے کو بے پروائی اور خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور اسے کوئی اہمیت نہ دیں۔ کیا ان کے دل کو پہلے سے خبر ہو گئی تھی کہ یہ ہماری گھریلو زندگی کی آخری ملاقات ہے۔

دو دو سال کی طویل قید کی دو میعادیں ہمارے درمیان حائل ہو گئیں عین اس وقت جب ہمیں ایک دوسرے کی بہت زیادہ ضرورت تھی، عین اس وقت جب ہم ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو گئے تھے۔ جیل کے پہاڑ جیسے دنوں میں میں یہی سوچا کرتا تھا لیکن مجھے یہ امید تھی کہ ایک دن آئے گا جب ہم ایک دوسرے سے پھر ملیں گے۔ انھوں نے یہ چار سال کیسے گزارے؟ میں اس کا کچھ اندازہ تو کر سکتا ہوں مگر ٹھیک ٹھیک میں خود بھی نہیں جانتا اس لیے کہ جیل کی ملاقاتوں میں اور اس تھوڑے سے عرصے میں جب میں جیل سے باہر رہا کچھ غیر معمولی حالات تھے۔ ہم دونوں بہت سنبھلے ہوئے رہتے تھے کہ کہیں اپنی پریشانی ظاہر کر کے دوسرے کو رنج نہ پہنچائیں۔ مگر یہ صاف نظر آتا تھا کہ کملا کو بہت سی فکریں ستا رہی ہیں اور ان کے دل کو چین نہیں ہے۔ میں انھیں کچھ نہ کچھ مدد دیتا مگر جیل میں رہ کر کیا کر سکتا تھا۔

۳۔ انسانی تعلقات کا مسئلہ

یہ اور اس قسم کے بہت سے خیالات باڈن وائلر میں تنہائی کی گھڑیوں میں میرے ذہن میں آیا کرتے تھے۔ میں قید خانے کے اثرات کو آسانی سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ برسوں سے جیل کی فضا کا عادی تھا اور موجودہ فضا اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ میں نازیوں کے ملک میں تھا جہاں عجیب و غریب واقعات ہو رہے تھے۔ مجھے نازیوں کے مسلک سے دلی نفرت تھی لیکن نازیت میری زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کر رہی تھی۔ اس خاموش گاؤں میں، جو بلیک فارسٹ کے ایک گوشے میں واقع تھا، نازیت کے آثار بہت کم نظر آتے تھے۔

یا شاید یہ بات تھی کہ میرا ذہن دوسرے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ میری پچھلی زندگی کے نقشے میری آنکھوں میں پھر رہے تھے اور ہر جگہ کملا میرے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ میری نظر میں ہندوستانی عورت کی بلکہ مطلق عورت کی ایک مثالی تصویر بن گئی تھیں۔ بعض اوقات ان کا تصور میرے ذہن میں کچھ عجیب طریقے سے ہندوستان کے تصور کے ساتھ مخلوط ہو جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا پر اسرار ملک، جو اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہمیں دل سے عزیز ہے، میرے سامنے کھڑا ہے۔ میں اپنے دل میں سوچتا تھا یہ کملا کون ہے؟ کیا میں اُسے جانتا ہوں، اس کی حقیقی شخصیت کو پہچانتا ہوں؟ کیا وہ مجھے جانتی اور سمجھتی ہے؟ میں بھی ایک انوکھی طبیعت رکھتا تھا اور میرے اندر ایسی نامعلوم گہرائیاں تھیں جن کی تہ کو میں خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا

کہ میری اس طبیعت کی وجہ سے کملا مجھ سے کچھ ڈری ہوئی سی رہتی ہیں۔ میں اس قسم کا آدمی تھا جس کے ساتھ شادی کر کے نبھانا بہت مشکل تھا۔ ہم دونوں بعض چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر اسی کے ساتھ بعض چیزوں میں بہت زیادہ مشابہ بھی تھے۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری طبیعتوں کی قوت ہی ہمارے باہمی تعلقات کے لحاظ سے کمزوری بن گئی تھی۔ ایسی صورت میں یا تو آپس میں مکمل مفاہمت اور قلبی اتحاد ہوتا ہے یا پھر ایک کشمکش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ معمولی طریقے سے گھریلو زندگی بسر کرے اور جو کچھ پیش آئے اُسے چپ چاپ برداشت کرے۔

ہندوستان کے بازاروں میں جو فوٹو عام طور پر نظر آتے ہیں ان میں سے ایک میں میری اور کملا کی تصویریں ساتھ ساتھ دکھائی گئی ہیں اور ان کے اوپر لکھا ہوا ہے آدرش (مثالی) جوڑی۔ بہت سے لوگ ہمیں ایسا ہی سمجھتے تھے لیکن حقیقت میں آدرش کو حاصل کرنا نہایت مشکل ہے۔ پھر بھی مجھے یاد ہے کہ جب سیلون میں ہم تعطیل منا رہے تھے تو میں نے کملا سے کہا تھا کہ باوجود تمام اختلافات اور مشکلات کے، باوجود ان آزمائشوں کے جن میں زندگی نے ہمیں مبتلا کیا ہم بڑے خوش قسمت ہیں۔ شادی بھی عجب چیز ہے۔ آج ہزار ہا سال کے تجربے کے بعد بھی اس کی وہی حالت ہے جو پہلے تھی۔ ہمیں اپنے آس پاس بہت سے گھروں میں ناکام شادیوں کے نمونے نظر آتے تھے اور ہم دیکھتے تھے کہ اس کی چمک دمک کس طرح ماند پڑ جاتی ہے۔ میں نے کملا سے کہا کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں اور انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس لئے کہ اگرچہ کبھی کبھی ہم میں آپس میں جھڑپ

ہو جاتی تھی اور ہم ایک دوسرے سے خفا ہو جایا کرتے تھے لیکن ہم نے محبت کی چنگاری کو بجھنے نہیں دیا اور ہم دونوں ہمیشہ زندگی کے نئے نئے مرحلوں سے گذرتے رہے اور ہمیں ایک دوسرے کی سیرت کے نئے نئے پہلو نظر آتے رہے۔

انسانی تعلقات کا مسئلہ کتنا اہم ہے۔ ہم اکثر سیاسیات اور معاشیات کی گرما گرم بحثوں میں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور چین کی قدیم دانشمندانہ تہذیبیں اسے نظر انداز نہیں کرتی تھیں۔ انھوں نے اخلاق اور معاشرت ایسے طریقے وضع کئے تھے جو باوجود اپنی خامیوں کے انسان میں ایک توازن ضرور پیدا کر دیتے تھے۔ یہ توازن آج ہندوستان میں نظر نہیں آتا اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے مغربی ملکوں میں بھی جنھوں نے اور بہت سی چیزوں میں اس قدر ترقی کر لی ہے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ کیا توازن دراصل ایک طرح کا جمود ہے اور ترقی کے منافی ہے؟ کیا ان میں سے ایک کی خاطر دوسرے کو قربان کرنا ضروری ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے کہ توازن کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی ترقی بھی ہو سکے اور ماضی کی حکمت کو حال کے جوشِ عمل اور سائنس کے ساتھ سمویا جا سکے۔ سچ پوچھیے تو ہم دنیا کی تاریخ میں اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی نہ پیدا ہوئی تو دونوں برباد ہو جائیں گے۔ ✓

✓ (۴) کرسمس ۱۹۳۵ء

کملا کی حالت سنبھل گئی۔ کچھ ایسا نمایاں افاقہ تو نہ تھا مگر پچھلے ہفتوں کی پریشانی کے بعد ہمیں بہت اطمینان محسوس ہوا۔ بحران گذر گیا تھا اور طبیعت

ایک حالت پر ٹھہر گئی تھی۔ یہ بجائے خود غنیمت تھا۔ یہ کیفیت ایک مہینے تک رہی اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بیٹی اندرا کے ساتھ کچھ دن کے لئے انگلستان چلا گیا۔ مجھے وہاں گئے ہوئے آٹھ برس ہو گئے تھے اور میرے بہت سے دوست بڑے اصرار سے ملنے کے لئے بلا رہے تھے۔

میں باڈن وائلر واپس آگیا اور پھر وہی روزمرہ کا معمول شروع ہو گیا۔ جاڑے کا موسم آگیا تھا اور ہر طرف برف کی سفید چادر بچھ گئی تھی۔ کرسمس کے قریب کملا کی حالت بگڑنے لگی۔ ایک اور بحران شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے آخری دنوں میں میں برف اور کیچڑ سے گذرتے ہوئے یہ سوچا کرتا تھا کہ بس وہ اب چند دن اور چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ جاڑے کا پُرسکون منظر، برف کی سفید چادر اوڑھے ہوئے، میری نظر کے سامنے موت کی خاموشی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ میرے دل میں امید کا چراغ بجھ گیا تھا۔

مگر کملا نے اس بحران کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی حیرت انگیز قوت حیات سے اسے جھیل گئیں۔ وہ مقابلتاً تندرست اور خوش نظر آتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ہم انھیں باڈن وائلر سے کہیں اور لے جائیں۔ ایک تو ان کی طبیعت یہاں رہتے رہتے اکتا گئی تھی دوسرے سینے ٹوریم کا ایک مریض جو انھیں کبھی کبھی پھولوں کا تحفہ بھیجا کرتا تھا اور دو ایک بار ان سے ملنے کو آیا تھا، مر گیا۔ یہ مریض ایک آئرش لڑکا تھا جس کی حالت کملا سے بہت بہتر تھی اور اُسے یہ اجازت مل گئی تھی کہ ٹہلنے کو جایا کرے۔ ہم نے یہ کوشش کی کہ اس کی اچانک موت کی خبر کو کملا سے چھپائیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جو لوگ بیمار ہوتے ہیں خصوصاً وہ بدنصیب جنھیں سینے ٹوریم میں رہنا پڑتا ہے اس قدر تیز حس ہو جاتے ہیں کہ

وہ بہت سی باتیں جن کو ان سے چھپانے کی کوشش کی جائے سمجھ جاتے ہیں۔

جنوری میں میں چند دن کے لئے پیرس اور وہاں سے لندن گیا۔ زندگی پھر مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ لندن میں یہ خبر ملی کہ میں دوبارہ انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب ہوا ہوں جس کا اجلاس اپریل میں ہونے والا ہے۔ مجھے اس کی پہلے سے توقع تھی اس لئے کہ دوستوں نے مجھے آگاہ کر دیا تھا اور میں کملا سے بھی اس کے متعلق گفتگو کر چکا تھا۔ اب میرے سامنے دو صورتیں تھیں اور دونوں بہت تکلیف دہ تھیں۔ یا تو کملا کو اس حالت میں چھوڑ دوں یا صدارت سے استعفےٰ دے دوں۔ کملا میرے استعفےٰ دینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئیں۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ہندوستان جا کر پھر واپس آجاؤں۔

جنوری ۱۹۳۶ء کے آخر میں میں کملا کو لے کر باڈن وائلر سے لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے ایک سینے ٹوریم لے گیا۔

۵۔ وفات

سوئٹزرلینڈ کملا کو بھی پسند آیا اور مجھے بھی۔ وہ مقابلتاً بشاش نظر آتی تھیں اور میں سوئٹزرلینڈ کے اس حصے سے پہلے سے واقف تھا اس لئے مجھے یہاں اجنبیت کا احساس نہ تھا۔ کملا کی حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ فی الحال کسی اور بحران کا اندیشہ نہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت تک ان کی طبیعت ٹھہری رہے گی۔

ادھر ہندوستان مجھے اصرار سے بلا رہا تھا۔ میرے دوستوں کا تقاضا تھا کہ جلد واپس آؤ۔ میری بے چینی بڑھنے لگی اور میرا ذہن اپنے ملک کے مسائل پر غور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کئی سال سے جیل میں رہنے اور دوسری معذوریوں

کی وجہ سے میں سیاسی معاملات میں عملی حصہ نہیں لے سکا تھا اور ان سے بے تعلق سا ہو گیا تھا۔ مگر اب مجھ میں صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ لندن اور پیرس کے سفر اور ہندوستان کی خبریں مجھے خیالی دنیا سے کھینچ کر عملی دنیا میں لے آئیں اور اب میرے لئے وہاں لوٹ کر جانا ممکن نہ تھا۔

میں نے اس بارے میں کملا سے گفتگو کی اور ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ دونوں نے یہ رائے دی کہ مجھے ہندوستان واپس جانا چاہئے اور میں نے ڈچ کے ایل۔ ایم لائن کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے ۲۸ فروری کو روانہ ہونا تھا۔ جب یہ سب باتیں طے ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کملا کو اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ میں انھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں مگر انھیں یہ بھی منظور نہ تھا کہ مجھے میرے ارادے سے روکیں۔ میں نے ان کو تسلی دی کہ میں ہندوستان میں زیادہ نہیں ٹھہروں گا اور دو تین مہینے کے بعد واپس آجاؤں گا بلکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے پہلے بھی آسکتا ہوں۔ جس دن وہ مجھے بلانے کا تار دیں گی اس کے ایک ہفتے کے اندر پہنچ جاؤں گا۔

میری روانگی میں چار پانچ روز باقی تھے۔ اندرا جو قریب کے ایک قصبے میں مدرسے میں داخل کر دی گئی تھی، یہ چار پانچ روز ہمارے ساتھ بسر کرنے کے لئے آرہی تھی۔ اس دن ڈاکٹر مجھ سے ملنے کو آیا اور اس نے یہ رائے دی کہ تم اپنی روانگی آٹھ دس دن کے لئے ملتوی کر دو۔ اس سے آگے اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے فوراً اس کی بات مان لی اور دوسرے ہوائی جہاز سے روانگی کا انتظام کر لیا۔

ان آخری دنوں میں کملا کی حالت میں ایک عجیب تغیر ہوا۔ اُن کی جسمانی صحت میں تو بظاہر کوئی خاص فرق نہ تھا مگر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی

رہتی تھیں اور آس پاس کی چیزوں کی طرف بہت کم توجہ کرتی تھیں۔ وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ انھیں کوئی پکار رہا ہے یا کوئی شخص کمرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے حالانکہ مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

۲۸ فروری کو صبح تڑکے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت اندرا وہاں موجود تھی اور ہمارے سچے دوست ڈاکٹر اٹل بھی تھے جنھوں نے پچھلے چند مہینے میں کسی وقت ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

کچھ اور دوست آس پاس کے قصبوں سے آ گئے اور ہم کملا کی لاش کو لوزان کے کریمیٹوریم[1] میں لے گئے۔ چند منٹ میں وہ خوش نما جسم اور وہ حسین چہرہ جو ہر وقت مسکرایا کرتا تھا جل کر راکھ ہوگیا۔ جو ہستی کبھی نشاط زندگی سے معمور تھی اب اس کا جسم خاکی ایک چھوٹے سے ظرف میں سما گیا۔

۶۔ مسولینی۔ واپسی

جس رشتۂ امید نے مجھے لوزان میں روک رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا اور اب مجھے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سچ پوچھیے تو اسی کے ساتھ میرا دل بھی ٹوٹ گیا۔ مجھے اپنے صدمے کا احساس رفتہ رفتہ ہوا اس لیے کہ ان دنوں میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اور میرا ذہن پوری طرح کام نہیں کرتا تھا۔ میں اندرا کو لے کر مانترو چلا گیا کہ اس کے ساتھ چند روز خاموشی سے بسر کروں۔

مانترو میں لوزان کے اطالوی قنصل مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ وہ

---

[1] وہ قبرستان جہاں لاش کو پہلے بجلی سے جلاتے ہیں اور پھر اس کی راکھ کو دفن کر دیتے ہیں۔

سینور مسولینی کی طرف سے تعزیت کا پیام لائے تھے۔ مجھے کسی قدر تعجب ہوا اس لئے کہ سینور مسولینی سے نہ تو کبھی میری ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہم دونوں میں اور کسی قسم کا تعلق تھا۔ میں نے قنصل سے کہا کہ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کریں۔

چند ہفتے پہلے روم سے میرے ایک دوست نے لکھا تھا کہ سینور مسولینی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس وقت میرا روم جانا کسی طرح ممکن نہ تھا چنانچہ میں نے ان کو یہی جواب دے دیا تھا۔ کچھ دن بعد جب میں ہوائی جہاز سے ہندوستان واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا پھر ان کا پیام پہنچا اور اب کی بار اس میں اشتیاق اور اصرار کا رنگ تھا۔ میں اس ملاقات سے بچنا چاہتا تھا لیکن مجھے یہ منظور نہ تھا کہ مجھ پر کج خلقی کا الزام آئے۔ معمولی حالات میں شاید میں اپنے آپ کو ان سے ملنے پر آمادہ کر لیتا اس لئے کہ مجھے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ لیکن ان دنوں حبش کی جنگ جاری تھی اور میری ان کی ملاقات سے طرح طرح کے نتیجے نکالے جاتے اور فسطائی پروپیگنڈا میں اس سے کام لیا جاتا۔ میں لاکھ تردید کرتا مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ حال میں ایسے کئی واقعات پیش آئے کہ ہندوستانی طالب علم اور دوسرے ہندوستانیوں کے اٹلی جانے سے فسطائی پروپیگنڈا نے فائدہ اٹھایا حالانکہ یہ بیچارے ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے بلکہ بعض اوقات انھیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۹۳۱ء میں اٹلی کا مشہور اخبار (ژورنال دیتالی) گاندھی جی سے ایک فرضی انٹرویو شائع کر چکا تھا۔

اس لئے میں نے اپنے دوست سے معذرت کر دی۔ کچھ دن کے بعد میں نے پھر ایک خط لکھا اور ٹیلیفون بھی کر دیا تاکہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ یہ سارا واقعہ کملا کی وفات سے پہلے کا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے

ایک اور پیام بھیجا کہ علاوہ اور وجوہ کے میری حالت اس وقت ایسی نہیں کہ کسی سے ملاقات کرسکوں۔

اس قدر شدت سے انکار کرنا اس وجہ سے ضروری تھا کہ مجھے ہوائی جہاز سے روم سے گذرنا اور وہاں رات بھر ٹھہرنا تھا۔ اس مختصر قیام سے میں کسی طرح نہیں بچ سکتا تھا۔

چند روز مانٹروہیں ٹھہرنے کے بعد میں جنیوا ہوتا ہوا مارسیلز پہنچا اور وہاں سے کے۔ ایل۔ ایم لائن کے ہوائی جہاز میں مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ شام کے قریب روم پہنچے تو وہاں ایک اعلیٰ عہدہ دار نے مجھے سینور مسولینی کے معتمد کا خط دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ڈوچے کو مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی اور انھوں نے اس روز شام کے چھ بجے کا وقت انٹرویو کے لئے مقرر کیا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے ان پیاموں کا ذکر کیا جو میں بھیج چکا تھا۔ مگر انھوں نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ اب تو سارا معاملہ طے ہوچکا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی اور اگر یہ انٹرویو نہ ہوا تو وہ اپنے عہدے سے برطرف کر دئے جائیں گے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ ڈوچے سے صرف چند منٹ کی ملاقات ہوگی اور اس کی خبر اخبار میں شائع نہیں ہوگی۔ وہ بس مجھ سے مل کر ذاتی طور پر میری بیوی کی وفات پر اظہار تعزیت کرنا چاہتے ہیں۔ ایک گھنٹے تک یہی بحث ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے اخلاق و تہذیب کا پورا لحاظ رکھا گیا لیکن گفتگو ناگوار رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میرے لئے یہ ایک گھنٹہ نہایت تکلیف دہ تھا اور غالباً طرف ثانی کے لئے اس سے بھی زیادہ۔ آخر وہ وقت آپہنچا جو انٹرویو کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ میں اپنی بات پر قائم رہا۔ ڈوچے کے محل پر ٹیلیفون سے اطلاع دی گئی کہ میں نہیں آسکتا۔

شام کو میں نے سینور مسولینی کے نام خط لکھا جس میں اس کی معذرت کی کہ انھوں نے از راہ مہربانی مجھے ملاقات کے لیے مدعو کیا اور میں اسے قبول نہیں کر سکا اور ان کے پیام تعزیت کا شکریہ ادا کیا۔

میں روم سے روانہ ہو کر قاہرہ پہنچا اور یہاں کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ قاہرہ سے آگے مشرق کی طرف، مغربی ایشیا کے صحراؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب تک سفر کے انتظامات اور مختلف واقعات نے مجھے اپنی طرف متوجہ رکھا تھا۔ مگر قاہرہ سے روانہ ہونے کے بعد اس لق و دق صحرا پر اُڑتے ہوئے مجھے شدید تنہائی کا احساس ہونے لگا اور زندگی خالی اور بے مقصد نظر آنے لگی۔ میں گھر واپس جا رہا تھا جو اب گھر نہیں رہا تھا۔ میرے پاس ایک ٹوکری رکھی تھی اور اس ٹوکری میں ایک چھوٹا سا ظرف تھا۔ کملا کے جسم خاکی میں سے بس یہ تھوڑی سی خاکستر باقی رہ گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ہمارے سنہری خواب بھی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ میرے دل سے بار بار آواز آ رہی تھی، وہ اب دنیا میں نہیں — کملا اب دنیا میں نہیں۔

مجھے اپنی بات یاد آئی جس کے متعلق میں کملا سے، ان کے بھوالی کے قیام کے زمانے میں، گفتگو کیا کرتا تھا۔ جب میں نے کتاب لکھنی شروع کی تو اس کا ایک آدھ باب لے جا کر انھیں سنایا کرتا تھا۔ انھوں نے اس کا صرف ایک حصہ دیکھا تھا باقی کتاب وہ اب کبھی نہیں دیکھیں گی اور نہ اب ہم دونوں مل کر کتابِ زندگی کا کوئی باب لکھیں گے۔

جب میں بغداد پہنچا تو میں نے لندن کے پبلشر کو جو "میری کہانی" کو شائع کر رہا تھا تار دیا کہ کتاب ان الفاظ میں معنون کی جائے "کملا کے نام جواب دنیا میں نہیں۔"

کراچی آگیا۔ لوگوں کا ہجوم اور جانے بوجھے چہرے نظر آئے۔ الہ آباد پہنچ کر ہم اس انمول ظرف کو گنگا کے تیز دھارے پر لے گئے اور اُسے اس مادر مہربان کی آغوش میں دے دیا۔ نہ جانے اُس نے ہمارے کتنے بزرگوں کو سمندر میں پہنچایا ہوگا اور ہماری اولاد میں سے کتنے اس کی آغوش میں اپنا آخری سفر طے کریں گے۔

تیسرا باب

ہندوستان کی تلاش

۱۔ ماضی کا نقشہ

فکر و عمل کے اس دور میں جس سے میں گذر چکا ہوں میرے ذہن پر ہندوستان کا خیال چھایا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ ہندوستان کیا ہے اور مجھے اس سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس وقت اپنے ملک کا جو مبہم تصور میرے ذہن میں تھا اس میں بعد کے تجربات سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ تصور کبھی کبھی ہلکا پڑ جاتا تھا مگر مٹتا کبھی نہ تھا۔ یہ پرانی روایات اور نئے واقعات کا ایک عجیب معجون مرکب تھا جو میرے دل میں فخر کے جذبے کے ساتھ ساتھ ندامت کا احساس بھی پیدا کرتا تھا۔ اپنے ماحول کی بہت سی چیزوں مثلاً توہم پرستانہ رسوم، فرسودہ خیالات خصوصاً غلامی اور افلاس کی حالت پر مجھے شرم آتی تھی۔

بڑا ہو کر جب میں قومی آزادی کی جد و جہد میں شریک ہوا تو ہندوستان کا خیال ہر وقت میرے دل میں کھٹکنے لگا۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ یہ ہندوستان کیا چیز ہے جو میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا ہے جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے اور عمل پر اُبھارتا ہے تاکہ ہم اپنی اس مبہم آرزو کو پورا کرسکیں جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ابتدا میں شاید میرے

عمل کا محرک شخصی، اور قومی خودداری کا جذبہ اور یہ خواہش تھی، جو سب انسانوں میں مشترک ہے، کہ ہم غیروں کو اپنے اوپر حکومت نہ کرنے دیں اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ مجھے یہ بات نہایت افسوس ناک معلوم ہوتی تھی، کہ ہندوستان جیسا بڑا ملک جو ایک قدیم ترین اور شاندار تہذیب کا وارث ہے، ایک دور افتادہ جزیرے کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو اور اُس کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک یہ تھا کہ اس جبری تعلق نے ہمارے ملک کو انتہائی ذلت اور افلاس میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ خیال مجھے اور دوسروں کو عمل پر ابھارنے کے لئے کافی تھا۔

لیکن اس سے ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا جو میرے دل میں کھٹک رہے تھے۔ جغرافی اور طبیعی پہلو سے قطع نظر کرکے ہندوستان حقیقت میں کیا ہے؟ گذشتہ زمانے میں وہ کن اصولوں کا علم بردار تھا اور اس کی طاقت کا کیا راز تھا؟ اس نے وہ اپنی اگلی طاقت کیسے کھودی؟ کیا واقعی یہ طاقت بالکل جاتی رہی؟ آج کل وہ بے شمار انسانوں کا مسکن ہونے کے علاوہ کسی اور لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ جدید دنیا میں وہ کس طرح کھپ سکتا ہے؟

اس مسئلے کا وسیع تر بین الاقوامی پہلو میرے سامنے اس وقت آیا جب میں یہ محسوس کرنے لگا کہ کسی ملک کا اور ملکوں سے بے تعلق ہو کر رہنا نہ تو مناسب ہے اور نہ ممکن ہے۔ مستقبل کا جو نقشہ میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان دنیا کے اور ملکوں کے ساتھ گہرے سیاسی، معاشی اور تہذیبی تعلق اور اتحاد عمل کے رشتے سے وابستہ ہوگا۔ مگر مستقبل سے پہلے ہمیں حال سے نبٹنا ہے اور حال کے پیچھے ماضی کا طویل اور اُلجھا ہوا

سلسلہ ہے جس نے حال کو پیدا کیا ہے اس لئے میں ماضی کے مطالعے سے بصیرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ہندوستان سے مجھے قلبی تعلق تھا اور اس میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو خود بخود میرے دل کو گرما دیتی تھیں۔ پھر بھی میں اسے ایک اجنبی نقاد کی حیثیت سے دیکھتا تھا اور نہ صرف اس کی موجودہ حالت کو بلکہ بہت سی چیزوں کو جو پرانے زمانے کی یادگار تھیں ناپسند کرتا تھا۔ میرا نقطۂ نظر ایک حد تک مغربی تھا اور میں ہندوستان کا مطالعہ اس طرح کرتا تھا جس طرح کوئی مغربی دوست کرتا۔ مجھے یہ شوق تھا کہ اس کے خیالات اور اس کی ہیئت کو بدل دوں اور اسے جدیدیت کا لباس پہنا دوں۔ مگر اسی کے ساتھ میرے دل میں یہ شبہہ پیدا ہوتا تھا کہ میں جو یہ فیصلہ کرنے بیٹھا ہوں کہ ہندوستان کے قدیم ورثے کا بہت بڑا حصہ رد کردینے کے قابل ہے، ہندوستان کو جانتا بھی ہوں یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی چیزیں ختم کردینی چاہئیں اور ختم کردینی پڑینگی لیکن اگر ہندوستان کے اندر کوئی پائدار اور قابل قدر جوہر نہ ہوتا تو اسے جو عظمت حاصل ہوئی وہ نہ ہوتی اور وہ ہزاروں برس تک مہذب زندگی نہ بسر کرسکتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ بیش بہا جوہر کیا ہے؟

میں وادی سندھ میں موہنجو دارو کے ایک ٹیلے پر کھڑا ہوا اپنے آس پاس اس قدیم شہر کے گھروں اور سڑکوں کو دیکھ رہا تھا جو اب سے پانچ ہزار سال پہلے ایک قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب کا مالک تھا۔ پروفیسر Childe لکھتے ہیں " وادیٔ سندھ کی تہذیب ایک مکمل نمونہ ہے انسانی زندگی کی ایک خاص ماحول سے مکمل مطابقت کا جو سالہا سال کے صبر

اور محنت سے پیدا ہوئی ہوگی۔ اس میں ہندوستان کا مخصوص رنگ نظر آتا ہے
اور موجودہ ہندوستانی تہذیب کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔" کیسا حیرت انگیز
تصور ہے۔ کسی تہذیب و تمدن کا مسلسل پانچ چھ ہزار سال تک باقی
رہنا اور وہ بھی جمود کی حالت میں نہیں اس لئے کہ ہندوستان برابر بدلتا
رہا اور ترقی کرتا رہا۔ اُسے ایرانیوں، مصریوں، یونانیوں، چینیوں،
عربوں، وسط ایشیا کے باشندوں اور بحر روم کے علاقے کی قوموں سے
سابقہ پڑتا رہا۔ اس نے ان پر اثر ڈالا اور ان سے متاثر ہوا لیکن اس
کی اپنی تہذیب ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی کہ آج تک باقی ہے اس
قوت کا راز کیا تھا اور وہ کس چیز سے پیدا ہوئی تھی۔

میں نے ہندوستان کی تاریخ کا اور اس کے وافر قدیم ادب
کے ایک حصے کا مطالعہ کیا اور میں اُس کے خیالات کی قوت، زبان و
بیان کی فصاحت اور اس ذہن کی وسعت اور ہمہ گیری سے بہت
متاثر ہوا جس نے اسے پیدا کیا۔ میں نے عالم تصور میں مغربی اور وسطی
ایشیا کے ان سیاحوں کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا جو قدیم زمانے میں
یہاں آئے تھے اور اپنے سفرنامے چھوڑ گئے ہیں۔ میں نے ان کارہائے
نمایاں پر نظر ڈالی جو ہندوستان نے مشرقی ایشیا میں انگ کور، بوروبدور
اور بہت سے دوسرے مقامات پر انجام دیئے۔ میں نے ہمالیہ کی سیر کی
جس کے ساتھ بہت سی ایسی کہانیاں اور افسانے وابستہ ہیں اور جس نے
ہمارے خیالات اور ہمارے ادب پر بہت اثر ڈالا ہے۔ مجھے پہاڑوں
سے جو محبت ہے اور کشمیر سے جو تعلق ہے اس کی وجہ سے ہمالیہ میرے
لئے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ اس میں مجھے نہ صرف اس وقت

زندگی، قوت اور حسن کا جلوہ نظر آیا بلکہ گذرے ہوئے زمانے کی حسن و خوبی کی یادگار دکھائی دی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے دریاؤں نے جو عظیم الشان پہاڑ سے نکل کر ہندوستان کے میدانوں میں بہتے ہیں میرے دل کو لبھایا اور مجھے اپنی تاریخ کے بے شمار مناظر یاد دلائے۔ انڈس یا سندھ جس کی وجہ سے ہمارا ملک ہند اور ہندوستان کہلایا اور جس کو عبور کر کے ہزارہا سال سے نسلیں اور قومیں اور قافلے اور لشکر ہندوستان آتے رہے، برہم پتر جو تاریخ کے سلسلے سے کسی قدر الگ رہا لیکن پرانی کہانیوں کی بدولت مشہور ہے شمال مشرقی ہمالیہ کی ایک وادی سے نکل کر خاموشی اور نزاکت کے ساتھ اونچے پہاڑوں کے درمیان اور درختوں کے ڈھکے ہوئے میدانوں میں بہتا ہوا، جمنا جس کے ساتھ ناچ رنگ اور کھیل کود کی بے شمار کہانیاں وابستہ ہیں، اور سب کی سرتاج گنگا جس نے ہندوستان کے دل کو اپنی محبت میں اسیر کر لیا ہے اور تاریخ کے آغاز سے اب تک کروڑوں اربوں انسانوں کو اپنی جاترا کے لئے کھینچ بلایا ہے۔ گنگا کی کہانی اس کے منبع سے لے کر دہانہ تک اور قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک دراصل داستان ہے ہندوستانی تمدن کی، سلطنتوں کے عروج و زوال کی، شان دار اور باوقار شہروں کی، انسان کی جسمانی جدوجہد اور ذہنی غور و فکر کی، جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے دماغ ہمہ تن مصروف رہتے تھے، زندگی کے اظہار واثبات اور ترک و انکار کی، نشیب و فراز کی، ارتقا اور انحطاط کی، موت اور حیات کی۔

میں نے پرانی یادگاروں کی سیر کی، اجنٹا، ایلورا اور ایلیفنٹا کے غاروں میں سنگ تراشی کے نمونے اور دیواروں کی تصویروں کا مطالعہ

کیا اور آگرے اور دہلی کی عہد متاخر کی خوبصورت عمارتیں دیکھیں جن کا ایک ایک پتھر زبان حال سے ہندوستان کی تاریخ سناتا ہے۔

خود اپنے شہر الہ آباد میں یا ہردوار میں میں کمبھ میلہ دیکھنے جاتا اور لاکھوں آدمیوں کو ہندوستان کے ہر حصے سے آکر گنگا میں نہاتے دیکھتا جیسے ان کے بزرگ ہزارہا سال سے نہاتے رہے ہیں۔ مجھے ان میلوں کا وہ ذکر یاد آجاتا جو چین اور دوسرے ملکوں کے سیاحوں نے تیرہ سو سال پہلے قلم بند کیا تھا۔ اُس زمانے میں بھی یہ میلے نہایت قدیم سمجھے جاتے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب سے چلے آرہے ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ کتنا زبردست عقیدہ ہے جو پشتہا پشت سے لوگوں کو اس مشہور و معروف دریا کی طرف کھینچ رہا ہے۔

ان سفروں اور سیاحتوں کی بدولت مجھے اپنے مطالعے کے پس منظر میں ماضی کی تصویر نظر آئی۔ اب تک میرے ذہن میں اس کا محض ایک ذہنی خاکہ تھا۔ اب مجھے اس سے قلبی تعلق پیدا ہوگیا اور ہندوستان کی اس تصویر میں جو میرے سامنے تھی رفتہ رفتہ جان پڑنے لگی اور مجھے اپنے بزرگوں کی سرزمین جیتے جاگتے انسانوں سے آباد نظر آنے لگی جو ہنستے تھے، روتے تھے، محبت کرتے تھے اور تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو زندگی کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنی حکمت سے ایک ایسا نظام بنایا جس نے ہندوستان کی تہذیب کو ہزارہا سال کے لئے مضبوط بنیادوں پر قائم کردیا۔ ماضی کی سینکڑوں روشن تصویریں میرے ذہن میں محفوظ تھیں اور

جب میں کسی جگہ جاتا تو وہ تصویر جو اُس سے تعلق رکھتی تھی آنکھوں میں پھر جاتی۔
بنارس کے قریب سارناتھ میں مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے بدھ اپنا پہلا
وعظ کہہ رہے ہیں اور اس کے الفاظ جو کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں ڈھائی
ہزار سال کی دوری سے صدائے بازگشت کی طرح میرے کانوں میں
گونجنے لگتے۔ اشوک کی ہر لاٹ اور اس کے کتبے مجھے اپنی پُر شوکت
زبان میں ایک ایسے شخص کی داستان سناتے جو شہنشاہ تھا لیکن انسان
کی حیثیت سے وہ عظمت رکھتا تھا جو کسی شہنشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ فتح پور
سیکری میں ایسا معلوم ہوتا کہ اکبر تھوڑی دیر کے لئے اپنی سلطنت کو بھول کر
مختلف مذاہب کے عالموں کے درمیان بیٹھا بحث اور مناظرے میں
مشغول ہے۔ اس شوق میں کہ شاید کوئی نئی بات معلوم ہو اور اُس سوال
کا جواب ملے جو ہمیشہ سے انسان کے دل میں کھٹک رہا ہے۔

اس طرح تاریخ ہند کے مناظر، اس کے نشیب و فراز، فتح و شکست
کی تصویریں ایک طویل سلسلے میں آہستہ آہستہ میرے سامنے سے گذرتی
تھیں۔ یہ ایک عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی کہ کسی تہذیب کی روایات
پانچ ہزار سال کے عرصے میں جس میں بہت سے حملے ہوئے اور بہت سے
انقلاب آئے، مسلسل قائم رہیں، اور انھوں نے عوام میں پھیل کر ان کی زندگی
پر زبردست اثر ڈالتی رہیں۔ صرف چین میں قدیم روایات اور تہذیبی زندگی
کا یہ تسلسل نظر آتا ہے۔ ماضی کے مناظر کا یہ سلسلہ رفتہ رفتہ حال کے افسوسناک
منظر سے مل گیا۔ آج ہندوستان اپنی ساری گذشتہ عظمت اور قوت کے

باوجود ایک غلام ملک اور برطانیہ کا تابع محمل ہے۔ دنیا میں ایک خوفناک اور مہلک جنگ چھڑی ہوئی ہے اور انسانیت کو حیوانیت سے بدل رہی ہے۔ لیکن پانچ ہزار سال کی ان تصویروں نے میری نظر میں سارا نقشہ بدل دیا اور ایسا معلوم ہوا کہ حال کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا ہے۔ برطانوی حکومت کے ایک سواسی سال ہندوستان کی طویل تاریخ میں محض ایک ضمنی واقعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پھر پاکر رہے گا۔ تاریخ کے موجودہ باب کا آخری صفحہ لکھا جانا شروع ہوگیا ہے۔ دنیا بھی اس ہولناک جنگ سے بچ نکلے گی اور اپنے آپ کو پھر سے نئی بنیادوں پر تعمیر کرے گی۔

۲۔ قومیت اور بین الاقوامیت

مجھے ہندوستان سے جو تعلق تھا وہ جذباتی تھا لیکن یہ کئی باتوں کے لحاظ سے محدود اور مشروط تھا۔ یہ اسی طرح کا تعلق تھا جو قومیت کی شکل اختیار کیا کرتا ہے لیکن عام طور پر غیر محدود اور غیر مشروط ہوتا ہے موجودہ زمانے میں قومیت ہندوستان کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ زندگی کی فطری اور صحیح نشو ونما کا نتیجہ ہے۔ ہر محکوم ملک کے لئے قومی آزادی کی لگن سب چیزوں پر مقدم ہونی چاہیے، مخصوصاً ہندوستان کے لئے جو اپنی جداگانہ شخصیت کا شدید احساس رکھتا ہے اور ایک شاندار ماضی کا وارث ہے۔ یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

ان جدید تحریکوں نے جو ساری دنیا میں نظر آرہی ہیں ثابت کردیا ہے کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ قومیت کا زور بین الاقوامی اور پرولتاری تحریکوں کی وجہ سے گھٹ رہا ہے۔ یہ ان محرکات میں جو قوموں کو ابھارتے

میں سب سے قوی محرک ہے اور اس کے ساتھ اجتماعی جذبات وروایات اور مشترک زندگی اور مشترک مقصد کا احساس وابستہ ہے۔ جنگ سے پہلے ایک متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ رفتہ رفتہ قومیت سے دور ہو رہے تھے یا کم سے کم ان کا یہ خیال تھا۔ دوسری طرف پرولتاری تحریکیں جن کی بنیاد بالارادہ بین الاقوامیت پر رکھی گئی تھی قومیت کی طرف کھنچ رہی تھیں۔ جنگ نے آکر سب کو قومیت کے سیلاب میں بہا دیا۔ قومیت کے دوبارہ جنم لینے یا یوں کہئے کہ نئے سرے سے دریافت کئے جانے اور اس کی زبردست اہمیت کے احساس نے نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں اور پرانے مسائل کی شکل وصورت بدل دی ہے۔ قدیم روایات کو جو دلوں میں راسخ ہو چکی ہیں آسانی سے مٹایا یا نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ نازک موقعوں پر ان کا احساس بیدار ہو کر لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اکثر جیسا کہ ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں ان روایات سے بالارادہ لوگوں کو بڑی سے بڑی جد و جہد اور قربانی پر اُبھارنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف روایات کو بڑی حد تک قبول کرنا اور نئے حالات اور خیالات سے مطابقت دینی پڑتی ہے اور دوسری طرف نئی روایات تعمیر کرنی پڑتی ہیں۔ قومیت کا نصب العین بہت گہرا اور قوی ہے یہ کوئی فرسودہ چیز نہیں جس کی مستقبل کے لئے کچھ اہمیت نہ ہو لیکن اس کے مقابلے میں دوسرے نصب العین جو آج کل کے حالات سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں، یعنی بین الاقوامی اور پرولتاری نصب العین، پیدا ہو گئے ہیں اور اگر دنیا میں توازن قائم کرنا ہے اور باہمی کش مکش کو دور کرنا ہے تو ان سب تصورات میں کسی نہ کسی قسم کا امتزاج پیدا کرنا لازمی ہے۔ قومیت کا جو دائمی اثر

انسانی طبیعت پر ہے اسے تسلیم کرنا چاہیئے اور ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن اُسے ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہیئے۔

جب قومیت کا اثر ان ملکوں میں جو نئے خیالات اور بین الاقوامی تحریکوں سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے ہیں اب تک اس قدر عام ہے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ذہن پر اس کا کتنا زیادہ تسلط ہوگا۔ بعض اوقات ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری قومیت ہماری پس ماندگی کی علامت ہے بلکہ ہمارا آزادی کا مطالبہ بھی ہماری تنگ نظری کو ظاہر کرتا ہے۔ جو حضرات یہ فرماتے ہیں ان کا شاید یہ خیال ہے کہ اگر ہم برطانوی سلطنت یا وفاق میں چھوٹے حصہ دار کی حیثیت سے شریک ہو جائیں تو سچی بین الاقوامیت کا جھنڈا بلند ہو جائے گا۔ ان پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہوئی کہ اس قسم کی نام نہاد بین الاقوامیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ برطانوی قومیت کے تنگ دائرے کو کچھ اور وسیع کر دیا جائے۔ یہ صورت ہمیں یوں بھی پسند نہ آتی اور اب تو انگریزی حکومت کے منطقی نتائج نے ہمارے دل میں اس تصور کی بالکل گنجائش نہیں رکھی۔ تاہم ہندوستان باوجود اپنے شدید قومی جوش کے حقیقی بین الاقوامیت کے قبول کرنے میں اور سب قوموں پر سبقت لے گیا ہے اور وہ قومی ریاست کو ایک بین الاقوامی ادارے سے ملحق کرنے بلکہ ایک حد تک اس کے ماتحت رکھنے پر تیار ہے۔

۴۔ ہندوستان کی قوت اور کمزوری

ہندوستان کے عروج و زوال کے اسباب کی تلاش بہت دیر طلب

اور دشوار ہے۔ لیکن زمانۂ حال میں جو اسباب اس کے انحطاط کا باعث ہوئے وہ ظاہر ہیں۔ ہندوستان صنعت کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور یورپ میں جو مدتوں سے بہت سی باتوں میں پیچھے تھا صنعتی ترقی میں آگے بڑھ گیا۔ اس صنعتی ترقی کی تہ میں وہ علمی روح اور زندگی کا وہ ولولہ تھا جس نے اپنے آپ کو بہت سے عملی کارناموں میں اور تحقیقی سیاحتوں میں ظاہر کیا۔ نئے فنون کی بدولت مغربی یورپ کے ملکوں کی فوجی طاقت بہت بڑھ گئی، وہ آسانی سے دنیا میں پھیل گئیں اور مشرق پر حکومت کرنے لگیں۔ یہ ہے مختصر کہانی نہ صرف ہندوستان کی بلکہ تقریباً سارے ایشیا کی۔ البتہ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ہندوستان صنعت میں پیچھے کیوں رہ گیا۔ اگلے وقتوں میں وہ ذہنی چستی اور صنعتی مہارت سے محروم نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی تنزل کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ رفتہ رفتہ جوش حیات اور ذوق سعی کم ہوتا گیا، تخلیقی روح گھٹتی گئی اور تقلید کا شوق بڑھتا گیا۔ جہاں سرکش فکر فطرت اور کائنات کے اسرار کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتی تھی وہاں نقالط شرح نویسوں نے طول طویل شرحیں اور تاویلیں لکھنی شروع کردیں۔ شاندار آرٹ اور سنگ تراشی کی جگہ کاری گری رہ گئی جس میں محض جزویات کی باریکی اور دیدہ ریزی تھی کوئی بلند تصور یا مقصد نہ تھا۔ سادہ اور پرزور عبارت کی جگہ تکلف اور تصنع سے کام لیا جانے لگا۔ وہ ذوق عمل اور وفور حیات جس کی بدولت بیرونی نوآبادیاں قائم ہوئی تھیں اور ہندوستانی تہذیب دور دراز ملکوں میں پہنچائی گئی تھی اب ختم ہوگیا اور تعصب اور تنگ نظری اس حد تک پہنچ گئی کہ سمندر پار جانے کی بھی ممانعت کردی گئی۔ قدیم زمانے میں پہلی عقلی تحقیق و تجسس کی جو روح

نظر آتی ہے اور جس سے سائنس کی ترقی کی امید ہو سکتی تھی وہ لاعقلیت اور تقلید پرستی سے بدل گئی۔ ہندوستانی زندگی ایک سست رو ندی کی طرح ماضی کے کھنڈروں کے اندر سے رینگتی ہوئی بہنے لگی۔ وہ ماضی کے بوجھ میں دب گئی اور اس پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس جسمانی تکان اور ذہنی غنودگی کی حالت میں ہندوستان تنزل اور جمود میں مبتلا ہو گیا اور دنیا کے دوسرے ملک آگے بڑھ گئے۔

مگر یہ تبصرہ بالکل مکمل اور پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اگر ایک طویل عرصے تک جمود اور تعطل کی حالت رہتی تو ماضی سے بالکل قطع تعلق ہو جاتا، قدیم دور کی عمارت مسمار ہو جاتی اور اس کے کھنڈروں پر ایک نئی عمارت کھڑی ہو جاتی۔ لیکن اس طرح کا قطع تعلق نہیں ہوا بلکہ زندگی میں تسلسل باقی رہا۔ وقتاً فوقتاً نئی زندگی کے شعلے بھی بھڑک اٹھتے تھے جن میں سے بعض بہت روشن تھے اور بہت دیر تک باقی رہے۔ ہر مرتبہ یہ کوشش ہوتی رہی کہ جدید عناصر کو قدیم عناصر سے مطابقت دی جائے اور ان سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اکثر ایسا ہوا کہ قدیم عنصر کی محض ظاہری صورت محض ایک علامت کے طور پر باقی رہ گئی اور اس کا ہیولے بالکل بدل گیا۔ لیکن زندگی کی ایک لہر جو ایک نامعلوم منزل کی طرف بہے جا رہی تھی اور قدیم و جدید میں امتزاج کی خواہش تقریب تقریب ہر زمانے میں موجود رہی۔

یہی موج حیات یہی خواہش امتزاج تھی جس نے ہندوستانی تہذیب کو قائم رکھا اور جس کی بدولت وہ بہت سی قدیم روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تصورات کو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا خواب ہے جو ہندوستان ہزاروں سال سے دیکھ رہا ہے جو کبھی واضح اور

روشن ہوجاتا ہے اور کبھی خواب پریشاں بن جاتا ہے ۔ ہر جماعت اور ہر قوم اپنی قومی تقدیر کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ یا وہم رکھتی ہے اور شاید وہ ایک حد تک حقیقت پر مبنی ہوتا ہے ۔ میں خود ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ہندوستان کے بارے میں اس وہم یا حقیقت کا قائل ہوں ۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو چیز مسلسل سیکڑوں نسلوں کی زندگی کی تشکیل کر سکتی ہے اس کی تہ میں ضرور قوت کا ایک لازوال خزانہ ہوگا جس سے وہ ہر زمانے میں حیات تازہ حاصل کرتی رہتی ہے ۔

کیا واقعی قوت کا کوئی ایسا خزانہ موجود تھا ؟ اور اگر تھا تو کیا وہ خشک ہوگیا یا کچھ ایسے چھپے ہوئے سوت تھے جو اُسے آب حیات کی تازہ رسد پہنچاتے رہے ؟ اور اب ؟ کیا اب بھی یہ سوت جاری ہیں اور ہم ان سے قوت اور تازگی حاصل کر سکتے ہیں ؟ ہم ایک پرانی نسل سے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مختلف نسلوں کے ایک معجون مرکب سے، تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا سلسلہ انسانی تاریخ کے آغاز تک پہنچتا ہے ۔ کیا ہماری عمر ختم ہونے پر آگئی اور اب ہم شام زندگی یا شب زندگی کی گھڑیاں پوری کر رہے ہیں ان بوڑھوں کی طرح جن میں قوت حیات اور قوت تخلیق باقی نہیں رہتی اور جن کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انھیں امن اور سکون حاصل ہو اور آرام سے سوتے رہیں ۔

کسی جماعت کسی قوم کی زندگی تغیر سے خالی نہیں ہوتی ۔ وہ برابر دوسروں میں ملتی جلتی اور آہستہ آہستہ بدلتی رہتی ہے ۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب مرچکی اور پھر دفعتہً ایک نئی قوم کی شکل میں، یا پرانی قوم کے ایک نئے روپ میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے ۔ کبھی قدیم اور جدید میں بالکل قطع تعلق ہوجاتا ہے اور کبھی دونوں افکار و مقاصد کے زندہ رشتوں سے وابستہ

رہتے ہیں۔

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ پرانی اور جمی جمائی تہذیبیں رفتہ رفتہ مٹ گئیں یا دفعتہً ختم ہوگئیں اور نئی طاقت ور تہذیبوں نے ان کی جگہ لے لی۔ کیا زندگی کی کوئی خاص طاقت، قوت کا کوئی اندرونی خزانہ ہوتا ہے جو کسی قوم یا تہذیب کو زندہ رکھتا ہے اور اس کے بغیر تمام سعی وعمل اسی طرح بے کار ہے جیسے ایک بوڑھے کی یہ کوشش کہ وہ جوان بن جائے۔

آج کل دنیا کی قوموں میں سے تین میں مجھے یہ قوت حیات نظر آتی ہے — امریکی، روسی اور چینی (عجب بے جوڑ مجموعہ ہے)۔ امریکی، اگرچہ ان کی جڑیں پرانی دنیا میں پیوست ہیں، حقیقت میں ایک نئی قوم ہیں۔ وہ پرانی قوموں کی بندشوں اور الجھنوں سے پاک ہیں اور قدیم روایات کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ اس لئے اگر ان میں اتنی قوت عمل اور مستعدی ہے تو کوئی تعجب نہیں، یہی حال کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لوگوں کا ہے۔ یہ سب کے سب پرانی دنیا سے الگ تھلگ زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھ رہے ہیں۔

روسی کوئی نئی قوم نہیں ہیں لیکن ان کا رشتہ ماضی سے اس طرح منقطع ہوگیا ہے جیسے موت کے بعد ہو جاتا ہے اور انھوں نے نئے سرے سے جنم لیا ہے جس کی کوئی مثال تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ ان میں پھر سے جوانی کی قوت، چستی اور مستعدی پیدا ہوگئی ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ماضی میں اپنی جڑیں دوبارہ تلاش کریں لیکن ان کی قوم ایک نئی قوم اور ان کی تہذیب ایک نئی تہذیب بن گئی ہے۔

روس کی مثال یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک قوم از سر نو زندگی اور جوانی حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قیمت ادا کرے اور عوام کی دبی ہوئی قوت کے خزانے کھول دے۔ ممکن ہے کہ یہ جنگ باوجود اپنی دہشت خیزی اور ہلاکت انگیزی کے کچھ اور قوموں کو جو اس ہنگامے سے بچ نکلیں نئے سرے سے جوان کر دے۔

چینیوں کی حالت ان سب سے جدا ہے۔ نہ تو وہ کوئی نئی قوم ہیں اور نہ ان کے ہاں ایسا انقلاب عظیم ہوا ہے جیسا روس میں۔ البتہ سات برس کی مہلک جنگ نے انھیں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ نہ معلوم اس جنگ کا اثر ہے یا دوسرے عوامل کا جو زیادہ مستقل ہیں یا دونوں چیزوں کا۔ بہرحال چینیوں میں وہ زندگی اور قوت پیدا ہو گئی ہے جسے دیکھ کر میں حیران رہ جاتا ہوں۔ میں اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ ایک ایسی قوم جس میں یہ بنیادی طاقت موجود ہے تباہ ہو سکتی ہے۔

اسی قسم کی قوت حیات جو میں نے چینیوں میں دیکھی کبھی کبھی مجھے ہندوستانیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور یوں بھی میرے لئے ان چیزوں کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنا مشکل ہے۔ شاید میری خواہش میرے مشاہدے اور خیال کو متاثر کرتی ہو۔ بہرحال میں جو ہندوستان میں مارا مارا پھرا تو اسی چیز کی تلاش میں۔ اگر ان میں یہ قوت حیات موجود ہے تو بہت اچھا ہے اور وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور اگر وہ اس سے محروم ہیں تو ہماری ساری سیاسی جدوجہد اور شور وغل محض ایک کھیل ہے جس سے

کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایسا سیاسی سمجھوتا ہو جائے جس سے ہماری حالت کم و بیش پہلے کی طرح رہے یا کسی قدر بہتر ہو جائے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری قوم کے اندر دبی ہوئی قوت اور صلاحیت کے خزانے موجود ہیں اور اس کی کوشش کی کہ اس قوت اور صلاحیت کو ابھاروں تاکہ اس کے اندر از سر نو زندگی اور جوانی کا احساس پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی جو حیثیت ہے اس کو دیکھتے ہوئے وہ دنیا میں دوسرے درجے پر نہیں رہ سکتا۔ یا تو اس کی بہت بڑی اہمیت ہوگی یا پھر بالکل نہیں ہوگی۔ درمیانی حالت میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا درمیانی حالت میں رہنا ممکن بھی نہیں۔

پچھلے پچیس سال میں ہماری تحریک آزادی اور برطانوی حکومت سے کشمکش میرے نزدیک اور بہت سے لوگوں کے نزدیک اس خواہش پر مبنی تھی کہ ہندوستان میں از سر نو زندگی اور قوت پیدا کر دی جائے۔ ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اپنی جد و جہد سے، خود اپنے اوپر عائد کی ہوئی تکلیفوں اور قربانیوں سے، بالقصد خطروں کا مقابلہ کر کے، ظلم اور بدی کی اطاعت سے انکار کر کے ہم ہندوستان کی روح کو پھر سے گرما دیں گے اور اسے خواب گراں سے چونکا دیں گے۔ اگرچہ ہمیں بار بار انگریزوں سے لڑنا پڑتا تھا لیکن ہماری نظر ہمیشہ اپنی قوم پر رہتی تھی۔ ہمارے خیال میں سیاسی ترقی محض اسی صورت میں قدر و قیمت رکھتی ہے جب وہ ہمارے اس بنیادی مقصد کے حاصل کرنے میں مدد دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر ایسا طرز عمل اختیار کرتے تھے، جو کوئی سیاست داں، جیسے تنگ سیاسی دائرے کے اندر رہنا ہے، کبھی نہ اختیار کرتا اور ملکی اور غیر ملکی نقاد ہماری

ضد اور حماقت پر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ واقعی یہ ہماری حماقت تھی یا نہیں تھی اس کا فیصلہ تو مستقبل کا مورخ ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایک بلند مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے اور دور تک سوچتے تھے غالباً موقع پرستانہ سیاست کے نقطۂ نظر سے ہم سے بہت سی حماقتیں سرزد ہوئی ہوں گی لیکن ہم کبھی اس بات کو نہیں بھولے کہ ہمارا اصل مقصد ہندوستانی قوم کی عام سطح کو بلند کرنا ہے۔ نفسی حیثیت سے، روحانی حیثیت سے اور اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی حیثیت سے بھی ہمیں جس چیز کی فکر تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں میں یہ اندرونی قوت پیدا کردیں پھر دوسری چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ ہمیں مغرور بدیسی حکومت کی اس شرمناک محکومی اور بزدلانہ اطاعت کا داغ مٹانا تھا جو ہم کئی پشتوں سے کر رہے تھے۔

۴۔ ہندوستان کی تلاش

اگرچہ کتابوں اور قدیم یادگاروں اور اسلاف کے کارناموں کے مطالعے سے میں ہندوستان سے کسی قدر واقف ہو گیا لیکن میرا اطمینان نہیں ہوا اور جو سوال میرے دل میں کھٹک رہا تھا اس کا جواب نہیں ملا اور مل بھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ ان میں تو صرف ماضی کا ذکر تھا اور میں جاننا چاہتا تھا کہ ماضی اور حال میں کوئی حقیقی تعلق ہے یا نہیں۔ حال میری اور مجھ جیسے دوسرے لوگوں کی نظر میں، شدید افلاس اور مصیبت، عوام کی عہد وسطیٰ کی زندگی اور متوسط طبقے کی سطحی جدیدیت کا ایک معجون مرکب ہے۔ میں اپنے طبقے کے لوگوں کا قائل نہیں تھا مگر چار و ناچار انھیں سے یہ توقع رکھتا تھا کہ ہندوستان کی فلاح و نجات کی تحریک میں قیادت کا فرض انجام دیں گے۔ متوسط طبقہ

محکومی اور پابندی کے تنگ دائرے میں گھٹ رہا تھا اور آزادی سے نشو و نما حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ برطانوی حکومت کے ماتحت اس کا موقع نہیں مل سکتا تھا اس لئے اس حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ مگر یہ جذبہ اس نظام کے خلاف نہ تھا جو ہمیں کچل رہا تھا۔ ہمارا متوسط طبقہ چاہتا تھا کہ اس نظام کو قائم رکھے مگر انگریزوں کو ہٹا کر حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ وہ اسی نظام کے سانچے میں ڈھلا تھا اس لئے اس سے یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ اس کی تردید کرے اور اس کو مٹانے کے درپے ہو۔

نئی قوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہمیں کھینچ کر دیہات میں عوام کے پاس لے گئیں۔ نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کو ہندوستان میں ایک اور ہی دنیا نظر آئی جسے وہ قریب قریب بھول گئے تھے یا کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہندوستانی زندگی کی اس تصویر کو دیکھ کر ہم گھبرا گئے نہ صرف اس لئے کہ یہ زندگی رنج و مصیبت اور پیچیدہ مسائل سے بھری ہوئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے ذہنی تصورات اور اخلاقی قدروں کو تہ و بالا کردیا۔ گویا اس طرح ہمارا ہندوستان کا مطالعہ شروع ہوا جس نے ہمارے اندر بصیرت بھی پیدا کی مگر اسی کے ساتھ ہمیں ایک کش مکش میں مبتلا کردیا۔ ہم لوگوں پر اس کے جو اثرات پڑے وہ ہر ایک کے سابق ماحول اور تجربے کے لحاظ سے مختلف تھے۔ بعض لوگ پہلے سے گاؤں والوں سے واقف تھے اور ان کے دل میں انھیں دیکھ کر کوئی نیا احساس نہیں پیدا ہوا۔ ان کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی مگر میرے لئے حقیقت میں یہ ایک نئی دریافت تھی اس لئے کہ عام طور پر مجھے ہر وقت اپنے ہم وطنوں کی کمزوریوں کا تکلیف دہ احساس رہتا تھا لیکن ہندوستان کے دیہاتیوں میں ایک ایسی دلکش خوبی نظر آئی

جسے الفاظ میں سمجھانا مشکل ہے۔ یہ چیز متوسط طبقے میں، میں نے کہیں نہیں پائی تھی۔

میں عوام کی مثالی تصویر نہیں کھینچتا اور جہاں تک ممکن ہے ان کا خیال محض ایک مجرد تصور کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ ہندوستان کے لوگ میری نظر میں حقیقت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ ان کا تصور ایک بے رنگ جماعت کی حیثیت سے نہیں بلکہ افراد کی حیثیت سے کروں۔ شاید اس وجہ سے کہ میں ان سے کچھ زیادہ توقع نہیں رکھتا تھا، مجھے ان کو دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے انھیں توقع سے بہتر پایا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ان میں جو ایک قسم کی قوت اور توازن پایا جاتا ہے شاید ہندوستان کی ان قدیم تہذیبی روایات کی وجہ سے ہے جو ایک حد تک ان میں اب بھی موجود ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں زمانے نے انھیں اس طرح پیسا ہے کہ وہ بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ پھر بھی بہت سی برائیوں اور کمزوریوں کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ قابل قدر چیزیں بھی موجود ہیں۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان میری جدوجہد زیادہ تر اپنے صوبے تک محدود رہی۔ میں صوبہ متحدہ کے اڑتالیس ضلعوں میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتا رہا۔ یہ علاقہ ہمیشہ سے ہندوستان کا دل سمجھا جاتا ہے۔ یہی عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی تہذیب کا مرکز تھا جہاں بہت سی قومیں بنیں اور بگڑیں، جہاں ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان شورش اٹھی اور بے رحمی کے ساتھ دبا دی گئی۔ میں نے ہر جماعت اور نسل کے لوگوں سے واقفیت حاصل کی۔ شمالی اور مغربی اضلاع کے مضبوط جاٹوں سے جو نمونے کے کاشتکار اور مقابلتاً خوش حال ہیں؛

جن کی صورت سے بہادری اور آزادی ٹپکتی ہے، راجپوت کسانوں اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں سے جواب تک اپنے نسل اور خاندان پر ناز کرتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض مسلمان ہو گئے ہیں، ہوشیار اور ماہر کاریگروں سے جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، اور بے شمار غریب کسانوں سے، خصوصاً اودھ اور مشرقی اضلاع کے کاشتکاروں سے جنھیں پشتوں کے ظلم اور افلاس نے اس طرح پیس ڈالا ہے کہ وہ مشکل سے اپنی حالت کے بہتر ہونے کی توقع کر سکتے ہیں مگر پھر بھی ان کے دل امید اور عقیدے سے معمور ہیں۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان جب کبھی میں جیل سے باہر رہا خصوصاً ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخابات کی مہم کے دوران میں، میں نے سارے ہندوستان کے شہر اور گاؤں چھان ڈالے۔ سوائے بنگال کے دیہاتی علاقے کے جہاں بدقسمتی سے مجھے بہت کم جانے کا اتفاق ہوا، میں نے ہر صوبے کا دورہ کیا اور ایک ایک گاؤں میں پہنچا۔ میں سیاسی اور معاشی مسائل کا ذکر کرتا تھا اور میری تقریر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سیاسیات اور انتخابات میرے دماغ پر چھائے ہوئے ہیں لیکن اس تمام عرصے میں میرے قلب کے ایک گوشے میں اس سے کہیں زیادہ گہرے خیالات چھپے ہوئے تھے جنھیں انتخابات اور روزمرہ کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میرے دل میں کچھ اور ہی جوش تھا۔ میں پھر تحقیق و تجسس کے سفر پر نکلا تھا، ہندوستان کے لوگ اور ہندوستان کی سرزمین میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان اپنی تمام دلکشی اور تنوع کے ساتھ روز بروز میرے ذہن پر مسلط ہوتا گیا لیکن جتنا زیادہ میں نے اس کا مطالعہ کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے لئے یا کسی اور شخص کے لئے ان تصورات کو سمجھنا بہت مشکل ہے جو اس کی زندگی میں مجسم نظر آتے ہیں۔ مجھے جس چیز نے حیران

گویا وہ ہندوستان کی وسعت یا اس کا تنوع نہ تھا بلکہ اس کی روح کی گہرائی جس کی تہ تک میں نہیں پہنچ سکا اگرچہ کبھی کبھی اس کی ایک ذراسی جھلک نظر آجاتی جس سے میرا اشتیاق اور بڑھ جاتا۔ وہ ایک قدیم وصلی کی طرح ہے جس پر مختلف افکار و تخیلات کی تہ پر تہ لکھی گئی ہے لیکن کوئی بعد کی تحریر پہلے کی تحریروں کو پوری طرح مٹا نہیں سکی۔ یہ سب چیزیں ہمارے شعوری یا تحت شعوری نفس میں ساتھ ساتھ موجود ہیں اور انھیں سے ہندوستان کی پیچیدہ اور پُراسرار شخصیت بنی ہے۔ وہ ساکت و صامت چہرہ ایک پُراسرار اور کبھی کبھی ایک طنز آمیز تبسم کے ساتھ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک نظر آتا ہے۔ اگرچہ بظاہر ہماری قوم میں بے حد اختلاف اور تنوع ہے لیکن ہر جگہ وحدت کا ایک گہرا نقش موجود ہے جس نے سیکڑوں ہزاروں سال تک ہمیں ایک رشتے میں مربوط رکھا خواہ ہماری سیاسی حالت کیسی ہی ابتر کیوں نہ ہو۔ ہندوستان کی وحدت اب میرے لئے محض ایک ذہنی تصور نہ تھا بلکہ ایک قلبی واردات جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بنیادی وحدت اس قدر قوی تھی کہ کوئی سیاسی تقسیم، کوئی آفت اور مصیبت اس میں خلل نہ ڈال سکی۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان کا یا کسی ملک کا تصور ایک انسانی وجود کی حیثیت سے کرنا بالکل مہمل ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں کیا اور مجھے ہندوستانی زندگی کی تقسیم اور اختلاف، طبقے، ذات، مذہب، نسل اور تہذیبی مدارج کے فرق کا پورا پورا احساس ہے۔ پھر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو ملک زمانۂ دراز سے ایک مشترک تہذیبی پس منظر اور مشترک تصور زندگی رکھتا ہے اس میں ایک مخصوص روح پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے کل باشندوں پر اپنا نقش

بٹھا دیتی ہے چاہے ان میں باہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ اس کا نمونہ ہر شخص کو چین میں نظر آتا ہے چاہے وہ ایک قدیم وضع کے ماندرین کو دیکھے یا ایک کمیونسٹ کو جو ماضی سے اپنا رشتہ توڑ چکا ہے۔ اسی روح ہندوستان کی مجھے تلاش تھی محض تجسس کی خاطر نہیں، اگرچہ تجسس کا جذبہ بھی موجود تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس کا عرفان مجھے اپنے ملک اور قوم کے سمجھنے میں مدد دے گا اور میرے فکر و عمل کی رہنمائی کرے گا۔ سیاسیات اور انتخابات روزمرہ کی چیزیں ہیں جن میں ہم ذرا ذرا سی چیزوں پر جوش میں آجاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ہندوستان کے مستقبل کی ایک مضبوط، پائدار اور خوش نما عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی بنیادیں تلاش کرنے کے لئے بڑی گہرائی تک کھودنا پڑے گا۔

۵۔ بھارت ماتا

جب میں جلسوں میں تقریریں کرتا پھرتا تھا تو اکثر سننے والوں کے سامنے ہندوستان یا بھارت کا ذکر کرتا تھا (یہ ہمارے ملک کا قدیم سنسکرت نام ہے جو ہمارے افسانوی مورث اعلیٰ کے نام پر رکھا گیا ہے)۔ مگر شہروں میں میں اس قسم کا ذکر بہت کم کرتا تھا اس لئے کہ وہاں سننے والے اتنے بھولے بھالے نہ تھے اور ان کے لئے ایسی باتوں کی ضرورت تھی جن میں زیادہ وزن ہو لیکن کسانوں سے جن کا زاویۂ نظر محدود تھا میں اس عظیم الشان ملک کی باتیں کیا کرتا تھا جس کی آزادی کے لئے ہم جد و جہد کر رہے

تھے۔ انھیں بتایا کرتا تھا کہ گو ملک کا ہر حصہ دوسرے حصے سے الگ ہے مگر یہ سارے کا سارا ہندوستان ہے، کسانوں کے مسائل شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ایک سے ہیں اور سوراج ملے گا تو صرف ملک کے بعض حصوں کو نہیں بلکہ سبھی کو ملے گا۔ میں ان سے اپنے ان سفروں کا حال بیان کیا کرتا تھا جو میں نے شمال مغرب میں درۂ خیبر سے لے کر دور جنوب میں راس کماری تک کئے ہیں، اور یہ بتاتا تھا کہ ہر جگہ کسان مجھ سے ایک سے سوال کرتے تھے، اس لئے کہ ان کی دقتیں اور تکلیفیں ایک ہی سی ہیں — یعنی افلاس، قرض، زمیندار، مہاجن، بھاری لگان اور محصول اور پولیس کی زیادتیاں۔ اور یہ سب چیزیں اسی نظام کا جز ہیں جو بدیسی حکومت نے ہم پر عائد کر رکھا ہے۔ چونکہ سب کا مرض ایک ہے اس لئے علاج بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ میں یہ کوشش کرتا تھا کہ ان کے ذہن میں ہندوستان کا، اور ایک حد تک اس وسیع دنیا کا جس میں ہم رہتے ہیں، ایک مجموعی تصور پیدا کروں۔ بیچ بیچ میں میں چین، اسپین، حبش، وسطی یورپ، مصر اور مغربی ایشیا کے ملکوں کی جد و جہد کا ذکر کر دیتا تھا۔ میں انھیں سوویٹ یونین کی حیرت انگیز تبدیلیوں کا اور امریکہ کی زبردست ترقی کا ذکر سناتا تھا۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا مگر اتنا مشکل بھی نہ تھا جتنا میں نے ابتدا میں سمجھا تھا۔ اس لئے کہ ہماری قدیم رزمیہ داستانوں اور قصے کہانیوں نے، جن سے وہ اچھی طرح واقف تھے، انھیں اپنے ملک کے تصور سے آشنا کر دیا تھا اور ہر جگہ بعض ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو دور دور کا سفر کر کے

ان مقدس مقامات کی زیارتوں کو گئے تھے جو ہندوستان کے چاروں کونوں میں واقع ہیں۔ یا پھر پنشن یافتہ سپاہی ہوتے تھے جو پہلی جنگ عظیم یا دوسری لڑائیوں کے سلسلے میں بیرونی ملکوں کی سیر کر چکے تھے۔ میں جو اشارے بیرونی ملکوں کی طرف کرتا تھا انھیں بھی وہ ۱۹۳۰ء کے بعد کی کساد بازاری کے نتائج کی بدولت سمجھ جاتے تھے۔

بعض اوقات جب میں کسی جلسے میں پہنچتا تو میرا استقبال اس نعرے سے کیا جاتا "بھارت ماتا کی جے۔" میں اچانک ان سے پوچھ بیٹھتا کہ اس نعرے کے کیا معنی ہیں؟ یہ بھارت ماتا کون ہے جس کی فتح وہ چاہتے ہیں۔ میرے سوال پر انھیں ہنسی بھی آتی اور تعجب بھی ہوتا۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا اور وہ ایک دوسرے کی طرف اور میری طرف دیکھ کر رہ جاتے میں اپنے سوال پر اصرار کرتا۔ آخر کوئی مضبوط جاٹ جو پراچین وقتوں سے زمین سے وابستہ ہے جواب دیتا کہ اس کا مطلب دھرتی سے ہے۔ میں پوچھتا کہ کون سی دھرتی؟ ان کے گاؤں کی یا سارے ضلعے اور صوبے کی یا کل ہندوستان کی؟ سوال جواب کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ اکتا جاتے اور مجھ سے کہتے کہ آپ ہی ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیجیے۔ میں انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ہندوستان وہ سب کچھ ہے جو وہ سمجھتے ہیں مگر اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ ہندوستان کے پہاڑ اور دریا، جنگل اور کھیت جو ہمارے لئے غذا مہیا کرتے ہیں، یہ سب ہمیں عزیز ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر ہندوستان کے لوگ ہیں، ہمارے جیسے انسان جو اس وسیع ملک میں پھیلے ہوئے ہیں بھارت ماتا سے مراد دراصل یہ کروڑوں انسان ہیں اور اس کی جے حقیقت میں ان لوگوں کی جے ہے۔ میں ان سے کہتا کہ تم اس بھارت ماتا کے جزو ہو بلکہ تم خود ہی

بھارت ماتا ہو۔ اور جب یہ خیال آہستہ آہستہ ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں گویا انھوں نے ایک بہت بڑی حقیقت دریافت کرلی۔

۶۔ ہندوستان کی کثرت اور وحدت

ہندوستان میں اختلافات بہت زیادہ ہیں۔ یہ بالکل ظاہر ہیں اور ہر شخص کو نظر آتے ہیں۔ ان کا تعلق نہ صرف صورت شکل اور وضع قطع سے ہے بلکہ بعض ذہنی عادتوں اور خصلتوں سے بھی۔ بادی النظر میں شمال مغرب کے پٹھان اور جنوب کے تامل میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان کی نسلیں الگ الگ ہیں اگرچہ ممکن ہے کہ کہیں کہیں ان میں اشتراک بھی ہو۔ ان کی صورتیں، قد و قامت، غذا، لباس اور زبان بالکل مختلف ہیں۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں وسط ایشیا کے اثرات نظر آتے ہیں اور کشمیر کی طرح یہاں بھی بہت سی رسمیں ان ملکوں کی یاد دلاتی ہیں جو ہمالیہ کی دوسری طرف واقع ہیں۔ پٹھانوں کے عام ناچ روسی کاسکوں کے ناچ سے بہت زیادہ مشابہ ہیں لیکن ان سب اختلافات کے باوجود پٹھان اور تامل دونوں پر ہندوستان کا نقش صاف نظر آتا ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ یہ سرحدی علاقہ بلکہ خود افغانستان ہزاروں سال تک ہندوستان سے ملحق رہا ہے۔ قدیم ترکی نسل اور دوسری نسلیں جو افغانستان اور وسط ایشیا کے بعض حصوں میں آباد تھیں اسلام سے قبل بودھ تھیں اور اس سے بھی پہلے رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں ہندو تھیں۔ سرحد کا علاقہ قدیم ہندوستانی تہذیب کے بڑے مرکزوں میں سے تھا اور وہاں اب تک کثرت سے پرانی عمارتوں اور خانقاہوں کے کھنڈر موجود ہیں خصوصاً ٹیکسلا کی عظیم الشان یونیورسٹی کے آثار جس کی شہرت اب سے دو ہزار سال پہلے پورے عروج پر تھی اور

جہاں نہ صرف ہندوستان کے ہر حصے سے بلکہ ایشیا کے مختلف علاقوں سے طالب علم کھچے چلے آتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تبدیل مذہب سے کچھ فرق ضرور ہوا ہے لیکن اتنا نہیں کہ وہ ذہنی کیفیت جس نے یہاں کے باشندوں میں نشو و نما پائی تھی بالکل بدل گئی ہو۔

پٹھان اور تامل باہمی فرق کی انتہائی مثالیں ہیں اور لوگ ان کے بین بین ہیں۔ یہ سب لوگ اپنی امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں مگر سب میں ہندوستان کا امتیازی نشان موجود ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوتی ہے کہ بنگالی، مرہٹے، گجراتی، تامل، اندھرے، اڑیا، آسامی، کنڑی، ملیالی، سندھی، پنجابی، پٹھان، کشمیری اور اس وسیع مرکزی علاقے کے لوگ جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے، سیکڑوں ہزاروں سال سے اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتے ہیں، اور ان میں کم و بیش وہی خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں جو روایات اور تاریخ کے مطابق ان کے بزرگوں میں تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان سب نے اس سارے عرصے میں ہندوستانیت کی امتیازی شان کو قائم رکھا ہے اور ان سب میں ہندوستان کی قومی میراث اور اس کی اخلاقی اور ذہنی صفات مشترک ہیں۔ اس میراث میں کوئی ایسی جان دار اور جاں بخش چیز تھی جس نے اپنے آپ کو ایک خاص طرز معاشرت، زندگی اور مسائل زندگی کے ایک خاص فلسفیانہ تصور میں ظاہر کیا۔ قدیم ہندوستان، قدیم چین کی طرح اپنی ایک الگ دنیا اور جداگانہ تہذیب و تمدن رکھتا تھا۔ اکثر بیرونی اثرات آکر اس تہذیب کو متاثر کرتے تھے اور پھر اس کے اندر جذب ہو جاتے تھے۔ جہاں اس میں تحلیل وانتشار کے رجحانات ظاہر ہوئے فوراً ترکیب و اتحاد کی کوشش شروع ہو جاتی تھی۔ وحدت کا خواب ہندوستان بدو تہذیب سے دیکھ رہا ہے۔ مگر وحدت کا تصور یہ نہیں تھا کہ کوئی خارجی

قوت بزور بروستی سب کو ایک رنگ میں رنگ دے، رسوم و عقائد کے ایک مقررہ سانچے میں ڈھال دے۔ ہندوستان کی وحدت اس سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ اس کے دائرے کے اندر رسوم و عقائد کے معاملے میں انتہائی رواداری برتی جاتی تھی اور اختلاف نہ صرف جائز بلکہ اچھا سمجھا جاتا تھا۔

اختلاف تو کچھ نہ کچھ ایک ہی قوم کے لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں مگر اس کی بنیادی وحدت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اس کا مقابلہ کسی دوسری قوم سے کیا جائے بلکہ دو ہمسایہ قوموں کے باہمی اختلافات بھی سرحد کے قریب کم ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ آج کل واقعات کا رخ سب کہیں ہم رنگی اور ہم آہنگی کی طرف ہے۔ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں قومیت کا موجودہ تصور نہیں تھا اور جاگیرداری، مذہبی، نسلی اور تہذیبی رشتے زیادہ اہم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تقریباً ہر تاریخی دور میں ایک ہندوستانی کو ہندوستان کے ہر حصے میں یگانگی کا، اور اس کے سوا ہر ملک میں اجنبیت اور غیریت کا احساس ہوتا، البتہ ان ملکوں میں جنھوں نے ایک حد تک اس کے مذہب اور تہذیب کو اختیار کر لیا وہ اتنی اجنبیت محسوس نہ کرتا جو ان مذاہب کے پیرو جن کی ابتدا ہندوستان کے باہر ہوئی تھی، مثلاً عیسائی، یہودی، پارسی اور مسلمان جب یہاں آ بسے، دو ہی چار پشت کے بعد ہندوستان کے مخصوص رنگ میں رنگ گئے اور وہ ہندوستانی جنھوں نے ان میں سے کوئی مذہب اختیار کیا تبدیل عقائد کے باوجود ہندوستانی ہی رہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ چاہے ان کے ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں انھیں ہندوستانی اور غیر ملکی ہی سمجھتے رہے۔

آج جبکہ قومیت کا تصور زیادہ ترقی کر چکا ہے، دوسرے ملکوں میں رہنے والے ہندوستانی اپنے اندرونی اختلافات کے باوجود، لازمی طور پر ایک جداگانہ قومی جماعت بنا لیتے ہیں اور بہت سے کام مل جل کر کرتے ہیں۔ ہندوستانی عیسائی کہیں بھی جائے ہندوستانی ہی کہلاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان ترکی، عرب، ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ہندوستانی ہی سمجھا جاتا ہے۔

شاید ہم سب کے ذہن میں اپنے ملک کی الگ الگ تصویریں ہیں اور ان میں سے کوئی دو بھی ایک سی نہیں۔ جب میں ہندوستان کا تصور کرتا ہوں تو میرے پیش نظر بہت سی چیزیں ہوتی ہیں:۔ وسیع میدان جن میں بے شمار چھوٹے چھوٹے گاؤں بکھرے ہوئے ہیں، وہ قصبے اور شہر جہاں میں جا چکا ہوں، برسات کا جادو جس سے سوکھی زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں، بڑے بڑے دریا اور بہتا ہوا پانی۔ درہ خیبر کا سپاٹ اور بے رنگ علاقہ، ہندوستان کا جنوبی سرا، سارے ہندوستان کے باشندے، اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے، مگر ان سب سے نمایاں تصویر برف پوش ہمالیہ کی اور کشمیر کی پہاڑی وادیوں کی ہے جو بہار میں نورستہ پھولوں سے ڈھکی ہوتی ہیں اور اُبلتے ہوئے چشموں کے شور سے گونجتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی پسند کی تصویریں بناتا ہے اور انھیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کے سامنے ایک گرم میدانی علاقے کا نقشہ ہوتا ہے مگر میں نے اپنے لیے یہ کوہستانی منظر منتخب کیا ہے۔ دونوں نقشے اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اس لیے کہ ہندوستان منطقہ حارہ سے منطقہ معتدلہ تک، خط استوا سے وسط

ایشیا کے سرد خطے تک پھیلا ہوا ہے۔

۷۔ ہندوستان کا دورہ

۱۹۳۶ء کے آخر اور ۱۹۳۷ء کے شروع میں میرے دورے کی رفتار برابر تیز ہوتی گئی اور آخر میں تو یہ نوبت پہنچ گئی جیسے کوئی بدحواس ہو کر دوڑتا ہو۔ میں آندھی کی طرح دن رات چلتا رہا نہ کہیں ٹھہرتا نہ آرام کرتا۔ ملک کے ہر حصے سے طلبی پر طلبی آ رہی تھی اور وقت محدود تھا۔ اس لئے کہ عام انتخابات قریب تھے اور میرے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ میں دوسروں کو الکشن جتانے میں کمال رکھتا ہوں۔ میں زیادہ تر موٹر سے اور کمتر ہوائی جہاز اور ریل سے سفر کرتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ دور تک مجھے ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، دخانی کشتی، اور بائسکل پر جانا پڑا اور کہیں کہیں پیدل بھی چلنا پڑا۔ سفر کے یہ مختلف اور انوکھے طریقے ان مقامات پر استعمال کرنے پڑتے تھے جو اندرون ملک میں واقع تھے اور شاہراہ عام سے بہت دور تھے۔ میں اپنے ساتھ دو دو میکروفون اور لاؤڈ اسپیکر رکھتا تھا کیونکہ ان کے بغیر بڑے بڑے مجمعوں میں کام نہ چلتا اور چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ جاتا۔ یہ میکروفون میرے ساتھ تبت کی سرحد سے لے کر بلوچستان کی سرحد تک، ایسے ایسے اجنبی مقامات پر گئے جہاں پہلے کسی نے انکو دیکھنا تو کیا، ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔

صبح تڑکے سے لے کر رات گئے تک مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا جہاں بڑے بڑے مجمعے میرے منتظر ہوتے تھے اور بیچ بیچ میں ان مقامات پر رکنا پڑتا تھا جہاں گاؤں کے لوگ بڑے صبر سے مجھے سلام کرنے کو کھڑے رہتے تھے۔ یہ ہنگامی جلسے میرے مصروف پروگرام کو گڑبڑ کر دیتے تھے

اور ان سے بعد کے مقررہ کاموں میں دیر ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ان بے چارے غریبوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتا چلا جاؤں۔ غرض دیر پر دیر ہوتی چلی جاتی تھی اور ان جلسوں میں جو کھلے میدان میں ہوتے تھے پلیٹ فارم تک پہنچنے میں اور پھر واپس آنے میں کئی کئی منٹ لگ جاتے تھے جن میں سے ہر منٹ قیمتی تھا۔ اسی طرح ایک ایک منٹ کر کے گھنٹے لگ جاتے تھے اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شام تک میں کئی گھنٹے لیٹ ہو جاتا تھا لیکن مجمع صبح سے انتظار کرتا رہتا تھا اگرچہ جاڑے کا زمانہ تھا اور یہ لوگ ناکافی کپڑے پہنے کھلے میدان میں بیٹھے سکڑتے رہتے تھے۔ میرا پروگرام اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے لمبا ہو جاتا تھا اور ہم لوگ کہیں آدھی رات کے بعد اپنی منزل پر پہنچتے تھے۔ ایک بار کرناٹک میں وسط فروری میں ہم نے کمال ہی کر دیا۔ اس دن کا پروگرام بہت بڑا تھا اور ہمیں ایک خوشنما پہاڑی جنگل میں سے ہو کر پیچ دار اور خراب رستے سے گزرنا تھا جہاں آہستہ آہستہ چلنا پڑتا تھا۔ ہمیں چھ بڑے جلسوں میں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جلسوں میں شریک ہونا تھا۔ پہلا جلسہ آٹھ بجے صبح کو شروع ہوا اور آخری جلسہ پچھلے پہر چار بجے ختم ہوا (حالانکہ یہ سات گھنٹے پہلے ہونا چاہیے تھا)۔ اس کے بعد ہمیں ستر میل کا فاصلہ طے کر کے اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ ہم دن رات میں چار سو پندرہ میل کا سفر کر کے اور بیشمار جلسوں میں شریک ہو کر سات بجے صبح وہاں پہنچے۔ میں برابر ۲۳ گھنٹے مصروف رہا اور ایک گھنٹے کے بعد مجھے دوسرے دن کا پروگرام شروع کرنا پڑا۔

کسی شخص نے بڑی زحمت اٹھا کر حساب لگایا کہ ان چند مہینوں میں جن

جلسوں میں میں نے تقریریں کیں ان میں کوئی ایک کروڑ آدمی شریک ہوئے اور
ان کے علاوہ لاکھوں آدمی مجھ سے سر راہ سڑکوں پر ملے۔ بڑے بڑے جلسوں
میں تقریباً ایک لاکھ آدمی ہوتے تھے اور بیس بیس ہزار کا مجمع تو عام طور پر
ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کسی چھوٹے سے قصبے سے گذرتے ہوئے مجھے یہ
دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ تقریباً سنسان پڑا ہے اور دوکانوں میں تالے لگے
ہیں۔ اس کی وجہ اس وقت معلوم ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ بستی کی
ساری آبادی، مرد عورتیں اور بچے گاؤں کی دوسری طرف جلسے کے میدان
میں جمع ہیں اور صبر کے ساتھ میرے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں اس طرح کام چلاتا رہا اور
میری صحت نے جواب نہیں دیا۔ حقیقت میں یہ جفاکشی اور برداشت کا
عجیب و غریب کارنامہ تھا۔ غالباً رفتہ رفتہ میرا جسم اس بھاگ دوڑ کا عادی
ہو گیا تھا۔ اکثر دو جلسوں کے درمیان موٹر میں چلتے ہوئے میں سو جاتا تھا
اور اٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن مجبوراً جاگنا پڑتا تھا کیونکہ ایک بہت بڑے
مجمعے کے نعروں کی آواز مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیتی تھی۔ میں نے کھانا بہت کم کر دیا
تھا اور کبھی کبھی خصوصاً شام کو بالکل غائب کر دیتا تھا۔ اس کا اثر میری صحت
پر اچھا پڑتا تھا لیکن حقیقت میں جس چیز نے میری صحت کو قائم رکھا اور میرے
اندر قوت کا ایک خزانہ بھر دیا وہ لوگوں کا جوش اور ان کی محبت تھی جو مجھے
ہر طرف گھیرے ہوئے تھی اور ہر جگہ میرا استقبال کرتی تھی۔ میں ایک حد
تک اس کا عادی ہو گیا تھا لیکن بالکل عادی کبھی نہ ہو سکا اور روز مجھے

اس کا ایک نیا تجربہ ہوتا تھا۔

۸۔ انتخابات

میرا دورہ خاص طور پر ان انتخابات سے تعلق رکھتا تھا جو سارے ہندوستان میں شروع ہونے والے تھے۔ مگر مجھے وہ ترکیبیں اور چالیں پسند نہ تھیں جو عام طور پر الکشن میں چلی جاتی ہیں۔ انتخابات جمہوری طریقے کا لازمی جزو ہیں اور ان کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ لیکن اکثر یہ انسانی فطرت کے بُرے پہلو کو نمایاں کر دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ان میں ہمیشہ وہی شخص کامیاب ہو جو دوسروں سے بہتر ہے۔ حساس طبیعت والے اور وہ لوگ جو اپنی کامیابی کے لئے کھوٹے اور بھدّے طریقے استعمال کرنے پر تیار نہیں نقصان میں رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ان مقابلوں سے دوری رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت ان لوگوں کی جاگیر ہے جن کا احساس کند اور آواز بلند ہے اور ان کے ضمیر میں کافی لچک ہے۔

خصوصاً جہاں ووٹ کا حق تھوڑے سے آدمیوں تک محدود ہو وہاں انتخابات کی یہ خرابیاں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں، بڑی تعداد کے حلقوں میں یہ قباحتیں نہیں ہوتیں یا اُسے کم اتنی نمایاں نہیں ہونے پاتیں۔ یوں تو بڑے سے بڑے بھی غلط بحثوں کے چھڑ جانے سے، یا مذہب کا نام آجانے سے (جیسا کہ ہم نے آگے چل کر دیکھا) جوش میں اندھے ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی بعض چیزیں ایک حد تک توازن پیدا کر دیتی ہیں اور موٹی موٹی خرابیوں کی روک تھام کرتی ہیں۔ مجھے اس معاملے میں جو تجربہ ہوا اس سے میرا یہ خیال اور پختہ ہو گیا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ووٹ کا حق ملنا چاہیئے۔ میں

اس بڑے حلقے پر ان چھوٹے حلقوں سے زیادہ بھروسا کر سکتا تھا جن میں ووٹ کا حق ملکیت کی یا تعلیمی قابلیت کی بنا پر دیا جاتا ہے۔ ملکیت کی شرط تو بہر حال نامعقول ہے۔ اب رہی تعلیم کی شرط، تو بظاہر یہ مناسب اور ضروری ہے لیکن میں نے حرف شناس یا معمولی پڑھے لکھے لوگوں میں کوئی ایسی خاص بات نہیں دیکھی کہ ان کی رائے ان جفاکش کسانوں کی رائے سے زیادہ قابل وقعت سمجھی جائے جو ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے محدود دائرے میں خاصے سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس ملک میں اصل مسئلہ کسانوں کا ہے وہاں ان کی رائے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ میں دل سے اس اصول کا قائل ہوں کہ ہر بالغ مرد اور عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے اور اگرچہ میں اس کی مشکلات کو سمجھتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس اصول کو ہندوستان میں رائج کرنے پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں کچھ زیادہ وزن نہیں اور وہ صرف مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کے اندیشوں پر مبنی ہیں۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں صوبوں کی اسمبلیوں کے انتخابات ایک محدود حقِ رائے دہندگی پر مبنی تھے جو کل آبادی میں سے صرف ۱۲ فی صدی کو پہنچتا تھا۔ پھر بھی یہ پچھلے اصول رائے دہندگی سے بہت غنیمت تھا اور اب، ریاستوں کو چھوڑ کر، کل ہندوستان میں تین کروڑ آدمیوں کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ ان انتخابات کا دائرہ سارے برطانوی ہند میں پھیلا ہوا تھا۔ ہر صوبے کو اپنی اسمبلی منتخب کرنی تھی اور اکثر صوبوں میں دو ایوان تھے اس لیے دو الکشن ہو رہے تھے۔ امیدواروں کی مجموعی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔

میرا اور ایک حد تک اکثر کانگریس والوں کا، رویہ ان انتخابات میں

کچھ غیر معمولی سا تھا۔ مجھے انفرادی امیدواروں کی فکر نہیں تھی بلکہ یہ چاہتا تھا کہ سارے ملک میں قومی تحریک آزادی، اور کانگریس کے انتخابی منشور کے موافق فضا پیدا ہو جائے۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو ہمارا مقصد حاصل ہو گیا ورنہ اکّا دکّا امیدواروں کے ہارنے جیتنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

میری تقریروں میں اصولی بحث ہوتی تھی۔ امیدواروں کا ذکر میں صرف اس حیثیت سے کرتا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے علم بردار ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو میں جانتا تھا مگر بہت سے ایسے بھی تھے جن سے مجھے مطلق ذاتی واقفیت نہ تھی اور مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ اپنے دماغ پر سیکڑوں ناموں کو یاد رکھنے کا بوجھ ڈالوں۔ میں کانگریس کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے اور جنگ آزادی کے لئے ووٹ مانگتا تھا۔ میں کوئی وعدہ نہیں کرتا تھا بجز اس کے کہ جب تک آزادی نہ ملے، ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ میں لوگوں سے کہتا تھا کہ ہمیں صرف اُسی صورت میں ووٹ دو جب تم ہمارے مقصد اور پروگرام کو سمجھ لو اور قبول کرلو، ورنہ مت دو۔ میں اس پر زور دیتا تھا کہ اگر تم کانگریس کے مقصد یا پروگرام سے اختلاف رکھتے ہو تو ہرگز اس کے حق میں رائے نہ دو، ہمیں جھوٹے ووٹوں کی ضرورت نہیں۔ ہم ایسے ووٹ نہیں چاہتے جو کسی خاص شخص کو پسند کرنے کی وجہ سے دیئے جائیں۔ ووٹ اور انتخابات سے ہمارا کچھ زیادہ کام نہیں چلے گا۔ یہ تو ایک دور دراز سفر کا چھوٹا سا مرحلہ ہے۔ ہمیں محض ووٹوں سے بہلانا، جب تک ان کی حقیقی اہمیت نہ سمجھ لی جائے اور آگے چل کر عمل کرنے کا ارادہ نہ ہو ہمیں دھوکا

دینا اور ملک سے غداری کرنا ہے۔ افراد کی کوئی اہمیت نہیں گو ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اچھے اور سچے آدمی ہماری نمائندگی کریں۔ اصل چیز مقصد ہے اور وہ جماعت جو اس کی علم بردار ہے اور وہ ملک جس کی آزادی کا ہم نے بیڑا اٹھایا ہے۔ میں نے آزادی کی تشریح کرکے بتایا کہ اس سے ہمارے ملک کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ہم محض یہ نہیں چاہتے کہ گوروں کی جگہ کالے ہم پر حکومت کرنے لگیں بلکہ اصلی معنی میں عمومی حکومت چاہتے ہیں جو عوام کی ہو اور عوام کے لئے ہو اور ہمارے افلاس اور مصیبت کو ختم کردے۔

یہ تھا مضمون میری تقریروں کا۔ اور اس غیر شخصی انداز کے سوا اور کوئی طریقہ انتخابی مہم میں اختیار کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ کسی خاص امیدوار کی کامیابی یا ناکامی سے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اس سے کہیں بڑے مقصد کی فکر تھی۔ دراصل مخصوص امیدواروں کی کامیابی کے محدود نقطۂ نظر سے بھی یہ طریقہ صحیح تھا اس لئے کہ اس طرح ان کا انتخاب اس بلند سطح پر پہنچ جاتا تھا جہاں ایک بڑی قوم جنگ آزادی میں مصروف، اور کروڑوں افلاس کے مارے ہوئے انسان افلاس کی لعنت کو دور کرنے کی کوشش میں سرگرم نظر آتے تھے۔ یہ خیالات بہت سے ممتاز کانگریسیوں کی زبان سے نکل کر اسی طرح پھیل رہے تھے جیسے سمندر سے تازہ ہوا کا پرزور جھونکا آتا ہے اور دوسروں کے تنگ خیالات اور انتخابی ڈھکوسلے ان کے سامنے نہیں ٹھہرتے۔ میں اپنی قوم سے واقف ہوگیا اور اس سے محبت کرنے لگا۔ ان کی کروڑوں آنکھوں نے مجھے مجمع کی نفسیات کے بہت سے مسئلے سمجھا دیئے۔

میں روزمرہ انتخابات کا ذکر کرتا تھا لیکن حقیقت میں انتخابات کا خیال میرے ذہن کی گہرائی تک نہیں پہنچتا تھا بلکہ محض سطح پر تیرتا رہتا تھا اور میں صرف ان ہی لوگوں سے واسطہ نہیں رکھتا تھا جنھیں ووٹ کا حق حاصل تھا بلکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں سے تعلق پیدا کر رہا تھا اور میرا پیام اگر کچھ تھا تو وہ سب کے لئے تھا خواہ وہ ووٹر ہوں یا نہ ہوں' میرا خطاب ہر ہندوستانی مرد عورت اور بچے سے تھا۔ اس مہم کا جوش بے شمار انسانوں سے جسمانی اور قلبی سابقے کا کیف میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں اس مجمعے میں اس کے ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں اور مجمعے کے جذبات کے ساتھ بہ رہا ہوں۔ میری آنکھیں ان ہزارہا آنکھوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو ان اجنبیوں کی طرح نہیں دیکھتے تھے جن میں پہلی بار ملاقات ہوئی ہو بلکہ ہمیں ایک دوسرے میں کوئی جانی پہچانی چیز نظر آتی تھی اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا چیز تھی۔ جب میں دونوں ہاتھ جوڑ کر انھیں نمسکار کرتا تھا تو بے شمار ہاتھ مجھے سلام کرنے کے لئے اٹھتے تھے اور ان کے چہروں پر محبت اور خلوص کی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی اور مجمعے کے خیر مقدم کی آواز مجھے گرم جوشی سے اپنے آغوش میں لے لیتی تھی۔ میری آواز انھیں میرا پیام پہنچاتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ نہ معلوم وہ میرے الفاظ کو اور ان خیالات کو جو ان الفاظ کی تہ میں پوشیدہ ہیں کہاں تک سمجھتے ہیں۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ سب کچھ سمجھتے تھے یا نہیں مگر ان کی آنکھوں میں ایک گہری مفاہمت کی چمک نظر آتی تھی جو لفظوں سے کہیں زیادہ پر معنی تھی۔

۹۔ عوام کی تہذیب

اس طرح میں زمانۂ حال میں ہندوستانی قوم کا مؤثر ڈراما دیکھتا تھا اور اکثر ان رشتوں کو ڈھونڈ لیتا تھا جو ان کی زندگی کو ماضی سے وابستہ کرتے ہیں، عین اس وقت جبکہ ان کی آنکھیں مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ مجھے ایک تہذیبی اساس دکھائی دیتا تھا جس نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہ اساس ایک مجموعہ تھا عامیانہ فلسفے، روایات، تاریخ، کہانیوں اور افسانوں کا جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ سرمایہ ان لوگوں کے پاس بھی تھا جو بالکل اَن پڑھ تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کی قدیم رزمیہ داستانوں رامائن، مہابھارت اور دوسری کتابوں کے مضامین سے عام پسند ترجموں اور کہانیوں کے ذریعے سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے واقعات اور اخلاقی نتائج ان کے دلوں پر نقش تھے اور ان کا ذہن اس سرمایے سے مالا مال تھا۔ اَن پڑھ دیہاتیوں کو سیکڑوں اشلوک حفظ تھے اور ان کی گفتگو میں بار بار ان اخلاقی کہانیوں کی طرف اشارہ ہوتا تھا جو قدیم ادبی کتابوں میں درج ہیں۔ اکثر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ دیہاتیوں کا مجمع آج کل کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ادبی تلمیحات استعمال کر جاتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر میرا ذہن ان تصویروں سے معمور ہے جو تاریخ پر اور مستند واقعات پر مبنی ہیں تو ایک اَن پڑھ کسان بھی اپنے ذہن میں تصویروں کا ایک مرقع رکھتا ہے جو زیادہ تر قدیم افسانوں، روایات اور داستانوں سے اور کم تر تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ پھر بھی یہ تصویریں کچھ کم واضح نہ تھیں۔

میں اُن کے چہرے اور قد و قامت کو دیکھتا تھا اور ان کی حرکات و

سکنات کا مطالعہ کرتا تھا۔ ان میں بہت سے حساس چہرے اور تنومند راست قامت اور سڈول جسم تھے اور عورتوں میں حسن اور نزاکت، تمکین و وقار اور اکثر ایک حزن و ملال کی کیفیت نظر آتی تھی۔ عموماً یہ بہتر نمونے اونچی ذاتوں میں نظر آتے تھے جو کسی قدر خوش حال ہیں۔ بعض وقت کسی دیہاتی سڑک یا کسی گاؤں سے گذرتے ہوئے میں ایک خوبصورت مرد یا حسین عورت کو دیکھ کر چونک پڑتا تھا اور مجھے عہد قدیم کے نقاشی کے نمونے یاد آجاتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ ان سب تکلیفوں اور مصیبتوں کے باوجود جو ہندوستان نے اٹھائی ہیں انسانیت کے یہ حسین نمونے اب تک کیوں کر باقی رہے۔ اگر حالات بہتر ہوں اور ان لوگوں کو ترقی کے موقعے ملیں تو یہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

ہر جگہ افلاس اور وہ بے شمار مصیبتیں جو اس سے پیدا ہوتی ہیں نظر آتی تھیں اور ہر پیشانی پر اس کا منحوس داغ دکھائی دیتا تھا۔ زندگی کچل کر اور مسخ ہو کر ایک بدنما چیز اور طرح طرح کی برائیوں اور مایوسیوں کا سرچشمہ بن گئی تھی۔ یہ کوئی خوش گوار منظر نہ تھا لیکن جو کچھ بھی ہو ہندوستان کی بنیادی حقیقت یہی تھی۔ ہندوستان کے لوگوں میں یہ مادہ حد سے زیادہ ہے کہ زمانے کے حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور جو کچھ پیش آئے اسے چپ چاپ سہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ایک خاص نرمی اور شرافت ہے جو ہزاروں سال کی تہذیبی میراث ہے اور جسے دنیا بھر کی تکلیفیں اور مصیبتیں اب تک نہیں مٹا سکیں۔

۱۰۔ زندگی کے دو دھارے

کچھ تو اس طرح اور کچھ دوسرے طریقوں سے میں نے موجودہ اور گزشتہ ہندوستان کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے قلب کے دروازے ان تاثرات، اور فکر و احساس کی ان لہروں کے لئے کھول دئے جو آج کل کے جیتے جاگتے انسان کے نظارے اور اگلے وقتوں کے بھولے بسرے لوگوں کی یاد سے اٹھتی تھیں۔ کبھی تو میں یہ کوشش کرتا کہ انسانوں کی اس لامتناہی قطار میں شامل ہو کر ان کے پیچھے پیچھے گھسٹتا ہوا چلوں اور کبھی اس سے الگ ہو کر اسے دور سے دیکھتا جیسے کوئی شخص پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر نیچے وادی پر نظر ڈالتا ہے۔

کبھی یہ سوچتا کہ آخر اس دائمی سفر کا مقصد کیا ہے؟ یہ لامتناہی قافلہ کس منزل کی طرف جا رہا ہے؟ مجھ پر تکان اور مایوسی کا غلبہ ہو جاتا اور میں اس سے نجات پانے کے لئے ایک بے تعلقی کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔ میں اپنی ذات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اور اس کی فکر نہیں کرتا تھا کہ میرا کیا انجام ہوگا۔ ایک حد تک مجھے اس کوشش میں کامیابی ہوئی لیکن پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ میرے اندر جذبات کا ایک آتش فشاں مادہ بھرا ہوا ہے اور حقیقی بے تعلقی کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ دفعتہً میرے ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور بے تعلقی کافور ہو جاتی ہے۔

لیکن جو تھوڑی سی کامیابی ہوئی اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ عین جوش عمل کی حالت میں اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیتا ہوں اور اُسے اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے کوئی دور کی چیز ہو۔ کبھی کبھی میں اپنی روزمرہ کی مصروفیتوں کو بھول کر ایک دو گھنٹے کے لئے اپنے دل کی خلوت گاہ میں چھپ کر بیٹھ رہتا ہوں اور کچھ دیر تک ایک دوسری زندگی بسر کرتا ہوں۔ اسی طرح زندگی کے یہ دو دھارے ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں۔ یہ ایک دوسرے میں سموئے ہوئے بھی ہیں اور الگ الگ بھی ہیں۔

چوتھا باب

۱۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب

سندھ کی تہذیب کی جو پر شکوہ یادگاریں موہنجدارو اور ہڑپا کی کھدائیوں
میں برآمد ہوئی ہیں، وہ ہندوستان کے ماضی کے اوّلین نقوش ہیں۔ ان کھدائیوں
نے قدیم تاریخ کے سارے تصورات کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ لیکن، بد قسمتی سے،
کھدائی شروع ہونے کے چند ہی سال بعد یہ کام بند کر دیا گیا اور اب تقریباً تیرہ
سال سے اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ اس کام کے رُکنے کی
سب سے بڑی وجہ غالباً ۱۹۳۰ء سے پہلے کے چند سال کی سرد بازاری تھی۔
حکومت کی طرف سے عذر کیا گیا کہ خزانے میں روپیہ کم ہے، حالانکہ شہنشاہی شکوہ
وعظمت کی نمائش کے لیے روپے کی کمی کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ دوسری جنگ
عظیم کے شروع ہونے پر تو کام بالکل ہی بند کر دیا گیا یہاں تک کہ جو کچھ اب تک
کھودا جا چکا ہے اُسے محفوظ رکھنے کی طرف سے بھی غفلت برتی گئی ہے۔ اس
عرصے میں مجھے دو مرتبہ موہنجدارو جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۱ء میں
اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۶ء میں۔ دوسرے سفر میں مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بارش
اور ریگستانی ہواؤں سے بہت سی عمارتوں کو جو کھود کر نکالی گئی ہیں نقصان پہنچا
ہے۔ جو امانت پانچ ہزار برس سے بھی زیادہ مدت تک مٹی اور ریت کے دامن
میں محفوظ رہی، اب وہ کھلی پڑی تھی اور برباد ہو رہی تھی۔ گذرے ہوئے زمانے
کے ان بیش بہا خزانوں کی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ محکمۂ آثار

قدیمہ کا جو افسر اس جگہ مقرر ہے، اُس نے مجھ سے شکایت کی کہ ان عمارتوں کو ان کی موجودہ صورت میں قائم رکھنے کے لئے جس مالی مدد یا سامان کی ضرورت ہے وہ بھی اُسے نہیں ملتا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد سے اب تک کی حالت کا مجھے علم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ بربادی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور چند سال کے اندر موہنجدارو کی عمارتوں کی بہت سی خصوصیات مٹ جائیں گی۔

یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دولت جو پھر کبھی ہاتھ نہیں آنے کی، جاتی رہے گی، صرف چند تصویریں یا تحریریں اس کی یاد دلانے کو باقی رہ جائیں گی۔

موہنجدارو اور ہڑپا ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان دو دور افتادہ مقاموں کے کھنڈروں کا پتہ نہیں چل گیا۔ یہ بات تقریباً یقینی سی معلوم ہوتی ہے کہ ان دو مقاموں کے بیچ میں بہت سے شہر اور قدیم انسان کی دستکاری کے بے شمار آثار اب بھی مدفون ہیں، اور جس تہذیب کے نشان یہ دو مقامات ہیں وہ ملک کے اکثر حصوں میں، کم سے کم، شمالی ہندوستان میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کبھی ایسا زمانہ آئے کہ ہم ہندوستان کے اس ماضیٔ بعید کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا سکیں اور اس طرح دُور رس انکشافات کا دروازہ کھل جائے۔ موہنجدارو اور ہڑپا کے علاوہ اس قدیم تہذیب کے بعض نشانات کا پتہ مغرب میں کاٹھیاوار میں اور پنجاب میں انبالے کے ضلع میں ملا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ محض وادیٔ سندھ کی تہذیب نہ تھی بلکہ اس کا دائرہ گنگا اور جمنا کی وادی تک پھیلا ہوا تھا۔ ابھی تو موہنجدارو کے کتبے پوری طرح پڑھے نہیں جا سکے ہیں۔ لیکن اس وقت تک ہمیں جتنی معلومات حاصل ہوتی ہے وہ بھی

بے حد اہم ہے۔ اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ تہذیب تھی اور ترقی کی اس منزل تک پہنچنے میں اُسے ہزاروں برس لگے ہوں گے۔ اس تہذیب میں ایک بات ایسی ہے جسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ اس پر دنیاوی رنگ غالب ہے، اور مذہبی رنگ بھی ہے مگر اتنا نہیں کہ وہ اس میں ڈوب کر رہ گئی ہو۔ یہ تہذیب صاف طور پر ہندوستانی تہذیب کے بعد میں آنے والے دوروں کی تمہید ہے۔

اس سلسلے میں سرجان مارشل نے ہمیں بتایا ہے کہ "موہنجدارو اور ہڑپا کو دیکھنے کے بعد ایک بات جو بالکل واضح ہو جاتی ہے یہ ہے کہ جس تہذیب کا اب تک پتہ چلا ہے، وہ ابتدائی کسی طرح بھی نہیں۔ اس تہذیب نے مدتوں ہندوستان کی سرزمین میں پرورش پائی تھی، اور یہ ہزاروں برس کی انسانی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ فارس، عراق اور مصر کی طرح اب ہندوستان کا شمار بھی اُن اہم سرزمینوں میں ہونا چاہیئے جہاں انسانی تہذیب پیدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ پروان چڑھی۔" آگے چل کر سرجان مارشل کہتے ہیں کہ "اگر ہندوستان کے دوسرے حصے نہیں، تو کم از کم پنجاب اور سندھ کے علاقے ایک ترقی یافتہ تہذیب کی گود میں پرورش پا رہے تھے۔ اور یہ تہذیب نہ صرف مصر اور عراق کی ہم عصر تہذیب سے مشابہ ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اُس سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔"

سندھ کی وادی کے باشندوں کے تعلقات اس دور کے سمیری تہذیب کے علاقوں سے تھے۔ یہاں تک کہ بعض شہادتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عقاد (Akkad) میں ہندوستانیوں کی (غالباً تاجروں کی) کوئی بستی تھی۔" وادیٔ سندھ کے شہروں کی بنی ہوئی چیزیں فرات اور دجلہ کے کنارے بسے ہوئے شہروں کے بازاروں میں بکتی تھیں۔ اور اسی طرح یہاں

شہری علاقوں کی بعض چیزوں کے علاوہ عراق کے بنے ہوئے سنگھار دانوں اور اسطوانی مہروں کی نقل کی جاتی تھی۔ تجارت صرف پکے مال اور سامان تعیش ہی تک محدود نہ تھی بلکہ بحرِ عرب کے ساحلوں سے آئی ہوئی مچھلی موہنجو دارو والوں کی غذا کا ایک جزو تھی۔[۵]

ہندوستان کے اُس قدیم زمانے میں بھی سوت کے کپڑے بُنے جاتے تھے۔ مارشل نے وادیٔ سندھ کی تہذیب اور ہم عصر مصری اور عراقی تہذیبوں کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کپڑوں کے لئے سوت کا استعمال اس زمانے تک صرف ہندوستان ہی میں ہوتا تھا اور مغربی دنیا میں دو یا تین ہزار برس بعد پہنچا۔ اس کے علاوہ قبل تاریخی مصر اور عراق میں یا مغربی ایشیا میں کسی جگہ بھی ہمیں اس طرح کے شاندار حماموں اور وسیع اور کشادہ رہائشی مکانوں کا پتہ نہیں ملتا جیسے موہنجو دارو میں موجود تھے۔ ان ملکوں میں زیادہ دولت اور زیادہ توجہ دیوتاؤں کے پُرشکوہ مندر اور بادشاہوں کے محل اور مقبرے بنانے میں صرف ہوتی تھی باقی سب لوگ مٹی کے کچے بے حیثیت مکانوں میں رہتے تھے۔ موہنجو دارو میں نقشہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں کی اچھی سے اچھی عمارتیں عوام کے آرام اور آسائش کی خاطر بنائی گئی ہیں۔" موہنجو دارو میں ہمیں جو حمام اور غسل خانے ملتے ہیں یا پانی کی نکاسی کا جیسا اچھا انتظام ہے اس کی مثال تاریخ میں اس سے پہلے کہیں موجود نہیں۔ موہنجو دارو میں پکی اینٹوں کی دو منزلہ عمارتیں ہیں اور ان عمارتوں میں غسل خانے بھی ہیں اور چوکیدار کے رہنے کی جگہ بھی۔

Gordon Childe- What Happnened in History
P. 112 (Pelican Books).

مارشل نے جس کی رائے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے متعلق مسلمہ طور پر مستند سمجھی جاتی ہے، ایک معنی خیز بات لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "وادیٔ سندھ کی تہذیب کی ایک انفرادی خصوصیت اُس کا آرٹ اور مذہب ہے۔ دوسرے ملکوں میں، اسی دور میں ہمیں آرٹ کے جو نمونے ملتے ہیں، وہ فنی خوبیوں کے اعتبار سے کسی طرح بھی یہاں کے بھیڑوں، کتوں اور دوسرے جانوروں کے مجسموں یا مہروں کی کندہ کاری کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان سارے مجسموں میں اور خاص کر چھوٹے سینگوں اور اونچے کوہان والے بیلوں کے مجسموں میں تخیل کی جو وسعت اور کندہ کاری کے فن میں جو نزاکت نظر آتی ہے اس کی مثال کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ اور ہڑپا میں جو دو چھوٹی مورتیں ملی ہیں اُن کی سی لچک اور نزاکت کے نمونے بہت بعد کے زمانے میں صرف یونان کے کلاسیکی دور میں ملتے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں کے مذہب میں البتہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو دوسرے ملکوں کے مذاہب میں بھی پائی جاتی ہیں اور یہ بات صرف اسی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر قبل تاریخی اور تاریخی مذہب کی یہی حالت ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے سندھی تہذیب کا مذہب اپنی خصوصیات میں خالص سندھی ہے اور اسے مشکل سے موجودہ 'ہندوئیت' سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔"

مختصر یہ کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب اور ایرانی، عراقی اور مصری تہذیبوں میں آپس میں تجارتی تعلقات تھے اور بعض حیثیتوں سے یہ تہذیب اپنی ہم عصر تہذیبوں سے بہتر و برتر تھی۔ یہ ایک شہری تہذیب تھی اور یہاں تاجروں کا طبقہ مالدار ہونے کے علاوہ، بظاہر شہری زندگی میں ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ موہنجوداڑو کی سڑکوں کے دونوں طرف دوکانوں کے نشانات ہیں اور انھیں دیکھ کر موجودہ زمانے کے کسی ہندوستانی بازار کی تصویر نظر میں پھر جاتی ہے۔ پروفیسر چائلڈ نے

لکھا ہے کہ "وادیٔ سندھ کے شہروں کے کاریگر اپنی چیزیں بازاروں میں بیچنے کے لئے تیار کرتے تھے۔ لیکن یہ بات ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اشیا کے مبادلے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے کسی سکے کا رواج تھا یا نہیں اور اگر تھا تو وہ کون سا سکہ تھا۔ وسیع اور فراخ مکانوں کے ساتھ جو گودام بنے ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ان مکانوں کے رہنے والے تاجر تھے۔ پھر ان مکانوں کی تعداد اور ان کی کشادگی اور فراخی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تاجروں کا طبقہ مقتدر اور خوش حال تھا۔" "ان کھنڈروں میں سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کی مقدار کثیر کے علاوہ، کٹے ہوئے تانبے کے برتن اور دوسری دھاتوں کے اوزار اور ہتھیار ملے ہیں۔" چائلڈ نے آگے چل کر لکھا ہے "شہر کی سڑکوں کی ترتیب، پانی کی نکاسی کے لئے نالیوں کا نہایت عمدہ انتظام اور ان نالیوں کی پابندی کے ساتھ صفائی — یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو موہنجدارو میں کسی باقاعدہ میونسپل حکومت کے وجود کا یقین دلاتی ہیں۔ اس میونسپل حکومت کی قوت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آرائش بلدہ کے جو قوانین بنائے گئے تھے اُن کی پوری پابندی کی جاتی تھی، اور سیلابوں کی وجہ سے جب شہر کی نئے سرے سے تعمیر ہوتی تھی تو سڑکیں اور گلیاں منظور شدہ نقشے کے مطابق بنائی جاتی تھیں۔"[1]

وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب اور ہندوستان کی موجودہ تہذیب کے

---

1. Gordon Childe: What happened in History P. 113 - 114.

درمیان بہت سے ایسے دور گذرے ہیں، جن کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ بے شمار واقعات پیش آئے ہوں گے اور ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہوں گی لیکن یہ درمیانی کڑیاں ہماری نظر کے سامنے نہیں ہیں۔ پھر بھی موجودہ ہندوستان اور اب سے تقریباً چھ سات ہزار برس پہلے کے ہندوستان کی تہذیب میں ایک بنیادی تسلسل پایا جاتا ہے اور ایک مسلسل زنجیر ان دو دور افتادہ زمانوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ اور یہ دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ موہنجارو اور ہڑپا میں کتنی چیزیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عادات اور روایات اب تک چلی آرہی ہیں، کتنی رسمیں اور ریتیں، کتنے ہنر اور دستکاریاں اور لباس کی وضعیں۔ ان میں سے اکثر نے سارے مغربی ایشیا پر اپنا اثر ڈالا۔

یہ بات کتنی اہم اور معنی خیز ہے کہ اپنی کہانی کے اس ابتدائی دور میں بھی، ہندوستان گھٹنوں چلنے والا بچہ نہیں تھا، بلکہ بہت سی باتوں میں وہ خاصا سیانا ہو چکا تھا۔ وہ ایک مبہم، خیالی دنیا کے خوابوں میں کھویا ہوا نہیں بلکہ زندگی کے طریقوں سے آشنا تھا۔ وہ صنعت میں اور زندگی کی آسائشوں کے مہیا کرنے میں بہت کچھ کر چکا تھا۔ وہ صرف خوبصورت چیزیں بنانے پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ مفید چیزیں بھی بناتا تھا اور اس کے یہاں جدید تہذیب کی پیدا کی ہوئی آسائشیں بھی موجود تھیں ــ اچھے غسل خانے اور پانی کی نکاسی کے منظم راستے۔

۲۔ آریا قوم کی آمد

لیکن وادیٔ سندھ کی تہذیب میں رہنے بسنے والے تھے کون، اور وہ

کہاں سے آئے تھے ؟ ہمیں یہ بات اب تک نہیں معلوم ۔ بہت ممکن ہے، بلکہ اغلب ہے کہ ان کا تمدن ہندوستان ہی میں پیدا ہوا ہو اور اس کی جڑیں اور شاخیں جنوبی ہند تک پھیلی ہوئی ہوں ۔ بہت سے عالموں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے عالموں اور دراوڑی قوموں کی باہمی مشابہت کی طرف اشارے کئے ہیں اور وادیٔ سندھ کی تہذیب اور جنوب کی تہذیب میں انھیں ایک بنیادی اشتراک نظر آتا ہے ۔ ممکن ہے کہ قدیم زمانے میں دوسرے ملکوں سے کچھ لوگ ہندوستان آ کر بس گئے ہوں، لیکن ان کی آمد کا زمانہ موہنجداڑو کے دور سے بھی غالباً ہزاروں برس پہلے کا زمانہ ہوگا ۔ اور اس لئے عملی نقطۂ نظر سے ہم ان لوگوں کا شمار ہندوستان کے اصلی باشندوں میں کر سکتے ہیں ۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کا کیا انجام ہوا اور وہ کس طرح ختم ہوگئی ؟ اس کا جواب کچھ لوگ (جن میں گورڈن چائلڈ بھی شامل ہے) یہ کہہ کر دے دیتے ہیں کہ کسی ناگہانی سانحے نے اس تہذیب کو یکایک ختم کر دیا ۔ دریائے سندھ اپنے طوفانی سیلابوں کے لئے مشہور ہے — یہ سیلاب شہروں اور گاؤں کو تنکے کی طرح بہا لے جاتے ہیں ۔ یا پھر سندھ کی خشک ریتیلی آب و ہوا رفتہ رفتہ سرسبز و شاداب علاقوں کو بالو سے ڈھک کر انھیں ریگستان بنا دیتی ہے ۔ موہنجداڑو کے کھنڈر خود اس بات کی شہادت دیتے ہیں ۔ یہاں رفتہ رفتہ بالو کی تہیں جمتی اور زمین کی سطح کو اونچا کرتی رہتی تھیں اور شہر کے باشندے پرانی بنیادوں پر اپنی عمارتیں زیادہ اونچی سطحوں پر بناتے رہتے تھے ۔ کھدائی میں جو مکان برآمد ہوئے ہیں اُن کی بناوٹ دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانوں کی سی ہے لیکن بنیادوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سطح کی اونچائی کے ساتھ ساتھ انھیں برابر اپنی دیواروں کو بھی اونچا کرنا پڑتا تھا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں سندھ کا علاقہ ایک

زرخیز اور خوش حال علاقہ تھا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ زرخیز علاقہ ریگستان بنتا رہا۔

اور اس لئے بہت ممکن ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلیوں نے اس علاقے کے لوگوں اور اُن کے رہن سہن پر نمایاں اثر ڈالا ہو لیکن یہ اثر دفعتہً نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ہوا ہوگا اور پھر آب و ہوا کی تبدیلیوں کا اثر یقیناً ایک چھوٹے سے خطے تک محدود رہا ہوگا۔ اور اس وسیع و عریض تہذیب کا پورا علاقہ، جو غالباً گنگا کی وادی بلکہ اُس سے بھی آگے تک پھیلا ہوا تھا، اس سے متاثر نہیں ہوا ہوگا، لیکن ان میں سے کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، اس لئے کہ ہمارے پاس کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے کافی مواد موجود نہیں۔ اور ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب ریت نے ان قدیم شہروں کو ڈھک کر نظر سے اوجھل کر دیا، اُسی نے اتنی مدت تک ان کی نشانیوں کو برقرار بھی رکھا۔ اور دوسرے شہر یا اس تہذیب کے دوسرے آثار جو ریت کی زد سے باہر تھے رفتہ رفتہ مٹتے گئے یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد ان کا نام و نشان تک نہ رہا۔ ممکن ہے کہ آئندہ اثری انکشافات سے تہذیب کی اس زنجیر کی کچھ اور کڑیوں کا پتہ چل سکے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب اور بعد کی تہذیبوں میں جہاں ہمیں ایک طرح کا تسلسل محسوس ہوتا ہے وہاں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور پھر جو تہذیب وجود میں آئی وہ کسی حد تک مختلف تھی۔ بعد میں آنے والی تہذیب شروع شروع میں غالباً زرعی تھی، گو اس دور میں کسی نہ کسی طرح کی شہری زندگی بھی موجود تھی۔ زندگی کے اس زرعی پہلو پر زیادہ زور غالباً مختلف وقتوں میں شمالی مغربی علاقوں سے ہندوستان میں داخل ہونے والے آریوں نے دیا۔

کہا جاتا ہے کہ آریوں کے نقل مکان کا زمانہ سندھی تہذیب کے تقریباً

ایک ہزار برس بعد شروع ہوا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ درمیانی وقفہ زیادہ طویل نہ رہا ہو، اور اس قوم کے مختلف گروہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے شمالی مغربی راستوں سے آ آ کر ہندوستانی زندگی میں جذب ہوتے رہے ہوں۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کا پہلا زبردست امتزاج ان آنے والے آریوں اور دراوڑوں میں ہوا جو غالباً وادی سندھ کی تہذیب کے حامل تھے۔ اور اسی امتزاج سے آگے چل کر ہندوستانی نسلیں اور بنیادی ہندوستانی تہذیب پیدا ہوئی جس میں دونوں کی نمایاں خصوصیات موجود ہیں۔ آئندہ آنے والے زمانے میں بہت سی اور قومیں ہندوستان آئیں — ایرانی، یونانی، پارتھیائی، سیتھی، ہن، ترک، ابتدائی عیسائی، یہودی، زرتشتی۔ ان قوموں نے ہندوستان پر اپنا اثر ڈالا اور خود ہندوستانی تمدن میں گھل مل گئیں۔ ہندوستان میں، ڈاڈویل کے قول کے مطابق "سمندر کی طرح، جذب کی بے پایاں قوت تھی۔" ذات پات اور چھوت چھات کے باوجود، ہندوستان میں غیر ملکی قوموں اور تمدنوں کو جذب کر لینے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان نے ہمیشہ اپنی قوت حیات کو قائم رکھا اور وقتاً فوقتاً شباب کی تازگی حاصل کرتا رہا۔ مسلمان بھی جب ہندوستان آئے تو ان پر اس کا زبردست اثر پڑا۔ ونسنٹ اسمتھ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مسلمان ترک بھی، اپنے پیش روشکوں اور یوچیوں کی طرح، ہندویت کی ہمہ گیر قوت جذب سے مغلوب ہو گئے اور بہت تیزی کے ساتھ اس رنگ میں رنگ گئے۔"

۲۔ ہندویت کیا ہے؟

ونسنٹ اسمتھ نے اس جملے میں 'ہندویت' (Hinduism) کا

لفظ استعمال کیا ہے۔ میرے نزدیک اس لفظ کو اس طرح استعمال کرنا صحیح نہیں، اسے ایک وسیع مفہوم میں استعمال کرنا چاہیئے اور اس سے ہندوستانی تہذیب مراد لینا چاہیئے۔ ہندویت کے لفظ سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے کہ آج کل ہم اسے ایک محدود اور خالص مذہبی معنی میں استعمال کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ہمارے قدیم ادب میں 'ہندو' کا لفظ کہیں بھی نہیں آیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے یہ لفظ آٹھویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہندوستان کی ایک تنتری کتاب میں ملتا ہے۔ اور یہاں بھی یہ لفظ کسی خاص مذہب کے پیرووں کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کم از کم یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ لفظ بہت پرانا ہے اور قدیم فارسی اور اوستا میں موجود ہے۔ اس کے بعد اسے مغربی اور وسط ایشیا کے لوگ ہزار سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک ہندوستان کے لئے یا دریائے سندھ کے اُس پار رہنے والے لوگوں کے لئے استعمال کرتے رہے۔ دریائے سندھ کا پُرانا نام 'سندھو' ہے اور یہ لفظ اُسی سے نکلا ہے۔ اسی لفظ 'سندھو' سے آگے چل کر 'ہندو' اور 'ہندوستان' اور 'انڈوس' اور 'انڈیا' کے الفاظ بنے۔ چین کے مشہور سیاح یوئین چوانگ نے، جو ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ "وسط ایشیا کے قبیلے ہندوستان کو 'ہندو' کہتے تھے۔" آگے چل کر وہ لکھتا ہے "یہ نام کچھ زیادہ موزوں نہیں ..... ہندوستان کے لئے سب سے موزوں اور مناسب نام آریا دیش (شاندار ملک) ہے۔" 'ہندو' کے لفظ کو ایک خاص مذہب کے لئے استعمال کرنے کا رواج بہت بعد میں ہوا۔

ہندوستان میں مذہب کے لئے، پرانے زمانے میں "آریا دھرم"

کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ 'دھرم' کا مفہوم محض مذہب کے مفہوم سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کا مادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں برقرار رکھنا۔ 'دھرم' کسی شے کے اندرونی نظام یا اس کے آئین وجود کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو سارے اخلاقی قوانین، کل انسانی فرائض اور ذمہ داریوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس لئے آریا دھرم (ویدک اور غیر ویدک) میں وہ سب مذاہب شامل ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ یہ لفظ بدھ مت اور جین مت والے بھی اپنے لئے استعمال کرتے تھے اور ویدک دھرم کے ماننے والے بھی۔ گوتم بدھ ہمیشہ نجات کے راستے کو 'آرین راستہ' کہتے تھے۔

'ویدک دھرم' کی ترکیب بھی پرانے زمانے میں مخصوص طور پر اُن فلسفیانہ خیالات، نظام اخلاق اور رسوم کے لئے استعمال کی جاتی تھی جن کا ماخذ وید تھے۔ اور اس طرح وہ سب لوگ جو ویدوں کو سند مانتے تھے 'ویدک دھرم' کے ماننے والے کہے جا سکتے تھے۔

سناتن دھرم کی ترکیب، جس کے معنی قدیم مذہب کے ہیں، ہندوستان کے کل قدیم مذاہب کے لئے (جن میں بدھ مت اور جین مت بھی شامل ہیں) استعمال کی جا سکتی تھی۔ لیکن اب اس پر ہندوؤں کے بعض راسخ الاعتقاد فرقوں نے قبضہ جما لیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف وہی قدیم ہندو دھرم کے پیرو ہیں۔

بدھ مت اور جین مت کو ہم نہ ہندو مت کہہ سکتے ہیں اور نہ ویدک دھرم۔ پھر بھی وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور انھیں ہندوستانی زندگی، تہذیب اور فلسفے کا ایک لازمی جزو سمجھنا چاہئے۔ ہندوستان کا رہنے والا بدھ یا جینی سو فی صدی ہندوستانی تخیل اور تہذیب کی پیداوار ہے پھر بھی ہم اُسے ہندو نہیں کہہ سکتے۔ اور اسی لئے ہندوستانی تہذیب کو ہندو تہذیب کہنا بڑی گمراہ کن

بات ہے ۔ آگے چل کر اس تہذیب پر اسلامی تہذیب کے بہت گہرے اثرات پڑے، پھر بھی ہندوستانی تہذیب کی بنیادی ہیئت اور مخصوص رنگ باقی رہا۔ آج کل بھی مغرب سے آئی ہوئی صنعتی تہذیب صدہا طریقوں سے اس پر گہرا اثر ڈال رہی ہے، اور یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

مذہب کی حیثیت سے ہندویت ایک مبہم، بے شکل اور متنوع شے ہے ۔ مختلف لوگوں کے ذہن میں اس کے مختلف تصور ہیں۔ اس کی کوئی منطقی تعریف کرنا قطعاً غیر ممکن ہے ۔ اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ جس معنی میں مذہب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس کے اعتبار سے یہ مذہب ہے بھی یا نہیں۔ ہندویت کی جو شکل اب ہے، بلکہ جو پہلے سے چلی آرہی ہے، اس میں بہت سے پست اور بلند عقیدے اور عمل شامل ہیں، جن میں سے اکثر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ اس کا بنیادی جذبہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔ مہاتما گاندھی نے اس کی تعریف اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے ! " اگر مجھ سے ہندومت کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ پُرامن طریقوں سے حق کی جستجو کا نام ہندومت ہے۔ آدمی خدا کو مانے بغیر بھی اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ ہندومت حق کی ان تھک جستجو کا دوسرا نام ہے ......

ہندومت حق و صداقت کا مذہب ہے ۔ حق ہمارا خدا ہے۔ ہمارے ہاں خدا سے انکار کی مثالیں موجود ہیں، لیکن حق سے انکار کی کوئی مثال نہیں۔" مہاتما گاندھی نے 'حق' اور 'امن' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن بہت سے مشہور اور مانے ہوئے ہندو کہتے ہیں کہ گاندھی جی نے امن یا عدم تشدد کا جو مفہوم سمجھا ہے، وہ ہندومت کا کوئی لازمی جزو نہیں ۔ اور اس کے لئے صرف 'حق' ہی ایک چیز رہ جاتی ہے جسے ہم ہندویت کی امتیازی خصوصیت کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر

ہے یہ کوئی تعریف ۔ یا متعین مفہوم نہیں۔

اگرچہ فکر کے مختلف پہلو جو ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں ہندوستانی تہذیب ہی کے مظاہر ہیں لیکن اس قدیم زمانے کا ذکر کرتے وقت بھی ہندو اور ہندویت کو ہندوستانی تہذیب کے مفہوم میں استعمال کرنا غلط اور غیر مناسب ہے۔ اور آج کل تو ان الفاظ کو اس وسیع مفہوم میں استعمال کرنا اور بھی غلط ہے۔ جب تک پرانا مذہب اور پرانا فلسفہ محض زندگی کی ایک روش یا تصور کائنات کا نام تھا، ہم ہندویت کو ہندوستانی تہذیب کا مترادف کہہ سکتے تھے لیکن جب مذہب نے ایک جامد شکل اختیار کرلی ہے اور اس میں مخصوص رسوم کی پابندی شروع ہوگئی تو اس کا مفہوم ایک لحاظ سے مرکب تہذیب سے زیادہ اور ایک لحاظ سے کم ہوگیا۔ ایک عیسائی یا مسلمان، اپنے آپ کو ہندوستانی طرز زندگی یا تہذیب کے سانچے میں ڈھال لینے کے بعد بھی مذہب اور عقیدے میں پکا عیسائی یا مسلمان رہتا ہے۔ اپنا مذہب بدلے بغیر اس نے ہندوستانیت کا رنگ اختیار کرلیا اور ہندوستانی بن گیا۔

اور اس لئے میرے نزدیک تو ہندوستان کے ملک، اس کی تہذیب یا اس کی متعدد روایات کے تاریخی تسلسل کے اظہار کے لئے صحیح لفظ 'ہندی' ہے جو لفظ ہندوستان کے مخفف 'ہند' سے بنا ہے۔ ہندوستان کے لیے 'ہند' کا لفظ اب بھی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مغربی ایشیا کے تقریباً سارے ملکوں میں، ایران، ترکی، عراق، افغانستان، مصر وغیرہ میں ہمیشہ سے ہندوستان کو 'ہند' اور ہندوستان کی ہر چیز کو 'ہندی' کہتے ہیں۔ 'ہندی' لفظ کا مذہب سے ذرا

بھی تعلق نہیں ۔ اور ہندوستان کے رہنے والے مسلمان اور عیسائی کو بھی 'ہندی' کہلائے جانے کا وہی حق حاصل ہے جو 'ہندومت' کے کسی پیرو کو۔ امریکا والے جب سارے ہندوستانیوں کے لئے 'ہندو' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو میرے خیال میں کچھ زیادہ غلطی نہیں کرتے۔ لیکن اگر وہ 'ہندو' کی جگہ 'ہندی' کا لفظ استعمال کرنے لگیں تو یہ استعمال پوری طرح صحیح ہو جائے۔ بدقسمتی سے لفظ 'ہندی' سنسکرت کے دیوناگری رسم الخط کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اور اس لئے اب اُسے اس کے صحیح اور وسیع تر مفہوم میں استعمال کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جب کبھی ہمارے یہ باہمی تنازعے ختم ہو جائیں تو ہم اس لفظ کو اس کے وسیع معنوں میں بولنے لگیں۔ آج کل ہم ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو 'ہندوستانی' کہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ثقیل لفظ ہے اور اسے وہ تاریخی اور تمدنی اہمیت حاصل نہیں جو لفظ 'ہندی' کو حاصل ہے خصوصاً ہندی تہذیب کے گذرے ہوئے زمانوں کو 'ہندوستانی' کہہ کر پکارنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ہم اپنی تہذیبی روایات کے لئے خواہ کوئی سا لفظ بھی استعمال کریں — انڈین، ہندی یا ہندوستانی — ہم ایک خاص بات یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری تہذیب اور قوم کے ارتقا کی سب سے اہم خصوصیت ترکیب و امتزاج کا وہ داخلی رجحان ہے جو ہمارے فلسفیانہ طرز خیال کا پیدا کیا ہوا ہے۔ بیرونی اثرات مختلف زمانوں میں اس تہذیب پر حملہ آور ہوتے رہے لیکن اس نے ہمیشہ ان کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کیا اور امتزاج اور جذب کے عمل سے اس پر فتح حاصل کی۔ اس عمل نے ہمیشہ تہذیب کو ایک حیاتِ نو بخشی اور اس نئی زندگی سے تہذیب میں

شگفتگی اور تازگی پیدا ہوئی، تاہم اس کی بنیادی حقیقت ہر حال میں دبی رہی۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ نے اسی حقیقت کے متعلق لکھا ہے "اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مختلف اقوام اور افکار کے درمیان اتحاد اور امتزاج پیدا کرنے اور اس طرح کثرت میں وحدت پیدا کرنے کی جو صلاحیت رہی ہے وہ نسلِ انسانی کے لئے اس کا ایک خاص عطیہ ہے"

۴۔ تہذیب کی سب سے قدیم دستاویزیں۔ کتب مقدسہ اور دیو مالا

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے انکشاف سے پہلے، ویدوں کو ہندوستانی تہذیب کی سب سے قدیم دستاویزیں سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی اور یورپی مورخین میں ہمیشہ ویدک زمانے کے تعین کے متعلق اختلاف رہا ہے۔ یورپی مورخ اس زمانے کا تعین بہت بعد میں کرتے ہیں اور ہندوستانی مورخ بہت پہلے۔ ہندوستانیوں کی یہ خواہش کہ قدیم تہذیب کی اہمیت میں اضافہ کرنے کے لئے ویدک زمانے کو جتنا زیادہ ممکن ہوسکے پیچھے لے جائیں، کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر ونٹرنٹز ([illegible]) کا خیال ہے کہ ویدک لٹریچر کی ابتدا دو ہزار یا ممکن ہے ڈھائی ہزار برس قبل مسیح رہی ہو۔ اس تعین کے بعد ویدک عہد موہنجداڑو کے عہد سے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے،

عام طور پر مورخ متفقہ طور پر رگ وید کے گیتوں کی تاریخ ۱۵۰۰ قبل مسیح بتاتے ہیں۔ لیکن جب سے موہنجداڑو کی کھدائیاں ہوئی ہیں عموماً یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان ابتدائی تحریروں کی تاریخ کو اور پیچھے سرکا دیا جائے۔ بہرحال صحیح تاریخ خواہ کچھ بھی ہو، غالباً یہ تحریریں قدیم یونانی یا اسرائیلی تحریروں سے پرانی ہیں یعنی دراصل یہ انسانی ذہن کی قدیم ترین یادگاریں ہیں۔ سکیں ملر نے

رگ وید کے متعلق کہا ہے کہ "یہ پہلی بات ہے جو آرین انسان کی زبان سے نکلی۔"
'وید' آرین لوگوں کے وہ خیالات ہیں جو انھوں نے ہندوستان کی زرخیز زمین میں آکر ظاہر ہوئے — وہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لائے تھے لیکن ان کی ترقی اور تکمیل ہندوستان میں ہوئی۔ خیالات کا یہی سرچشمہ تھا جس سے ایران میں 'اوستھا' نکلی۔ ویدوں کی زبان اور اوستھا کی زبان میں حیرت انگیز مماثلت ہے اور یہ بات کہی گئی ہے کہ اوستھا کی زبان ویدک سے اس سے زیادہ قریب ہے جتنی ویدک قدیم سنسکرت سے۔

مختلف مذہبوں کے صحیفوں کا جائزہ ہم کس طرح لے سکتے ہیں؟ عام طور پر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ صحائف آسمانی ہیں۔ اور اگر کوئی ان صحیفوں کو انسانی ذہن کی پیداوار سمجھ کر ان کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرنے لگے تو عقیدتمندوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ پھر بھی ان کی جانچ پرتال کا اور کوئی صحیح طریقہ نہیں۔

مجھے ہمیشہ سے مذہب کی کتابیں پڑھنے میں تامل رہا ہے۔ ان کتابوں کی ہمہ گیری کے جو دعوے کئے جاتے ہیں وہ میرے دل کو بھی نہیں لگے۔ اور مذہبی عمل کے جو نمونے میری نظر کے سامنے آئے انھوں نے مجھے اصل ماخذوں کی طرف رجوع کرنے کا شوق نہیں دلایا۔ پھر بھی مجھے ان کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی پڑا، اس لئے کہ ان سے لاعلمی کوئی خوبی کی بات نہیں تھی، بلکہ ایک بہت بڑی کمی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کچھ کتابوں نے نوع انسانی پر زبردست اثرات ڈالے ہیں، اور جس چیز میں اتنی تاثیر تھی، اس میں کوئی نہ کوئی پنہاں قوت اور صفت ضرور ہوگی، سعی و عمل کا کوئی حیات بخش خزانہ ضرور ہوگا۔ میں نے یہ کتابیں دیکھیں، اور ان کے اکثر حصوں کو باوجود کوشش کے بڑی مشکل سے پڑھ سکا۔ ان میں مجھے ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن انھیں کتابوں کے

بعض ٹکڑوں کے حسن اور کشش نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور یکایک کسی فقرے یا جملے سے مجھ میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی اور مجھے کسی پُر عظمت وجود کا احساس ہوا۔ بدھ اور عیسیٰؑ کے بعض لفظوں کی گہری معنویت میں مجھے آج بھی وہی تاثیر اور صداقت نظر آئی جو اب سے دو ہزار برس یا اس سے بھی پہلے ان میں موجود تھی۔ ان میں ایک ایسی صداقت تھی جسے ماننے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے — ایک ایسی پائدار صداقت جسے زمانے کی دست برد بھی نہیں مٹا سکتی۔ کبھی کبھی جب میں نے سقراط کے متعلق یا چینی فلسفیوں کے متعلق کچھ پڑھا یا اپنشد یا بھگوت گیتا کا مطالعہ کیا تو میری یہی کیفیت ہوئی ہے۔ مجھے ان صحیفوں کے مابعد الطبیعی مسائل یا رسوم کی بحث، یا اس طرح کی اور بہت سی باتوں سے مطلق دلچسپی نہیں تھی، اس لئے کہ ان چیزوں کو اُن اہم مسئلوں سے کوئی تعلق نہ تھا جو میرے سامنے تھے۔ کبھی کبھی شاید ایسا بھی ہوا کہ جو کچھ میں نے پڑھا اس کی اندرونی معنویت کو نہ سمجھ سکا۔ بعض اوقات اسی چیز کو دوبارہ پڑھ کر کچھ مطلب نکلا لیکن عام طور پر میں اس طرح کے پُر اسرار حصوں کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ نہ میرے لئے ان میں کوئی کام کی بات تھی اور نہ مجھے ان صحیفوں کی طول طویل تشریحوں اور تفسیروں سے کوئی دلچسپی تھی۔ میرے لئے کسی ایسی کتاب کا پڑھنا ممکن نہ تھا جسے محض آسمانی صحیفہ سمجھ کر بے چون وچرا اوّل سے آخر تک مان لینا ضروری ہو۔ کسی صحیفے کو اس نقطۂ نظر سے پڑھوں تو میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مجھے تو ان کتابوں میں اُسی صورت میں دلچسپی اور لطف محسوس ہوتا تھا جب میں انھیں کسی مرد دانا و بینا کے ذہن کا نتیجۂ فکر سمجھوں — جو ان صفات کے باوجود ایک معمولی انسان تھا، کوئی اوتار یا دیوتاؤں کی زبان سے بولنے والا الناصح تھے

متعلق نہ ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ اس کی صداقت کی کوئی ضمانت۔ میرے نزدیک یہ بات کہ کوئی انسان انتہائی ذہنی اور روحانی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ شان دار ہے کہ وہ محض خدا کا یا کسی بڑی قوت کا آلہ کار ہو۔ بعض مذہبوں کے بانی واقعی حیرت انگیز شخصیتوں کے مالک تھے، لیکن جوں ہی میں انھیں عام انسانوں سے مختلف کچھ سمجھنے لگتا ہوں، میری نظر میں ان کی ساری عظمت ختم ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں انسان کے ذہن اور روح کی ترقی سے امید کی لہر پیدا ہوتی ہے، کسی ایسے وجود کی ترقی سے نہیں جسے محض ایک پیغام پہنچانے کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔

بالکل یہی خیال میرا دیومالا کے متعلق ہے۔ لوگ اگر دیومالا کی حماقت آمیز کہانیوں کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھنے لگیں تو وہ محض خرافات اور فضولیات کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ لیکن اگر انسان آنکھ بند کر کے ان پر ایمان نہ لائے تو یہ کہانیاں ایک نیا حسن اور نئی تاثیر لے کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ تخیل کی ان پُربہار رنگینیوں میں انسان کو بے شمار سبق ملیں گے۔ اب یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کی کہانیوں کو کوئی سچ نہیں جانتا اور اس لئے بغیر کسی دقت کے ہم اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور انھیں اپنے ذہنی سرمایے کا جزو بنا لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں ان ساری کہانیوں کو سچ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے تو سوچئے کہ یہ کہانیاں ہمارے ذہن کے لئے کتنا بھاری بوجھ بن جائیں اور عقیدہ اور یقین کے اس بوجھ کے نیچے دب کر ہم ان کہانیوں کے سارے حسن اور لطف سے محروم رہ جائیں۔ ہندوستانی دیومالا یونانی دیومالا سے کہیں زیادہ وسیع، پُرمعنی، حسین اور جمیل ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ

جن مردوں اور عورتوں نے روشن خواب اور حسین تخیل تعمیر کئے وہ کیسے ہوں گے اور فکر و تخیل کی کس کان سے انھوں نے یہ ہیرے کھود کر نکالے ہوں گے۔

غرض جب مذہبی صحیفوں کا جائزہ اس نظر سے لینے کے لئے کہ وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہیں ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کس زمانے میں لکھے گئے، کس مذہبی فضا اور ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی، اور زمانے، فکر، اور تجربے کی کتنی مدت اور وسعت ہمارے اور ان کے درمیان حائل ہے۔ ہمیں ان صحیفوں پر سے مذہبی رسوم کے وہ سارے رنگ بھی ہٹا دینے چاہئیں جو زمانے نے ان پر چڑھا دئے ہیں اور پھر ان کے سماجی پس منظر میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انسانی زندگی کے بہت سے مسائل ہر زمانے میں ایک سے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے ان کتابوں میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ مسائل ایسے بھی تھے جو صرف ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص تھے اور اس لئے اب ان سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

۵ - وید

بہت سے ہندو ویدوں کو آسمانی صحیفے سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بڑی بدنصیبی ہے اس لئے کہ انھیں آسمانی صحیفہ سمجھ لینے کے بعد ہمارے لئے ان کی حقیقی اہمیت اس حیثیت سے ختم ہو جاتی ہے کہ وہ انسانی ذہن اور اس کی فکر کے ابتدائی نقوش ہیں۔ حقیقت میں وہ ذہن اور وہ فکر کتنی عجیب و غریب تھی۔ وید (جس کا مادہ سنسکرت کا لفظ 'ود' بہ معنی جاننا ہے) اصل میں ایک خاص زمانے کے علم کے مجموعے کا نام ہے۔ اس میں مختلف طرح کی

چیزیں جمع ہیں ـــ گیت، دعائیں، قربانی کے رسوم، سحر و افسون اور حسین فطری شاعری۔ ان میں عبادت اور پرستش ہے اور یہ دیوی دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ ان صحیفوں میں زندگی کا جوش اور ولولہ اُبل رہا ہے۔ ویدک آرین لوگوں میں یہ جوش حیات اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ روحانی مسائل کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ صرف ایک مبہم تصور رکھتے تھے کہ موت کے بعد کسی قسم کی زندگی ہے اور بس۔

رفتہ رفتہ خدا کا تصور پیدا ہوا۔ شروع شروع میں یہ تصور کچھ بڑے دیوتا اور رفیع دیوتاؤں کا تصور تھا۔ ذرا آگے چل کر اس نے وحدانیت کی شکل اختیار کر لی اور پھر اور آگے چل کر اس تصور میں کئی چیزیں مل جل گئیں۔ فکر اور تخیل ان تصورات کو نئی نئی سرزمینوں میں لے جاتا ہے۔ انسان قدرت کے بھیدوں پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کی حقیقت کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔ ان ساری تبدیلیوں میں عہدہا برس کی مدت لگ جاتی ہے، اور جب تک ہم ویدک عہد کے آخری زمانے میں پہنچتے ہیں، فکر اُپنشد کے فلسفے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

پہلا وید "رگ وید" غالباً ان کتابوں میں جو نوعِ انسانی کے پاس موجود ہیں سب سے پہلی کتاب ہے اور اس میں ہمیں انسانی جذبات کا سب سے پہلا اظہار نظر آتا ہے ـــ اس میں شاعری کا کیف ہے اور مسرت کا جوش جو حسن قدرت اور اسرار فطرت کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ انھیں ابتدائی گیتوں میں، جیسا کہ ڈاکٹر میکنی کول نے کہا ہے "انسانی اولوالعزمی کی ابتدائی کہانی ہے، اُس سفر کی کہانی جو انسان نے اپنی دنیا کی حقیقت اور انسانی زندگی کے بھیدوں کے انکشاف کے لئے شروع کیا تھا...... ہندوستان نے اس گذرے ہوئے زمانے میں ایک ایسی جستجو شروع کی تھی، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔"

اس کے باوجود ہمیں معلوم ہے کہ رگ وید سے بھی صدیوں پہلے دنیا میں تمدن اور فکر کا وجود تھا۔ اور اسی زمانے میں وادیٔ سندھ اور عراق کی تہذیبوں کے علاوہ بعض دوسرے تمدن پھولے پھلے۔ اور اس لئے رگ وید کا یہ انتساب بیحد موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

"ان روشن ضمیر بزرگوں کے نام جنھوں نے سب سے پہلے راہ کا کھوج لگایا۔"

ویدوں کے ان بھجنوں کی تعریف رابندر ناتھ ٹیگور نے اس طرح کی ہے

"یہ گیت انسان کے اُس مجموعی تاثر کے شاعرانہ شواہد ہیں، جو حیات کے تحیّر اور جلال نے اس میں پیدا کیا تھا۔ انسان کو جس کے تخیل میں جوش اور خلوص بھرا ہوا تھا، تہذیب کے بالکل ابتدائی دور میں زندگی کے بے پایاں رازوں کا احساس ہوا۔ اور اس احساس کے بعد، اس کے سادہ عقیدے نے قدرت کے سارے عناصر اور قوتوں کو الوہیت کی طرف منسوب کیا۔ لیکن اس سادہ عقیدے میں بہادری اور مسرت کا جذبہ شامل تھا، اور یہ سادہ عقیدہ قدرت کو ایک پُراسرار شے سمجھ کر، زندگی کو شکوک وشبہات کے بوجھ سے دبائے بغیر اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیتا تھا۔ یہی عقیدہ تھا جس میں ڈوب کر انسان قدرت کے متضاد اسرار پر غور وفکر کرنے کی پریشانیوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ گو کبھی کبھی کوئی وجدانی واردات اُس سے اس طرح کی باتیں بھی کہلوا لیتی تھی : 'حق صرف ایک ہے، گو مرد دانا نے اس کے مختلف نام رکھ چھوڑے ہیں'۔"

لیکن فکر کا جذبہ رفتہ رفتہ بڑھتا رہا، یہاں تک کہ 'وید' کے مصنف کی زبان پکار اُٹھی "اے عقیدے، ہم میں یقین پیدا کر" اور اسی زبان نے ایک بھجن

میں جس کا عنوان ہے "تخلیق کا گیت" اور زیادہ اہم سوالات اٹھائے ہیں۔
اس بھجن کے عنوان کا ترجمہ مکیس مُلر نے "نامعلوم دیوتا کے نام" کیا ہے۔

(۱) اس وقت نہ عدم تھا نہ وجود: نہ ہوا کا کرہ تھا اور نہ اس سے
آگے آسمان۔

کیا چیز پردہ پوش تھی اور کیا چیز پناہ دیتی تھی؟ کیا اُس وقت پانی
تھا اور کیا پانی کی اتھاہ گہرائیاں تھیں؟

(۲) اس وقت نہ موت تھی اور نہ کوئی شے غیر فانی تھی۔ اس وقت
دن کو رات سے الگ کرنے والا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک
شے تھی، جو کسی خارجی فضا میں نہیں بلکہ خود اپنے وجود کی فضا میں
سانس لیتی تھی — اُس سے الگ کوئی اور شے نہ تھی۔

(۳) اس وقت صرف تاریکی، تاریکی کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اور
یہ سب کچھ غیر مرئی تھا اور غیر متشکل۔

اور صرف ایک وجود تھا، حرارت کی زبردست قوت کا پیدا کیا ہوا۔

(۴) اس کے بعد، سب سے پہلے خواہش پیدا ہوئی — خواہش جو
روح کا تخم اور اس کی بنیاد ہے۔

روشن ضمیروں نے اپنی روحانی قوت سے غیر موجود میں موجود کا
علاقہ دریافت کیا

(۵) اور پھر دونوں کے درمیان ایک خط کھنچ گیا — کیا کیا اس خط کے اوپر
تھا اور کیا کیا اُس کے نیچے؟

پیدا کرنے والے تھے، زبردست قوتیں تھیں، ایک طرف آزاد عمل،
اور اس کے آگے قوت عمل کا سرچشمہ —

(۶) اور کون یقین کے ساتھ جانتا ہے اور کون بتا سکتا ہے کہ یہ وجود
کہاں سے آیا اور یہ ساری تخلیق کہاں سے ہوئی؟
دیوتاؤں کی تخلیق کائنات کی تخلیق کے بعد ہوئی — پھر کون جانے
یہ کیسے پیدا ہوئی؟
(۷) وہ ذات، تخلیق کا اولین سرچشمہ — یہ ساری تشکیل اُسی نے کی
یا اس نے نہیں کی
اس کی نظر آسمان سے اس دنیا کی نگہداشت کرتی ہے — وہ
یقیناً یہ سب کچھ جانتا ہے یا شاید نہیں جانتا " لے

۶ - حیات کا اثبات اور انکار

مدتوں پہلے کے اس دھندلے آغاز سے ہندی فکر و فلسفہ، اور حیات و تمدن کے چشمے نکلتے ہیں اور رفتہ رفتہ زیادہ وسیع و فراخ ہوتے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ سیلاب کی صورت میں پھیل کر سارے ملک میں زرخیز مٹی کی ایک تہ بچھا دیتے ہیں۔ اس ہزاروں برس کی مدت میں ان چشموں نے کبھی کبھی اپنے بہاؤ کے راستے بھی بدلے اور کبھی کبھی سمٹ کر چھوٹے بھی ہوگئے، لیکن انھوں نے اپنی حقیقی ماہیت میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ یہ بات کبھی ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر ان میں شروع ہی سے بقائے حیات کا مادہ نہ ہوتا۔ بقا و دوام کی یہ قوت ضروری نہیں کہ ہمیشہ اچھی ہی ہو۔ اس کا نتیجہ،

لے یہ ترجمہ Everyman's Library کی کتاب Hindu Scriptures سے لیا گیا ہے۔

جیساکہ مدتوں ہندوستان میں ہوا، جمود اور انحطاط بھی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک اہم حقیقت ہے جو پیش نظر رہنی چاہیئے ــ خاص کر اس موجودہ زمانے میں جبکہ جنگیں اور معاشی بحران بڑے بڑے سربلند تمدنوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکے دے رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ سخت اور نازک جنگ، جو ہر چیز کو تہس نہس کرنے پر تلی ہوئی ہے مغرب اور مشرق کو کوئی ایسی چیز دے سکے، جس میں انسان کے وہ سارے کارنامے شامل ہوں جو اس نے اب تک کئے ہیں، اور ان کارناموں میں وہ اضافے کر سکے جن کی اب تک کمی تھی۔ لیکن ان جنگوں سے بار بار دنیا کے مادی وسائل، انسانی زندگی، اور حیات کی ان قدروں کی، جنھوں نے زندگی کو معنویت دی ہے، جو تباہی اور بربادی ہو رہی ہے وہ بہت معنی خیز ہے۔ دنیا نے مختلف سمتوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس ترقی سے زندگی کے معیاروں میں اس طرح کے اضافے ہوئے ہیں، جن کا پچھلے زمانوں میں تصور بھی محال تھا، اور یہ سب کچھ ہمارے موجودہ حد سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی تمدن کی پیداوار ہے ــ لیکن باوجود اس کے کیا یہ صحیح ہے کہ اس تمدن میں خود اس کی تباہی اور بربادی کا بیج موجود تھا؟

ایک غیر ملکی قوم کی غلامی میں جکڑا ہوا ملک اپنے حال سے بھاگ کر ماضی کے خوابوں میں پناہ لینا چاہتا ہے اور اسے گذرے ہوئے زمانے کے پر عظمت تصور سے ایک گونہ تشفی ہوتی ہے۔ یہ مشغلہ احمقانہ بھی ہے اور خطرناک بھی اور ہم میں سے بہت سے اس احمقانہ مشغلے میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح کا ایک دوسرا تصور جس میں اکثر ہندوستانی مبتلا ہیں یہ خیال ہے کہ ہم روحانی حیثیت سے اب بھی بلند ہیں گو دوسری حیثیتوں سے ہم دنیا میں بہت

پست ہو گئے ہیں۔ روحانی یا کسی اور طرح کی عظمت اور بلندی کی بنیاد غلامی، فاقہ کشی اور مصیبت پر نہیں قائم ہو سکتی۔ بہت سے مغربی مصنفوں نے یہ خیال اور بھی راسخ کر دیا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس دنیا کی نہیں بلکہ دوسری دنیا کی فکر ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہر ملک میں غریب اور بدنصیب آدمی دوسری دنیا سے لو لگاتے ہیں یا انقلاب پسند بن جاتے ہیں، اس لئے کہ موجودہ دنیا میں انھیں اپنا گذارہ نظر نہیں آتا۔ یہی حال غلام قوموں کا بھی ہے۔

جب آدمی سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو محض بیرونی یا خارجی دنیا اُسے مطمئن نہیں کر سکتی اُسے کسی معنوی حقیقت کی جستجو ہوتی ہے۔ وہ کسی نفسیاتی یا روحانی تسکین کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ زندگی کی داخلی اور خارجی لہریں قوموں کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ جہاں یہ لہریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی یا قریب ہوتی ہیں وہاں توازن اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جب ان لہروں میں بُعد ہونا شروع ہو جاتا ہے تو کشمکش شروع ہوتی ہے اور ایسی بحرانی کیفیتیں پیدا ہونے لگتی ہیں جن سے دماغ اور روح دونوں کو بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے۔

رگ وید کے عہد سے زندگی اور خیال کی یہ دونوں لہریں ہمیں رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ابتدائی لہروں پر زندگی کے خارجی اثرات غالب ہیں۔ ان پر قدرت کے حسن اور اُس کے رموز، زندگی کی مسرتوں اور قوت نمو کا زیادہ گہرا اثر ہے۔ دیوتا اور دیویاں اپنی خصوصیات میں انسانوں سے مماثل ہیں۔ وہ زمین پر آ کر عورتوں اور مردوں سے ملتے چلتے ہیں۔ ان کے اور انسانوں کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں۔ اس دور کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ اس میں فکر اور تحقیق کا جذبہ غالب ہے، اور روحانی

دنیا کے رموز میں زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ زندگی اب بھی پہلے کی طرح
بھری پُری ہے۔ لیکن انسان کبھی کبھی اس کے خارجی مظاہر سے منہ موڑ کر
بے تعلقی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اب اس کی نظر ان غیر مرئی چیزوں کی
طرف پھر جاتی ہے، جنھیں غیر معمولی طریقے سے دیکھا، سنا یا محسوس نہیں
کیا جا سکتا۔ اب ذہن میں اس طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں ـــــ ان
ساری چیزوں کی کیا غرض ہے؟ کیا کائنات کا کوئی مقصد ہے؟ اگر
اس کا کوئی مقصد ہے تو انسانی زندگی اور کائنات میں ہم آہنگی کیسے پیدا
کی جا سکتی ہے؟ کیا ہم مرئی اور غیر مرئی دنیاؤں میں ہم آہنگی پیدا کرکے
زندگی کا صحیح طریق عمل معلوم کر سکتے ہیں؟

مختصر یہ کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی فکر اور عمل کی یہ
دونوں لہریں ـــ زندگی سے لگاؤ اور اس سے بے تعلقی ـ ساتھ ساتھ
چلتی رہیں۔ اور مختلف دوروں میں کبھی ایک کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور
کبھی دوسری کی۔ تاہم اس تہذیب کا بنیادی پس منظر اس دنیا کی بے حقیقتی
کا احساس، اور دوسری دنیا سے لو لگانے کا جذبہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جب
فلسفیانہ فکر نے اس دنیا کو مایا قرار دیا، جس سے عام لوگ فریب نظر مراد لیتے
ہیں تو یہ تصور بھی مطلق نہیں بلکہ اضافی تھا اور ایک بالاتر حقیقت کی نسبت سے
قائم کیا گیا تھا جیسے افلاطون کا سایۂ حقیقت کا تصور۔ عملی طور پر وہ دنیا کو ویسا
ہی سمجھتا تھا جیسی وہ نظر آتی ہے اور زندگی کی گوناگوں مسرتوں سے لطف اندوز
ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ غالباً سامی تہذیب اور وہ بہت سے مذہب
جو اس سے پیدا ہوئے (خصوصاً ابتدائی عیسائیت) اس سے کہیں زیادہ
آخرت پرست تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے لکھا ہے کہ "کل سامی مذہبوں

کی بنیاد اس دنیا کی بے حقیقتی کا مستقل تصور تھا" اور اس تصور کا نتیجہ اکثر یہ ہوا کہ زندگی مختلف وقتوں میں کبھی عیش پرستی کے مترادف بن گئی اور کبھی نفس کشی کے۔

ہندوستانی تہذیب کے ہر دورِ ترقی میں ہمیں یہ چیزیں نظر آتی ہیں — حیات و کائنات سے جی بھر کر لطف اٹھانا، زندگی کو عین راحت سمجھنا، آرٹ، ادب، موسیقی، رقاصی، مصوری اور تھیٹر کی ترقی اور ان کے علاوہ جنسی تعلقات کی تحقیق کا شوق۔ یہ بات تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ کوئی ایسی تہذیب کوئی ایسا نظریۂ حیات جس میں دنیا کو بے حقیقت سمجھا گیا ہو، زندگی کے اتنے متنوع اور اتنے پُرجوش نمونے پیش کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ بات البتہ بالکل صریح اور واضح ہے کہ کوئی تہذیب جو بنیادی طور پر آخرت پرست ہو ہزاروں برس تک جاری نہیں رہ سکتی۔

اس کے باوجود بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور فکر کا بنیادی اصول زندگی کی نفی نہیں بلکہ اثبات ہے۔ زندگی کی نفی اور اثبات کے اصول میرے نزدیک کسی نہ کسی حد تک تمام قدیم تہذیبوں اور مذہبوں میں موجود ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے بعض طبقوں نے زندگی کی نفی کی لیکن مجموعی حیثیت سے ہندوستانی تہذیب کے اس پہلو پر کبھی زور نہیں دیا۔ بلکہ میرے خیال میں تو اس میں یہ رنگ عیسائیت کے مقابلے میں کم ہے۔ بودھ مت اور جین مت نے البتہ زندگی سے بے تعلقی پر زور دیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ کے بعض دور ایسے ہوئے ہیں کہ لوگ زندگی سے بھاگتے رہے اور ایک بہت بڑی تعداد میں انھوں نے خانقاہوں کی راہبانہ زندگی اختیار کرلی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس فرار کی وجہ کیا تھی۔ اسی طرح کی، بلکہ اس سے

بھی زیادہ اہم، مثالیں ہمیں عہد وسطیٰ کے یورپ میں ملتی ہیں، جہاں لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ دنیا اب ختم ہونے والی ہے۔ شاید زندگی سے بے تعلقی اور اس کے انکار کی وجہ مایوسی کا وہ جذبہ ہوتا ہے جو بعض سیاسی یا معاشی حالات پیدا کر دیتے ہیں۔

گو بودھ مت کا نظریہ یا نظریے (اس لئے کہ اس کے کئی نظریے ہیں) نفی زندگی کی طرف مائل ہیں لیکن انتہا پسندی سے وہ ہمیشہ دور رہا ہے۔ اس کا اصول اعتدال یا طریق اوسط ہے۔ نروان کو جو بدھ مت کے عقیدے کا بنیادی اصول ہے، زندگی کی نفی سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ نروان ایک اثباتی حقیقت ہے لیکن چونکہ انسانی فکر اس کا احاطہ کرنے سے معذور تھی اس لئے اُس کی وضاحت کے لئے منفی ترکیبیں استعمال کی گئیں۔ اگر بودھ مت، جو ہندوستانی فکر اور تہذیب کی مثالی پیداوار ہے، محض زندگی کے نفی اور انکار کا نتیجہ ہوتا تو اس کا اثر اس کے لاکھوں پیروؤں پر پڑنا یقینی تھا۔ حالانکہ اس کے بالکل خلاف، بودھ مت کے ماننے والے ملکوں کی مثال متعدد طریقوں سے اس بات کی تردید کر رہی ہے۔ اور چینیوں کی زندگی اس حقیقت کی نمایاں مظہر ہے کہ زندگی کا اثبات یا ایجاب کسے کہتے ہیں۔

یہ الجھن اور غلط فہمی شاید اس لئے پیدا ہوئی کہ ہندوستانی فکر نے ہمیشہ زندگی کے آخری مقصد کو اہم سمجھا اور اس پر زور دیا ہے۔ زندگی کی تخلیق میں ایک لامحدود قوت کا جو ہاتھ ہے اُسے ہندوستانی فکر نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور اس لئے گو اس نے زندگی کے اثبات پر پورا عقیدہ رکھا لیکن وہ کبھی اس کا غلام اور حلقہ بگوش بن کر نہیں رہا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنی پوری قوت اور توجہ سے عمل صالح پر عامل ہو لیکن اپنے آپ کو اس سے بلند و برتر

رکھو اور اس عمل کے نتائج کی فکر نہ کرو۔ اس طرح اس فکر و فلسفہ نے زندگی اور عمل سے کسی قدر علیحدگی کی تعلیم تو ضرور دی لیکن اُس سے کلی اجتناب نہیں سکھایا۔ علیحدگی کا یہ تصور ہمیشہ سے ہندوستانی فکر و فلسفہ کا ایک خاص جزو رہا ہے' بالکل اسی طرح جیسے دوسرے ملکوں کی فکر میں۔ ہندوستانی فکر نے جو بات کہی ہے اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرئی اور غیر مرئی دنیاؤں میں صحیح قسم کا توازن اور ہم آہنگی رکھنی ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر مرئی دنیا کے عمل سے انسان کو زیادہ لگاؤ اور تعلق پیدا ہو جائے تو وہ دوسری دنیا کو بھول جاتا ہے اور وہ اس کے تصور میں دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح عمل بھی بے مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستانی فکر کے اس ابتدائی سفر میں حق پر زور ہے' اسی پر بھروسہ ہے اور اُسی کی زبردست خواہش ہے۔ محض عقیدہ اور ایمان کو اُن پست ذہنوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے جو حق کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ نقطۂ نظر ذاتی تجربہ کا پیدا کیا ہوا تھا۔ یہی تجربہ جب غیر مرئی دنیا کا تصور کرتا تھا تو دوسرے جذباتی اور نفسیاتی تجربوں کی طرح اس کا انداز اس انداز سے مختلف ہو جاتا تھا جو وہ مرئی اور خارجی دنیا کے تجربات میں اختیار کرتا تھا۔ وہ اس زمان و مکان کی دنیا کو چھوڑ کر کسی دوسری مختلف اور وسیع کائنات میں پہنچ جاتا تھا اور اس لئے زمان و مکان کے نقطۂ نظر سے اس کی تشریح دشوار ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ تجربہ کیا تھا۔ وہ محض تخیل تھا یا حق یا حقیقت کے کسی پہلو کا مشاہدہ۔ غالباً اکثر یہ تجربہ محض خود فریبی کا نتیجہ ہوتا تھا مجھے زیادہ دلچسپی اس بات سے ہے کہ اس حقیقت کی جستجو کا جو زندگی کے خارجی پہلو کے پیچھے چھپی ہوئی تھی ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو حکمی اور اذعانی نہیں تھا۔

اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان میں فلسفے پر چند گنے چنے فلسفیوں کی اجارہ داری نہیں تھی۔ فلسفہ عوام کے مذہب کا بنیادی جزو تھا۔ اور ایک لطیف شکل میں ان تک پہنچ کر ان میں وہ فلسفیانہ نظر پیدا کر دیتا تھا جو ہندوستان میں بھی اسی طرح عام ہو گئی تھی جیسے چین میں۔ اس فلسفیانہ نظر کا مفہوم کچھ لوگوں کے نزدیک گہرا اور پیچیدہ تھا اور وہ اس کا مقصد یہ سمجھتے تھے کہ اس کی مدد سے اشیاء کے اسباب اور قوانین کا پتہ چلائیں، زندگی کے آخری مقصد کی جستجو کریں اور زندگی کے گوناگوں تضاد میں ایک بنیادی اتحاد کی تلاش میں سرگرم ہوں۔ لیکن اکثر لوگوں کے لئے یہ فلسفہ ایک سیدھی سادی چیز تھی۔ پھر بھی اس فلسفے سے انھیں مقصد، سبب اور نتیجے کا احساس ہوتا تھا اور ان میں زندگی کی سختیاں اور بد نصیبیاں برداشت کرنے کی ہمت اور اطمینان اور سکون کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے ڈاکٹر تائی چی تاؤ (Tai chi-Tao) کو ایک مرتبہ لکھا تھا کہ چین اور ہندوستان کا فلسفہ تکمیل کی جستجو اور زندگی کے تضاد کو حیات کی مسرت میں جذب کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس فلسفہ اور فکر کے کچھ حصے نے ان پڑھ اور جاہل عوام کو بھی متاثر کیا۔ اور ہم نے ابھی دیکھا کہ سات سال کی خوفناک جنگ کے بعد بھی چینیوں کے عقیدے میں تذبذب اور ان کے ذہنوں کی شگفتگی میں کمی نہیں آئی۔ ہندوستان میں ہماری آزمائش زیادہ سخت اور زیادہ طویل ہے۔ غریبی اور حد درجے کی فلاکت مدتوں سے ہمارے کبھی نہ بچھڑنے والے ساتھی بنے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ہم ہنستے ہیں، ناچتے ہیں اور گاتے ہیں اور مایوس نہیں ہوتے۔

۷۔ مطابقت و امتزاج ۔ ذات پات کے نظام کی ابتدا

ہندوستان میں آریا قوم کی آمد نے نئے سیاسی اور جماعتی مسائل پیدا کر دیئے۔ مفتوحہ جماعت یعنی دراوڑوں کے پیچھے تہذیب کا ایک وسیع پس منظر تھا۔ اور اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آریا اپنے آپ کو دراوڑوں سے بہت زیادہ برتر سمجھتے تھے اور اس چیز نے دونوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل کر دی۔ ان دراوڑوں کے علاوہ ہندوستان میں کچھ دیسی قبیلے خانہ بدوشوں اور جنگلی آدمیوں کے بھی تھے۔ ان قبیلوں اور مختلف گروہوں کے باہمی اختلاف اور میل جول سے ہندوستان میں ذات پات کی ریت شروع ہوئی اور اس نے آگے چل کر ہندوستان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ ذات پات کا یہ نظام نہ غالباً آریائی تھا اور نہ دراوڑی۔ یہ اصل میں مختلف جماعتوں اور فرقوں کی سماجی تنظیم کی، اور اُس وقت کے حالات اور واقعات کے مطابق ان کی عقلی ترتیب کی ایک کوشش تھی۔ اس تنظیم میں آگے چل کر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئیں اور آج یہ ہمارے لئے ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ لیکن ہم ذات پات کی تنظیم کی اچھائیوں اور برائیوں کا اندازہ اس کی اس بدلی ہوئی شکل اور موجودہ صورت سے نہیں کر سکتے۔ یہ تنظیم جس زمانے میں شروع ہوئی، اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے بے حد موزوں تھی۔ اس طرح کی تقسیم و تنظیم تقریباً ہر پرانی تہذیب کے شروع میں ہوتی رہی ہے، گو چین بظاہر اس سے بچا رہا۔ آریا قوم کی ایک اور شاخ یعنی ایرانیوں میں، ساسانی عہد میں جماعت چار طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گو ان چار طبقوں نے کبھی ذات پات کی شکل اختیار نہیں کی۔ ان پرانی تہذیبوں میں سے اکثر کی بنیاد

جن میں یونانی تہذیب بھی شامل ہے، قوم کی غلامی پر قائم تھی۔ ہندوستان میں اس طرح بڑے پیمانے پر مزدور پیشہ جماعت کی غلامی کا رواج نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے گھرانوں میں غلاموں کی ایک مختصر اور محدود تعداد تھی۔ افلاطون نے اپنی 'ریاست' میں سوسائٹی کی اسی طرح کی تقسیم کا ذکر کیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے کیتھولک لوگوں میں بھی ایسی تقسیم رائج تھی۔

ہندوستان میں ذات پات آریا اور غیر آریا کی گہری تقسیم سے شروع ہوئی۔ غیر آریا قوموں میں دراوڑی اور ہندوستان کے دیسی قبیلے دونوں شامل تھے۔ آریا لوگوں نے شروع شروع میں اپنے آپ کو صرف ایک ذات تک محدود رکھا۔ لفظ آریا کا مادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کاشت کرنا۔ آریا لوگ تقریباً سب کے سب کاشت کار تھے اور کاشت کاری کو ایک اونچا پیشہ سمجھتے تھے۔ کاشت کار ہی پنڈت کا کام کرتے تھے اور سپاہی اور تاجر کا بھی۔ اور لوگ پنڈتوں کو کوئی مخصوص اونچی جماعت نہ سمجھتے تھے۔ ذات پات کا جو فرق آریا لوگوں نے اپنے آپ کو غیر آریوں سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے شروع کیا تھا، اس نے خود رفتہ رفتہ اُن پر بھی اثر کیا اور جوں جوں تقسیم کار کا دائرہ بڑھتا گیا اس نئی تقسیم نے ذاتوں کی شکل اختیار کر لی۔

اس طرح ایک ایسے زمانے میں جب عام طور پر یہ رواج تھا کہ فاتح قوم یا تو مفتوح قوموں کو سرے سے ختم کر دیتی تھی یا انھیں غلام بنا لیتی تھی، ذات پات نے ایک زیادہ پُرامن حل پیش کر دیا اور اس حل سے آگے چل کر تقسیم کار کے طریقہ کو اور بھی زیادہ مدد ملی۔ زندگی میں مدارج پیدا ہو گئے اور جو قوم پہلے صرف کاشتکاروں کی قوم تھی اس میں سے رفتہ رفتہ تین ذاتیں پیدا ہو گئیں۔ ویش، جن میں کاشت کار، دست کار اور تاجر شامل تھے؛ چھتری، جو حاکموں یا

اور سپاہیوں کی جماعت تھی، اور برہمن، اور مفکر جن کا کام جماعت کی رہبری اور رہنمائی اور قوم کے آدرشوں کی حفاظت تھا۔ ان تین ذاتوں کے نیچے چوتھی جماعت شودروں یا مزدوروں اور موٹا کام کرنے والوں کی تھی۔ ملکی قبیلوں میں سے اکثر کو سماجی سیڑھی میں سب سے نیچے شودروں میں جگہ مل گئی گھلنے ملنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ شروع شروع میں ان ذاتوں میں ایک لوچ اور لچک تھی، سختی اور پابندی بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ غالباً حاکم جماعت کو سب سے زیادہ آزادی حاصل تھی، اور جب کسی مہم کو فتح حاصل کر کے یا کسی اور طرح طاقت مل جاتی۔ اُسے یہ آزادی تھی کہ وہ چاہے تو چھتریوں کی ذات میں شامل ہو جائے اور پھر برہمنوں سے کہہ کر اپنے لئے ایسا شجرہ بنوالے کہ اس کا سلسلہ کسی قدیم آریا سورما سے جا ملے۔

؎ "آریا" کا مفہوم اب کسی نسل سے متعلق نہیں رہا اور اُس کے معنی صرف "شریف" کے ہو گئے اور "غیر آریا" کا مفہوم "رذیل" رہ گیا اور خانہ بدوش اور جنگلی قوموں کا شمار اسی رذیل طبقے میں ہونے لگا۔

ہندوستانی دماغ ہمیشہ سے حد درجہ تجزیہ پسند رہا ہے، یہاں تک کہ وہ خیالات اور تصورات اور زندگی کے معمولات کو بھی الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنے کا عادی تھا اور اس لئے آریا لوگوں نے نہ صرف سوسائٹی کو چار طبقوں میں تقسیم کیا بلکہ انسانی زندگی کے چار حصے کر دیے۔ پہلا حصہ بچپن اور ابتدائے شباب کا تھا۔ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جس میں انسان علم حاصل کرنے کے علاوہ ضبط نفس اور زہد اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ دوسرے حصے میں انسان گھریلو اور دنیاداری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ تیسرے حصے میں انسان کی حیثیت ایک بڑے بوڑھے سیاست داں کی ہوتی تھی، جو

دنیاوی تجربہ اور سوجھ بوجھ سے اپنے آپ کو بے غرض قومی خدمت میں لگا سکے
چوتھا حصہ ایسے زہد اور پرہیزگاری کی زندگی تھی جس میں انسان دنیا سے
بے تعلق ہو کر رہتا تھا۔ اس طرح ان لوگوں نے انسان کی ان دو متضاد
کیفیتوں کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی، جو اُسے کبھی زندگی کی طرف
مائل کرتی ہیں اور کبھی اُسے مردود قرار دیتی ہیں۔

چین اور ہندوستان میں ہمیشہ علم و فضل بڑی عزت کی نظر سے دیکھا
جاتا تھا، اس لئے کہ علم کے عموماً دو مفہوم سمجھے جاتے تھے — دانش اور نیکی۔
بادشاہ اور سپاہی دونوں عالم کے آگے سر جھکاتے تھے۔ پرانا ہندوستانی نظریہ
یہ تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت اور حکومت ہوتی ہے ان کی نیت قطعی طور
پر بے لوث نہیں ہو سکتی۔ اُن کے ذاتی میلانات اور رجحانات ان کی قومی خدمات
میں حائل ہوتے ہیں۔ اور اس لئے قدروں کا تعین اور اخلاقی معیاروں کا تحفظ
مفکروں کی ایک ایسی جماعت کے سپرد کیا جاتا تھا جو دنیاوی افکار و آلام سے
آزاد ہوں تاکہ وہ زندگی کے مسائل پر بے تعلقی کے ساتھ غور و فکر کر سکیں۔
یہی وجہ تھی کہ مفکروں اور فلسفیوں کی اس جماعت کو سماجی نظام میں سب سے
اونچی جگہ ملتی تھی اور سب لوگ اس کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ حاکم اور
سپاہیوں کا نمبر ان کے بعد آتا تھا، وہ خواہ کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں۔
ان کی عزت پہلی جماعت کے مقابلے میں کم ہوتی تھی۔ دولت اور ثروت کا مرتبہ
عزت و احترام کے خیال سے اس کے بھی اور بعد آتا تھا۔ لڑنے والی جماعت،
گو اس نظام میں سب سے اونچی منزل پر نہیں تھی، پھر بھی دلوں میں اس کا بیحد
احترام تھا۔ چین کی طرح، اس جماعت کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔
یہ نظریہ کسی نہ کسی حد تک دوسرے ملکوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً عہد وسطیٰ

کے یورپ میں عیسائیت کا یہی حال تھا۔ سارے روحانی، مذہبی اور اخلاقی معاملات میں، یہاں تک کہ حکومت کے عام اصولوں میں بھی روم کے پادری نے رہنما اور رہبر کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور عملی حیثیت سے روم نے دنیاوی معاملات میں بھی بے حد دلچسپی لینی شروع کر دی، یہاں تک کہ گرجا کے پادری نے اپنے مخصوص دائرے میں حاکم کا درجہ حاصل کر لیا۔ ہندوستان میں بھی برہمنوں کی جماعت جہاں ایک طرف مفکروں اور فلسفیوں کی جماعت تھی وہاں وہ ایک بااثر مذہبی جماعت بھی تھی جس نے اپنے مخصوص حقوق کی حفاظت کو اپنا ایک اہم فرض بنا رکھا تھا۔ پھر بھی اس نظریے نے ہندوستانی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اور ایک ایسا انسان ہمیشہ اس کا آدرش رہا جو عالم فاضل ہو، کریم ہو، فطرتاً نیک ہو، ضبطِ نفس رکھتا ہو اور اس میں دوسروں کے لیے ایثار اور قربانی کی صلاحیت موجود ہو۔ لیکن برہمنوں کی جماعت میں ہمیشہ سے وہ سارے عیوب موجود رہے ہیں جو ایک امتیازی اور مخصوص جماعت میں پیدا ہو جانے لازمی ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ہوئے ہیں جن میں نہ علم تھا اور نہ نیکی۔ پھر بھی عوام کے دلوں میں ان کی عزت قائم ہے، اس لیے نہیں کہ ان کے قبضے میں دنیاوی جاہ و حشم اور مال و دولت ہے، بلکہ اس لیے کہ ان کی جماعت میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے آدمیوں کی بہت بڑی تعداد گذری ہے اور انھوں نے عوام کی بہبودی کے لیے جو خدمات انجام دیں یا جو قربانیاں کیں وہ بے حد اہم ہیں۔ گو ہر زمانے میں کچھ نمایاں شخصیتوں کی مثال نے پوری جماعت کو فائدہ پہنچایا تاہم عوام کی عزت و احترام کا معیار سرکاری مرتبہ نہیں بلکہ ذاتی صفات ہی رہی ہیں۔ عام رواج یہ تھا کہ جس کسی شخص میں علم و فضل ہوتا یا نیکی ہوتی، لوگ اس کی عزت کرتے۔ اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں کہ لوگوں نے غیر برہمن اور نیچ ذات کے لوگوں کی بھی بے حد

عزت کی اور انھیں مہاتما سمجھا۔ سرکاری عہدے یا فوجی اقتدار سے خواہ لوگ خائف ہو جائیں لیکن ان چیزوں کی عزت ان کی نظر میں ہرگز نہیں تھی۔

آج کل، مال و دولت کے اس زمانے میں بھی پرانی روایتوں کا اثر باقی ہے اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ گاندھی (جو برہمن نہیں) ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر بن سکتا ہے اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو زور، دباؤ، سرکاری اقتدار یا دولت مندی کے بغیر بھی تسخیر کر سکتا ہے۔ کسی قوم کی تہذیبی روایات اور اس کے مرئی یا غیر مرئی اثرات کا پتہ لگانے کی یہ کسوٹی بہت اچھی ہے کہ وہ قوم کس طرح کے لیڈر کے سامنے اپنا سر جھکاتی ہے۔

پرانی ہندوستانی تہذیب یا ہند آریائی تہذیب کا مرکزی خیال 'دھرم' تھا جس کا مفہوم محض مذہب یا عقیدہ سے کچھ زیادہ وسیع ہے۔ اپنی ذات اور دوسروں کی ذات کے ساتھ انسان کے جو فرائض وابستہ ہیں ان کی تکمیل کا نام دھرم ہے۔ دھرم اصل میں 'ریت' کا ایک حصہ ہے۔ ریت اس بنیادی اخلاقی قانون کو کہتے ہیں جو کائنات اور اس کی موجودات کے مناسب عمل کی رہبری کرتا ہے۔ اگر کائنات کا نظام کچھ حقیقت رکھتا ہے تو انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کا جزو صحیح بن کر عمل کو اس سے ہم آہنگ بنائے۔ اگر آدمی اپنے فرائض کو پورا کرے اور اس کا عمل اخلاقی اصول کے مطابق درست ہو تو لازمی طور پر اس عمل کے صحیح نتیجے پیدا ہوں گے۔ 'حقوق' بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کسی حد تک ہر جگہ پرانا نقطۂ نظر یہی تھا۔ اور اس میں اور آج کل کے نظریے میں نمایاں تضاد نظر آتا ہے، جو ہر جگہ حقوق طالب ہے، افراد کے حقوق، جماعتوں کے حقوق اور قوموں کے حقوق۔

۸۔ ہندوستانی کلچر کا تسلسل

اس طرح اس ابتدائی زمانے میں ہمیں اس تہذیب و تمدن کے اولین نقوش نظر آنے لگتے ہیں جس نے آگے چل کر اس قدر فروغ پایا اور جو، باوجود متعدد تبدیلیوں کے آج تک موجود ہے۔ بنیادی آدرشوں اور منظم تصورات کی تشکیل ہو رہی تھی اور ادب اور فلسفہ، آرٹ اور ڈراما اور زندگی کی باقی سرگرمیاں ان آدرشوں اور تصوروں سے متاثر ہو رہی تھیں۔ اسی زمانے میں ہمیں علیحدگی اور چھوت چھات کا بیج پھوٹتا نظر آتا ہے جو آگے چل کر ایک زہریلا درخت بن گیا اور اس کی جڑیں برابر پھیلتی چلی گئیں اور ہمارے زمانے میں آکر انھوں نے ذات پات کے نظام کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی تشکیل ایک خاص زمانے کے لیے ہوئی تھی، اور اس خاص زمانے میں اس کا مقصد سماجی نظام کو مرتب کر کے اس میں قوت اور توازن پیدا کرنا تھا — لیکن آگے چل کر یہی چیز سماجی نظام اور انسانی ذہن دونوں کے لیے سم قاتل بن گئی۔ وہ امن اور سلامتی جس کی تلاش تھی حاصل ہو گئی لیکن اساسی ترقی کو کھو کر۔

یہ صورت ایک طویل مدت کے بعد جا کر پیدا ہوئی لیکن اسی دوران میں ترقی کا بنیادی جذبہ اور تحریک اتنی قوی اور زبردست تھی کہ یہ سارے ہندوستان میں اور مشرق کے سمندروں تک پھیل گئی۔ اور اس میں اس درجہ مضبوطی اور استقلال تھا کہ متواتر دھکوں اور حملوں کے باوجود قائم رہی۔ پروفیسر میکڈانل نے اپنی "سنسکرت ادب کی تاریخ" میں ہمیں بتایا ہے کہ "مجموعی حیثیت سے ہندوستانی ادب کی اہمیت اس کی بدیع الخیالی (اوریجنلیٹی) ہے۔ جب چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں یونانیوں نے ہندوستان کے شمالی مغربی علاقے پر حملہ کیا تو

ہندوستانیوں کی اپنی ایک قومی تہذیب تھی اور اس پر بیرونی عناصر اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ اور فارسی، یونانی، سیتھی اور اسلامی حملوں اور فتوحات کے پے در پے طوفان کے باوجود، انگریزوں کے عہد تک ہند آریائی نسل کے لوگوں کی زندگی اور ادب برابر ترقی کرتی رہی اور بیرونی اثرات سے محفوظ رہی۔ ہند یورپی نسل کی کسی اور شاخ نے اس طرح الگ تھلگ رہ کر ارتقا کی منزلیں طے نہیں کیں۔ چین کے سوا دنیا کا کوئی اور ملک اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا کہ اُس کے ادب اور زبان، مذہب اور عقیدہ، سماجی اور معاشی رسوم کو تین ہزار برس سے بھی زیادہ مدت تک اس طرح بے روک ٹوک نشوونما کا موقع ملا ہو۔"

پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان تاریخ کی اس طویل مدت میں بالکل الگ تھلگ رہا۔ اُسے برابر ایرانیوں، یونانیوں، چینیوں، وسط ایشیا کی اور دوسری قوموں سے برابر سابقہ پڑتا رہا۔ اگر ہندوستان کی بنیادی تہذیب نے اس مسلسل سابقے کے باوجود اپنی امتیازی شان قائم رکھی تو یقیناً اس تہذیب ہی میں کوئی ایسی بنیادی طاقت، کوئی اندرونی قوت حیات اور زندگی کا احساس تھا جس نے اسے باقی رکھا۔ تین چار ہزار برس کی اس مدت میں تہذیب کا مسلسل نشوونما پانا حیرت انگیز ہے۔ مشہور عالم اور مستشرق میکس مُلر نے اس ہندی تہذیب کی اسی خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے "حقیقت میں، ہندی فکر کے قدیم ترین اور اُس کے جدید ترین پہلوؤں کے درمیان ایک ایسا تسلسل ہے، جو تین ہزار برس سے بھی زیادہ طویل مدت میں پھیلا ہوا ہے۔"

اسی جوش میں اور آگے چل کر اپنے ان لکچروں میں جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں دیے تھے، میکس مُلر نے کہا ہے کہ "اگر ہم ساری دنیا پر نظر ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ دنیا کا کونسا ملک ایسا

ہے جسے فطرت نے اپنی ساری دولت، قوت اور خوبصورتی عطا کی ہو — یہاں تک کہ وہ دنیا میں بہشت کا نمونہ بن جائے — تو میں ہندوستان کا نام لوں گا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کس آسمان کے سایے میں انسانی ذہن کی قوتوں نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے، اور کہاں اس نے زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل پر غور و فکر کر کے، ان میں سے اکثر کے ایسے حل دریافت کئے ہیں، جو افلاطون اور کانٹ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی اہمیت رکھتے ہیں — تو میں ہندوستان کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور اگر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ہم یورپ والے جن کے ذہن کی پرورش یونانیوں اور رومیوں کے فلسفے سے، یا سامی النسل یہودیوں کی فکر کے دامن میں ہوئی ہے، اپنی اصلاح کس ادب سے کر سکتے ہیں؟ — ایسی اصلاح جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے، تاکہ ہم اپنی داخلی زندگی کو زیادہ مکمل، زیادہ جامع اور زیادہ ہمہ گیر بنا سکیں یا دوسرے لفظوں میں اس میں صحیح معنوں میں انسانیت پیدا کر سکیں، ایسی انسانیت جو صرف اس عارضی حیات کے لئے نہ ہو، بلکہ حیاتِ ابدی سے تعلق رکھتی ہو — تو میں پھر ہندوستان ہی کا نام لوں گا۔"

اس کے تقریباً نصف صدی بعد رومیں رولاں نے بھی کچھ اسی انداز کی باتیں لکھی: "اگر روئے زمین پر کوئی جگہ ہے جسے انسان کے ان سارے خوابوں کا گہوارہ کہہ سکتے ہیں، جو اس نے ابتدائے آفرینش سے دیکھنے شروع کئے تھے، تو وہ ہندوستان ہے۔"

۹ - اُپنشد

اپنشد، جن کا زمانہ تقریباً ۸۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے، ہند آریائی

فکر کے ارتقا کا ایک اور قدم ہے اور بہت بڑا قدم ہے۔ اس وقت تک آریا قوم ہندوستان میں اچھی طرح رس بس چکی ہے، اور یہاں ایک مستحکم اور خوش حال تہذیب کا ارتقا ہو چکا ہے۔ یہ تہذیب نئے اور پرانے عناصر کا مجموعہ ہے، جس پر آریوں کی فکروں اور آدرشوں کا غلبہ ہے، لیکن اس فکر اور آدرش کے پس منظر میں عبادت کے بالکل ابتدائی طریقے بھی جھلک رہے ہیں۔ اس دور میں جب ویدوں کا ذکر ہوتا ہے تو اس میں احترام کے جذبے کے ساتھ ساتھ ایک ہلکا سا طنز بھی ہوتا ہے۔ ویدوں کے دیوتا اب لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور پروہتوں کی مذہبی رسمیوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ماضی سے بے تعلق ہو جانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس ماضی کو آئندہ کی ترقی کے لئے سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

اپنشد، تحقیق کے جذبے، ذہنی تگ و دو اور حقیقتِ اشیا کی جستجو کے ولولے سے معمور ہیں۔ حقیقت کی تلاش اور جستجو کا طریقہ بے شک جدید سائنس کے طریقوں کی طرح معروضی نہیں، لیکن اس نقطۂ نظر میں سائنٹفک طریقۂ کار کی جھلک ضرور موجود ہے۔ کوئی مذہبی عقیدہ اس تلاش کی راہ میں حائل نہیں ہوتا، گو اس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو آج ہمارے لئے بے حقیقت اور بے معنی ہے۔ یہ تحقیق سب سے زیادہ زور تکمیل نفس پر دیتی ہے یا اپنی ذات اور ذات مطلق کی معرفت پر، اس لئے کہ ان دونوں ذاتوں کو حقیقت میں ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ خارجی دنیا کو بے حقیقت نہیں سمجھا جاتا، لیکن اسے ایک اضافی مفہوم میں حقیقی سمجھا جاتا ہے یعنی یہ حقیقت داخلی حقیقت کا ایک پہلو ہے۔

اپنشدوں میں بہت سی جگہ ابہام ہے اور اس لئے ان کی مختلف تاویلیں

کی گئی ہیں۔ لیکن اس بات کا زیادہ تعلق فلسفیوں اور محققوں سے ہے۔ اپنشدوں کی فکر کا عام رجحان وحدت وجود کی طرف ہے اور فکر کے اس انداز کا مقصد غالباً ان اختلافات کو دور کرنا تھا جو اس زمانے کے لوگوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جن سے شدید بحث و نزاع کا دروازہ کھل گیا تھا۔ یہ ترکیب و امتزاج کی ایک کوشش ہے۔ سحر اور مافوق الفطرت علم کی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی ہے۔ اور ان مذہبی ریتوں اور رسموں کو فضول بتایا گیا ہے جن میں عقل سے کام نہ لیا جائے۔ "جو لوگ اس طرح کی رسموں میں مصروف رہ کر بھی اپنے آپ کو عالم اور دانش مند سمجھتے ہیں، ان کی مثال ان اندھوں کی سی ہے جو بغیر کسی مقصد کے دوسرے اندھوں کی رہبری میں لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے ہیں اور کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچتے۔" ویدوں تک کے علم کو ادنیٰ علم سمجھا جاتا ہے: اعلیٰ علم صرف وہ ہے جس کا تعلق ذہن کی گہرائیوں سے ہے۔ اور اس لئے اپنشدوں نے برابر اس طرح کے فلسفیانہ علم کے خلاف تنبیہ کی ہے جو بغیر صحیح ذہنی تربیت کے حاصل کیا گیا ہو۔ اس فکر میں، سماجی عمل اور روحانی جدوجہد کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک مسلسل کوشش کا جذبہ موجود ہے۔ انسان کے لئے زندگی کے فرائض اور علائق کی تکمیل ضروری ہے، لیکن بے تعلقی کے جذبے کے ساتھ۔

اس دور میں غالباً تکمیل نفس کے فلسفہ پر حد سے زیادہ زور دیا گیا اور اس لئے جماعتی نقطۂ نظر کو اس سے نقصان پہنچا۔ اپنشدوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "انسانی ذات سے زیادہ بلند کوئی اور چیز نہیں۔" اپنشد کے مفکروں نے غالباً جماعت اور سماج کے متعلق یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ مکمل اور مستحکم ہو گئی اور اس لئے ان کا ذہن برابر "تکمیل نفس" کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ اس تکمیل

کی جستجو میں اس نے آسمانوں کی سیر بھی کی اور دل کی گہرائیوں کی بھی - ہندوستان کا
یہ قدیم نقطۂ نظر محدود قومی نقطۂ نظر نہیں تھا، اگرچہ ہندوستانی بھی چینیوں، یونانیوں
اور رومیوں کی طرح یہ ضرور سمجھتے ہوں گے کہ ہندوستان دنیا کا محور ہے۔ مہابھارت
میں ایک جگہ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ " سارا عالم انسانیت ایک جسم اجتماعی
ہے جس کے مختلف اعضا ایک دوسرے سے وابستہ ہیں "۔

اپنشدوں میں مختلف مسائل پر جن الہیاتی پہلوؤں سے غور کیا گیا ہے
وہ میری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ لیکن مجھے اس چیز نے بے حد متاثر کیا
کہ جن مسائل پر اندھے عقیدہ کا پردہ پڑا ہوا تھا انھیں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا
گیا۔ فکر کا یہ انداز مذہبی نہیں، فلسفیانہ ہے۔ مجھے اس فکر کا جوش، اس کا انداز
استفسار اور اس کا عقلی اور استدلالی پس منظر پسند ہے۔ اپنشد کی شکل استاد اور
شاگرد کے درمیان سوال اور جواب کی سی ہے اور بعض محققوں کا خیال ہے کہ
یہ کتاب کسی استاد کے لکھے ہوئے یا اس کے شاگردوں کے لئے ہوئے نوٹ
ہیں۔ پروفیسر ایف۔ ڈبلو۔ ٹامس نے اپنی کتاب Legacy of India
میں لکھا ہے " جس چیز نے اپنشد کو ایک عجیب و غریب حیثیت اور یقینی تاثیر
دی ہے، وہ اس کا پر خلوص لہجہ ہے گویا دو بے تکلف دوست گہرے ذاتی
مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں "۔ سی۔ راج گوپال اچاریہ ان کا ذکر کرتے ہوئے
پر زور انداز میں کہتے ہیں " تخیل کی وسعت، فکر و نظر کی بلند پروازی، اور
جذبۂ تحقیق کی بے باکی، جو سچ کی پیاس نے پیدا کی ہے، اس کی رہنمائی میں اپنشد
کے استاد اور شاگرد دونوں کائنات کے " راز آشکارا " کی گہرائیوں میں
ڈوبتے ہیں اور اس طرح دنیا کا یہ قدیم ترین مذہبی صحیفہ ایک جدید ترین اور
دلنشین کتاب بن جاتا ہے۔"

اپنشد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی فکر کا انحصار حق و صداقت پر ہے "سچائی کی جیت ہوتی ہے، جھوٹ کی نہیں۔ معرفت الٰہی کی راہ سچ ہی کی رہنمائی میں طے ہوتی ہے" اور اپنشد کی ایک مشہور دعا میں روشنی اور بصیرت طلب کی گئی ہے۔ "مجھے جھوٹ کی راہ سے ہٹا کر سچ کی راہ دکھا! مجھے اندھیرے سے اجالے میں لے جا! مجھے موت سے نکال کر حیات جاوداں کا راستہ بتا!"

اپنشد میں ہر جگہ ایک بے قرار طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے ___ جسے تلاش و تحقیق کی قلش کبھی چین نہیں لینے دیتی۔ "کس کے حکم سے دماغ اپنا نشیمن ڈھونڈھتا ہے؟ کس کے حکم سے زندگی اپنا سفر شروع کرتی ہے؟ اور کس کے حکم سے انسان تقریر کرتا ہے؟ کس خدا نے آنکھ اور کان کو راستہ دکھایا ہے؟" اور آگے چل کر "ہوا ساکن کیوں نہیں رہ سکتی؟ اور انسانی دماغ کو سکون کیوں میسر نہیں؟ پانی کیوں بہتا ہے، کیوں اس کی روانی ذرا سی دیر کے لئے بھی نہیں تھمتی؟ کیوں؟ کس کی تلاش میں؟ مہم جوئی کا تقاضا انسان کو برابر چھیڑ کر آگے بڑھاتا رہتا ہے، برابر یہ سفر جاری ہے راستے میں کہیں مقام نہیں اور سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔" 'ایتریا برہمن' میں ایک بھجن اسی طویل اور کبھی ختم نہ ہونے والے سفر کے متعلق ہے، اور جو ہم میں سے ہر ایک کو کرنا ہے۔ اس بھجن کا ہر حصہ ان لفظوں پر ختم ہوتا ہے "چرائی دلی، چرائی دتی ___" اور اس لئے لئے مسافر، چلا چل! چلا چل۔"

اس تلاش میں کہیں عجز و انکسار نہیں ___ وہ عجز و انکسار جو ایک قادر مطلق ہستی کے سامنے ضروری ہے جس سے مذہب کا تصور عموماً وابستہ ہوتا ہے۔ یہ تلاش ماحول پر ذہن کی فتح مندی کی نشانی ہے۔ "میرا جسم مٹ کر خاک ہو جائے گا،

میری سانس جا کر بے قرار اور غیر فانی ہوا میں مل جائے گی، لیکن میں نہیں مٹوں گا، میرے عمل نہیں مٹیں گے۔" اے دماغ! یہ بات یاد رکھ، ہمیشہ یاد رکھ۔" صبح کی ایک دعا میں سورج کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے "اے درخشاں عظمت والے آفتاب! میں ہی وہ ہوں، جس نے تجھے وہ بنایا جو تو ہے"۔ کتنی پر عظمت خود اعتمادی ہے!

روح کیا ہے؟ اس کی تشریح و تعریف صرف منفی انداز میں کی جا سکتی ہے: "وہ یہ بھی نہیں اور یہ بھی نہیں"۔ یا ایک طرح سے اثباتی انداز میں بھی "وہ تو ہی ہے"۔

فرد کی روح ایک چنگاری کی طرح ہے جو روح مطلق کی آتش فروزاں سے جھڑتی ہے اور پھر اسی میں جذب ہو جاتی ہے" جیسے آگ ایک حقیقت ہے، لیکن جب وہ دنیا میں داخل ہوتی ہے، تو جس چیز کو جلاتی ہے اسی کے مطابق اپنی صورت بدل لیتی ہے۔ اسی طرح روح مختلف جسموں میں داخل ہو کر مختلف بن جاتی ہے۔ حالانکہ خود اس کی کوئی شکل نہیں"۔ یہ تصور کہ ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے، ہمارے اور دوسری اشیا کے درمیان سے رکاوٹیں اور پردے ہٹا لیتا ہے اور انسان اور قدرت میں باہمی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اور دنیا کے اختلاف اور گوناگونی میں ایک ربط اور ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے۔ "جو چیز ہر شے کا علم رکھتی ہے، وہ ایک ذات واحد ہے۔ جو شخص ایک مرتبہ 'وحدت' کو دیکھ لیتا ہے اس کے لئے نہ کوئی غم ہے نہ کوئی دھوکا" اور جب اس ذات واحد میں سب چیزیں نظر آتی ہیں اور جو ہر شے میں اس ذات کا جلوہ دیکھتا ہے، اس کی نظر سے وہ کبھی نہیں چھپ سکتا۔"

ہنداریوں کی حد درجے کی انانیت اور خلوت پسندی کا مقابلہ اگر ہم فکر کے

اس ہمہ گیر نظریہ سے کریں، جو ذات اور جماعت کی ہر رکاوٹ سے اور دوسرے خارجی اور داخلی اختلافات سے بلند و برتر ہے، تو یہ بڑا دلچسپ مطالعہ ہوگا۔ یہ دوسرا نظریہ ایک طرح کی الٰہیاتی جمہوریت ہے۔ "جو کوئی ہر شے میں ایک روح کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس ایک روح میں اُسے سب کچھ نظر آتا ہے، وہ اب کسی مخلوق کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔" اگرچہ یہ محض ایک نظریہ تھا، لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے زندگی کو متاثر کیا ہوگا اور اُس میں رواداری اور معقول پسندی کی فضا پیدا کر کے مذہبی امور میں آزاد خیالی کو روا رکھ کر انسان میں "زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کی وہ خواہش اور صلاحیت پیدا کی ہوگی جو (چینی تہذیب کی طرح) ہندوستانی تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب یا تہذیب کسی ایک جماعت کی ملکیت نہیں۔ وہ ایک قدیم اور دانشمندانہ تہذیب کی نشانیاں ہیں اور ان کے پیچھے اَن تھک ذہنی کاوشوں کا سرمایہ ہے۔

اپنشدوں میں ایک سوال ہے جس کا ایک نہایت عجیب لیکن معنی خیز جواب دیا گیا ہے۔ سوال ہے کہ "کائنات کیا ہے؟ یہ کہاں سے نکلی ہے اور کہاں جائے گی؟" اور جواب یہ ہے کہ "یہ آزادی سے نکلی ہے، آزادی پر قائم ہے اور آزادی میں جذب ہو جائے گی۔" اس جواب کا صحیح مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا، سوائے اس کے اپنشدوں کے مصنفوں کے نزدیک آزادی کے تخیل کی بیحد اہمیت تھی۔ یہ تخیل ان کے دلوں سے قریب تھا اور اس لئے وہ ہر چیز کو اسی کی روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ سوامی وویکانند ہمیشہ اس پہلو پر زور دیا کرتے تھے۔

عمر کی مدد سے بھی ہمارے لئے یہ بات آسان نہیں کہ ہم اس دور افتادہ دور کے رنگ میں ڈوب کر اس کی ذہنی فضا کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ تحریر کا انداز بھی ایسا ہے جس کے ہم قطعی عادی نہیں، اس قدر عجیب و غریب کہ اس کا ترجمہ

کرنا مشکل ہے — اور زندگی کا پس منظر بھی بالکل مختلف ہے۔ ہم اپنے زمانے کی بہت سی عجیب اور نامعقول باتوں کو صحیح فرض کر لیتے ہیں محض اس لئے کہ ہم ان کے عادی ہیں لیکن جس چیز کے ہم قطعی عادی نہیں اُس کا تصور اور اس کا ادراک کہیں زیادہ دشوار ہے۔ ان ساری دشواریوں اور ناقابل فتح رکاوٹوں کے باوجود، ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور میں اپنشد کے پیغام کو لوگوں نے توجہ اور دلچسپی سے سنا ہے اور اس پیغام سے قومی مزاج اور کردار پر قوی اثرات پڑے ہیں۔ بلوم فیلڈ نے اس پیغام کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہندی فکر کا کوئی نمایاں پہلو ایسا نہیں (حتیٰ کہ بودھ مت کا آزاد خیال فلسفہ بھی) جو اپنشد کے فلسفہ میں موجود نہ ہو۔"

ابتدائی ہندی افکار ایران ہوتے ہوئے یونان پہنچے اور انھوں نے وہاں کے بعض مفکروں اور فلسفیوں کو متاثر کیا۔ ذرا بعد کے زمانے میں فلوطین ایرانی اور ہندی فلسفہ کا مطالعہ کرنے کے لئے مشرقی ممالک میں آیا اور اس نے اپنشدوں کے صوفیانہ عناصر کا اثر قبول کیا۔ ان افکار میں سے اکثر فلوطین کے ذریعے سے سینٹ اگسٹین تک پہنچے اور اس کے ذریعے سے ان افکار نے اس زمانے کی عیسائیت پر اپنا اثر ڈالا۔ [1]

---

[1] رومین رولاں نے ویکانند پر جو کتاب لکھی ہے اس کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر ابتدائی صدیوں کے یونانی مسیحی تصوف اور اس کے ہندی تصوف کے باہمی تعلق کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "صدہا باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ دوسری صدی عیسوی میں یونانی فکر میں مشرقی افکار بہت کثرت سے شامل ہو گئے تھے۔

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں یورپ نے ہندی فلسفہ کو نئے سرے سے دریافت کیا اور یورپ کے فلسفیوں اور مفکروں پر اس کا بے حد قوی اثر پڑا۔ اس سلسلہ میں یورپ کے قنوطی فلسفی شوپنہار کی رائیں اکثر پیش کی جاتی ہیں۔ "اپنشد کے ہر جملے سے گہرے، جدید اور بلند افکار کا پتہ چلتا ہے اور اس کے سارے فکر پر ایک بلند، پاک اور پر خلوص جذبہ چھایا ہوا نظر آتا ہے.......... ساری دنیا میں کوئی مطالعہ...... اتنا فائدہ مند اور رفعت بخش نہیں جتنا اپنشدوں کا......... یہ رفیع ترین دانش کی تخلیق ہیں......... اور دیر سویر یہ یقینی ہے یہ فکر لوگوں کا ایمان بن جائے۔" اور آگے چل کر شوپنہار نے کہا ہے "اپنشدوں کا مطالعہ میری زندگی کے لئے وجہ تسکین بنا ہے۔ یہی مطالعہ میری موت کو بھی پر سکون بنائے گا۔" اس رائے کے متعلق میکس ملر نے کہا ہے کہ "شوپنہار ہرگز ایسا انسان نہیں جو کوئی بات اندھا دھند کہہ دے یا غیر مربوط صوفیانہ خیالات پر سر دھننے لگے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں نہ خوف محسوس ہوتا ہے نہ تامل کہ 'ویدانت' کے متعلق میری رائے میں بھی وہی جوش ہے جو شوپنہار کی رائے میں اور میں اس کا ممنون ہوں کہ اس فلسفہ نے زندگی کے سفر میں میری بڑی رہبری کی ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر میکس ملر کہتا ہے "اپنشد...... ویدانت فلسفہ کا...... سرچشمہ ہیں ـــ اور ویدانت کا فلسفہ ایک ایسا نظام ہے جس میں انسانی فکر اپنے عروج پر پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے"۔ "میری زندگی کے سب سے زیادہ خوش گوار اوقات وہ ہوتے ہیں جب میں ویدانت کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میرے لئے ان میں صبح کی درخشانی اور پہاڑوں کی نرم ہوا کی تازگی ہے ـــ اگر انسان ایک مرتبہ ان کا مطلب سمجھ لے تو

معلوم ہوتا ہے ان میں کتنی سادگی ہے اور کتنی سچائی ؟"
لیکن اپنشدوں اور ان کے بعد کی کتاب بھگوت گیتا کو مغرب سے جو خراج تحسین ملا ہے اس میں شاید سب سے زیادہ پرجوش الفاظ آئرلینڈ کے شاعر جی ۔ ڈبلیو ۔ رسل کا ہے ۔ " نئے مفکروں میں گوئٹے، ورڈزورتھ، ایمرسن اور تھورو میں اس جوش اور دانش مندی کا تھوڑا سا عکس موجود ہے ۔ لیکن جو کچھ ان مفکروں نے کہا ہے، وہ سب کچھ اور اس سے بھی بہت زیادہ مشرق کی پرشکوہ مذہبی کتابوں میں موجود ہے ۔ بھگوت گیتا اور اپنشدوں میں ہر موضوع اور ہر شے کے متعلق علم و دانش کا وہ ربانی تصور ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے پرسکون انداز میں ہزاروں جوشیلی زندگیوں اور ان کی سرگرم روحانی جستجو اور جدوجہد کا مطالعہ کیا ہوگا، جب جا کر وہ ان چیزوں کے متعلق اس قدر وثوق کے ساتھ لکھ سکے ہوں گے جن کا روح انسانی کو یقین ہے ۔"[1]

---

[1] اپنشدوں میں سے ایک (چندوگیا) میں ایک عجیب و غریب اور دلچسپ عبارت ہے ۔ " سورج نہ کبھی ڈوبتا ہے، نہ نکلتا ہے ۔ جب آدمی سوچتے ہوتے ہیں کہ سورج غروب ہو رہا ہے تو حقیقت میں سورج دن کا دورہ ختم کر کے دوسری طرف چلا جاتا ہے اور اس دن کو رات اور دوسری طرف کے حصے کو دن میں بدل دیتا ہے ۔ اور جب لوگ صبح کے وقت یہ سوچتے ہیں کہ اب سورج نکل رہا ہے تو حقیقت میں سورج رات کا سفر ختم کر کے اس طرف چلا آتا ہے اور اس حصے کو دن بنا کر دوسرے حصے کو رات بنا دیتا ہے ۔ حقیقت میں وہ غروب کبھی نہیں ہوتا ۔"

۱۰۔ فلسفۂ انفرادیت کے اچھے اور بُرے پہلو

اپنشدوں میں برابر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حقیقی ترقی جسمانی صحت اور دماغی صفائی اور جسم اور دماغ دونوں کی باقاعدہ تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ حصول علم کے لئے، یا کوئی اور کارِ نمایاں کرنے کے لیے انسان کو ضبط نفس اور ایثار سے کام لینا پڑتا ہے اور تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ کسی نہ کسی قسم کی ریاضت یا تپسیا کا جذبہ ہندوستانی فکر کا ایک جزو لازم ہے اور یہ جذبہ عالی منصب مفکروں میں بھی عام رہا ہے اور ان پڑھ عوام میں بھی۔ یہ جذبہ جس طرح اب سے ہزاروں برس پہلے ہندوستانی زندگی میں موجود تھا اسی طرح اب بھی موجود ہے۔ اور ان عمومی تحریکوں کی بنیادی نفسیات کو سمجھنے کے لئے، جنھوں نے گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان بھر میں ہلچل سی مچا دی تھی، اس جذبہ کا سمجھنا ضروری ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اپنشدوں کے مصنفوں کے دقیق و نازک خیالات صرف ایک ایسے مخصوص طبقہ کے لوگوں تک محدود تھے جن میں ان خیالات کے سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ وہ عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر تھے۔ فکری تخلیق کرنے والی جماعت ہمیشہ اقلیت میں ہوتی ہے، لیکن اگر وہ اکثریت کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو اور ہمیشہ اکثریت کو بلندی اور ترقی کی راہوں پر لگانے میں کوشاں رہے تاکہ دونوں گروہوں کا باہمی تفاوت دور ہو جائے تو ایسی صورت میں ایک ترقی پذیر اور مستحکم تہذیب ظہور میں آتی ہے۔ اگر فکر کرنے والی اقلیت نہ ہو تو یقینی طور پر تہذیب کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اقلیت اور اکثریت کے باہمی تعلق ٹوٹ جائیں تو بھی سخت خطرہ ہوتا ہے

رشتہ ٹوٹ جائے تو اس صورت میں بھی تہذیب کا زوال ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ باہمی رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد عمومی طور پر سماج میں معاشی اتحاد باقی نہیں رہتا اور آخر کار اقلیت اپنی قوتِ تخلیق کھو بیٹھتی ہے اور نخل بے ثمر ہو کر رہ جاتی ہے یا اس کی جگہ سوسائٹی کوئی دوسری تخلیقی قوت پیدا کر لیتی ہے۔

دوسروں کی طرح میرے لئے بھی اپنشدوں کے عہد کا تصور اور اُن قوتوں کا تجزیہ دشوار ہے جو اس دور میں سرگرم تھیں۔ تاہم اتنا میں بھی سوچ سکتا ہوں کہ فکر کرنے والی اقلیت اور نہ سوچنے والے عوام کے درمیان جو ذہنی اور معاشی تفاوت تھا اس کے باوجود ان دونوں گروہوں میں ایک تعلق تھا' کم از کم دونوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ تھی۔ جس سوسائٹی میں یہ لوگ رہتے تھے اس میں معاشرتی درجہ بندی تھی مگر اسی کے ساتھ ذہنی مدارج میں بھی فرق تھا اور اس فرق کو لوگ تسلیم کرتے اور اُنھیں زندگی کا ایک لازمی جزو سمجھتے تھے۔ اس چیز سے کسی نہ کسی طرح کی معاشی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی اور باہمی اختلافات کے مواقع نہیں پیدا ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنشدوں کی فکر کی تاویل بھی عوام کے نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی تاکہ وہ عوامی عقائد اور میلانات سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس فکر نے اپنا بنیادی مفہوم کھو دیا۔ سماج کے اس تدریجی نظام میں ذرا بھی دخل نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وحدت وجود کا تصور توحید کا مذہبی تصور بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے ادنیٰ درجے کے عقیدوں اور عبادتوں کو نہ صرف رواداری کی نظر سے دیکھا جاتا تھا بلکہ ان کی ہمت افزائی کی جاتی تھی تاکہ مختلف طبقوں کے عقائد ان کے مدارج ارتقا کے مطابق ہوں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنشدوں کے افکار نے عوام کی زندگی پر کوئی نمایاں اثر نہیں کیا اور سوچنے والی اقلیت اور عوام کے درمیان جو ذہنی تفاوت تھا وہ اور بھی واضح ہوگیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، آئندہ زمانے میں اس تفریق و تفاوت نے نئی تحریکوں کی شکل اختیار کرلی — مادی فلسفہ کی ایک پر زور لہر، پھر لا دریت اور دہریت۔ ان تحریکوں سے اور آگے چل کر بودھ مت اور جین مت پیدا ہوئے اور انھیں سے سنسکرت کے مشہور رزمیے رامائن اور مہا بھارت وجود میں آئے — اور ان سب نے دوبارہ مختلف عقیدوں اور فکر کے مختلف اندازوں میں ایک امتزاج اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان عہدوں میں مفکر جماعت کے تخلیقی کارنامے زیادہ واضح نظر آتے ہیں اور اس اقلیت اور عوام کی اکثریت کے درمیان ایک باہمی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے دونوں گروہ ہم خیال اور ہم سفر دکھائی دیتے ہیں۔

اور اس طرح ایک دور کے بعد دوسرا آتا ہے اور ان مختلف دوروں میں فکر اور عمل، ادب اور ڈراما، سنگ تراشی اور معماری کے علاوہ، تمدن، تبلیغ اور آبادکاری کے میدانوں میں تخلیقی سرگرمی کا بے پایاں جوش دکھائی دیتا ہے۔ ان مختلف دوروں کے درمیان بے آہنگی، تفریق اور انتشار کے دور بھی آتے رہتے ہیں، جو کبھی تو اندرونی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور کبھی بیرونی مداخلت کا۔ لیکن اس طرح کے انتشار کے ہر دور کے بعد تخلیقی سرگرمی کا ایک تازہ دور آتا ہے اور اس انتشار پر غلبہ پالیتا ہے۔ اس طرح کا آخری اہم بالشان دور جس میں مختلف سمتوں میں تخلیقی سرگرمیاں عمل میں آئیں وہ کلاسیکی دور ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں شروع ہوا۔

ایک ہزار سنہ عیسوی یا اس سے کچھ پہلے سے ہندوستان میں اندرونی تخریب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے، گو اس عہد میں بھی فن کارانہ تخلیق کا جذبہ کارفرما رہا اور ہندوستان میں نفیس فنی کارناموں کی تخلیق ہوئی۔ نئی نسلیں ہندوستان میں آئیں تو اپنے ساتھ نئے تخیلی پس منظر لے کر آئیں اور ان کی آمد نے ہندوستان کے تھکے ہوئے ذہن اور روح میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ پھر اس نئے ربط نے نئے مسائل پیدا کئے اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندآریوں کی گہری انفرادیت نے، رفتہ رفتہ تہذیب پر اچھے اور برے اثرات ڈالے۔ اسی انفرادیت نے تاریخ کے مختلف دوروں میں، بار بار بلند و برتر شخصیتیں پیدا کیں۔ اسی انانیت نے پوری تہذیب میں ایک عین پسندانہ اور اخلاقی فضا پیدا کی اور خواہ اس فضا سے عمل پر کوئی نمایاں اثر نہ ہو لیکن وہ ہر دور میں موجود رہی اور اب تک بھی ہے۔ اسی فضا اور ماحول نے اور سوسائٹی کی بلند و برتر شخصیتوں کی مثال نے سماجی نظام کو قائم رکھا اور جب کبھی اس میں انتشار کے آثار پیدا ہوئے اُسے نئے سرے سے درست کر دیا۔ اور ان کوششوں نے تہذیب و تمدن کے چمن کو اور بھی زیادہ تر و تازہ اور شاداب کر دیا۔ گو یہ تمدن ایک محدود جماعت کی میراث تھا تاہم اس نے عوام کو بھی کسی نہ کسی حد تک متاثر کیا۔ ان لوگوں میں دوسروں کے عقائد اور خیالات سے رواداری کا جو جذبہ تھا اُس کی وجہ سے یہ اس کشمکش سے محفوظ رہے جس سے سماجی نظام میں انتشار اور افتراق پیدا ہوتا ہے، اور اس طرح ہمیشہ ایک خاص طرح کا توازن قائم رہنے میں بے حد مدد ملی، زندگی کے اس وسیع دائرہ میں انھوں نے لوگوں کو اپنی پسند اور مرضی کی زندگی بسر کرنے

کا موقع دیا اور یہ ایک ایسی دانشمندی تھی جو صرف ایک پرانی اور پختہ کار قوم سے ظہور میں آسکتی تھی ـــــ انفرادیت کے یہ سارے کارنامے مجموعی حیثیت سے بے حد اہم ہیں۔

لیکن اسی انفرادیت نے انھیں یہ بھی سکھایا کہ وہ انسان کے معاشی پہلو کو کوئی اہمیت نہ دیں اور فرد پر جو فرائض معاشرے کی طرف سے عائد ہوتے ہیں انھیں اہم نہ جانیں۔ اس درجہ بند سماج میں، ہر شخص کی اپنی علیحدہ، مقررہ اور بٹی ہوئی زندگی تھی اور اس زندگی میں اس کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں تھیں جنھیں وہ اپنے محدود حلقہ میں پورا کرتا تھا۔ اُسے نہ معاشرے کے وجود کا احساس تھا اور نہ اس کے ذمہ معاشرے کی طرف سے کوئی فرض عائد تھا۔ اور اس میں یہ سماجی احساس پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی تھی۔ سماجی احساس کا تصور بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، کسی قدیم سوسائٹی میں اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ اور اس لئے قدیم ہندوستان میں اس کی موجودگی کی توقع عبث ہے۔ تاہم ہندوستان میں انفرادیت، علیحدگی اور سماج کی درجہ بندی کو ایک خاص طرح کی اہمیت حاصل تھی۔ یہی علیحدگی آگے چل کر ہندوستانی ذہن کے لئے ایک قید خانہ ثابت ہوئی ـــــ نہ صرف نچلے طبقوں کے لئے جنھیں اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچا بلکہ اونچے طبقوں کے لئے بھی۔ ہماری تاریخ کا اول سے آخر تک یہ ایک کمزور پہلو تھا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوں جوں ذات پات کے نظام کی سختی بڑھتی رہی ذہن کے لوچ میں بھی فرق آتا رہا اور رفتہ رفتہ قوم کی تخلیقی قوت ختم ہو کر رہ گئی۔

ایک اور عجیب حقیقت بھی نمایاں اور واضح ہے۔ ہندوستانیوں میں

ہر طرح کے عقیدے، روایت یا احمقانہ توہم پرستی تک کے لئے روا داری کا جو جذبہ تھا وہ مضر بھی ثابت ہوا اور اس نے قوم میں بہت سے مضر رسوم پیدا کرکے انھیں روایتی بوجھوں کے نیچے دبا دیا اور ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ پروہتوں نے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور عوام کی توہم پرستی کی بنیادوں پر اپنے مفاد کی اونچی عمارت کھڑی کرلی۔ پروہتوں کے طبقہ کا اثر اور اقتدار یہاں شاید اتنا زیادہ کبھی نہیں ہوا جتنا عیسوی مذہب کے بعض فرقوں میں، اس لئے کہ یہاں بہت سے روحانی قائد ایسے بھی تھے جو اس طبقے کی حرکتوں کو برا کہتے تھے۔ لیکن پروہتوں کا اثر اور اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ عوام ہمیشہ ان کے ہاتھوں میں رہے۔ اور انھوں نے ہمیشہ عوام کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔

مذہب کے معاملے میں یہ آزاد خیالی اور تعصب دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے اور ان دونوں سے مل کر متکلم فلسفیوں کا گروہ اور مذہبی رسوم پرستی کے معاملے میں ایک انتہا پسند جماعت وجود میں آئی۔ لوگ ہمیشہ قدیم مفکروں کی رائیوں کو مستند جان کر انھیں اپنا رہبر بناتے تھے لیکن ان کی صداقتوں کو بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخلیقی اور روحانی قوتوں میں زوال آگیا اور جو چیز پہلے زندگی اور معنویت سے معمور تھی وہ ایک کھوکھلا اور بے معنی خول ہو کر رہ گئی۔ اروبندو گھوش نے لکھا ہے کہ "اگر اپنشدوں کے زمانے، بودھ مت یا کلاسیکی عہد کے کسی قدیم ہندوستانی کو لاکر موجودہ ہندوستان میں کھڑا کر دیا جائے...... تو اسے یہ نظر آئے گا کہ اس کی قوم نے ماضی کی ظاہری صورتوں، چھلکوں اور چیتھڑوں کو اپنے سینے میں لگا رکھا ہے اور معنوی خوبیوں کو نوے فی صدی کھو بیٹھی ہے۔

"......اُسے اپنی قوم کی ذہنی مفلسی، جمود اور بے حسی کو اور قوم میں علمی اور ادبی گرمجوشی کے فقدان اور تخلیقی جذبہ کی کمزوری کو دیکھ کر انتہائی حیرت ہوگی۔"

۱۱۔ مادّیت

انسان کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس نے دنیا کے قدیم ادب کا بہت سا حصہ گنوا دیا ہے — ہندوستان میں، یونان میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں، شاید ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لئے کہ یہ کتابیں شروع شروع میں کھجور کے پتّوں یا بھوج پتر پر لکھی جاتی تھیں (جو ایک درخت کی نازک چھال ہوتی تھی اور بڑی آسانی سے گھس جاتی تھی) اور بعد میں کاغذ پر۔ اُس زمانے میں کتاب کی صرف تھوڑی سی جلدیں ہوتی تھیں۔ اگر یہ جلدیں کھو جائیں یا برباد ہو جائیں تو گویا وہ کتاب ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی تھی، اور اس کا پتہ صرف اس کے حوالوں یا اقتباسوں سے چل سکتا تھا جو دوسری کتابوں میں موجود ہوں۔ اس کے باوجود سنسکرت یا اس زبان کی دوسری شاخوں میں لکھے ہوئے پچاس یا ساٹھ ہزار مخطوطات کا پتہ اب تک چل چکا ہے اور برابر نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ بہت سی پرانی ہندوستانی کتابیں اب تک ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوئیں لیکن اُن کے تبّتی اور چینی ترجمے ملے ہیں۔ اگر مذہبی اداروں، خانقاہوں اور مختلف لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں منظم طریقے پر کھوج لگایا جائے تو غالباً اس طرح کی اور بہت سی کتابیں نکل سکیں گی۔ غلامی کی بیڑیاں توڑ دینے کے بعد جب ہم اپنی مرضی سے کام کر سکیں گے تو من جملہ اور چیزوں کے اس طرح کی کتابوں کا کھوج، مخطوطات کی تحقیقی اور تنقیدی جانچ پڑتال اور ان میں سے چند مناسب اور موزوں مخطوطات کا ترجمہ اور اشاعت اس طرح کے کام ہیں جو ہمیں ہندوستان

میں کرتے ہیں۔ اس طرح کے مطالعے سے یقیناً ہندوستانی تاریخ کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑے گی، خصوصاً تاریخی واقعات اور بدلتے ہوئے تصورات کے عمرانی پس منظر پر۔

متواتر تباہیوں اور بربادیوں کے باوجود اور ایسی صورت میں کہ مخطوطات کی تلاش میں کوئی متحدہ کاوش اور کوشش نہیں کی گئی، پچاس ہزار سے بھی زیادہ مخطوطات کا برآمد ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ پرانے زمانے میں علمی، ڈرامائی، فلسفیانہ اور دوسری تصانیف کی کتنی کثرت تھی۔ جو مخطوطات ملے ہیں اُن میں سے بہت سی ابھی تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھی گئی ہیں۔

پرانے زمانے کی جو تصانیف معدوم ہو گئیں ان میں مادیت کے فلسفیانہ ادب کا وہ سارا ذخیرہ بھی شامل ہے جو اپنشدوں کے ابتدائی دور کے بعد ظہور میں آیا۔ اس طرح کے مواد کی موجودگی کا جو ثبوت ہمارے پاس موجود ہے وہ یا تو اُن تنقیدوں کی صورت میں ہے جو اس فلسفہ پر کی گئیں اور یا ان تحریروں کی شکل میں جو مادیت کے نظریوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے لکھی گئیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ مادیت کے فلسفہ کو ہندوستان میں صدیوں تک مانا گیا اور ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگوں پر اس کا بہت گہرا اثر تھا۔ کوٹلیا کی مشہور سیاسی اور معاشی کتاب ارتھ شاستر میں (جو چوتھی صدی عیسوی میں لکھی گئی) مادیت کو ہندوستان کے اہم فلسفیوں میں سے ایک بتایا گیا ہے۔

ان حالات میں اس فلسفے کے متعلق ہمیں جو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یا اس کے نقادوں کی زبانی ہیں اور یا ایسے لوگوں کی زبانی جو اس فلسفے کی تنقیص کرنا اور اس کا مذاق اڑانا اور یہ دکھانا چاہتے تھے کہ یہ بالکل فضول اور بے معنی ہے۔ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جاننے کے لئے ہم

اس کے مخالفوں کے محتاج ہیں۔ لیکن اسے بڑا ثابت کرنے کی جو زبردست خواہش ان لوگوں میں تھی اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ ان لوگوں کی نظر میں کتنا اہم تھا۔ ہندوستان میں مادیت پر جتنا مواد موجود تھا، بہت ممکن ہے کہ اُسے پروہتوں اور مذہب کے کٹر عقیدت مندوں نے آگے کے دوروں میں جل کر مٹا دیا ہو۔

مادی فلسفہ ہر طرح کی حکمرانی، فکر، مذہب اور دینیات کی اجارہ داری کا مخالف تھا۔ مادی فلسفی ویدوں اور ویدانت پروہتوں اور روایتی عقیدوں کو برا کہتے تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ عقیدہ کو آزاد ہونا چاہیے۔ اس کی بنیاد محض مفروضات یا ماضی کی مستند روایات پر نہیں ہونی چاہیے۔ وہ سحر اور اوہام پرستی کی ہر صورت پر لعن طعن کرتے تھے۔ ان کا عام انداز بہت سی حیثیتوں سے جدید مادیت سے مشابہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو ماضی کے بوجھ اور اس کی زنجیروں سے آزاد کرنا چاہتے تھے — وہ ماضی جو انھیں غیر محسوس چیزوں پر غور و فکر کرنا سکھاتا تھا اور فرضی دیوتاؤں کی پوجا کی تعلیم دیتا تھا۔ مادیت تو صرف اس چیز کے وجود کی قائل تھی جو دیکھی جا سکے۔ جو چیز دکھائی نہیں دیتی اس کے متعلق کوئی رائے یا مفروضہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس لئے صرف مادہ (اپنی مختلف شکلوں میں) اور یہ دنیا ہی ایسی چیزیں ہیں جو واقعی موجود کہا جا سکتا ہے۔ جسم سے الگ نہ کوئی دوسری دنیا ہے نہ بہشت نہ دوزخ اور نہ کوئی روح۔ دماغ، ذہانت اور اس طرح کی اور بہت سی چیزیں سب بنیادی عناصر سے پیدا ہوئی ہیں۔ مظاہر فطرت کو انسانی قدروں سے ذرا بھی واسطہ نہیں، اور وہ ہمارے نیک و بد کے تصورات سے بے نیاز ہیں۔ اخلاقی قوانین محض انسان کے اپنے بنائے ہوئے رسوم ہیں۔

یہی ساری باتیں آج ہم مانتے ہیں، اور یہ باتیں اب سے دو ہزار برس پہلے کی نہیں بلکہ خود ہمیں اپنے زمانے کی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ خیالات کیسے پیدا ہوئے؟ یہ شبہے، یہ اختلافات، اور روایتی اقتدار کے خلاف انسانی ذہن کی یہ بغاوت —— یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں؟ ہمیں اس زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات کا زیادہ علم نہیں لیکن ان واقعات سے ایک بات واضح طور پر نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ زمانہ سیاسی تصادم اور معاشی اضطراب کا تھا اور اسی اضطراب نے عقیدے کو ذہنی تحقیق و جستجو کی طرف مائل کیا تھا کہ اس جستجو میں شاید کوئی ایسی راہ مل جائے جو ذہن کو مطمئن کر سکے۔ اسی ذہنی اضطراب اور معاشی انتشار کا نتیجہ تھا کہ نئی راہیں نکلیں اور فلسفیانہ فکر کے نئے نظاموں کی تشکیل ہوئی۔ فلسفہ نے اب اپنشدوں کے روحانی انداز نظر کو چھوڑ کر ذرا باقاعدگی اختیار کر لی ہے اور اس کی بنیاد دلائل و براہین پر ہے —— یہ فلسفہ مختلف لباس پہن کر ہمارے سامنے آیا —— بودھ مت کا لباس، جین مت کا لباس اور اس مذہب کا لباس جسے ہم کسی مناسب لفظ کی کمی کی وجہ سے ہندو مذہب کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی رزمیہ کتابیں اور بھگوت گیتا اسی دور کی کتابیں ہیں۔ اس دور کے فکر کو کسی منظم شکل میں ترتیب دینا مشکل ہے اس لئے کہ فکر اور نظریے ایک دوسرے سے مخلوط ہیں اور ان میں عمل اور ردعمل کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری ہے۔ بودھ چھٹی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ فکر کے بعض عناصر کا ارتقا ان سے پہلے ہوا، بعض کا ان کے بعد، اور اکثر کئی عناصر ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے رہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب بودھ مت کی نشو و نما ہو رہی تھی ایران کی سلطنت سندھ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک زبردست حکومت سے اس قرب

نے ہندوستانی فکر پر یقیناً اثر ڈالا ہوگا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں شمالی مغربی ہندوستان پر سکندر کا حملہ ہوا۔ یہ حملہ بجائے خود تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن یہ ہندوستان کی بعض اہم تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سکندر کی وفات کے تقریباً فوراً بعد ہی چندر گپت نے موریہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں یہ پہلی قومی اور وسیع مرکزی حکومت تھی۔ روایتوں میں اس طرح کے بہت سے طاقت ور حکمرانوں کا تذکرہ ہے اور ایک رزمیہ تصنیف میں تو شمالی ہند کی حکومت اور شہنشاہی کے لئے ایک باقاعدہ جنگ کا بھی ذکر ہے۔ لیکن جہاں تک قیاس کہتا ہے، غالباً قدیم ہندوستان بھی، قدیم یونان کی طرح، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھا۔ یہاں بہت سے قبیلوں کی جمہوریتیں تھیں، اور ان میں سے بعض دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی تھیں اور یونان کی طرح، یہاں بھی شہری ریاستیں تھیں جن پر بااقتدار تاجروں کا قبضہ تھا۔ بودھ کے زمانہ میں اس طرح کی متعدد جمہوری ریاستیں تھیں اور وسطی اور شمالی ہندوستان میں چار بڑی سلطنتیں تھیں (جن میں گندھار اور افغانستان بھی شامل تھے)۔ حکومت کا نظام خواہ کچھ بھی ہو، شہری یا دیہی، ریاست شخصی حیثیت سے بہت مضبوط تھی اور بڑی سلطنت کی شہنشاہی تسلیم کر لینے کے بعد بھی اس کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ یہ ریاست غالباً جمہوریت کی ابتدائی صورت تھی، گو یونان کی طرح یہاں بھی ایک محدود طبقے کا قبضہ تھا۔

قدیم ہندوستان اور یونان گو بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ان میں اتنی زیادہ یکسانی ہے کہ مجھے اس بات کا یقین سا ہے کہ دونوں کی زندگی کا پس منظر بھی ایک ہی سا ہوگا۔ پلوپنیشیا کی

لڑائی، جس نے یونانی جمہوریت کا خاتمہ کر دیا، بعض حیثیتوں سے قدیم ہندوستان کی مشہور جنگ مہابھارت سے ملتی جلتی ہے۔ یونانی قومیت اور آزاد شہری ریاست کے خاتمے اور ناکامی نے یونانیوں میں شک اور مایوسی کا جذبہ پیدا کر دیا اور اسرار و الہام کی جستجو سے قوم کے ابتدائی بلند آدرش پستی کی طرف مائل ہو گئے۔ فکر کا مرکز اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا اور آگے چل کر فلسفے کے نئے اسکول ـــ ابیقوری اور رواقی فلسفہ ـــ پیدا ہو گئے۔

اس طرح کی خفیف اور بعض حیثیتوں سے متضاد معلومات کی بنیاد پر دو تاریخی تہذیبوں میں تاریخی تقابل کرنا خطرناک بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ پھر بھی بعض اوقات انسان اس پر مجبور سا ہو جاتا ہے۔ مہابھارت کی لڑائی کے بعد کے دور میں ذہنی انتشار کی جو فضا ہندوستان میں تھی اس کے تصور کے ساتھ ذہن یونان کے اس دور تک پہنچ جاتا ہے جب یونانی قومیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ آدرشوں میں اوچھاپن اور ابتذال پیدا ہو رہا تھا اور ذہن نئے فلسفوں کی جستجو میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ سیاسی اور معاشی حیثیت سے غالباً دونوں جگہ ایک ہی سی اندرونی تبدیلیاں ہو رہی ہوں گی ـــ مثلاً قبیلوں کی جمہوریت اور شہری ریاست کو کمزور کر کے حکومت کی طاقت کو مرکزی بنا دینے کا خیال۔

لیکن اس تقابل کے سہارے سے ہم کچھ زیادہ دور تک نہیں چل سکتے۔ در اصل یونان کبھی ان صدموں سے پنپ نہ سکا، حالانکہ یونانی تہذیب بحیرۂ روم کے علاقوں میں کئی صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس نے روم اور یورپ پر اپنا اثر ڈالا۔ برخلاف اس کے ہندوستان نے حیرت انگیز طریقے سے اپنے آپ کو سنبھالا اور مہابھارت اور رامائن کے عہد اور بودھ عہد کے بعد کے ایک ہزار سال ہندوستان میں تخلیقی سرگرمیوں سے پُر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں

اَن گنت نام ایسے ہیں جو فلسفہ، ادب، ڈراما، ریاضی اور دوسرے فنون کے میدانوں میں چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ابتدائی عیسوی صدیوں میں تخلیقی اور عملی سرگرمیوں کے پورے جوش اور شباب کا زمانہ ہے۔ اسی جوش نے اپنی سرگرمی نوآبادیات میں دکھائی اور ہندوستانی اور اُن کی تہذیب مشرقی سمندروں میں دور دور کے جزیروں میں جا پہنچی۔

۱۲۔ رزمیہ، تاریخ، روایت اور دیومالا

ہندوستان کی دو بڑی رزمیہ کتابوں ـــــ رامائن اور مہابھارت ـــــ کی تدوین غالباً کئی صدیوں میں پوری ہوئی اور بعد میں آنے والے دوروں میں ان میں اضافے بھی ہوتے رہے۔ ان کتابوں میں ہند آریوں کے ابتدائی زمانے کا ذکر ہے، جب وہ اپنے آپ کو پھیلانے اور منظم کرنے کے لئے لڑائیاں لڑ رہے تھے اور فتوحات حاصل کر رہے تھے ـــــ لیکن ان کتابوں کی ترتیب و تدوین بہت بعد میں ہوئی۔ میرے خیال میں دنیا میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں جس نے عوام کے ذہن پر اتنا مسلسل اور اتنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہو جتنا ان دو کتابوں نے ـــــ گویا یہ کتابیں اب سے ہزاروں برس پہلے لکھی گئی تھیں لیکن ہندوستانیوں کی زندگی میں اب بھی ان کا اثر جاری و ساری ہے۔ اور یہ اثر اور تاثیر سنسکرت کے اصلی صحیفوں سے نہیں بلکہ ان کتابوں کے ترجموں اور خلاصوں سے اور اُن اَن گنت طریقوں سے پیدا ہوئی جن سے روایت و داستان پھیل کر لوگوں کی زندگی کے رگ و ریشے میں سرایت کرتی ہے۔

یہ دونوں کتابیں ہندوستان کے اس روایتی طریقے کی نمائندگی کرتی ہیں جو اونچے طبقے کے ارباب دانش سے لے کر نیچے طبقے کے اَن پڑھ اور سادہ

گنواروں تک تہذیبی ارتقا کے مختلف مدارج کو ملحوظ رکھتا ہے۔ ان کتابوں سے ہمیں
ہندوستانی زندگی کے ان بھیدوں کا پتہ ملتا ہے جن سے ایک منتشر اور متفرق
جماعت میں اجتماع اور اتحاد پیدا کیا جاتا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو
سوسائٹی مختلف طریقوں سے بٹی اور بکھری ہوئی تھی، جس میں ذاتوں
کی مختلف سیڑھیاں تھیں اُس کے اختلافات کو دور کرکے کس طرح اُسے
ہم آہنگ بنایا جاتا تھا اور مشترک شجاعانہ روایات اور اخلاقی زندگی کے
سانچے میں ڈھالا جاتا تھا۔ جان بوجھ کر لوگوں میں فکر و عمل کی ایسی وحدت
پیدا کی جاتی تھی جو کثرت پر غالب آجائے۔

بچپن کی جو یادیں اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں اُن میں رزمیہ کتابوں
کی وہ کہانیاں بھی ہیں جنھیں میں نے اپنی والدہ یا گھر کی دوسری بڑی بوڑھیوں
سے سنا تھا ــــ بالکل اُسی طرح جیسے یورپ اور امریکا کے بچے پریوں کی
کہانیاں یا بہادری کے قصے سنتے ہیں۔ ان کہانیوں میں میرے لئے بہادری
کی داستانوں کا لطف بھی تھا اور پریوں کی کہانیوں کا بھی۔ ہر سال میں ایک مرتبہ
میں رام لیلا کا تماشا دیکھنے جاتا تھا، جہاں کھلے میدانوں میں لوگ ان کہانیوں کا
رہس کرتے تھے اور ہزاروں آدمی اس تماشے کو دیکھنے اور جلوس میں شریک
ہونے کے لئے آتے تھے۔ یہ تماشے بھدّے اور ان گھڑ ہوتے تھے مگر اس سے
کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے کہ کہانی ہر ایک کو لفظ بلفظ یاد ہوتی تھی مطلب
خوشی منانے سے تھا اور وہ حاصل ہو جاتا تھا۔

اس طرح ہندوستان کی دیومالا اور پرانی روایتیں میرے ذہن میں
داخل ہوئیں اور تخیل کی بنائی ہوئی اور بہت سی تصویروں میں گھل مل گئیں۔
مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کہانیوں کو کبھی لفظ بلفظ سچ نہیں سمجھا بلکہ میں ان

کے ساحرانہ اور فوق عادت حصوں پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ پھر بھی یہ کہانیاں تخئیلی حیثیت سے میرے لیے، اتنی ہی سچی اور صحیح تھیں جتنی الف لیلہ کی کہانیاں یا پنچ تنتر کی جانوروں کی کہانیاں، جن میں سے بہت مغربی ایشیا اور یورپ نے اپنالی ہیں[1]۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا اور بہت سی تصویریں میرے ذہن میں جمع ہوتی رہیں — ہندوستان اور یورپ کی پریوں کی کہانیاں، یونانی دیو مالا کی کہانیاں، جون آف آرک کی کہانیاں، الیس ان ونڈرلینڈ کی کہانی، اکبر اور بیربل کے بہت سے لطیفے، شرلاک ہومز کی، بادشاہ آرتھر اور اس کے مصاحبوں کی، ہندوستانی غدر کی، نوجوان ہیروئین جھانسی کی رانی کی کہانیاں اور راجپوتوں کی بہادری اور جاں بازی کے قصے۔ ان قصے کہانیوں نے اور ان کے علاوہ اور

---

[1] پنچ تنتر کی کہانیوں کے جو ان گنت ترجمے اور خلاصے ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں میں ہوتے رہے ہیں ان کی داستان طول طویل، پیچیدہ اور بے حد دلچسپ ہے۔ پہلا ترجمہ چھٹی صدی عیسوی میں فارس کے شہنشاہ خسرو نوشیرواں کے حکم سے سنسکرت سے پہلوی زبان میں ہوا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد (۵۷۰ء میں) ایک ترجمہ سریانی میں ہوا اور کچھ دن بعد عربی زبان میں کیا گیا۔ دسویں صدی میں سریانی، عربی اور فارسی میں نئے ترجمے شائع ہوئے اور فارسی کا ترجمہ 'کلیلہ و دمنہ' کے نام سے مشہور ہوا۔ انھیں ترجموں کے ذریعے سے پنچ تنتر یورپ پہنچی۔ گیارھویں صدی کے آخر میں سریانی زبان سے ایک ترجمہ یونانی میں ہوا اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک ترجمہ عبرانی میں۔ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں لاطینی، اطالوی، ہسپانی، جرمن، سویڈی، ڈنمارکی، ہالینڈی، آئس لینڈی، فرانسیسی، انگریزی، ہنگری، ترکی اور متعدد سلافی زبانوں میں متعدد ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے اور اس طرح پنچ تنتر کی کہانیاں ایشیائی اور یورپی ادب میں جذب و پیوست ہو گئیں۔

بہت سی کہانیوں نے میرے ذہن میں ایک عجیب طرح کی پراگندگی پیدا کی لیکن اس پراگندگی میں بھی ہندوستانی دیومالا کی ان کہانیوں کا نقش جو میں نے اپنے بچپن میں سنی تھیں سب سے زیادہ واضح تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے ذہن پر جو متعدد اور متضاد اثرات پڑتے رہے جب اُن کے باوجود ان کہانیوں کا نقش میرے ذہن پر اتنا گہرا رہا تو دوسرے ذہنوں پر ان کا کتنا گہرا اثر ہوتا ہوگا اور خاص کر ہمارے اَن پڑھ عوام کے ذہنوں پر۔ وہ اکثر تہذیبی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے اور جو حسن اور تخیلی اشارے ان کہانیوں اور تمثیلوں میں پوشیدہ ہیں وہ میرے نزدیک ایسی چیز ہے جسے ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

ہندوستانی دیومالا صرف ان رزمیہ کتابوں تک محدود نہیں ہے اس کا سلسلہ ویدک عہد تک پہنچتا ہے اور سنسکرت ادب میں یہ مختلف صورتوں اور لباسوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ شاعروں اور ڈراما نگاروں نے دیومالا سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنی کہانیوں اور خوبصورت تصورات کی عمارت کھڑی کی ہے۔ مثلاً جب کوئی حسینہ "شجر اشوک" کے نیچے پہنچتی ہے تو اُس میں سے پھول ہی پھول برسنے لگتے ہیں۔ انھیں کہانیوں میں محبت کے دیوتا کام دیو اور اس کی بیوی رتی (سرخوشی) اور اُس کے دوست بسنت یا بہار کے دیوتا کی کہانی بھی ہے۔ من چلا کام دیو اپنا پھولوں سے لدا ہوا تیر شیو پر چلاتا ہے اور شیو کی تیسری آنکھ سے آگ کا ایک شعلہ نکل کر اُسے خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ اننگ (غیر مجسم) ہو کر پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

ان ساری کہانیوں کا جذبہ بہادرانہ اور جاں بازانہ ہے اور وہ ہر حال میں سچائی اور اپنی بات پر قائم رہنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان

زندگی بھر وفا شعار رہے، ہمت سے کام لے، اچھے عمل کرے اور دوسرے کی بھلائی کے لیئے اپنے آپ کو قربان کردے۔ کبھی کبھی تو کہانی محض افسانہ معلوم ہوتی ہے اور یا افسانہ اور حقیقت کا میل، کسی روایتی واقعہ کی مبالغہ آمیز شکل۔ افسانہ اور حقیقت اس طرح ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ ان کا الگ کرنا دشوار ہے اور یہ امتزاج تخیل کی پیدا کی ہوئی تاریخ بن جاتا ہے۔ اس تاریخ سے خواہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ واقعہ دراصل کیا تھا لیکن اتنی ہی اہم ایک دوسری بات معلوم ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ لوگ کس طرح کی باتوں کو سچ سمجھتے تھے، ان کے خیال میں اُن کے بزرگ کس طرح کے کارنامے کرسکتے تھے، اور کونسے آدرش اُن کے رہنما تھے۔ اس لیئے یہ باتیں حقیقت ہوں یا افسانہ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کہانیاں ان کی زندگیوں کا ایک پُرتاثیر عنصر بن گئی تھیں، اور اُنھیں روزانہ زندگی کی بدنما اور ناگوار تلخیوں سے نکال کر ایک بلند سطح پر لے جانے کی کوشش کرتی تھیں۔ انسان کو ہمیشہ جدوجہد اور صحیح زندگی کی راہ دکھاتی تھیں، خواہ آدرش کتنا ہی مشکل اور اس کی منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔

گوئٹے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو لوگ روم کی پرانی جانبازی کی داستانوں کو لکریشیا وغیرہ کے قصوں کو مصنوعی یا غلط بتاتے تھے وہ انھیں بہت برا کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "جو چیز بنیادی طور پر غلط یا مصنوعی ہے وہ ہمیشہ مہمل اور بے اثر ہوگی کبھی دلکش اور موثر نہیں ہوسکتی۔ اور اس لیئے اگر آدمیوں میں اتنی عظمت تھی کہ انھوں نے اس طرح کی چیزوں کی تخلیق کی تو ہم میں کم از کم عظمت تو ہونی چاہیئے کہ اُنھیں سچ سمجھیں۔"

اس طرح تخیل کی پیدا کی ہوئی یہ تاریخ، جو کہیں تو افسانہ اور حقیقت کا امتزاج ہے اور کہیں محض افسانہ، علامت کے طور پر حقیقت رکھتی ہے اور اس کی روشنی میں ہمیں ایک خاص زمانہ کے لوگوں کے دل و دماغ اور مقصد کی تصویریں نظر آجاتی ہیں۔ یہ

کہا جاسکتا ہے اس نقطۂ نظر سے بھی سچی ہیں کہ یہ ہمارے فکروعمل کی یا دوسرے لفظوں میں ہماری آیندہ تاریخ کی بنیاد بنتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں تاریخ کا سارا تصور فلسفہ و مذہب کے ان تخیلی اور اخلاقی رجحانات کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس زمانے میں لوگ واقعات کے مربوط تذکرے اور ان کی مسلسل تدوین کو بہت کم اہمیت دیتے تھے۔ زیادہ اہم ان کے نزدیک یہ چیز تھی کہ انسانی عمل اور تاریخی واقعات سے انسانی سیرت کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ یونانیوں کی طرح، ہندوستانی بھی انتہا درجے کی تخیلی اور فن کارانہ طبیعت رکھتے تھے۔ اور ماضی کے واقعات کا ذکر کرتے وقت دل کھول کر تخیل اور فن کاری سے کام لیتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر چیز سے، اپنے مستقبل کے عمل کے لئے کوئی نہ کوئی اخلاقی درس حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

بہ خلاف یونانیوں، چینیوں اور عربوں کے پرانے زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کو تاریخ نویسی کا شوق نہیں تھا۔ یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو سلسلہ وار مرتب اور مدوّن نہیں کر سکتے۔ واقعات ایک دوسرے میں اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ بڑا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ ہمارے محقق صبر اور محنت سے ہندوستانی تاریخ کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی کی کلہن کی تاریخ کشمیر، راج ترنگنی، ہی صرف ایک ایسی کتاب ہے جسے صحیح معنوں میں تاریخ کہا جا سکتا ہے اس کے علاوہ اگر ہم رامائن، مہا بھارت وغیرہ کی تخیلی تاریخ، کتبوں، سکوں اور دوسرے فنی اور عمارتی باقیات کا مطالعہ کریں اور سنسکرت ادب کے پورے دفتر کا جائزہ لیں تو کچھ اشارات ہاتھ آتے ہیں یا پھر دوسرے ملکوں سے خصوصاً یونان، چین اور عرب سے آنے والے سیاحوں کے سفرناموں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔

تاریخی حس کی اس کمی کا عوام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس لیے کہ دوسرے ملکوں کی طرح بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی کہیں زیادہ، انھوں نے نسلاً بعد نسل انھیں روایتوں، کہانیوں اور دیومالا سے جو کچھ ملتا رہا اسی کی بنیاد پر وہ ماضی کا تصور قائم کرتے رہے۔ تخیل کی پیدا کی ہوئی اور افسانہ اور حقیقت سے ملی جلی یہ تاریخ عوام کا سرمایہ بن گئی اور اسی سرمایے سے قوم کو ایک قوی اور مستقبل تہذیبی پس منظر مل گیا۔ لیکن تاریخ کی طرف سے بے توجہی برتنے کے برے نتیجے پیدا ہوئے جو اب تک چلے جا رہے ہیں۔ اس چیز نے ہماری نظر کو دھندلا اور ہمیں واقعی زندگی سے بے گانہ کر دیا۔ ہم میں زود اعتقادی پیدا ہو گئی اور واقعات کو صحیح رنگ میں دیکھنے کی عادت جاتی رہی۔ مگر فلسفے کے پیچیدہ، مبہم اور غیر معین مسائل میں ہمارے ذہن کا یہ حال نہ تھا۔ دراصل فلسفے کے معاملے میں تو وہ تحلیل اور ترکیب دونوں سے کام لیتا تھا بلکہ اکثر تنقیدی اور کبھی کبھی تشکیلی طرز اختیار کرتا تھا۔ لیکن جہاں واقعات سے بحث ہو وہاں اس کا انداز بالکل غیر تنقیدی ہوتا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ فلسفہ واقعے کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔

سائنس اور عہد جدید کے اثرات کی بدولت ہندوستانی ذہن اب واقعات کو زیادہ اہمیت دینے لگا ہے۔ اس میں تنقید کی صلاحیت، شہادتوں کو جانچنے اور تولنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ روایات پر محض ان کی قدامت کی وجہ سے آمنّا و صدقنا نہیں کہتا۔ بہت سے ماہر مورخ واقعات کی تحقیق میں مصروف ہیں لیکن اب وہ دوسرے پہلو پر حد سے زیادہ زور دے رہے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں جیتی جاگتی تاریخیں نہیں بلکہ محض واقعات کی ترتیب وار فہرستیں ہیں۔ تاہم آج بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جہاں روایت کا قدم درمیان میں آیا ہم ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اچھے خاصے ذہن اور روشن خیال آدمیوں کی قوت تنقید ماؤف ہو جاتی

ہے یہ ممکن ہے یہ قوم پرستی کے جذبے کا نتیجہ ہو جو ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔
ہمارا ذہن صرف اس وقت صحیح طور پر کام کرنے کے قابل ہوگا جب ہم سیاسی اور معاشی
حیثیت سے آزاد ہو جائیں گے۔

ابھی حال ہی میں تنقیدی نقطۂ نظر اور قومی روایات کی باہمی کشاکش کی ایک
اہم اور معنی خیز مثال دیکھنے میں آئی۔ ہندوستان کے بڑے حصہ میں وکرمی سمت
رائج ہے۔ اس سال کا شمار شمسی حساب کے مطابق ہے لیکن اس کے مہینے چاند
کے حساب سے ہیں۔ پچھلے مہینہ (یعنی اپریل ۱۹۴۴ء میں) اس سنہ کے دو ہزار برس
پورے ہو گئے اور ہزار سال کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس موقع پر سارے ہندوستان
میں جشن منائے گئے اور میرے نزدیک یہ جشن بالکل موزوں اور مناسب تھے۔
اس لئے کہ اول تو یہ وقت کے شمار کا ایک اہم نقطہ تھا، دوسرے وکرم یا وکرما دتیہ،
جس کے نام سے یہ موسوم ہے ہماری تاریخ و روایت میں مدتوں ہر دل عزیز رہا ہے۔
اس نام سے بے شمار کہانیاں وابستہ ہیں جو بھیس بدل بدل کر مختلف زمانوں میں
ایشیا کے اکثر حصوں میں بلکہ یورپ تک میں پہنچتی رہیں۔

وکرم کو لوگ مدتوں سے ایک قومی ہیرو اور ایک مثالی بادشاہ سمجھتے رہے
ہیں۔ ایک حکمراں کی حیثیت سے لوگ اُسے اس لئے یاد کرتے ہیں کہ اس نے بیرونی
حملہ آوروں کو ہندوستان میں گھسنے سے روکا۔ لیکن اس کی اصل شہرت کی بنیاد
اس کے دربار کی وہ پرشکوہ علمی اور تمدنی فضا ہے جس میں اس نے بعض مشہور
مصنفوں، فنون لطیفہ اور موسیقی کے ماہروں کو اکٹھا کر لیا تھا جو اس کے دربار کے
'نورتن' کہلاتے تھے۔ وکرما دتیہ کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں ان میں سے اکثر سے
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دل سے اپنی رعایا کا بھلا چاہتا تھا اور ہر موقع پر دوسروں کی
بھلائی کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دیتا تھا۔ وکرما دتیہ اپنے جود و سخا،

اپنے ایثار، ہمت و جواں مردی اور سادہ مزاجی کی وجہ سے مشہور ہے۔ لیکن دراصل اس کی ہر دل عزیزی کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان تھا اور علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ ان کہانیوں سے یہ بات کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ ایک کامیاب جنگجو اور فاتح بھی تھا۔ ہندوستانی ذہن اور ہندوستانی آدرش کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے ہمیشہ انسان کی نیکی اور اس کے ایثار کو بے حد اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیصر کے نام کی طرح وکرمادتیہ کا نام بھی ایک علامت اور لقب بن گیا اور بعد میں آنے والے بہت سے حکمرانوں نے یہ لقب اختیار کیا۔ اس چیز نے ایک الجھن پیدا کر دی ہے کہ تاریخ میں بہت سے بادشاہوں کا ذکر وکرمادتیہ کے نام سے آیا ہے۔

لیکن یہ وکرم (جس سے وکرمی سمت منسوب ہے) کون تھا؟ اور اس کا زمانہ کیا تھا؟ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ سب چیزیں مبہم اور غیر واضح ہیں۔ سنہ ۵۷ قبل مسیح کے قریب (جو حقیقت میں وکرمی سمت کے شروع ہونے کا زمانہ ہے) اس نام کے کسی بادشاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہند میں ایک وکرمادتیہ تھا جس نے ہن قوم کے حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے انھیں ہندوستان سے باہر نکالا تھا۔ یہی وکرمادتیہ ہے جس کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کے دربار میں "نورتن" تھے، اور یہ کہانیاں اسی بادشاہ کے متعلق ہیں لیکن اب سوال یہ ہے کہ جو وکرمادتیہ چوتھی صدی عیسوی میں تھا اس کا تعلق اس سنہ کے ساتھ کیسے پیدا کیا جائے جو سنہ ۵۷ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا۔ یہ ظاہر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وسط ہند کی ریاست مالوہ میں ایک سنہ رائج تھا جو سنہ ۵۷ء سے شروع ہوا تھا اور وکرمادتیہ کے مرنے کے بہت عرصے بعد یہ سنہ اس کے نام سے موسوم کر دیا گیا اور وکرمی کہلانے لگا۔ لیکن یہ سب چیزیں مبہم اور غیر یقینی ہیں۔

جو چیز مجھے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالتی ہے یہ ہے کہ خاصے سمجھ دار ہندوستانیوں نے بھی محض اس غرض سے کہ اس روایتی سورما وکرم کا تعلق کسی نہ کسی طرح اب سے دو ہزار برس پہلے کے ایک سنہ سے پیدا کر دیں، تاریخ کے ساتھ عجیب عجیب کھیل کھیلے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ اس نے ایک بدیسی قوت کا مقابلہ کیا اور اس کی خواہش تھی کہ ایک قومی سلطنت کے سایے میں ہندوستان میں ایک تہذیبی اتحاد پیدا کیا جائے۔ حالانکہ، حقیقت میں، وکرم کی سلطنت صرف شمالی اور وسطی ہند تک محدود تھی۔

کچھ یہ ہندوستانیوں ہی پر موقوف نہیں کہ وہ تاریخ کے لکھتے وقت قوم پرستی کے جذبے اور قومی مفاد کے خیال سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہر قوم اور ہر ملک میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اپنے ماضی کو زیادہ سے زیادہ روشن بنا کر دکھائے، اور اپنے نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرے۔ انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی وہ تاریخیں جو ہم میں سے اکثر کو مجبوراً پڑھنی پڑی ہیں، عام طور پر انگریزی حکومت کی طرف سے صفائی کی بحثیں اس کی شان میں لمبے چوڑے قصیدے ہیں ــــ اس عہد سے پہلے کے ہزارہا سال کے حالات کا ذکر ان میں ایک حقارت کے انداز سے ہوتا ہے۔ حقیقت میں، ان کے نقطۂ نظر سے تو تاریخ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس عہد سے پہلے جو کچھ ہوا وہ گویا ایک پراسرار طریقے سے اس معراج کی تیاری تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے دور کو بھی واقعات میں تصرف کر کے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ برطانوی راج کی برکتیں اور انگریزوں کے اوصاف دلوں پر نقش ہو جائیں۔ اب جا کر بہت آہستہ آہستہ تاریخ کا صحیح تصور پیدا ہو رہا ہے لیکن اس

طرح کی مثالیں تلاش کرنے کے لئے جن میں کچھ خاص مقاصد کے حصول یا اپنے ذاتی رجحانات و تعصبات کی تائید کی غرض سے تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر دکھایا گیا ہے، ہمیں گذرے ہوئے زمانے کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا اپنا زمانہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ پھر اگر حال کو، جو خود ہمارا اپنا دیکھا اور محسوس کیا ہوا ہے، اس طرح مسخ کیا جا سکتا ہے تو پھر ماضی کا کیا ٹھکانا ہے؟

ان ساری باتوں کے باوجود یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہندوستانی ذہن بغیر کسی تحقیق و جستجو کے روایت اور افسانہ کو آسانی سے تاریخ سمجھ لیتا ہے۔ ہندوستانیوں کو اس لاابالی انداز فکر اور نتائج کے اخذ کرنے میں اس سہل انگاری سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

لیکن میں دیوتاؤں اور دیویوں کی کہانیوں اور افسانوں اور روایتوں کے زمانے کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ وہ زمانہ تھا جب زندگی بھرپور تھی اور فطرت سے ہم آہنگ، اور انسان کا ذہن کائنات کے اسرار پر حیرت اور مسرت سے نظر ڈالتا تھا، آسمان اور زمین ایک دوسرے سے بالکل قریب معلوم ہوتے تھے اور دیویاں اور دیوتا کیلاش پربت یا ہمالیہ کی دوسری سیرگاہوں سے اتر کر انسانوں کے کھیل کود میں حصہ لیتے یا مرد عورت کو اس کے کرموں کی سزا دینے زمین پر آجاتے تھے۔ اسی بھرپور اور توانا زندگی اور قومی تخیل سے روایتیں اور کہانیاں پیدا ہوئیں، اور طاقت ور اور حسین دیوتاؤں اور دیویوں نے جنم لیا، اس لئے کہ قدیم ہندوستانی بھی، یونانیوں کی طرح حسن اور حیات کے عاشق تھے۔ پروفیسر گلبرٹ مرے نے "اولمپی نظام کو حسن و جمال کا مکمل نمونہ بتایا ہے۔ جن لفظوں میں انھوں نے اس کی تعریف کی ہے وہی ہندوستانی ذہن کی ابتدائی تخلیق کے نمونوں پر صادق آتے ہیں۔ یہ تخلیقی کارنامے "فن کاروں کے خواب ہیں، اُن کے آدرش اور تمثیلیں۔ وہ کسی ایسی حقیقت

کے نقوش ہیں جو اُن کے ماوراء ہے۔ وہ ایسے دیوتا ہیں جنھیں شک اور عقیدت کی ایک مخلوط کیفیت، ایک غیر شعوری خود فریبی، ایک دلی آرزو نے پیدا کیا ہے۔ ان دیوتاؤں کی مشکک فلسفی بھی، اپنی ساری فلسفیانہ احتیاط کے ساتھ، دلکش اور دلنشیں مفروضات کی حیثیت سے عبادت کر سکتے ہیں۔ ان کو انسان اس طرح نہیں مانتا جیسے ٹھوس واقعات کو۔ جو کچھ آگے چل کر پروفیسر مرے نے یونان کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق بھی نقط بہ نقط ہندوستان پر ہوتا ہے "جس طرح انسان کا بنایا ہوا سب سے حسین مجسمہ خدا نہیں تھا، بلکہ محض ایک علامت تھی جس کی مدد سے خدا کا تصور قائم کیا جا سکے۔ اسی طرح جب خدا کا تصور قائم ہو گیا تو وہ بھی حقیقت نہیں تھا بلکہ محض حقیقت کا ایک پرتو...
... اور ان لوگوں نے ایسے عقیدے وضع نہیں کیے، جو علم کی تردید کرتے ہوں اور ایسے احکام صادر نہیں کیے، جو انسان کو اس کے نورِ باطن کی ہدایت سے منحرف کرتے ہوں۔"

رفتہ رفتہ ویدانت دیوتاؤں اور دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کا زمانہ تاریکی میں گم ہوتا رہا اور دقیق اور مشکل فلسفوں نے ان کی جگہ لے لی۔ لیکن لوگوں کے ذہنوں میں ان دیوتاؤں کے نقش اب بھی باقی رہے۔ یہ رنج و راحت میں ان کے ساتھی اور دکھ درد میں ان کے دوست، ان کے مبہم آدرشوں اور تمناؤں کے مظہر تھے۔ ان دیوتاؤں کے تصور کی بنیاد پر شاعروں نے اپنے تخیل کی عمارتیں کھڑی کیں، اپنے خوابوں کے محل بنائے اور ان محلوں کو شوخ اور حسین نقش و نگار سے سجایا۔ ان روایات اور شاعرانہ تخیلات کو الیف۔ ڈبلو۔ بین نے بڑی خوبصورتی سے اپنایا ہے اور ہندوستانی دیو مالا کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا ایک سلسلہ مرتب کیا ہے۔ ان میں سے ایک کہانی میں جس کا عنوان "چاندنی کی قاش" ہے عورت کی تخلیق کا حال بیان کیا گیا ہے۔ "جب دنیا کی تخلیق ہوئی اور تو اشتری (صنّاع قدرت) نے عورت کو

بنانے کا ارادہ کیا تو اُسے پتہ چلا کہ اس کا سارا مسالہ مرد کے بنانے میں ختم ہو گیا اور اب ٹھوس عناصر میں سے کچھ باقی نہیں بچا۔ اس کشمکش میں، بڑی غور و فکر کے بعد اس نے یہ کیا کہ "اس نے چاند کی گولائی لی اور بیلوں کا پیچ و خم، گھاس کا لچکنا اور امربیل کا چمٹنا، نرسل کی نزاکت اور پھولوں کی نزہت، پتیوں کی لطافت اور سونڈ کی لچک، ہرن کا وحشت سے تکنا اور شہد کی مکھیوں کا جھرمٹ باندھنا، سورج کی کرنوں کی مسرت اور سرخوشی اور بادلوں کی اشک باری، ہواؤں کا تلوّن، خرگوش کی بھڑک، مور کی اکڑ، طوطے کے سینے کی نرمی، سنگ خارا کی سختی، شہد کی مٹھاس، چیتے کی تندخوئی، آگ کی گرمی برف کی ٹھنڈک، مینا کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوک، سارس کی مکاری، چکور کی وفاداری ــــ یہ ساری چیزیں لیں اور سب کو ملا جلا کر اس نے عورت بنائی۔ اُسے مرد کو دے دیا۔"

۱۳۔ مہابھارت

رزمیہ داستانوں کے زمانے کا تعین مشکل ہے۔ ان میں اس عہد کا ذکر ہے جب آریا لوگوں کے ہندوستان میں بستیاں بسانے کا سلسلہ جاری تھا اور وہ یہاں مضبوطی سے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بہت سے آدمیوں نے مل کر لکھا ہے یا بعد کے زمانوں میں ان میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ رامائن ایک رزمیہ نظم ہے جس میں کسی حد تک بیان کی یکسانی پائی جاتی ہے۔ مہابھارت پرانی داستانوں کا ایک بہت بڑا اور متفرق مجموعہ ہے۔ دونوں کی تکمیل غالباً بودھ مت سے پہلے ہو چکی تھی، گو ان میں بعد کے زمانوں میں کچھ اضافے بھی ہوئے۔

فرانسیسی مورخ مشلے نے ۱۸۶۴ء میں رامائن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جس کا عمل اور ارادہ حد سے گذر چکا ہے اس سے کہو کہ اس گہرے پیالے

میں سے زندگی اور شباب کا ایک لمبا گھونٹ پی لے ...... مغرب میں ہر چیز تنگ اور گھری ہوئی ہے۔ یونان چھوٹا ہے اور اس میں میرا دم گھٹتا ہے، یہودیوں کا ملک خشک ہے اور یہاں میں ہانپنے لگتا ہوں۔ اب مجھے تھوڑی دیر کے لئے بلند خیال ایشیا اور دقیق النظر مشرق سے لو لگانے دو۔ وہاں میری پسند کی عظیم الشان نظم ہے ـــــ بحرِ ہند کی طرح وسیع، مقدس، سورج کی روشنی سے معمور و مزین ـــــ ربانی ہم آہنگی کا صحیفہ جس میں بے آہنگی نام کو نہیں۔ وہاں امن و سکون کی حکمرانی ہے اور کشمکش کے درمیان ایک ابدی حلاوت، ایک عالم گیر اخوت، جو ساری ذی روح مخلوق پر حاوی ہے۔ ایک بحرِ بے پایاں ـــــ محبت کا، دردمندی کا اور رحم کا۔"

اگرچہ رامائن ایک زبردست رزمیہ نظم ہے اور لوگوں کو محبوب، لیکن جس کا شمار دنیا کی سب سے ممتاز کتابوں میں ہے وہ دراصل مہابھارت ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے ـــــ پرانے ہندوستان کی روایات، اساطیر اور سیاسی اور معاشی آئین کا بحر العلوم۔ دس سال یا اس سے بھی زیادہ کچھ عرصے سے بہت سے قابل ہندوستانی فاضل اس کتاب کے مختلف موجودہ نسخوں کے مطالعے اور جانچ پرتال میں مصروف ہیں تاکہ ان سب کا مقابلہ کر کے اس کا ایک مستند نسخہ شائع کریں۔ ان لوگوں نے کچھ حصے شائع بھی کئے ہیں لیکن کام ابھی پورا نہیں ہوا اور برابر جاری ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ عالم گیر جنگ کے اس ہیبت ناک زمانہ میں بھی روس کے بعض مستشرقین نے مہابھارت کا ایک روسی ترجمہ شائع کیا ہے۔

غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب بیرونی عناصر ہندوستان میں داخل ہو کر اپنے رسوم اپنے ساتھ لا رہے تھے اور یہ رسوم آرین لوگوں کے رسوم سے بالکل مختلف

تھے۔ اوراس لئے اس زمانے میں متضاد خیالات اور رسوم کا ایک عجیب معجون مرکب نظر آتا ہے۔ آریا لوگوں میں چند شوہری کا قطعاً رواج نہ تھا پھر بھی مہا بھارت کی ایک خاص ہیروئن پانچ بھائیوں کی مشترکہ بیوی ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی ملکی اور دیسی اقوام اور باہر سے آنے والے ویدک تہذیب میں جذب ہو رہے تھے اور ویدک مذہب میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے انداز میں وہ جامعیت پیدا ہو رہی تھی جس نے آگے چل کر جدید "ہندویت" کی شکل اختیار کی۔ یہ تبدیلیاں اس لئے ممکن ہوئیں کہ ویدک مذہب کا بنیادی نظریہ بنا بریں تھا کہ حق و صداقت' پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور اس کی معرفت کے بہت سے اور راستے ہیں۔ اسی لئے ہر طرح کے مختلف بلکہ متضاد عقائد کے ساتھ بھی رواداری برتی گئی۔

مہا بھارت میں ہندوستان یا بھارت ورش (جیسا کہ ہندوستان کو ہندی نسل کے روایتی بانی کی نسبت سے کہا جاتا تھا) کے بنیادی اتحاد پر نمایاں طور پر زور دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان کا ایک دوسرا نام آریہ ورت' یا آریوں کی سرزمین تھا۔ لیکن یہ نام صرف شمالی ہندوستان کے اس حصے تک کے لئے مخصوص تھا جو وسط ہند میں وندھیاچل پہاڑیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ غالباً آریہ لوگ اس زمانے تک اس پہاڑ کی حد سے زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے۔ رامائن کی کہانی آریوں کے جنوب کی طرف بڑھنے اور پھیلنے کی کہانی ہے۔ جس بڑی خانہ جنگی کا ذکر مہا بھارت میں ہے اس کے متعلق مبہم طور پر یہ خیال عام ہے کہ یہ لڑائی چودھویں صدی قبل مسیح کے قریب ہوئی تھی۔ یہ لڑائی ہندوستان (یا غالباً شمالی ہندوستان) کی فرماں روائی کی غرض سے لڑی گئی تھی اور اس لڑائی کے زمانہ سے 'بھارت ورش' یا ایک مکمل ہندوستان کے تصور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس تصور کے مطابق بھارت ورش میں

موجودہ افغانستان (جسے اس زمانے میں گندھار کہتے تھے جس سے شہر قندھار کا نام
ماخوذ ہے) بھی شامل تھا اور اسے ہندوستان کا ایک لازمی اور اہم حصہ سمجھا جاتا تھا۔
اور ہندوستان کے سب سے بڑے راجا کی رانی کو گندھاری یعنی گندھار کی شہزادی
کہتے تھے۔ اسی زمانے میں دلّی یا دہلی (موجودہ دہلی نہیں بلکہ ہستناپور اور اندرپرستھ
کے قدیم شہر جو اسی کے قریب واقع تھے) ہندوستان کا دارالسلطنت بنی۔

مسز نویدتا (Margaret Noble) نے
مہابھارت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ایک غیر ملکی کو جو اس کتاب کا مطالعہ کرتا
ہے ...... دو چیزیں فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ایک تو کثرت میں وحدت کا
تصور دوسرے اس بات کی مسلسل کوشش کہ پڑھنے والوں کے سامنے ہندوستان
کو ایک مرکزی اور متحدہ ملک کی حیثیت سے پیش کیا جائے جس کی ترکیب اور وحدت
کی بنیاد اس کی شجاعانہ روایات کی بنیاد پر قائم ہے۔"[1]

مہابھارت میں کرشن کے قصے ہیں اور مشہور نظم بھگوت گیتا بھی اسی کا ایک
حصہ ہے۔ گیتا میں جو فلسفیانہ تخیل ہے اس کے علاوہ بھی یہ کتاب ان اخلاقی اصولوں
پر زور دیتی ہے جو حکومت کے کام اور عام انسانی زندگی میں ضروری اور اہم ہیں۔
یہ اصول دھرم کی بنیاد ہیں اور اس بنیاد کے بغیر نہ تو حقیقی مسرت حاصل ہو سکتی ہے
اور نہ سوسائٹی کا قیام و ثبات ممکن ہے۔ اس کا مقصد سماجی بھلائی ہے ـــــ کسی
ایک خاص جماعت یا گروہ کی بھلائی نہیں بلکہ ساری دنیا کی بھلائی اس لئے کہ انسانوں کا

---

[1] یہ عبارت میں نے سر ایس رادھا کرشنن کی کتاب Indian Philosophy سے
لی ہے۔ اور بھی بہت سی عبارتیں ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں اور یوں بھی میں نے اس باب میں اور
دوسرے بابوں میں ان کی تصانیف سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

کی ساری دنیا ایک قائم بالذات جسم اجتماعی ہے۔ پھر بھی کچھ بنیادی اصولوں (مثلاً حق کی پیروی یا عدم تشدد) کو چھوڑ کر، دھرم بھی ایک اضافی شے ہے اور اس کا انحصار کسی خاص زمانہ کے مخصوص حالات پر ہوتا ہے۔ یہ بنیادی اصول ہمیشہ قائم رہتے ہیں لیکن دھرم جو فرائض اور ذمہ داریوں کا مجموعہ ہے وقت کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ عدم تشدد پر اس جگہ اور دوسرے مقامات پر جو زور دیا گیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ اس لئے لکھنے والے کو اس اصول میں اور حق کے لئے لڑنے میں کوئی صریحی تضاد نظر نہیں آتا۔ پورا رزمیہ ایک بڑی لڑائی کے محور پر گھومتا ہے۔ اہنسا یا عدم تشدد کے تصور کا مفہوم یہ تھا کہ جب جنگ اور متشددانہ عمل ناگزیر ہو جائے تو انسان اپنے جذبات میں تشدد نہ پیدا ہونے دے، غصہ اور نفرت پر قابو رکھے اور اپنے نفس پر ضبط و اختیار سے کام لے۔ ایسے موقعوں پر عدم تشدد کا مفہوم جسمانی عدم تشدد نہیں ہوتا۔

مہابھارت ایک ایسا خزانہ ہے جس میں ہمیں ہر طرح کی بیش بہا چیزیں مل سکتی ہیں۔ یہ رنگا رنگ، بھرپور اور اُبلتی ہوئی زندگی کا سرچشمہ ہے، اسے ہندی فلسفہ کے اس تصور سے دور کا بھی تعلق نہیں، جس میں ترکِ دنیا اور زندگی کی بے حقیقتی پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب محض اخلاقی مقولوں کا مجموعہ نہیں، گو اس میں زیادہ حصہ اخلاق اور اصولِ اخلاق کی فراوانی ہے۔ مہابھارت کی تعلیم کا خلاصہ ایک جملہ میں اس طرح کیا گیا ہے "جو کچھ تجھے پسند نہیں، وہ تو دوسروں کے ساتھ مت کر۔" اس میں ہر جگہ اجتماعی مفاد پر زور دیا گیا ہے اور یہ چیز اس لحاظ سے توجہ کے قابل ہے کہ عام طور پر ہندوستانی فلسفہ کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ذاتی تکمیل کو اجتماعی مفاد سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ مہابھارت میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "جس چیز میں اجتماعی مفاد نہ ہو یا جو کچھ کرکے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے، وہ ہرگز مت کرو۔"

اور آگے چل کر "سچائی، ضبطِ نفس، ترکِ لذات، کشادہ دلی، عدم تشدد

حسن عمل میں استقلال ــــ یہ چیزیں کامیابی کے ذرائع ہیں، ذات پات یا خاندان نہیں۔" "حسن عمل زندگی یا حیات جاودانی سے زیادہ بہتر ہے۔" "غم حقیقی مسرت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔" جو لوگ دولت کے جویا ہیں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ "ریشم کا کیڑا اپنی دولت کے ہاتھوں مرتا ہے۔" اور ان سب سے زیادہ ایک ایسا مقولہ جو صرف ایک زندہ اور آگے بڑھتی ہوئی قوم سے کہا جا سکتا ہے "بے اطمینانی ترقی کی مہمیز ہے۔"

مہا بھارت میں ویدوں کی کثرت پرستی ہے، اپنشدوں کی وحدت پرستی ــ اور الوہیت، ثنویت اور وحدانیت۔ تصور حیات اب بھی تخلیقی اور کم وبیش استدلالی ہے، اور خلوت پسندی کا جذبہ اب تک محدود ہے۔ ذات پات میں سختی نہیں۔ اعتماد کا جذبہ اس وقت تک بھی موجود تھا، لیکن جب خارجی قوتوں نے حملہ کیا تو پرانے نظام کے قیام و استحکام میں اندیشہ پیدا ہونے لگا، اور اس اعتماد میں کسی حد تک کمی آگئی، اور داخلی اتحاد اور قوت پیدا کرنے کی خواہش نے یکسانی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ نئے نئے امتناعی حکم جاری ہوئے۔ گائے کے گوشت کا کھانا جو پہلے جائز تھا قطعی ممنوع ہوگیا۔ مہا بھارت کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معزز مہمانوں کو گائے یا بچھڑے کا گوشت کھانے کو دیا جاتا تھا۔

۱۴۔ بھگوت گیتا

بھگوت گیتا مہا بھارت کا ایک حصہ ہے ــــ ایک وسیع ڈراما کا ایک منظر۔ لیکن بجائے خود مکمل ہے۔ یہ ۰۰۰ شعروں کی ایک چھوٹی سی نظم ہے ــــ ولیم وان ہم بولٹ کے لفظوں میں یہ دنیا کی کل زبانوں میں سب سے زیادہ دلکش فلسفیانہ نظم ہے بلکہ شاید حقیقی معنوں میں صرف یہی فلسفیانہ نظم کہلانے کی مستحق ہے۔ جب سے یہ

لکھی گئی آج تک اس کی ہر دلعزیزی اور اثر میں ذرا بھی کمی نہیں آئی - اب بھی ہندوستان میں اس کا پیام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے - ہر گروہ اور ہر خیال کے مفکر اور فلسفی گیتا کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی تفسیر و تاویل کی ہے - بحران کے وقت میں، جب انسانی ذہن پر شبہات کا سایہ ہوتا ہے اور فرائض کی کشمکش اس میں انتشار پیدا کر دیتا ہے تو وہ روشنی اور رہبری کی تلاش میں گیتا کی طرف متوجہ ہوتا ہے - اس لئے کہ یہ نظم بحران اور کشاکش کی پیداوار ہے ــ سیاسی اور معاشی کشاکش اور اس سے بھی زیادہ انسان کی روحانی کشاکش - گیتا کی ہر زمانے اَن گنت تفسیریں لکھی گئی ہیں اور اب تک اسی تسلسل اور پابندی سے لکھی جا رہی ہیں - یہاں تک کہ ہندوستانی فکر اور عمل کے بعض قائدین ــ تلک، ارو بند و گھوش اور گاندھی ــ نے بھی گیتا پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی تاویلیں کی ہیں - گاندھی جی اپنے عدم تشدد کے مستحکم عقیدے کی بنیاد اسی پر رکھتے ہیں، دوسرے مفکر اسی کی بنیاد پر جنگ و تشدد کو ایک صحیح راہ عمل بتاتے اور اُسے حق بجانب ثابت کرتے ہیں -

یہ نظم اس مکالمے سے شروع ہوتی ہے جو مہا بھارت کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے میدان جنگ میں، ارجن اور کرشن کے درمیان ہوا - ارجن کو اس خیال سے تکلیف ہے کہ اس کے ضمیر میں لڑائی کے خیال اور اس کے نتیجوں کے تصور سے ایک ہیجان و اضطراب پیدا ہوتا ہے ــ اور وہ سوچتا ہے کہ عوام کا کشت و خون، دوستوں اور عزیزوں کی خوں فشانی، یہ سب کچھ کس لئے ؟ کون سا نفع، اس نقصان اور اس گناہ سے زیادہ وزنی بن سکتا ہے ؟ فکر اور اخلاق کا کوئی نظریہ اس کی دست گیری نہیں کرتا، ساری قدریں درہم برہم ہو جاتی ہیں اور ارجن انسان کی اس مظلوم روح کی مثال بن جاتا ہے جسے ذمہ داری اور اخلاق

کی کشاکش نے مضطرب کر رکھا ہے۔ اس شخصی اور ذاتی مکالمہ کے بعد گیتا ہمیں رفتہ رفتہ زیادہ بلند اور زیادہ لاشخصی حدود میں لے جاتی ہے — شخصی فرائض اور اجتماعی احساس، اخلاق اور انسانی زندگی میں اس کی عملی حیثیت، روحانی نظر جسے ہر چیز پر حاوی ہونا چاہئے — آگے چل کر یہ مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس حصہ میں جو کچھ ہے اس کا زیادہ حصہ مابعدالطبیعی یا الہیاتی ہے — اور اس میں انسانی زندگی کے تین طریقوں — یعنی شعور (علم) کی راہ، عمل کی راہ اور عقیدہ کی راہ — میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور غالباً زیادہ زور عقیدہ اور مذہب پر دیا گیا ہے — یہ فکر ایک شخصی معبود کی تخلیق کر لیتی ہے — گو اس کے متعلق کہا یہی گیا ہے کہ وہ ایک ذات مطلق کا ظہور ہے۔ بنیادی طور پر گیتا کا موضوع انسانی زندگی کا روحانی پس منظر ہے اور روزانہ زندگی کے عملی مسائل کا تذکرہ اسی سلسلے میں ضمنی طور پر آجاتا ہے۔ زندگی کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے، گیتا عمل کی ایک پکار ہے، لیکن زندگی کی اس پکار کے پیچھے ہر جگہ ایک روحانی جذبہ اور کائنات کا ایک وسیع اور بلند مقصد جلوہ گر ہے۔ بے عملی کو برا کہا گیا ہے۔ عمل اور زندگی کو زمانہ اور عہد کے اونچے آدرشوں کے مطابق رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے — اس لئے کہ آدرش ہر زمانہ اور عہد میں بدلتے رہتے ہیں اور اس لئے "ڈھنگ دھرم" یعنی ایک خاص عہد کے آدرش کا نظر کے سامنے رہنا لازمی ہے۔

— کیونکہ موجودہ ہندوستان مایوسی اور محرومی سے بھرا ہوا ہے اور حد سے زیادہ بے عملی کا شکار رہا ہے اس لئے عمل کی اس پکار کے لئے ایک خاص کشش ہے اور ہم اس پکار کا مفہوم اپنے حالات کے مطابق یہ لے سکتے ہیں کہ ہم عمل کریں؛ سماجی بہبودی کے لئے، قومی خدمت کے لئے — بے غرضانہ وطن اور انسان کی محبت میں ڈوبا ہوا عمل۔ گیتا کے نزدیک ایسا عمل پسندیدہ ہے لیکن اس کے پیچھے

روحانی آدرش کا ہونا ضروری ہے۔ عمل بے تعلقی کے ساتھ ہونا چاہیئے، نتیجہ کے خیال سے بے نیاز۔ صحیح عمل یقینی طور پر صحیح نتیجے پیدا کرے گا، خواہ وہ نتیجے فوری طور پر ظاہر نہ ہوں ـــــ اس لئے کہ سبب اور نتیجے کا قانون ہر حال میں قائم اور دوامی رہتا ہے۔

گیتا کا پیغام کسی خاص گروہ یا کسی خاص خیال کے لوگوں کے لئے نہیں۔ اس کا خطاب ساری دنیا سے ہے، ہر ایک شخص سے ہے، خواہ وہ برہمن ہو یا ذات سے نکالا ہوا بے دھرم۔ گیتا کہتی ہے "سب راستے میری طرف کو آتے ہیں"۔ گیتا کی یہی وسعت نظر ہے جس کی بدولت وہ ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں میں مقبول ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہے جو ہر عہد میں تازہ اور نئی معلوم ہوتی ہے اور امتداد زمانہ اسے فرسودہ نہیں کر سکتا ـــــ حقیقی جستجو اور تلاش کی روح، فکر اور عمل کا خلوص اور اختلاف اور تضاد کے باوجود ایک توازن اور ہم آہنگی۔ اس میں صحیح توازن ہے، اختلاف کے باوجود وحدت ہے اور ایک ایسی فضا ہے جو انسان کو بدلتے ہوئے ماحول پر قادر اور غالب رکھتی ہے، اُسے اس ماحول سے بھاگنے یا اس کے ساتھ بدل جانے کی تعلیم نہیں دیتی۔ گیتا کی تصنیف کو ڈھائی ہزار برس ہوگئے۔ اس طویل مدت میں ہندوستانی فطرت کو متواتر ارتقا اور تنزل اور رد و بدل کے دوروں سے گذرنا پڑا ...... ایک تجربہ کی جگہ دوسرے نے لی، ایک فکر کے بعد دوسری پیدا ہوئی، لیکن ہر زمانہ میں ہندوستانی فطرت کو گیتا میں زندگی کا نشان ملتا رہا، اور اس زندگی نے گیتا کو ارتقا پذیر فکر سے ہم آہنگ رکھا۔ اس میں ہمیشہ تازگی اور نیا پن رہا اور ان روحانی مسائل میں جو انسان کے ذہن کو مضطرب رکھتے ہیں اس نے ہمیشہ اس کی رہبری اور رہنمائی کی۔

۱۵۔ قدیم ہندوستان کی زندگی اور اُس کے کارنامے

قدیم ہند کے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعی فکر کے ارتقا کا پتہ چلانے کے لئے محققوں اور فلسفیوں نے بہت کام کیا ہے۔ تاریخی واقعات کی صحیح ترتیب قائم کرنے اور مختلف دوروں کی سیاسی حالت کا صحیح سے صحیح خاکہ کھینچنے کا کام بھی بہت بڑی حد تک ہوا ہے۔ لیکن اس زمانے کی سماجی اور اقتصادی حالت کی تحقیقات کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے ــــ لوگ کس طرح رہتے تھے، وہ کیا کام کرتے تھے، کس طرح کرتے تھے، کیا بناتے تھے، اور ان کی تجارتی زندگی کا انداز کیا تھا؟ اب ان مسائل کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کی جا رہی ہے، اور اس سلسلہ میں بعض ہندوستانی فاضلوں کی اور ایک امریکی فاضل کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ خود مہابھارت اس طرح کی سماجی اور معاشی معلومات کا خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں بھی ہیں جن سے مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں پر اسی خاص نقطۂ نظر سے تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ ایسی کتابوں میں سے ایک بے حد بیش بہا تصنیف چوتھی صدی قبل مسیح کی لکھی ہوئی کوٹلیا کی کتاب 'ارتھ شاستر' ہے۔ اس کتاب میں موریہ سلطنت کے سیاسی، سماجی، معاشی اور فوجی نظام کی بہت سی تفصیلیں ہیں۔

اس سے بھی قدیم جاتک کہانیوں کا مجموعہ جس سے بودھ عہد سے پہلے کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جاتک کہانیوں کو ان کی موجودہ شکل بودھ کے زمانے کے کچھ عرصہ بعد دی گئی۔ ان کہانیوں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ ان میں بودھ کی ان ساری حالتوں کا ذکر ہے جو اپنے حسبانی روپ میں آنے سے پہلے انھوں نے

اغنیا کی تھیں۔ یہ کہانیاں بودھ ادب کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن میرے
خیال میں یہ کہانیاں بہت پرانی ہیں۔ ان میں بودھ کے عہد سے پہلے کے زمانے
کا ذکر ہے اور ان سے ہمیں اس زمانے کے ہندوستان کے متعلق بیش بہا معلومات
حاصل ہوتی ہیں۔ پروفیسر رز ڈیوڈز نے ان کہانیوں کو ادب العوام کا سب سے
پرانا لمبے حد مکمل اور انتہائی اہم مجموعہ بتایا ہے۔ ہندوستان میں لکھی ہوئی جانوروں
کی اور بعض دوسری کہانیوں کے جو مجموعے مغربی ایشیا اور یورپ پہنچے ہیں ان میں
سے اکثر کا سلسلہ ان جاتک کہانیوں سے ملتا ہے۔

جاتک کہانیاں اس عہد کی مصوری کرتی ہیں جب ہندوستان کی دو خاص
نسلوں —— یعنی دراوڑوں اور آریوں —— کا مکمل امتزاج ہو رہا تھا۔" وہ ایک
ایسی متنوع اور منتشر سوسائٹی کی تصویر پیش کرتی ہیں جو تقسیم کی ہر کوشش کی مخالف ہے۔
یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جسے اس زمانے کے ذات کے تصور کے مطابق ہم کسی
حیثیت سے منظم نہیں کہہ سکتے ہیں۔ جاتک کہانیاں اس عہد کی عام روایات کی نمائندگی
کرتی ہیں —— وہ عام روایات جو برہمنی روایات یا چھتریوں کی روایات سے بالکل
مختلف ہیں۔

Richard Fick : The Social Organisation in North-East India in Buddha's time, (Calcutta 1920) P. 286.

اس کے مقابلے میں زیادہ جدید تصنیف رتی لال مہتا کی کتاب 'Buddhist India' ہے۔ اس کتاب کا ماخذ بھی زیادہ تر جاتک کہانیاں ہیں اور میں نے زیادہ واقعات اسی کتاب سے لئے ہیں۔

ان کہانیوں میں بہت سی سلطنتوں اور ان کے حکمرانوں کے نقشے اور شجرے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہی جو شروع شروع میں انتخاب پر مبنی تھی موروثی بن گئی اور بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا اس کا وارث ہونے لگا۔ عورتوں کو اس وراثت میں حق نہیں تھا، لیکن کبھی کبھی اس قاعدے کی خلاف ورزی بھی کی گئی۔ چین کی طرح، یہاں بھی رعایا کی ساری مصیبتوں کا ذمہ دار بادشاہ کو سمجھا جاتا ہے۔ کسی طرح کی بھی خرابی ہو جائے ذمہ داری ہر حال میں بادشاہ کی ہے۔ بادشاہ کے پاس وزیروں کی ایک کونسل ہوتی تھی اور کہیں کہیں اس طرح کے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی کوئی اسمبلی بھی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود بادشاہ قطعاً خود مختار تھا، گو اُسے کچھ مقررہ رسوم کی پابندی بھی کرنی پڑتی تھی۔ پروہت کی حیثیت بے حد ممتاز تھی۔ دربار میں وہ ایک مشیر اور مذہبی رسوم کے نگراں کی طرح رہتا تھا۔ ان کہانیوں میں بعض ایسے بادشاہوں کا بھی ذکر ہے جن کے ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے لوگوں نے بغاوت کی، اور کبھی کبھی ایسے بادشاہوں کو اُن کے جرم کی سزا میں قتل تک کر دیا گیا۔

گاؤں کی پنچایتیں اپنے معاملات میں بالکل آزاد اور خود مختار تھیں۔ ریاست کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کی مالگزاری تھی۔ یہ مالگزاری بادشاہ کا حصہ سمجھ کر دی جاتی تھی اور عموماً جنس کی شکل میں دی جاتی تھی۔ غالباً یہ مالگزاری پیداوار کا چھٹا حصہ ہوتی تھی۔ اس زمانے کی تہذیب زرعی تہذیب تھی۔ ہر گاؤں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ سیاسی اور معاشی تنظیم کے لئے دس دس یا سو سو کے گاؤں کے حلقے بنا دیے گئے تھے۔ زراعت کے علاوہ، مویشی پالنے اور دودھ دہی بیچنے کے پیشے عام تھے۔ باغ باغیچوں کا

بھی بہت زیادہ رواج تھا، اور لوگ پھولوں اور پھلوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ اُس زمانے کے پھولوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے۔ آم، انجیر، انگور، کیلا اور کھجور لوگوں کے مرغوب پھل تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہروں میں ترکاری اور پھلوں کی، اور پھولوں کی بہت سی دوکانیں ہوا کرتی تھیں۔ پھولوں کے ہار ہندوستانیوں کو آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی پسند تھے۔

شکار ایک عام شغلہ تھا، خاص کر اس لئے کہ اس سے خوراک کا سامان مہیا ہوتا تھا۔ گوشت خوری کا عام رواج تھا اور پرند اور مچھلی کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا۔ ہرن کا گوشت تو خاص طور پر بہت پسند کیا جاتا تھا۔ شہروں میں مچھلی بازار اور مذبح ہوتے تھے۔ لیکن غذا کا خاص جزو چاول، گیہوں، اور باجرہ کے علاوہ بعض دوسرے اناج تھے۔ گنّے سے شکر نکالی جاتی تھی۔ شراب کی دوکانیں بھی عام تھیں اور شراب غالباً چاول، گنّے اور پھلوں کی بنائی جاتی تھی۔

دھاتوں اور قیمتی پتھروں کے لئے کانیں کھودی جاتی تھیں اور اس زمانے میں جن دھاتوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے ان میں سونا، چاندی، تانبا، لوہا، جست، ٹین اور پیتل بھی ہیں۔ جن قیمتی پتھروں کا ذکر ہے ان میں ہیرا، لعل، مونگا اور موتی ہیں۔ سونے، چاندی اور تانبے کے سکوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس زمانہ میں تجارت میں شرکت اور سودی قرضوں کا رواج بھی تھا۔

جو چیزیں اس زمانے میں بنتی تھیں ان میں ریشم، اون اور سوت کے کپڑوں کے علاوہ نمدے، کمبل اور قالین بھی ہوتے تھے۔ کتائی، بنائی اور رنگائی کی صنعتوں کا عام رواج تھا اور ان سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ دھات کی صنعت لڑائی کے ہتھیار تیار کرتی تھی۔ تعمیر میں پتھر، اینٹیں اور لکڑی استعمال کی جاتی تھی۔ بڑھئی طرح طرح کا فرنیچر اور دوسری چیزیں بناتے تھے ــــ گاڑیاں، رتھ، جہاز، مسہریاں،

کرسیاں، تپائیاں، بکس اور کھلونے ان کی صنعت کے نمونے ہیں۔ بید کا کام کرنے والے گدّے، ٹوکریاں، پنکھے اور چھتریاں بناتے تھے۔ کمہار ہر گاؤں میں ہوتا تھا۔ پھولوں سے اور صندل کی لکڑی سے، طرح طرح کی خوشبوئیں، تیل اور سنگھار کے سامان بنتے تھے اور ان میں صندل کا غازہ بھی تھا۔ بہت سی دوائیں اور جڑی بوٹیاں تیار ہوتی تھیں اور کبھی کبھی لاشوں کو مسالہ لگا کر رکھا جاتا تھا۔

جن مختلف طرح کے کاریگروں اور پیشہ وروں کا ذکر ہم نے اب تک کیا، ان کے علاوہ بعض اور پیشوں کا بھی ذکر آتا ہے ــــ مثلاً معلم، ڈاکٹر، جراح، سوداگر، گویّے، نجومی، سبزی فروش، ایکٹر، ناچنے والے، بازی گر، نٹ، کٹھ پتلی کا ناچ دکھانے والے وغیرہ۔

گھروں میں غلام رکھنے کا رواج عام تھا لیکن زراعت کا کام یا اسی طرح کے دوسرے کام مزدوروں سے لیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں کچھ اچھوت بھی تھے اور انھیں چنڈال کہتے تھے اور ان کا کام مردوں کو اٹھانا تھا۔

تاجروں اور کاریگروں کی برادریوں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ فِک نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہندوستانی تہذیب کے بہت سے ابتدائی زمانے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تاجروں اور کاریگروں کی برادریاں اقتصادی وجوہ سے ظہور میں آئی تھیں، اور ان کا مقصد روپیہ کا بہتر مصرف آمد و رفت کی سہولتیں پیدا کرنا اور اپنی جماعت کے قانونی مفاد کی حفاظت کرنا تھا۔" جاتکوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ کاریگروں کی ۱۸ برادریاں تھیں لیکن ان میں صرف چار کا نام بتایا گیا ہے ــــ ایک بڑھئیوں اور راجوں کی، دوسری لوہاروں اور سناروں کی، تیسری چمڑے کا کام کرنے والوں کی اور چوتھی مصوّروں کی۔

مہابھارت میں بھی تاجروں اور کاریگروں کی برادریوں کا تذکرہ ہے۔

مہابھارت میں ایک جگہ لکھا ہے "برادریوں کا تحفظ اتحاد میں ہے"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "تاجروں کی برادریوں کا اتنا اثر تھا کہ بادشاہ کوئی ایسا قانون جاری نہیں کر سکتا تھا جو ان کے مفاد کے خلاف ہو۔ بادشاہ پروہتوں کے بعد اگر کسی کے اقتدار سے گھبراتا تھا تو ان برادریوں کے سرپنچوں سے۔"[1] تاجروں کا سرغنہ جسے شریشٹھی (سیٹھ) کہتے تھے، ایک ممتاز شخصیت کا لک سمجھا جاتا تھا۔

جاتک کہانیوں سے ایک اور بے حد اہم بات کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خاص خاص پیشے کے لوگوں کے لئے الگ الگ بستیاں یا گانوں بسائے گئے تھے مثلاً ایک گانوں بڑھیوں کا تھا، جس میں ایک ہزار گھرانے تھے یا ساروں اور لوہاروں کا گانوں، اور اسی طرح کے اور گانوں۔ خاص خاص بستیاں عام طور پر کسی نہ کسی شہر کے قریب بسائی جاتی تھیں۔ ان شہروں میں ان گانوں کی بنی ہوئی چیزوں کی کھپت ہوتی تھی اور شہروں سے گانوں والوں کو اُن کی ضروریات کی چیزیں ملتی تھیں۔ غالباً پورا گانوں امداد باہمی کے طریقوں پر عامل تھا اور اس طرح پورا گانوں مل کر بڑی بڑی فرمائشوں کو پورا کرتا تھا۔ غالباً اسی طرح کی علیحدہ اور بنی ہوئی زندگی سے ذات پات کا طریقہ شروع ہوا اور پھیلا۔ جو چیز ابتدا میں برہمنوں اور اونچے طبقے کے لوگوں نے شروع کی تھی اُسی کو تاجروں اور کاریگروں کی انجمنوں نے اپنا لیا۔

سارے شمالی ہندوستان میں لمبی چوڑی سڑکوں کا سلسلہ تھا اور یہ سڑکیں ملک کے دور دور کے حصوں کو ملاتی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے مسافر خانے تھے

---

[1] Professor E. Washburn Hopkins: Cambridge History of India Vol: 1, page 209.

اور جا بجا شفا خانے۔ تجارت صرف ملک کے اندر ہی عام نہیں تھی بلکہ ہندوستان اور بیرونی ممالک کے درمیان بھی تجارت کا سلسلہ تھا۔ مصر میں ہندوستانیوں کے سروں کے جو مجسمے برآمد ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے قریب مصر کے شہر میمفس میں ہندوستانی تاجروں کی ایک نو آبادی تھی۔ غالباً جنوبی مشرقی ایشیا اور ہندوستان کے درمیان بھی تجارتی تعلقات تھے۔ ان جزیروں سے تجارت کرنے کے لیے جہازوں کا ہونا ضروری تھا اور یہ بات اب تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں دونوں طرح کے جہاز بنتے تھے ــــ ایسے جہاز جو ملکی تجارت میں دریاؤں میں کام دیتے تھے اور ایسے جہاز جن سے سمندری سفر کیا جاتا تھا۔ مہا بھارت میں بعض اشارے اس طرح کے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ " دور دراز سے آنے والے جہاز " چنگی دیا کرتے تھے۔

جاتکوں میں تاجروں کے بحری سفروں کا اکثر جگہ تذکرہ ہے۔ تاجروں کے قافلے ریگستانوں میں ہوتے ہوئے مغرب کی طرف بڑوچ کے بندرگاہ تک اور شمال میں گندھارا اور وسط ایشیا کی طرف جایا کرتے تھے۔ بڑوچ کے بندرگاہ سے جہاز خلیج فارس میں بابل کے بندرگاہ کو جاتے تھے۔ جاتکوں کی شہادت کے مطابق، ہندوستان کے اندر بھی دریاؤں کے ذریعے جہازوں کی خاصی آمدورفت ہوتی تھی۔ جہاز بنارس، پٹنہ، چمپا (بھاگلپور) اور دوسرے شہروں سے سمندر کی طرف اور وہاں سے جنوب کے بندرگاہوں کو، اور لنکا اور ملایا کو جایا کرتے تھے۔ پرانے تامل گیتوں میں 'کاویری پٹنم' نام کے ایک بڑے بندرگاہ کا تذکرہ ہے، جو جنوبی ہند میں کاویری دریا کے کنارے آباد تھا۔ یہ بندرگاہ بین الاقوامی تجارت کا مرکز تھا۔ اس زمانے کے جہاز بھی خاصے بڑے ہوتے ہوں گے، اس لیے کہ جاتکوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک ایک جہاز پر 'سیکڑوں' تاجر اور مسافر سفر کرتے تھے۔

'ملندا' (یہ کتاب پہلی صدی قبل مسیح کی ہے — ملندا شمالی ہندوستان کے ایک یونانی بادشاہ کا نام ہے، جو بودھ مت کا پکا پیرو ہو گیا تھا) میں لکھا ہوا ہے کہ "کسی جہاز کا مالک جو کسی بندرگاہ پر رہتا ہے اور اپنے جہاز کا کرایہ اور محصول لے لے کر دولت مند ہو گیا ہے، آسانی سے سمندر پار کر سکتا ہے اور ونگا (بنگال) یا تکولا یا چین یا سودیرا یا سورت یا اسکندریہ یا کورمنڈل کے ساحل یا ہندوستان سے باہر کسی ایسی جگہ جہاں جہاز جا سکے۔ جا سکتا ہے۔"[1]

جو چیزیں ہندوستان سے باہر جاتی تھیں وہ یہ تھیں: ریشم کے کپڑے، ململ، دوسرے باریک کپڑے، چھری چاقو، زرہ بکتر، زربفت، کارچوبی کپڑے، نمدے، دوائیں، عطر، ہاتھی دانت اور اس کا بنا ہوا سامان، جواہرات اور سونا (اور کبھی چاندی) یہ خاص خاص چیزیں تھیں جن کی تجارت تاجر کرتے تھے۔[2]

ہندوستان، یا یوں کہنا چاہیے کہ شمالی ہندوستان اپنے آلاتِ حرب کے لیے مشہور تھا، خاص کر اپنے فولاد کی خوبی، تلواروں اور پیش قبضوں کے لیے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں بہت بڑی سوار اور پیدل ہندوستانی فوج ایرانی فوج کے ساتھ یونان گئی۔ فردوسی کی مشہور مثنوی 'شاہ نامہ' میں بیان کیا گیا ہے کہ جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا تو ایرانیوں نے فوراً ہندوستانیوں سے تلواریں اور دوسرے اسلحہ منگائے۔ تلوار کے لئے پرانی (ایام جاہلیت کی) عربی میں 'مہنّد'

---

[1] Mrs. C.A.F. Rhys Davids in Cambridge History of India Vol. 1, page 212.

[2] Rhys Davids: 'Budhist India', P. 98.

کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے معنی ہیں "ہند کا" یا ہندوستانی۔ یہ لفظ اب بھی عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان نے لوہے کے پکا کرنے کے فن میں بڑی ترقی کی تھی۔ دہلی کے قریب ایک بہت بڑی لوہے کی لاٹ ہے۔ اس نے جدید سائنس والوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور وہ اب تک اس بات کا پتہ نہیں چلا سکے کہ وہ کن اجزا اور ترکیبوں سے بنایا گیا ہے کہ اس پر بیرونی عناصر کی تبدیلیوں نے ذرا بھی اثر نہیں کیا۔ اس پر جو کتبہ کھدا ہوا ہے وہ گپت رسم الخط میں ہے جو ہندوستان میں چوتھی صدی عیسوی سے ساتویں صدی تک رائج رہا۔ لیکن بعض فاضلوں کا خیال ہے کہ یہ لاٹ اس سے بھی بہت پہلے کی ہے اور کتبہ اس پر بعد میں کھودا گیا ہے۔

سکندر نے چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان پر جو حملہ کیا تھا وہ فوجی نقطۂ نظر سے ایک معمولی سی چیز ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک سرحدی حملہ کی تھی اور سکندر کو اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ سرحد ہی کے ایک سردار نے اس کا ایسا سخت مقابلہ کیا کہ اُسے ہندوستان کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے کا خیال چھوڑ دینا پڑا۔ اگر سرحد کا ایک معمولی سا حکمراں اس طرح لڑ سکتا تھا تو اور جنوب میں بڑھ کر جو بڑی اور اس سے زیادہ طاقت ور سلطنتیں تھیں وہ کیا کچھ نہ کرتیں؛ غالباً یہی وجہ تھی کہ اُس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور واپس چلے جانے پر مصر ہوئی۔

ہندوستان کی فوجی طاقت کا اندازہ بھی بہت جلد ہو گیا، جب سکندر کی واپسی اور موت کے بعد سلوکس نے دوبارہ حملے کی کوشش کی۔ اُسے چندر گپت نے ہرا کر پیچھے ہٹا دیا۔ اُس زمانے میں ہندوستانی فوجوں کو ایک خاص لحاظ سے برتری

حاصل تھی اور وہ یہ کہ اُن کے پاس سدھے ہوئے جنگی ہاتھی تھے۔ ان ہاتھیوں کا مقابلہ ہم آج کل کے ٹینکوں سے کر سکتے ہیں۔ سلوکس نکیٹر جب ۳۰۲ قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے حکمراں اینٹی گونس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا اُس نے ہندوستان سے ۵۰۰ جنگی ہاتھی منگائے تھے۔ مورخوں کی رائے ہے کہ لڑائی میں ان ہاتھیوں کی موجودگی ہی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس میں اینٹی گونس مارا گیا اور اس کا لڑکا ڈیمیٹریس کہیں بھاگ گیا۔

ہاتھیوں کے سدھانے اور گھوڑوں کے پالنے پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں اور اُن میں سے ہر کتاب کو 'شاستر' کہتے ہیں۔ اب اس لفظ کا مفہوم ہمارے نزدیک مقدس کتاب یا مذہبی صحیفہ ہے لیکن پرانے زمانہ میں یہ لفظ ریاضی سے لے کر رقاصی تک ہر طرح کے علم و فن کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور پرانے زمانے کے لوگ مذہبی اور دنیاوی علم میں کوئی زبردست فرق نہ سمجھتے تھے۔ زندگی کے لئے جو چیز بھی مفید ہو سکے وہ ان لوگوں کے نزدیک تحقیق کا موضوع بن جاتی تھی۔

ہندوستان میں تحریر کا رواج بہت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ عہد حجری کے بنے ہوئے برتنوں پر برہمی رسم الخط میں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ موہنجداڑو میں بھی ایسے کتبے موجود ہیں جو اب تک پوری طرح حل نہیں ہوئے۔ یہ برہمی عبارتیں جو ہندوستان کے تقریباً ہر حصہ میں ملی ہیں یقینی طور پر ہندوستان کے اس بنیادی رسم الخط میں ہیں جس سے دیوناگری اور ہندوستان کے دوسرے رسم الخط پیدا ہوئے۔ اشوک کے بہت سے کتبے برہمی رسم الخط میں ہیں۔ شمالی مغربی علاقوں کے بعض دوسرے کتبے خروشتی رسم الخط میں ہیں۔

چھٹی یا ساتویں قبل مسیح میں پنینی نے اپنی مشہور سنسکرت گرامر لکھی۔[۱]

---

[۱] کیتھ اور بعض فاضلوں نے پنینی کا زمانہ ۳۰۰ قبل مسیح کے قریب بتایا ہے۔ لیکن دیکھئے صفحہ آئندہ

اُس نے اپنی کتاب سے پہلے بھی بعض قواعد کی کتابوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے زمانے تک سنسکرت زبان خاصی منجھ چکی تھی اور اس زبان میں برابر تصنیفوں کی تعداد بڑھ رہی تھی پننی کی کتاب کی حیثیت محض گرامر کی نہیں۔ لینن گریڈ کے روسی پروفیسر Th. Stcherbatsky نے اسے "انسانی دماغ کی ایک عظیم الشان تخلیق" بتایا ہے۔ پننی نے اپنی کتاب میں یونانی رسم الخط کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر کے آنے سے بہت پہلے سے بھی ہندوستان اور یونان میں کسی نہ کسی طرح کا ربط موجود تھا۔

اس زمانے میں علم ہیئت کا مطالعہ خاص توجہ سے کیا جاتا تھا اور اکثر ہیئت اور نجوم ایک دوسرے میں گھل مل جاتے تھے۔ طب پر درسی کتب بھی موجود تھیں اور ملک میں شفاخانے بھی تھے۔ روایت میں دھنونتری کو ہندوستانی طب کا موجد بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن طب کی جو اچھی کتابیں اس وقت تک ملی ہیں وہ عیسوی سنہ کی ابتدائی صدیوں میں لکھی گئی تھیں اور طب کی کتاب کا مصنف چرک ہے اور جراحی کی کتاب سُشرت کی لکھی ہوئی ہے۔ چرک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شمال مغرب کے علاقے کے بادشاہ کنشک کا درباری طبیب تھا۔ ان کتابوں میں بہت سی بیماریوں کے نام درج ہیں اور اُن کی تشخیص اور علاج کے طریقے بتلائے گئے ہیں — ان کتابوں میں جراحی، وضع حمل کے فن، غسل، غذا، حفظان صحت، بچوں کی غذا اور طبی تعلیم کے موضوعوں سے بحث کی گئی ہے۔ تجربے کو ہر چیز کی بنیاد بنایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جراحی کی تعلیم کے لئے لاشوں کی چیر پھاڑ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) زیادہ محققوں کی رائے ہے کہ اس کا زمانہ بودھ عہد سے پہلے تھا اور اُس نے اُسی زمانہ میں یہ کتاب لکھی۔ میرے خیال میں یہی رائے صحیح ہے۔

کی جاتی تھی۔ سشرت نے بہت سے جراحی آلوں کے علاوہ مختلف طرح کے جراحی عملوں کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً اعضا کی قطع و برید، پیٹ کا اپریشن، موتیا بند کا اپریشن وغیرہ۔ زخموں کو دھونی دے کر جراثیم سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ تیسری یا چوتھی صدی قبل مسیح میں مویشیوں کے شفاخانے بھی موجود تھے۔ یہ اثر غالباً جین اور بودھ مذہبوں کا تھا جن میں "اہنسا" پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

ریاضی میں قدیم ہندیوں نے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں — ان میں سے صفر کا نشان، اعشاریہ کا نظام شمار، نفی کے نشان کا استعمال اور الجبرا میں نامعلوم مقداروں کے ظاہر کرنے کے لئے ابجد کے حروف کا استعمال خاص طور پر اہم ہیں۔ ان انکشافات کے زمانہ کا تعین دشوار ہے، اس لئے کہ ان کے انکشاف اور عملی استعمال کے زمانوں میں ایک طویل وقفہ اور تفاوت ہے۔ لیکن اس بات میں اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ ارتھمیٹک، الجبرا اور جامیٹری کی ابتدا بالکل قدیم زمانہ میں ہو چکی تھی۔ رگ وید کے عہد میں بھی گنتی کے شمار میں دس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ قدیم ہندیوں میں وقت اور شمار کا غیر معمولی حس موجود تھا۔ ان کا سلسلۂ اعداد بہت دور تک پہنچا تھا اور بڑے سے بڑے عددوں کے نام موجود تھے۔ یونان، روم، فارس اور عرب کے لوگوں کے پاس ایک ہزار یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار ($10000 = 10^4$) کی گنتی سے زیادہ کے لئے کوئی مقررہ نام نہیں تھا۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں دس کو ۱۸ قوتوں تک (10^{18}) گنا جاسکتا تھا بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ اونچی رقموں تک۔ بودھ کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں دس کی ۵۰ قوتوں تک (10^{50}) گنتی آتی تھی۔

دوسری طرف چھوٹی سی چھوٹی گنتی کا یہ حال تھا کہ وقت کو باریک سے باریک وقفوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور چھوٹے سے چھوٹا وقفہ ایک سکنڈ کا تقریباً

$\frac{1}{2}$ ہوتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی منطقی پیمائش تقریباً ۲ر۱ × ۷ - ۱۰ انچ کے برابر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چھوٹی اور بڑی رقمیں محض نظری تھیں اور انھیں محض فلسفیانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ پرانے ہندوستانیوں میں زمان و مکان کا حس دوسری قدیم قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور نازک تھا۔ ان کا تخیل بہت وسیع تھا یہاں تک کہ اُن کے اساطیر میں بھی کروڑوں برس کے عہدوں کا ذکر ہے۔ ارضیات کی جدید تحقیقات کے پیش کئے ہوئے وسیع زمانے اور ہیئت کے بتلائے ہوئے ستاروں کے طول طویل فاصلے انھیں حیرت میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں ڈارون اور بعض دوسرے سائنس دانوں کے نظریوں نے یورپ میں جو ہنگامہ اور داخلی اضطراب پیدا کر دیا تھا، ہندوستان اُس سے اسی لئے محفوظ رہا کہ اُس کے پاس اتنا وسیع و عریض تحقیقی اور علمی پس منظر موجود تھا۔ یورپ کا عام ذہن ذمنت کے جس تصور کا عادی تھا اُس کی حد چند ہزار برس سے زیادہ نہ تھی۔

'ارتھ شاستر' میں اُن وزنوں اور پیمائشوں کی تفصیل موجود ہے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں شمالی ہند میں رائج تھیں۔ بازاروں میں تول کے باٹوں کی بہت زیادہ نگرانی اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔

رزمیہ عہد میں ہمیں جا بجا ایک خاص طرح کی یونیورسٹیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ یونیورسٹیاں عموماً شہروں کے قریب کے جنگلوں اور میدانوں میں بنی ہوتی تھیں اور یہاں طالب علم تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے مشہور عالموں اور فاضلوں کے گرد اکٹھے ہوتے تھے اور ان سے مختلف طرح کے مضامین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان مضامین میں جنگی تعلیم بھی شامل تھی۔ یونیورسٹیوں کے جنگلوں میں بنانے کا مقصد یہ تھا کہ طالب علم شہری زندگی کی خلل اندازیوں سے محفوظ رہیں اور پرہیزگاری

اور باقاعدگی کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد طالب علم ایک گرہست اور شہری کی زندگی گذارنا شروع کرتے تھے۔ غالباً ان مدرسوں میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوتی تھیں لیکن بعض باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اچھے اور ہر دلعزیز استاد کے پاس زیادہ شاگرد جمع ہوجاتے تھے۔

بنارس ہمیشہ سے علم و فضل کا مرکز رہا ہے حتیٰ کہ بودھ کے زمانے میں بھی اس کی یہی حیثیت تھی۔ بنارس کے قریب کے ایک باغ میں بودھ نے اپنا پہلا وعظ دیا تھا۔ لیکن کسی بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح بنارس کو بھی کبھی یونیورسٹی کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن وہاں الگ الگ استادوں کے الگ الگ حلقے تھے اور ہر استاد کے کچھ شاگرد ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ان حلقوں میں سخت قسم کے بحث مباحثے بھی ہوا کرتے تھے۔

شمال مغرب میں، موجودہ پشاور کے قریب ٹکشلا یا ٹیکسلا نام کی ایک پرانی اور مشہور یونیورسٹی تھی۔ اس یونیورسٹی میں سائنس کی اور خاص کر طب کی اور اس کے علاوہ دوسرے فنون کی تعلیم دی جاتی تھی اور ہندوستان کے دور دور کے حصوں سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ جاتک کہانیوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ امیروں اور برہمنوں کے لڑکے اپنے ساتھ نوکر اور ہتھیار لئے بغیر، تعلیم حاصل کرنے کے لئے ساتھ ساتھ ٹکشلا کا سفر کرتے تھے۔ ٹکشلا کی یونیورسٹی ایسے مقام پر واقع تھی کہ غالباً وسط ایشیا اور افغانستان سے بھی طالب علم یہاں پڑھنے آتے تھے۔ ٹکشلا کی یونیورسٹی کا فاضل ہونا اُس زمانے میں ایک عزت اور امتیاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ٹکشلا کی سند حاصل کئے ہوئے طبیبوں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی بودھ بیمار ہوتے تھے تو اُن کے مُرید ٹکشلا کے پڑھے ہوئے کسی مشہور طبیب کو

ان کے علاج کے لئے لاتے تھے چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح کے بڑے قواعد داں پنینی کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے بھی وہیں تعلیم پائی تھی۔

ٹکشلا بودھ عہد سے قبل کی یونیورسٹی اور برہمنی علوم کا مرکز تھی۔ بودھ عہد میں یہ بودھ علوم کا مرکز بن گئی اور ہندوستان کے ہر حصے سے اور ہندوستان کے باہر سے بودھ طالب علم یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ٹکشلا موریہ سلطنت کے شمالی مغربی صوبہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

ہندوستان میں قانون کے سب سے پہلے شارح، منو کے قول کے مطابق اس زمانہ میں قانونی حیثیت سے عورت کا درجہ بہت پست تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی دست نگر رہتی تھیں ــــ باپ کی، شوہر کی یا بیٹے کی۔ عورت کو قانون ایک منقولہ جائداد سمجھتا تھا۔ پھر بھی رزمیہ کتابوں میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس قانون کی پابندی سختی سے نہیں کی جاتی تھی اور گھر اور سماج میں عورتوں کو ممتاز اور عزت کی جگہ دی جاتی تھی۔ پُرانے مقنن منو نے خود ایک جگہ کہا ہے "جہاں عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتاؤں کا سایہ ہوتا ہے۔" ٹکشلا میں یا کسی اور یونیورسٹی میں عورت طالب علموں کے ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ عورتیں کہیں نہ کہیں تعلیم ضرور حاصل کرتی تھیں، اس لئے کہ پرانی کتابوں میں بار بار پڑھی لکھی اور فاضل عورتوں کا تذکرہ آتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی بہت سی مشہور فاضل عورتیں تھیں۔ موجودہ معیاروں کے نقطۂ نظر سے، قدیم ہندوستان میں بے شک عورت کی قانونی حیثیت پست تھی، پھر بھی قدیم یونان، روم، ابتدائی عیسائیت، عہد وسطیٰ کے یورپ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ تک بھی عورت کا جو درجہ رہا ہے، اس سے یہ حیثیت بدرجہا اچھی تھی۔

'منو' اور اس کے بعد کے مقننوں نے تجارت میں شرکت اور ساجھے داری کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ 'منو' نے اس شرکت میں خاص طور پر پروہتوں کا نام لیا ہے۔ یجناولکیا نے اس میں تجارت اور زراعت کو بھی شامل کیا ہے۔ ایک بعد کا مصنف نارد لکھتا ہے کہ "ہر شریک کا حصہ نفع، نقصان اور خرچ میں اُس روپئے کی نسبت سے ہوتا تھا جو وہ تجارت میں لگاتا تھا۔ ہر شریک مال کو گودام میں رکھنے کا خرچ، کھانے کے اخراجات، چنگی، محصول اور نقصان کی رقم معاہدہ کی شرائط کے مطابق ادا کرتا تھا۔"

منو کے ذہن میں ریاست کا تصور ایک چھوٹی سی شاہی ریاست کا تھا لیکن یہ رفتہ رفتہ بدلتا اور وسیع ہوتا رہا اور چوتھی صدی قبل مسیح میں وسیع موریا سلطنت کا تصور بن گیا اور یونانی دنیا سے بین الاقوامی تعلقات کا تصور بھی اس میں شامل ہوگیا۔

چوتھی صدی قبل مسیح کا یونانی سفیر میگاستھنیز ہندوستان میں غلامی کے وجود سے قطعی انکار کرتا تھا۔ لیکن اس کی یہ رائے صحیح نہیں اس لئے کہ اس زمانے میں گھروں میں غلام رکھنے کا یقیناً رواج تھا اور اُس زمانے کی ہندوستانی کتابوں میں غلاموں کی حالت سدھارنے کے اشارے موجود ہیں۔ لیکن ایک بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں غلامی کا رواج عام نہیں تھا اور غلاموں سے مزدوروں کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ غالباً اسی فرق کی وجہ سے میگاستھنیز نے یہ رائے قائم کی کہ ہندوستان میں غلامی کا رواج بالکل نہیں۔ اُس زمانے کا ایک قانون تھا کہ "کسی آریا کو کبھی غلام نہیں بنایا جاسکتا۔" یہ بتانا بھی دشوار ہے کہ آریا کون ہے اور کون نہیں ہے۔ لیکن اُس زمانے میں چاروں بنیادی ذاتیں (جن میں شودر بھی شامل تھے) آریا قوم میں شامل سمجھی جاتی تھیں۔ اچھوتوں کا شمار آریوں میں نہ تھا۔

چین میں بھی ہن خاندان کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں، غلاموں سے گھریلو کام لیے جاتے تھے۔ زراعت یا بڑے پیمانے کے مزدوری کے کاموں میں غلاموں سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی تھی۔ چین اور ہندوستان دونوں ملکوں میں غلاموں کی تعداد کی نسبت پوری آبادی کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہوتی تھی اور اس لحاظ سے ہندی اور چینی سماج اور عصری یونانی اور رومی سماج آپس میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے۔

اس پرانے زمانے میں ہندوستانی کیسے تھے؟ ہمارے لیے ایک ایسے زمانے کا تصور جو ہمارے زمانے سے اتنا دور اور اتنا مختلف تھا بے حد مشکل ہے۔ پھر بھی جو مختلف معلومات ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے ایک دھندلی سی تصویر بنتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ہندوستانی زندہ دل، خوش مزاج، اپنی روایتوں پر بھروسا اور فخر کرنے والے، فطرت کے رموز کے جویا، حیات و کائنات کے مسائل کی تحقیق میں مصروف، اپنے بنائے ہوئے معیاروں اور قدروں کو اہم سمجھنے والے، لیکن زندگی کو ہنسی خوشی گذار کر خوش دلی اور ہمت سے موت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ سکندر کے ہندوستانی حملہ کا یونانی مورخ، ایرین (Arrian) ہندوستانی نسل کی اس زندہ دلی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اُس نے لکھا ہے کہ "دنیا کی کوئی قوم ہندوستانیوں سے زیادہ گانے اور ناچنے کی شوقین نہیں۔"

۱۶- مہابیر اور بدھ: ذات پات

مہابھارت اور رامائن کے زمانے سے لے کر بودھ عہد کے ابتدائی زمانے تک شمالی ہندوستان کی زندگی کا پس منظر کچھ اسی قسم کا تھا۔ سیاسی اور معاشی حیثیت

سے اس میں برابر تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اور میل جول اور امتزاج کے علاوہ تقسیم عمل کے اصول اپنا کام کر رہے تھے۔ فکر و نظر کی دنیا میں مسلسل ارتقا ہو رہا تھا اور افکار میں اکثر تصادم پیدا ہو جاتا تھا۔ اپنشدوں نے جو بجائے خود پروہتوں کے اقتدار اور رسوم پرستی کے خلاف ایک ردعمل کی حیثیت رکھتے تھے، فکر اور عمل کی مختلف اور متعدد سمتوں میں تازیانے کا کام کیا۔ انسان کی نظر نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے ذہن نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اپنشد اسی ذہنی بغاوت کی پیداوار ہیں ___ اور آگے چل کر اسی بغاوت نے مادیت کے تیز دھارے کی شکل اور پھر جین مت اور بودھ مت کی شکل اختیار کی۔ بھگوت گیتا میں عقیدے کی مختلف صورتوں کے امتزاج کی کوشش بھی اسی ذہنی بغاوت کا ردعمل ہے۔ اور ان سب چیزوں سے مل کر ہندوستانی فلسفے کے چھ مذاہب پیدا ہوئے۔ مگر پھر بھی اس ساری ذہنی کشاکش اور بغاوت کے پیچھے ایک صاف، واضح اور قومی زندگی کا پس منظر موجود ہے۔

گو جین مت اور بودھ مت ایک حد تک ویدک مذہب ہی سے پیدا ہوئے ہیں لیکن اکثر حیثیتوں سے انھیں ویدک مذہب اور اس کی شاخوں کے خلاف بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ویدوں کے واجب التعمیل ہونے سے انکار ہے اور سب باتوں سے اہم یہ ہے کہ وہ علتہ العلل (یا مسبب الاسباب) کے وجود کا کوئی ذکر نہیں کرتے ___ دونوں نے اہنسا پر زور دیا اور مجرد راہبوں اور پروہتوں کی جمعیتیں قائم کیں۔ ان کے طرز فکر میں ایک حد تک واقعیت پسندی اور عقلیت ہے، حالانکہ غیر مرئی دنیا کے ادراک میں اس طرز فکر سے کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ جین مت کے بنیادی عقیدوں میں سے ایک یہ ہے کہ حق، ہمارے نقطۂ نظر کے اختلافات کے لحاظ سے ایک اضافی شے ہے۔ جین مت ایک سخت

قسم کا اخلاقی نظام ہے جو اس دنیا تک محدود ہے، آخرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور زندگی اور فکر کے راہبانہ پہلو پر زور دیتا ہے۔

جین مت کا بانی 'مہابیر' اور بدھ ہم عصر تھے اور دونوں چھتریوں کی نسل سے تھے۔ بدھ کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ۵۴۴ قبل مسیح میں ہوا اور بودھ سنہ کا آغاز اسی سال ہوا (یہ تاریخ روایتی ہے۔ مورخوں نے اس کی تاریخ ۴۸۷ قبل مسیح بتائی ہے۔ گو اب وہ بھی روایتی تاریخ کو زیادہ صحیح سمجھنے لگے ہیں)۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس دن میں یہ سب باتیں لکھ رہا ہوں وہ دن بودھ سنہ کے سال ۲۵۰۰ کا پہلا دن ہے ——— آج بیساکھ کے مہینے کے پورے چاند کا دن ہے ——— جسے عرفِ عام میں 'بیساکھی پورنما' کہتے ہیں۔ بودھ مت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بدھ بیساکھ کے مہینے میں (مئی - جون) پورے چاند کے دن پیدا ہوئے تھے۔ انھیں نروان بھی اسی دن ملا اور ان کا انتقال بھی اسی دن ہوا۔

بدھ نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور عوام کے مذہب، ان کی اوہام پرستی، ان کی رسوم، پروہتوں کے پیشے پر، اور ان کے مستقل حقوق پر جو ان کے ساتھ وابستہ تھے حملے کیے۔ انھوں نے الہیاتی اور مذہبی نقطۂ نظر، معجزے، الہام، غرض ان سب چیزوں کی مخالفت کی جو مافوق الفطرۃ عالم سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ ہر امر میں منطق، عقل اور تجربے سے استدلال کرتے تھے۔ ان کا سارا زور اخلاقیات پر تھا۔ ان کا طریقۂ عمل نفسیاتی اور تحلیلی تھا۔ الہیاتی فکر کی گھٹی ہوئی فضا کے بعد ان کا نقطۂ نظر پہاڑوں سے آنے والی تازہ ہوا کے جھونکوں کی طرح فرحت بخش معلوم ہوتا ہے۔

بدھ نے براہ راست ذات پات پر حملے نہیں کیے۔ انھوں نے صرف

یہ کیا کہ اپنے سلسلے میں اُسے کوئی جگہ نہیں دی اور ان کے سارے طرزِ عمل نے ذات پات کے نظام کو کمزور اور کھوکھلا کر دیا۔ غالباً ان کے زمانے میں اور کئی صدی بعد تک ذات پات میں بہت کچھ لچک موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ جو قوم ذات پات کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہو وہ نہ تو بیرونی تجارت میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کسی اور طرح کی بیرونی سرگرمی میں، حالانکہ بدھ کے ڈیڑھ ہزار برس بعد تک ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات بڑھتے رہے، اور ہندوستانی نو آبادیاں قائم ہوتی اور ترقی کرتی رہیں۔ شمال مغرب کے راستے سے بیرونی عناصر ہندوستان میں داخل ہوتے اور یہاں کی زندگی میں جذب ہوتے رہے۔

جذب و تحلیل کا یہ عمل دونوں طرف اثر ڈال رہا تھا اور اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔ ذات پات کے نظام کی نچلی منزل میں نئی نئی ذاتیں بن رہی تھیں، اس لئے کہ جو حملہ آور ہندوستان آکر فتح حاصل کر لیتا اس کا شمار فوراً چھتریوں یا حکمرانوں کی جماعت میں ہونے لگتا۔ عیسائی سنہ کی ابتدا سے ذرا پہلے اور ذرا بعد کے سکوں کو دیکھ کر دو یا تین صدیوں کی اس تیز تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے حکمراں کا نام غیر ملکی ہے۔ اُس کے بیٹے یا پوتے کا نام سنسکرت ہے اور اس کی تخت نشینی اور تاج پوشی چھتریوں کی رسموں کے مطابق ہوتی ہے۔

راجپوت چھتریوں کے اکثر قبیلوں کا سلسلہ یا تو شک یا سیتھی حملہ آوروں سے ملتا ہے (جن کے حملے دوسری صدی قبل مسیح میں شروع ہوئے تھے) یا سفید ہن قوم کے حملہ آوروں سے — یہ سب حملہ آور ہندوستان کے مذہب اور یہاں کی روایتوں کو اپنا لیتے تھے اور پھر اپنا سلسلہ مہابھارت اور رامائن کے مشہور سورماؤں سے ملانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح چھتریوں کی جماعت حقیقت میں اشتراکِ نسل سے زیادہ سماجی حیثیت اور پیشے کے اشتراک پر مبنی تھی اور اس لئے

بیرونی حملہ آوروں کے لئے اس ذات میں گھل مل جانا بہت آسان تھا۔
یہ ایک عجیب اور معنی خیز بات ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے ہر دور میں بڑے بڑے لوگوں نے پروہتوں کے اثر اور ذات پات کے نظام کی سختی کے خلاف بار بار احتجاج کیا ہے اور ان دونوں چیزوں کے خلاف زبردست تحریکیں پیدا ہوئیں، پھر بھی، آہستہ آہستہ اور بالکل غیر محسوس طریقے پر، ذات پات کی تقسیم بڑھتی اور پھیلتی رہی، یہاں تک کہ اس نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے مضبوط شکنجہ میں جکڑ لیا ــــ گویا قدرت کو یہی منظور تھا اور جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔ لوگ ذات پات سے باغی ہوئے اور ان باغیوں کی طرف بہت سے لوگ کھنچ کھنچ کر آئے، لیکن رفتہ رفتہ باغیوں کا یہ گروہ بھی ایک ذات بن گیا۔ جین مت پرانے مذہب کے خلاف ایک بغاوت تھی، اور بہت سی حیثیتوں سے اس سے بالکل مختلف بھی۔ لیکن اس نے ذات پات کے نظام سے رواداری برتی اور اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا ــــ اور اسی رنگ میں وہ ہندوستان میں اب تک موجود ہے بالکل جیسے ہندومت کے درخت کی ایک شاخ۔ بودھ مت نے اپنے آپ کو اس رنگ میں نہیں رنگا۔ اس نے اپنی نظر اور فکر کو نسبتاً زیادہ آزاد رکھا، اور اُسے ہندوستان سے چلا جانا پڑا ــــ حالانکہ اُس کا اثر ہندوستان اور ہندومت دونوں پر بہت گہرا ہے۔ عیسائیت اب سے ۱۸۰۰ برس پہلے یہاں آئی، آکر یہاں بس گئی اور رفتہ رفتہ اُس نے بھی اپنی کچھ ذاتیں بنالیں۔ مسلمانوں کا سماجی نظام، گو ذات پات کے قید و بند کا سخت مخالف ہے، لیکن ہندوستان کا تھوڑا بہت اثر اُس پر بھی پڑا۔
خود ہمارے اپنے زمانے میں ذات پات کے استبداد کو توڑنے

کے لئے متوسط طبقے میں متعدد تحریکیں شروع ہوئیں اور اُنھوں نے صورت حال میں فرق بھی پیدا کیا، لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان تحریکوں کا انداز عموماً براہ راست حملوں کا تھا۔ پھر گاندھی آئے اور انھوں نے ہندوستان کے براہ راست قدیم انداز میں، اس مسئلے کو بالواسطہ حل کرنا چاہا۔ اُن کی نظر عوام کی طرف تھی۔ اُن کے انداز میں بے باکی بھی تھی، جارحانہ زور بھی اور استقلال بھی، لیکن انھوں نے اس اصلی اور بنیادی نظریے کو ہاتھ تک نہیں لگایا جس پر ہندوستان کی چار خاص ذاتوں کی بنیاد ہے۔ انھوں نے صرف اس کے ملحقات پر حملہ کیا ہے، لیکن انھیں یقین ہے کہ اس بالواسطہ حملے سے وہ ذات پات کی جڑ کھود رہے ہیں[1]۔ گاندھی جی نے اس کی

---

[1] گاندھی جی نے ذات پات کے متعلق بہت تیز اور کھری باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ذات پات کو اور خاص کر ذات پات کے اس طریقے کو جو آجکل رائج ہے قطعی طور پر ختم ہوجانا چاہیے۔ اس سلسلے میں جو عملی پروگرام انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "اس کا مقصد سیاسی، سماجی اور معاشی آزادی ہے۔ ایک بڑی قوم کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک اخلاقی اور غیر جارحانہ انقلاب پیدا کرنا اس کا مقصد ہے۔ ایسا انقلاب جس کے اختتام پر ذات پات اور چھوت چھات اور اس طرح کے دوسرے اوہام کا خاتمہ ہو جائے گا، ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات گذرے ہوئے زمانے کی بات بن جائیں گے، انگریزوں اور یورپ کی دوسری قوموں کی طرف سے دلوں میں جو غبار ہے وہ دور ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور ابھی حال ہی میں انھوں نے کہا ہے کہ "ذات پات جو ہماری زندگی پر چھائی ہوئی ہے اب پرانے زمانے کی چیز (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بنیادوں کو ہلا دیا ہے اور عوام پر اس کا زبردست اثر پڑا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اگر اس عمارت کی ایک اینٹ بھی نکل گئی تو ساری کی ساری بیٹھ جائے گی۔ لیکن ایک اور گاندھی جی سے بھی زیادہ زبردست قوت اپنا کام کر رہی ہے — یعنی موجودہ زمانے کے حالات اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے کی یہ کہنہ اور محکم یادگار اب ختم ہو کر رہے گی۔

عین اس وقت جب ہم ہندوستانی ذات پات سے لڑ رہے ہیں (جس کی بنیاد شروع میں رنگ کے امتیاز پر تھی) مغرب میں ایسی نئی اور تحکم پسند ذاتوں نے جنم لیا ہے جنھوں نے نسلی امتیاز کو اپنا عقیدہ بنا رکھا ہے اور جو کبھی سیاسی اور معاشی لباس میں اور کبھی جمہوریت کا بھیس بدل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

بدھ سے پہلے، حضرت عیسیٰ سے سات سو سال پہلے، ایک عظیم المرتبت ہندوستانی حکیم اور مقنن یج نولکیا نے کہا تھا "ہمارا مذہب یا ہماری چمڑی کا رنگ ہم میں حسنِ عمل پیدا نہیں کرتا۔ حسنِ عمل، عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی کسی دوسرے کے ساتھ وہ نہ کرے جو وہ اپنے ساتھ نہ کرتا۔"

۱۷۔ چندر گپت اور چانکیا — موریا سلطنت کا قیام

بودھ مت رفتہ رفتہ ہندوستان بھر میں پھیل گیا۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ چھتریوں کی شروع کی ہوئی تحریک تھی اور اس کی بنیاد حاکم جماعت اور پروہتوں کی جماعت کی باہمی کشاکش اور مخالفت پر تھی۔ لیکن اس کے اخلاقی اور

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بن گئی ہے۔ اگر ہندو مذہب اور ہندوستان کو باقی رہنا اور ترقی کی راہوں پر چلنا ہے تو اس ذات پات کو مٹانا ہوگا۔"

جمہوری انداز، اور خاص کر پروہتوں اور رسم پرستی کے خلاف اس کی لڑائی نے اسے لوگوں میں مقبول بنا دیا۔ اس نے ایک اخلاقی تحریک کی حیثیت سے ترقی کی اور بعض برہمن مفکر بھی اس کے حامی بن گئے۔ لیکن عام طور پر برہمن اس کے مخالف تھے اور بودھ مت کے پیرووں کو بے دین اور قدیم مذہب سے باغی کہتے تھے۔ بودھ مت کی ظاہری ترقی سے کہیں زیادہ اہم اس کا اور قدیم ہندو مذہب کا باہمی عمل اور ردِ عمل تھا اور وہ شدید نقصان جو برہمنوں کے اقتدار کو پہنچتا رہا۔ اس مت کی ابتدا کے ڈھائی سو سال بعد شہنشاہ اشوک اس کا پیرو ہو گیا اور اس نے ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر اس مذہب کی پُرامن تبلیغ میں اپنی ساری قوت صرف کر دی۔

ان دو صدیوں میں ہندوستان میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ مدتوں سے بہت سی قوتیں نسلوں کے امتزاج و تحلیل اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور حکومتوں کو ایک متحدہ سلطنت بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک متحدہ مرکزی سلطنت قائم کرنے کا پُرانا جذبہ اب بھی برابر کام کر رہا تھا۔ ان ساری چیزوں نے مل کر ہندوستان میں ایک زبردست اور طاقتور سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ شمالی مغربی ہندوستان پر سکندر کے حملے نے اس ارتقائی کیفیت کو سب سے بڑا سہارا دیا۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں دو نمایاں شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ان بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اُٹھایا اور انھیں اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ چندر گپت موریا اور اس کا دوست، مشیر اور وزیر چانکیا برہمن ان دونوں کے اتحادِ عمل سے مفید نتیجے پیدا ہوئے۔ دونوں کو مگدھ کی طاقتور حکومت سے (جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر یا پٹنہ میں تھا) دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔ یہاں سے دونوں ٹکشلا پہنچے اور وہاں ان کا سابقہ یونانیوں سے پڑا

جو سکندر کے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ چندرگپت تو خود سکندر سے بھی ملا۔ اس نے اس کی فتوحات اور پُرعظمت کارناموں کا حال سنا تو اس کے دل میں اس کی ہمسری کا خیال پیدا ہوا۔ اس جذبے کے تحت میں چندرگپت اور چانکیا حالات کا مشاہدہ اور تیاریاں کرتے رہے۔ انھوں نے آئندہ کے لئے بڑے بڑے منصوبے باندھے اور ان کی تکمیل کے لئے موقع کے منتظر رہے۔

اسی زمانے میں خبر آئی کہ ۳۲۳ قبل مسیح میں بابل میں سکندر کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر کے سنتے ہی چندرگپت اور چانکیا نے قومیت کا وہ نعرہ بلند کیا جو پُرانا ہو کر بھی اب تک نیا ہے، اور اس طرح لوگوں کو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف بھڑکا دیا۔ ٹکشلا میں یونانیوں کی جو فوج تھی اُسے مار بھگایا اور ٹکشلا پر قبضہ کرلیا۔ قومیت کا نعرہ سن کر بہت سے راجہ اور سردار چندرگپت کے حامی بن کر آگئے تھے۔ ان سب کو ساتھ لے کر وہ پاٹلی پتر کی طرف چلا۔ سکندر کی موت کے دو سال کے اندر اندر وہ اس شہر پر قبضہ جما چکا تھا اور موریا سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی تھی۔ سکندر کا سپہ سالار سلوکس (جو سکندر کی وفات کے بعد ایشیائے کوچک سے ہندوستان تک کے سارے ملکوں کا حاکم تھا)، ہندوستان کے شمال مغرب پر پھر اپنا اقتدار قائم کرنے کے ارادے سے ایک فوج لے کر چلا اور اُس نے دریائے سندھ کو پار کرلیا۔ اس حملے میں اُسے شکست ہوئی اور اُسے کابل اور ہرات تک کا افغانستان کا علاقہ چندرگپت کو دینا پڑا۔ چندرگپت نے سلوکس کی لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ جنوبی ہند کو چھوڑ کر چندرگپت کی سلطنت پورے شمالی ہند میں بحرِ عرب سے خلیج بنگال اور شمال میں کابل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ

ہندوستان میں ایک وسیع مرکزی حکومت قائم ہوئی اور پاٹلی پترا اس کا دارالسلطنت قرار پایا۔

لیکن یہ نئی سلطنت تھی کیسی؟ خوش قسمتی سے ہمارے پاس اس سلطنت کے متعلق ہندوستانیوں اور یونانیوں دونوں کے مفصل بیانات موجود ہیں۔ سلوکس کے سفیر میگاستھنیز نے اس سلطنت کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ اہم وہ حالات ہیں جو خود کوٹلیا نے اپنی کتاب ارتھ شاستر (علم سیاست) میں، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، لکھے ہیں۔ کوٹلیا چانکیا کا دوسرا نام ہے۔ اور اس طرح ہمارے پاس ایک ایسے شخص کا بیان موجود ہے جو نہ صرف ایک بڑا فاضل تھا، بلکہ اس سلطنت کے قیام، ترقی اور استحکام میں ایک زبردست شریک اور مددگار۔ چانکیا کو ہندوستان کا میکاولی کہا گیا ہے اور کسی حد تک یہ تقابل صحیح بھی ہے۔ لیکن اسے ہر حیثیت سے میکاولی پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ ذہنی قابلیت میں بھی اور عمل میں بھی اس سے کہیں برتر تھا۔ چانکیا بادشاہ کا کوئی ادنیٰ ملازم نہ تھا نہ اس کی حیثیت معمولی مشیر کی تھی۔ اس کی صحیح تصویر ہمیں ایک پرانے ہندوستانی ناٹک میں ملی ہے (اس ناٹک کا نام مُدرا راکشس اور اس کا موضوع اسی عہد کی زندگی ہے) حوصلہ مند اور منصوبہ باز، خود بیں اور انتقام جو، کبھی اپنی ناکامی کو نہ بھولنے والا، اور کبھی اپنے مقصد سے بے خبر نہ رہنے والا، ایک ایسا انسان جو حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا ہے اور بادشاہ کو اپنا آقا نہیں بلکہ اپنا محبوب شاگرد سمجھتا ہے۔ زندگی میں سادہ اور پاک باز، اپنے بلند مرتبہ کے شان و شکوہ سے بے نیاز۔ جب اس نے اپنے منصوبے حاصل کر لیے اور اپنے مقصد کی تکمیل کر لی تو اپنے کاموں کو چھوڑ کر، گیان دھیان کی زندگی

بسر کرنے کی طرف مائل ہوا۔

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو چانکیا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے نہ کر سکتا ہو۔ وہ بالکل بے اصول آدمی تھا مگر اسی کے ساتھ بڑا عقلمند تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ بلند مقصد کے حصول کے لئے پست ذرائع کے استعمال کرنے سے مقصد کی بلندی زائل اور ضائع بھی ہو سکتی ہے۔ کلاؤزوٹس (Clausewitz) سے بہت پہلے چانکیا نے کہہ دیا تھا کہ جنگ شخصی ریاست کی پالیسی کی ایک شکل ہے جس میں حکمت عملی کی جگہ دوسرے ذرائع سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ جنگ کو ریاست کے بلند نصب العین کا تابع رہنا چاہیئے اُسے خود مقصد نہیں بن جانا چاہیئے۔ جنگ سے ارباب سیاست کی غرض سلطنت کی بھلائی ہونا چاہیئے نہ کہ دشمن کی شکست اور بربادی۔ اگر جنگ سے دونوں حریف تباہ و برباد ہو جائیں تو یہ سیاست تہی دستی کی نشانی ہے۔ جنگ مسلح فوجوں کی مدد سے لڑی جاتی ہے، لیکن مسلح فوجوں سے کہیں زیادہ اہم وہ تدبر اور سیاست ہے جو دشمن کی اخلاقی جرأت و قوت کو ختم کر دے، اس کی فوجوں میں انتشار پیدا کر کے اُسے تباہ و برباد کر دے یا فوجی حملے سے پہلے اُسے تباہی کی حد تک پہنچا دے۔ چانکیا اپنے مقصد کی پیروی اور اس کے حصول میں اخلاقی اصول سے بے نیاز اور اپنے ارادے میں پختہ تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ذہین اور عالی منش دشمن کو کچل دینے کے مقابلے میں اُسے اپنا دوست بنا لینا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چانکیا نے آخری فتح اس طرح حاصل کی تھی کہ پہلے دشمن کی فوج میں بے چینی اور بے اطمینانی کا بیج بویا۔ جب یہ بیج پھل لے آیا تو اُس نے چندر گپت کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے حریف کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آئے۔ اپنی طرف سے

چانکیا نے یہ کیا کہ دشمن کے اس وزیر کو، جس کی وفاداری نے اُسے بے حد متاثر کیا تھا، اپنا وزارت کا قلمدان دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بادشاہوں کے تعلقات میں جو تلخی تھی وہ ختم ہوگئی، دو قوتوں میں میل ملاپ ہوگیا، دشمن دوست بن گیا اور شکست و ذلت کی تلخی کے بجائے انجام یہ ہوا کہ سلطنت کی بنیاد مضبوط، مستحکم اور پائدار ہوگئی۔

موریا سلطنت نے یونانی حکومت سے، سلوکس کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی، سیاسی تعلقات قائم رکھے۔ ان تعلقات کی بنیاد دونوں ملکوں کے ٹھوس تجارتی مفاد پر قائم تھی۔ اسٹریبو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحر اخضر اور بحر اسود کے راستوں سے جو ہندوستانی مال یورپ جاتا تھا اس سلسلے کی زنجیر کو مربوط کرنے کے لئے وسط ایشیا کے دریائے جیحوں سے کام لیا جاتا تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ راستہ عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان دنوں وسط ایشیا نہایت زرخیز اور خوش حال تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ ارتھ شاستر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ بادشاہ کے اصطبل میں عربی گھوڑے تھے۔

۱۸۔ حکومت کی تنظیم

یہ سلطنت جو ۳۲۱ قبل مسیح میں شروع ہوئی اور ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں کابل تک پھیلی ہوئی تھی، کیسی تھی؟ ظاہر ہے جیسی اکثر سلطنتیں ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں یعنی استبدادی آمرانہ حکومت۔ شہروں اور گاؤں کے انتظام میں خاصی خود اختیاری تھی اور مقامی معاملات کی دیکھ بھال لوگوں کے چنے ہوئے مکھیا کرتے تھے۔ یہ مقامی خود اختیاری

لوگوں کو بہت عزیز تھی اور کوئی بادشاہ اس میں دخل نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی مرکزی حکومت کا اقتدار سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ گو بعض حیثیتوں سے موریا سلطنت موجودہ زمانے کی سیاست سے مشابہ ہے۔ لیکن اس زرعی زمانے میں فرد کی زندگی پر حکومت کا اتنا قریبی اور گہرا اثر ہونا ممکن نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ تاہم بہت سی دقتوں کے باوجود وہ رعایا کی زندگی میں ضبط اور نظم پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ریاست محض پولیس اسٹیٹ نہیں تھی یعنی اس کا کام صرف یہ نہیں تھا کہ وہ ٹیکس اور محصول جمع کرے اور ملک میں امن قائم رکھے۔

وہ ایک سخت اور بے لوچ دفتری حکومت تھی۔ کہیں کہیں جاسوسی کے محکمے کا بھی ذکر آتا ہے۔ زراعت کے لئے قواعد و ضوابط بنائے گئے تھے۔ اسی طرح سود کی شرحیں بھی مقرر تھیں۔ کھانے پینے کے سامان، بازاروں کارخانوں، مذبحوں، سبیلوں، تفریح گاہوں وغیرہ کے انتظام کے قاعدے موجود تھے اور کبھی کبھی ان کا معائنہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ تولنے اور ناپنے کے لئے باٹ اور پیمانے مقرر تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں میل کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ تجارت پر محصول لیا جاتا تھا اور بعض مذہبی رسموں پر بھی۔ جب کبھی کسی قانون یا قاعدے کی خلاف ورزی یا کوئی اور بے عنوانی ہوتی تھی تو مندروں کا روپیہ ضبط کر لیا جاتا تھا۔ اگر دولت مند کسی قسم کا غبن کرتے تھے اور عوام کی کسی مصیبت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تھے تو ان کی جائداد ضبط کر لی جاتی تھی۔ حفظانِ صحت اور علاج کا معقول انتظام تھا اور صدر مقامات پر طبیب متعین تھے۔ حکومت کی

طرف سے بیواؤں، یتیموں، بیماروں اور محتاجوں کو مدد ملتی تھی۔ قحط سالی کی روک تھام کی طرف حکومت کی خاص توجہ تھی۔ اور حکومت کے اناج گوداموں میں سے آدھے گودام ہمیشہ قحط کے وقت کے لیے محفوظ رکھے جاتے تھے۔

ان سب قاعدے قانونوں کی پابندی غالباً گاؤں کے مقابلے میں شہروں میں زیادہ ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اصول ہی اصول ہوں اور ان پر عمل بہت کم ہوتا ہو۔ تاہم ان کا موجود ہونا بھی دلچسپ ہے۔ گاؤں اپنے معاملات میں قریب قریب خودمختار تھے

چانکیا کی ارتھ شاستر میں بے شمار موضوعات سے بحث کی گئی ہے اور حکومت کے نظری اور عملی مسائل پر ہر پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں بادشاہ اس کے وزیروں اور مشیروں کے فرائض، کونسل کے جلسوں، حکومت کے مختلف محکموں، سیاست اور حکمت عملی، جنگ اور امن سبھی کا ذکر کیا گیا ہے۔

ارتھ شاستر میں چندرگپت کی زبردست فوج کا بھی تفصیلی حال ہے جس میں پیدل سپاہی اور سوار بھی تھے اور رتھ اور ہاتھی بھی [1]

کتاب میں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزوں کا بھی تذکرہ ہے:-

تجارت اور کاروبار، قانون اور کچہریاں، میونسپل حکومت، سماجی رسم و رواج،

---

[1] شطرنج کی ابتدا بھی غالباً فوج کی اسی ترتیب کے لحاظ سے ہوئی۔ چونکہ اس فوج میں چار مختلف عناصر (پیدل، سوار، رتھ اور ہاتھی) تھے اس لئے اسے چترانگ یا چار جسموں والی کہتے تھے اور اسی سے لفظ شطرنج نکلا۔ البیرونی نے اس کھیل کا حال بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اسے چار کھلاڑی (ایک ہی وقت میں) کھیلتے تھے

شادی اور طلاق، عورت کے حقوق، ٹیکس اور محصول، زراعت، کانیں اور کارخانے، کاریگر، بازار، فن باغبانی، مصنوعات، نہریں اور آبپاشی، جہاز اور جہاز رانی، مردم شماری، ماہی گیری، مذبح، پاس پورٹ، جیل خانے۔ اس زمانے میں بیواؤں کی شادی کی اجازت تھی اور بعض خاص حالات میں طلاق کی بھی۔

ایک جگہ چینا پٹہ (یعنی چین کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے) کا بھی ذکر ہے اور اس میں اور ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے میں امتیاز کیا گیا ہے۔ غالباً ہندوستانی ریشم چینی ریشم سے گھٹیا ہوتا تھا۔ چینی ریشم کے ذکر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چین اور ہندوستان کے درمیان چوتھی صدی قبل مسیح میں بھی تجارتی تعلقات تھے۔

تخت نشینی کے وقت بادشاہ کو اپنی رعایا کی خدمت کی قسم کھانی پڑتی تھی، "اگر میں تم پر ظلم کروں تو جنت سے، زندگی سے اور اولاد سے محروم رہوں۔" "رعایا کی خوشی میں اس کی خوشی ہے۔ اُن کی بہبودی کے لئے وہ اس چیز کو اچھا نہیں سمجھے گا جو خود اس کو پسند ہے بلکہ اس چیز کو جو اس کی رعایا کو اچھی لگتی ہے۔" "اگر بادشاہ مستعد ہے تو رعایا بھی مستعد ہوگی۔" یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بادشاہ امور سلطنت کو نظر انداز کر دے یا جب اس کا جی چاہے انجام دے۔ اس کو ہر وقت ان کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا اور اگر بادشاہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرے تو رعایا کو اختیار تھا کہ اُسے ہٹا کر دوسرے کو بادشاہ بنا دے۔

سلطنت کے مختلف حصوں میں نہریں جاری تھیں اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے آبپاشی کا محکمہ تھا۔ بندرگاہوں، پُلوں اور اُن جہازوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے، جو مختلف دریاؤں میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو اور برما

اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کو جاتے تھے ایک جہاز رانی کا محکمہ الگ تھا۔
بعض باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ برّی فوج کے ساتھ ساتھ حکومت
کی بحری فوج اور جہازی بیڑا بھی تھا۔

ملک میں تجارت کی حالت بہت اچھی تھی اور بڑے بڑے شہروں
کے درمیان بڑی اچھی اچھی سڑکیں تھیں، جن پر جا بجا مسافروں کے آرام کے
لئے مسافر خانے بنے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی اور مشہور سڑک کا نام
"شاہ راہ" تھا اور یہ سڑک دارالسلطنت سے لے کر شمالی مغربی سرحد تک
پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے ملکوں سے آنے والے تاجروں کے لئے مختلف
طرح کی آسانیاں اور سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ پُرانے زمانے
میں مصر کے لوگ اپنی ممیوں کو ہندوستانی ململ میں لپیٹ کر رکھتے تھے اور اپنے
کپڑے ہندوستان کے نیل میں رنگا کرتے تھے۔ پُرانے زمانے کی جو چیزیں
کھدائیوں میں نکلی ہیں اُن میں ایک طرح کا شیشہ بھی ہے۔ یونانی سفیر میگاستھنیز
نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کو خوبصورت چیزوں کا اور آرائش کا بے حد
شوق تھا۔ اپنے قد کو اونچا کرنے کے لئے وہ اونچی ایڑی کے جوتے
پہنا کرتے تھے۔

موریا حکومت کے عہد میں عیش پسندی بڑھ گئی تھی اور زندگی میں پیچیدگی،
تخصیص اور تنظیم پیدا ہو گئی تھی۔ ملک میں سرائیں، مہمان خانے، دعوت خانے،
تفریح گاہیں کثرت سے ہیں۔ مختلف فرقوں اور پیشہ وروں نے اپنی بیٹھکیں
بنا رکھی ہیں اور وقتاً فوقتاً ان میں دعوتیں بھی ہوتی ہیں۔ مختلف قسم کے گانے،
ناچنے اور ناٹک کا تماشا کرنے والے لوگوں کا دل بہلا کر اپنی روزی کماتے ہیں۔
ان کی پارٹیاں گاؤں گاؤں جا کر کھیل تماشے دکھاتی ہیں۔ ارتھ شاستر کے مصنف

نے ان تفریحی پارٹیوں سے کھیل تماشوں کے لئے کسی خاص ہال کی ضرورت کی مخالفت کی ہے۔ اس لئے کہ اس طرح کے کھیل تماشے لوگوں کا دھیان گھریلو زندگی اور کھیتوں کے کام کی طرف سے ہٹا دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض قانونوں میں ایسے لوگوں کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے جو عوام کے تفریحی جلسوں میں مدد دینے سے انکار کردیں۔ بادشاہ کی طرف سے ایک مرکزی ہال بنوایا گیا ہے جس میں حکومت عوام کی تفریح اور دلچسپی کے لئے ڈراموں کے علاوہ کشتیوں اور آدمیوں اور جانوروں کے مقابلوں کا انتظام کرتی ہے۔ لوگوں کو عجیب وغریب چیزوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ اور اکثر تہواروں اور جشنوں کے موقعوں پر سڑکوں پر روشنی کی جاتی ہے۔[۵۱] کبھی کبھی شاہی جلوس بھی نکلتے تھے اور بادشاہ اکثر شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔

اس وسیع مملکت میں بہت سے بڑے بڑے شہر تھے لیکن ان میں سب سے بڑا شہر حکومت کا دارالسلطنت پاٹلی پتر تھا۔۔۔ یہ شاندار شہر گنگا کے کنارے اُس جگہ بسا ہوا تھا جہاں سون دریا اس میں آکر گرتا ہے۔ میگاستھنیز نے اُس کا حال یوں بیان کیا ہے: "جہاں ایک دوسرے دریا کا سنگم گنگا سے ہوتا ہے، پالی بوتھرا (پاٹلی پترا) کا شہر بسا ہوا ہے۔۔۔ ۹ میل لمبا اور پونے دو میل چوڑا۔ اس کی شکل ایک متوازی الاضلاع کی سی ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک لکڑی کی دیوار بنی ہوئی ہے اور اس دیوار میں،

Dr. F.W. Thomas: Cambridge History of India, V. 1, P. 480. ۵۱

تیراندازی کے لئے جا بجا سوراخ ہیں۔ شہر کی حفاظت اور اُس کے گندے پانی کی نکاسی کے لئے ایک کھائی بنی ہوئی ہے۔ یہ کھائی شہر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، چھ سو فیٹ چوڑی اور تیس کیوبٹ (ایک کیوبٹ = ۱۸ تا ۲۲ انچ) گہری ہے۔ دیوار پر ۵۷۰ برج ہیں اور اس میں ۶۴ پھاٹک۔ صرف یہ دیوار ہی نہیں بلکہ شہر کے اکثر مکان بھی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ غالباً زلزلوں کے ڈر سے ایسا کیا گیا تھا، اس لئے کہ اس حصے میں زلزلے بہت آتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں بہار میں جو زبردست زلزلہ آیا اُس نے یہ بات اچھی طرح یاد دلادی۔ چونکہ مکان لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے آگ لگنے کے اندیشے سے بڑی بڑی احتیاطیں برتی جاتی تھیں۔ ہر مکان دار کو اپنے گھر میں سیڑھیاں، زنجیریں اور پانی سے بھری ہوئی نادیں رکھنی پڑتی تھیں۔ پاٹلی پتر میں ایک میونسپلٹی بھی تھی جس کے ممبر لوگوں کے چُنے ہوئے ہوتے تھے۔ میونسپلٹی میں کل تیس ممبر تھے اور وہ پانچ پانچ آدمیوں کی چھ کمیٹیوں پر بٹے ہوئے تھے جن کے سپرد صنعت و حرفت، پیدائش اور اموات کے اندراج اور مسافروں اور یاتریوں کے انتظامات کی نگرانی تھی۔ پوری میونسپل کونسل مل کر مالیات، حفظانِ صحت، آب رسانی، تعمیرات اور باغات کی دیکھ بھال اور انتظام کرتی تھی۔

۱۹ - بُدھ کی تعلیم

ایک طرف تو سیاسی اور اقتصادی انقلابات ہندوستان کا رنگ بدل رہے تھے اور دوسری طرف بودھ مت کے پیدا ہونے، دوسرے مذاہب سے ٹکرانے اور مذہب کے ٹھیکہ داروں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ایک ہیجان

برپا تھا۔ مباحثہ اور استدلال سے جن کا ہندوستانیوں کو ہمیشہ سے شوق سے کہیں زیادہ ایک زبردست نورانی شخصیت نے اُن کے دلوں کو متاثر کیا تھا اور اُس کی یاد اب تک اُن کے دلوں میں تازہ تھی۔ اس پیغام نے " جو پُرانا ہو کر بھی نیا تھا خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو الٰہیات کی باریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کو تسخیر کر لیا، اور ان کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیا۔ بدھ نے اپنے مریدوں سے کہا تھا " ہر ملک میں جاؤ اور اس پیغام کی تبلیغ کرو۔ لوگوں سے کہو کہ غریب اور امیر، چھوٹے اور بڑے سب ایک ہیں۔ اور اس مذہب میں آ کر سارے مذہبوں کا سنگم ہوتا ہے، بالکل اس طرح جیسے دریا سمندر میں ملتے ہیں"۔ اس کا پیغام عالمگیر انسانیت اور محبت کا پیغام تھا۔ " اس دنیا میں نفرت، نفرت سے ختم نہیں ہوتی، نفرت محبت سے ختم ہوتی ہے" اور " انسان سے کہو کہ وہ غصہ کو نرمی سے جیتے اور بُرائی کو بھلائی سے۔"

بودھ مت حُسنِ عمل اور ضبطِ نفس کا آدرش تھا " انسان لڑائی کے میدان میں ہزاروں پر فتح پا سکتا ہے، لیکن جو اپنے آپ پر فتح حاصل کرے وہ سب سے بڑا فاتح ہے۔" " انسان اپنی پیدائش سے نہیں، بلکہ اپنے عمل سے، نیچ ذات یا برہمن بنتا ہے۔" کسی گناہ گار کو بھی بُرا کہنے کی اجازت نہیں اس لئے کہ " جو لوگ جان بُوجھ کر کسی کے بُرے کام کو بُرا کہتے ہیں، وہ گویا اُس کے قصور کے زخم پر نمک چھڑکتے ہیں۔" دوسروں پر غالب آنے سے ہمیشہ بُرے نتیجے پیدا ہوتے ہیں " فتح نفرت کی پرورش کرتی ہے، اس لئے کہ مفتوح کو اس سے رنج پہنچتا ہے۔"

بدھ نے ان سب باتوں کی تعلیم کے لئے کسی مذہب کا سہارا نہیں ڈھونڈا اور نہ اس کے لئے خدا اور عاقبت کے خوف کی آڑ لی۔ اُس نے عقل، استدلال

اور تجربے کو تعلیم کی بنیاد بنایا ہے اور لوگوں سے کہا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں حق کی تلاش کریں۔ "کوئی میری بات صرف میری عزت اور احترام کی خاطر نہ مان لے پہلے اُسے اس طرح پرکھے جیسے آگ پر سونا" حق سے بے خبری بدھ کے نزدیک ہر کاوش اور تکلیف کا باعث ہے۔ اُس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ خدا یا وجود مطلق کوئی چیز ہے یا نہیں۔ اُس نے نہ تو خدا کے وجود کا اقرار کیا ہے اور نہ اس سے انکار۔ جب علم کا امکان ہی نہ ہو تو انسان کو کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سوال کے جواب میں بدھ نے یہ بات کہی تھی کہ "اگر ذات مطلق سے کوئی ایسی ذات مراد ہے جو موجودات سے بے تعلق رہ کر وجود رکھتی ہے تو میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ ہمیں کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ دوسری چیزوں سے بے تعلق رہ کر کوئی چیز موجود ہے؟ ساری کائنات، جو ہماری نظر میں ہے تعلقات کا ایک نظام ہے، ہمیں کسی ایسی شے کا علم نہیں جو بغیر کسی تعلق کے قائم ہو۔ اس لئے ہمیں صرف اس چیز پر یقین کرنا چاہئے جسے ہم دیکھ سکیں اور جس کے متعلق ہمیں یقینی علم ہو۔"

اسی طرح بدھ نے روح کے وجود کے متعلق بھی کسی سوال کا جواب صاف طور پر نہیں دیا ہے۔ نہ وہ اُس کے وجود کا اعلان کرتا ہے اور نہ اُس سے منکر ہے۔ وہ اس سوال پر قطعی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب ہندوستانی ذہن پر روح منفرد، روح مطلق، وحدانیت، وحدت پرستی اور دوسرے الہیاتی مسائل چھائے ہوئے تھے، بدھ کا یہ رویہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن بدھ نے اپنے ذہن کو ہر الہیاتی ظاہر پرستی سے آزاد کر لیا تھا۔ پھر بھی قانون قدرت کے استقلال و استحکام، علت و معلول کے ہمہ گیر رشتۂ سبب اور نتیجہ کے تسلسل اور ربط اور نیکی اور خوشی اور بدی اور غم کے بنیادی تعلق

پر اس کا یقین اور ایمان تھا۔

ہم تجربہ کی اس دُنیا میں اشیار اور حقیقتوں کی تشریح کے لئے الفاظ
اور اسمار استعمال کرتے ہیں اور انھیں کی بنا پر کہتے ہیں کہ " یہ ہے" یا
" یہ نہیں ہے"۔ لیکن اگر ہم ان چیزوں اور حقیقتوں کے سطحی پہلو سے ذرا
آگے کی طرف نظر دوڑائیں تو بہت ممکن ہے کہ ہماری زبان ان کی اصل
حقیقت کی تشریح اور وضاحت کے لئے کافی نہ ہو۔ شاید حقیقت 'ہے'
یا 'نہیں ہے' کے بیچ میں کوئی چیز ہو یا ان کے ماورا۔ دریا برابر بہتا
رہتا ہے، اور ہر وقت ایک ہی سا نظر آتا ہے لیکن دریا کا پانی برابر
بدلتا رہتا ہے۔ یہی حال آگ کا ہے۔ شعلہ بھڑکتا رہتا ہے، اُس کی
شکل صورت بھی قائم رہتی ہے۔ پھر بھی یہ شعلہ ایک ہی شعلہ نہیں رہتا،
ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز برابر بدلتی رہتی ہے اور زندگی اپنی
مختلف ہیئتوں میں تشکیل کا ایک دھارا ہے۔ حقیقت کوئی ایسی شے نہیں
جو مستقل اور کبھی نہ بدلنے والی ہو ۔۔۔ یہ تو ایک درخشاں قوت ہے، قوتوں
اور حرکتوں کا مجموعہ، سبب اور نتیجہ کی ایک زنجیر۔ وقت کا تصور' ایک واقعہ
کے بعد دوسرے واقعہ کے وجود کے تصور سے پیدا ہوا ہے'۔ ہم یہ ہرگز نہیں
کہہ سکتے کہ ایک چیز کسی دوسری چیز کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ کسی
مستقل شے کی بنیادی حیثیت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ کسی شے کی اصل حقیقت
اس کا وہ خلقی اور طبعی قانون ہے جو اسی طرح کی چیزوں سے اُس کا تعلق
پیدا کرتا ہے۔ ہمارے جسم اور ہماری روح ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک دنیا
وہ ختم ہو جاتے ہیں، اور کوئی دوسری چیز، اُن سے ملتی جلتی، لیکن اُن سے
مختلف، ظاہر ہوتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ ایک حیثیت سے ہم ہر وقت

مر رہے ہیں اور ہر وقت دوبارہ زندہ ہو رہے ہیں، اور موت اور زیست کا یہ تسلسل ایک مربوط حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ زندگی "ہر آن بدلنے والی ایک حقیقت کا تسلسل ہے"۔ ہر چیز سیال ہے، متحرک ہے اور متغیر۔

ان ساری باتوں کا سمجھنا ہمارے لئے دشوار ہے ــــ اس لئے کہ ہم مادی حقائق کے ادراک اور ان کے متعلق سوچنے کے ایک خاص طریقے کے عادی ہو چکے ہیں۔ پھر بھی یہ بات آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ بدھ کا فلسفہ ہمیں طبیعات کے بعض تصورات اور موجودہ فلسفیانہ فکر کے بعض پہلوؤں سے بہت قریب لے آتا ہے۔

بدھ کا طریقہ نفسیاتی تجزیہ کا طریقہ تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بدھ کو اس جدید ترین سائنس کی گہرائیوں میں کتنا درک اور دخل تھا۔ انسانی زندگی کا مطالعہ اور محاسبہ ذات مطلق کے تعلق سے الگ ہو کر کرتا تھا، اس لئے کہ اگر حقیقت میں اس طرح کا کوئی مطلق وجود ہے بھی تو وہ ہمارے ادراک سے بالاتر ہے۔ دماغ جسم کا ایک حصہ سمجھتا تھا ــــ ذہنی قوتوں کا ایک اجتماع ۔ اس طرح انسان اس کے نزدیک ذہنی حالتوں کا ایک مجموعہ تھا اور نفس یا ذات خیالات یا تصورات کا ایک دھارا۔ "جو کچھ ہم ہیں وہ اس کا نتیجہ ہے جو ہم نے سوچا ہے۔"

بدھ کے فلسفے میں زندگی کے دکھ درد پر بہت زور دیا گیا ہے اور "چار حقائق عالیہ" جو اس نے پیش کئے ہیں اسی دکھ درد سے متعلق ہیں ــــ ان کی وجوہ، ان کے ختم کرنے کا امکان، اور انھیں ختم کرنے کے طریقے۔ انھوں نے اپنے مریدوں سے ایک مرتبہ کہا کہ "تم نے مدتوں غم اٹھایا ہے اور تمھاری آنکھوں سے آنسو بہے ہیں۔ تم مدتوں اس (زندگی کے) سفر میں بھٹکے اور پھرے ہو،

تم نے رنج سہے ہیں، روئے ہو — اس لئے کہ جس چیز سے تم نے نفرت کی، وہ تمہارا حصہ تھا، اور جس چیز سے تم نے محبت کی وہ تمہارا حصہ نہیں تھا، جیسے کہ چاروں سمندروں کا سارا پانی تمہارا حصہ نہیں ہے۔"

رنج و غم کی یہ حالت ختم ہو جائے تو "نروان" حاصل ہو جاتا ہے نروان کیا ہے، اس پر لوگوں میں اختلاف ہے، اس لئے کہ ہماری ناقص زبان اور ہمارے محدود ذہن اس قابل نہیں کہ ایک لامحدود شے کا تصور اور تشریح کر سکیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شمع حیات کے بجھ جانے کا نام "نروان" ہے۔ لیکن بدھ نے نروان کے اس تصور سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ نروان ایک شدید قسم کی عملی قوت ہے۔ نفسانی خواہش کی کمی "نروان" نہیں بلکہ اس کا قطعی طور پر مٹ جانا "نروان" ہے — لیکن اس کی تشریح اور تعریف سوائے منفی انداز کے اور کسی طرح نہیں کی جا سکتی۔

بدھ کا راستہ عیش پرستی اور نفس کشی کے بیچ کا راستہ تھا۔ خود اپنے جسم کو اذیت میں مبتلا رکھ کر اپنے تجربہ کی بنا پر بدھ نے کہا ہے کہ جس شخص میں جسمانی قوت باقی نہیں رہی وہ صحیح راستے پر نہیں چل سکتا۔ یہ بیچ کا راستہ انسان کو آٹھ مختلف چیزوں میں راستی کی تعلیم دیتا ہے — عقائد میں، خواہشات میں، گفتگو میں، عمل میں، رہن سہن میں، جدوجہد میں، فکر میں اور اظہار طرب میں۔ یہ چیزیں خداداد نہیں، خود انسان کی ذاتی کوشش اور حسن عمل سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان راہوں پر چلنے میں کامیابی حاصل کرے اور اس طرح اپنے نفس پر فتح پا جائے تو اس کے لئے دنیا میں کوئی شکست نہیں۔" خدا بھی ایسے آدمی کی فتح کو شکست میں نہیں بدل سکتا جس نے اپنے اوپر فتح پائی ہے۔"

بدھ اپنے مریدوں کو صرف وہی باتیں بتاتے تھے، جن کے متعلق انہیں

یقین ہوتا تھا کہ وہ انھیں سمجھ سکیں گے یا ان پر عمل کر سکیں گے۔ اُن کی تعلیم ہر چیز کی تشریح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُنھیں دنیا کی ہر شے کی حقیقت کی وضاحت کا دعویٰ بھی نہیں تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے کچھ سوکھی پتیاں اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے محبوب مرید "آنند" سے پوچھا کہ بتاؤ کیا ان پتیوں کے علاوہ جو میرے ہاتھ میں ہیں اور بھی پتیاں ہیں؟ آنند نے جواب دیا "خزاں کی پتیاں ہر طرف گر رہی ہیں اور وہ اتنی ہیں کہ گنی بھی نہیں جا سکتیں" اس پر بدھ نے کہا "اسی طرح میں نے تمھیں مٹھی بھر دگنتی کی، سچائیاں بتائی ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی لاکھوں اور ایسی حقیقتیں ہیں جو گنی نہیں جا سکتیں۔"

۲۰ ۔ بدھ کی کہانی

مجھے بچپن ہی سے بدھ کی کہانی بڑی دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ جوان سدھارتھ کی شخصیت میں جسے ان گنت ذہنی اذیتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں نے بدھ بنایا تھا، ایک خاص کشش محسوس ہوتی تھی۔ اڈون آرنلڈ کی کتاب "لائٹ آف ایشیا" میری محبوب کتاب بن گئی۔ ذرا بڑا ہو کر جب مجھے اپنے صوبے میں ادھر اُدھر سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو میں ان جگہوں کی سیر کر کے بہت خوش ہوتا تھا جن کا تعلق بدھ کی کہانی سے تھا ـــ اس مقصد کے لئے کبھی کبھی میں اپنا راستہ بدل کر زیادہ لمبا راستہ اختیار کر لیتا تھا۔ ان جگہوں میں سے اکثر میرے صوبے میں ہیں یا اس صوبہ سے بہت قریب۔ میں ان جگہوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہاں (نیپال کی سرحد پر) بدھ پیدا ہوئے تھے، یہاں وہ گھومتے پھرتے تھے، یہاں (بہار کے شہر گیا میں) اس درخت کے نیچے انھیں روشنی ملی تھی، یہاں انھوں نے اپنا پہلا وعظ کہا تھا اور یہاں انھوں نے وفات پائی تھی۔

جب میں نے ان ملکوں کا سفر کیا جہاں بودھ مت اب بھی ایک زندہ اور غالب مذہب کی حیثیت رکھتا ہے تو میں اُن کے مندر اور خانقاہیں دیکھنے گیا۔ راہبوں اور عام لوگوں سے مل کر میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ بودھ مت نے ان کو کس سانچے میں ڈھالا ہے، ان کے ذہن اور وضع قطع پر اس کے کیا اثرات پڑے ہیں اور وہ جدید زندگی کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں؟ اس تحقیقات سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو مجھے پسند نہیں آئیں۔ بودھ مت کے عقلی اور اخلاقی مسلک پر بہت سے حاشیے چڑھ گئے ہیں۔ اس میں ہر جگہ رسوم کی پابندی اور کٹرپن آگیا ہے اور بدھ کی تعلیم کے باوجود لوگ مابعد الطبیعی عقیدوں کے پابند ہیں اور جادو کی تاثیر کے قائل۔ پھر بدھ کی سخت تنبیہہ کے باوجود، انھوں نے اس کو دیوتا بنا دیا اور اُس کے بڑے بڑے مجسمے، مندروں میں اور مندروں سے باہر مجھے جُھک کر دیکھ رہے تھے اور میں سوچتا تھا کہ بدھ ہوتے تو کیا کہتے۔ راہبوں میں سے اکثر جاہلِ مطلق تھے، جاہل، خود بیں اور دوسروں سے اطاعت اور پرستش کے طالب۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کا نہیں تو کم از کم ان کے لباس کا ضرور احترام کریں۔ ہر ملک میں یہ حال ہے کہ اس کی قومی خصوصیتوں نے مذہب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور اس پر اس کی مخصوص رسوم کا قبضہ ہے۔ میرے نزدیک یہ قدرتی بات ہے اور ارتقا کے نقطۂ نظر سے ناگزیر ہے۔

لیکن میں نے بہت سی ایسی باتیں بھی دیکھیں جو مجھے پسند آئیں۔ بعض خانقاہوں اور ان کے منسلکہ مدرسوں میں پُرسکون مطالعے اور غور و فکر کی فضا تھی۔ بہت سے راہبوں کے چہروں پر سکون اور اطمینان کا رنگ چھایا ہوا تھا ــــ وہ باوقار، حلیم اور زندگی کی فکروں سے آزاد اور بے تعلق نظر آتے تھے۔

کیا اس پرسکون فضا کو موجودہ زندگی سے کوئی ربط تھا۔ یا یہ محض اُس سے فرار کی ایک شکل تھی؟ کیا اس سکون کو زندگی کی اس مسلسل کشمکش سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا وہ سارا ابتذال، ساری ہوس رانی اور سارا جبر و استبداد جس نے ہمیں بے چین کر رکھا ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے؟

زندگی کو جس نظر سے میں دیکھتا ہوں، بدھ کی قنوطیت اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ــــ اور مجھے اس کی زندگی اور اس کے مسائل سے بھاگنے کی کوشش پسند نہیں۔ میرے دل کے کسی گوشے میں فطرت پرستی کا جذبہ مچل رہا ہے ــــ وہ فطرت پرستی جو زندگی اور فطرت کی گہما گہمی کی شیدائی ہے اور اس کشمکش سے نہیں گھبراتی جو زندگی میں ہر قدم پر پیش آتی ہے۔ جو کچھ مجھ پر گذری یا جو کچھ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا ہے وہ بے حد تکلیف دہ اور پریشان کن ہے، لیکن اس نے زندگی کے جذبے کو سست نہیں ہونے دیا۔

کیا بدھ مت انفعالی اور قنوطی ہے؟ ممکن ہے اس کے مفسروں کا یہی خیال ہو اور اس کے بہت سے پیرووں نے یہی نتیجہ نکالا ہو۔ میں اُس کی باریکیوں اور اس فلسفیانہ شکل کے متعلق جو اس نے آگے چل کر اختیار کی رائے دینے کا اہل نہیں لیکن جب میں بدھ کا تصور کرتا ہوں تو مجھے یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان میں انفعالیت اور قنوطیت نام کو بھی پائی جاتی ہے۔ پھر میری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ جس مذہب کی بنیاد انفعالیت اور قنوطیت پر ہو وہ انسانوں کی ایک بڑی جماعت کو کس طرح مسخر کر سکتا ہے، خاص کر ایسی صورت میں کہ اس بڑی جماعت کے اکثر لوگ بڑے دانشمند بھی تھے۔

بدھ کے جس جسمانی تصور کو ان گنت عقیدہ تمند ہاتھوں نے سنگ مرمر، کانسی اور پتھروں پر نقش کئے ہوئے مجسموں کی صورت دی ہے، اُس سے

ہندوستانی فکر کے پورے جذبے کی ترجمانی ہوتی ہے یا کم از کم اس فکر کا ایک اہم پہلو نمایاں اور واضح ہوتا ہے۔ کنول کے پھول پر بیٹھا ہوا، متین اور پُرسکون، خواہش اور نفس پرستی کے جذبات سے بالاتر، دنیا کے طوفانوں سے محفوظ و مامون، پاس ہو کر بھی دور، انسانی دسترس سے باہر، ناقابلِ حصول ــــ اس مجسمہ میں بظاہر یہ سب کچھ ہے، لیکن اس متین اور پُرسکون خط و خال کی گہرائیوں میں ایک جوش، ایک اضطراب پنہاں ہے ــــ اتنا قوی اور ایسا عجیب و غریب جو ہمارے ادراک اور تصور میں نہ سما سکے۔ ان مجسموں میں بدھ کی آنکھیں بند ہیں، لیکن کوئی روحانی قوت باہر کی چیزوں کو دیکھتی اور انسانی جسم کو بے پناہ قوت کی لہروں سے بھر دیتی ہے۔ ہزاروں برس گذر گئے، پھر بھی وہ ہم سے دور نہیں ہوئے ــــ اُن کی آواز ہمارے کانوں میں کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے "زندگی کی کشاکش سے ڈر کر بھاگو مت! سکون کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو۔ زندگی میں ترقی اور نشو و نما کی نت نئی راہیں نکلیں گی۔"

شخصیت کی تاثیر ہمارے زمانے میں بھی ہمیشہ کی طرح مسلم ہے ــــ اور ایک ایسی شخصیت جس نے انسانی ذہن پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ ہزاروں برس گذرنے کے بعد بھی اس کا تصور ہم میں زندگی کی لہر پیدا کر دیتا ہے، یقیناً ایک غیر معمولی شخصیت ہوگی ــــ ایک ایسا انسان، جو بقول بارتھ کے "سکون اور پُرکشش شکوہ کا مکمل سراپا ہے، جس کے دل میں ہر ذی روح کے لئے بے پایاں شفقت اور ہر مصیبت زدہ کے لئے رحم اور ہمدردی ہے اور جو اخلاقی آزادی اور بلند خیالی کا مجسم نمونہ ہے۔" ایک ایسی قوم اور ایسا ملک جو انسانیت کا ایسا بلند نمونہ پیش کر سکے، یقیناً دانشمندی اور روحانی قوت کا گہرا سرچشمہ ہے۔

۲۱ - اشوک

چندرگپت موریا نے ہندوستان اور مغربی دنیا کے درمیان جو تعلقات قائم کئے تھے وہ اس کے بیٹے بندوسار کے عہد میں بھی قائم رہے۔ پاٹلی پتر کے دربار میں مصر کے بادشاہ بطلیموس اور سلوکس کے بیٹے اور وسط ایشیا کے حکمراں انٹیوکس کے سفیر موجود تھے۔ چندرگپت کے پوتے اشوک نے ان تعلقات کو اور بھی بڑھایا اور پھیلایا۔ اور اس کے عہد میں ہندوستان ایک بین الاقوامی مرکز بن گیا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس زمانے میں بدھ مت بہت تیزی سے دنیا میں پھیل رہا تھا۔

اشوک ۲۷۳ قبل مسیح کے قریب تخت پر بیٹھا۔ اس سے پہلے وہ شمالی مغربی صوبہ میں، جس کا دارالسلطنت تکشلا تھا، وائسرائے رہ چکا تھا۔ جب اشوک تخت پر بیٹھا تو اس سلطنت میں ہندوستان کا زیادہ حصہ شامل تھا اور یہ وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ صرف جنوبی اور جنوبی مشرقی ہندوستان کا کچھ حصہ اس سے الگ تھا۔ ہندوستان میں پورے ملک کو ایک شہنشاہی حکومت میں شامل کرنے کا جو خواب مدتوں سے دیکھا جا رہا تھا، اس نے اشوک کے دل میں بھی ایک ولولہ پیدا کیا، اور اس نے کلنگ (جو ہندوستان کے مشرقی ساحل پر واقع تھا اور جس میں موجودہ اڑیسہ اور آندھرا کا ایک حصہ شامل تھا) فتح کرنے کی تیاری شروع کی۔ کلنگ والے بڑی بہادری اور جواںمردی سے لڑے پھر بھی اشوک کی فوجوں نے اس کو فتح کر لیا۔ اس لڑائی میں بے حد خونریزی ہوئی اور جب اشوک کو اس کی اطلاع ملی تو اُسے بڑا دکھ ہوا اور اُس کے دل میں لڑائی کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی۔ عین اس وقت جب فتح یابی

اشوک کے قدم چوم رہی تھی اس نے لڑائی بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دنیا میں کسی فاتح حکمراں یا سپہ سالار نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ تاریخ میں یہ اپنی قسم کی واحد مثال ہے۔ سارے ہندوستان نے اشوک کی شہنشاہی تسلیم کرلی، صرف جنوب کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا۔ وہ چاہتا تو اُسے بھی آسانی سے تسخیر کرسکتا تھا لیکن اُس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب آئندہ کوئی لڑائی نہیں لڑے گا۔ البتہ بودھ مت کے پیغام سے متاثر ہوکر اُس نے دوسرے میدانوں میں فتوحات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اشوک نے جو کچھ محسوس کیا اور جس طرح اپنے احساس کو عملی جامہ پہنایا، وہ خود اُسی کے لفظوں میں اُس کے متعدد علمناموں میں یا پتھر اور دھات پر کندہ کئے ہوئے کتبوں میں موجود ہے۔ یہ کتبے اور فرمان سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور اب تک ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کتبوں نے نہ صرف اشوک کی رعایا تک اس کا پیغام پہنچایا بلکہ آنے والے زمانہ کے لئے اُسے محفوظ کرلیا۔ ایک فرمان میں کہا گیا ہے:۔

”مقدس اور مہربان شہنشاہ نے اپنی تخت نشینی کے آٹھ سال بعد کلنگ فتح کیا۔ اس جنگ میں ایک لاکھ پچاس ہزار آدمی گرفتار کئے گئے، ایک لاکھ پچاس ہزار لڑائی کے میدان میں قتل ہوئے اور اس سے کئی گنے اور جان سے مارے گئے۔

کلنگ کی فتح کے بعد ہی مقدس شہنشاہ کے دل میں پرہیز گاری کے قانون (دھرم) کی محبت نے گھر کرلیا اور اس نے اس قانون کی حفاظت اور تبلیغ کا بیڑا اُٹھایا۔ اور اس کے بعد مقدس شہنشاہ کو کلنگ فتح کرنے کا رنج ہوا، اس لئے کہ کسی ملک کی فتح سے لوگوں کی جانیں جاتی ہیں اور اُنھیں

زنجیروں میں بندھنا پڑتا ہے۔ یہ خیال مقدس شہنشاہ کو بڑا دکھ دے رہا ہے۔"

اس کتبے میں آگے چل کر یہ بتایا گیا ہے کہ اشوک آئندہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا کہ جتنے آدمی کلنگ میں مقتول اور مقید ہوئے ان کا سواں یا ہزارواں حصہ بھی قتل یا قید کیا جائے۔ 'دھرم کے قانون' سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا اصل فتح ہے۔ اور اس طرح کی فتوحات شہنشاہ نے نہ صرف اپنی مملکت میں حاصل کی ہیں بلکہ دوسری دور دراز مملکتوں میں بھی۔ اور آگے چل کر اس کتبے میں کہا گیا ہے:۔

"اگر کوئی شخص مقدس شہنشاہ کے ساتھ برائی کرے گا تو مقدس شہنشاہ جہاں تک ممکن ہوگا اُسے بھی برداشت کریں گے۔ مقدس شہنشاہ اپنی مملکت میں بسنے والے جنگلی باشندوں پر بھی مہربانی کی نظر رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن میں اچھی عادتیں پیدا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو مقدس شہنشاہ کو بے حد رنج ہوگا۔ اس لئے کہ مقدس شہنشاہ کی خواہش ہے کہ دنیا میں ہر ذی روح کو اطمینان حاصل ہو، وہ سکون، مسرت اور ضبطِ نفس کی زندگی گزار دے۔"

اس عجیب و غریب بادشاہ نے، جسے لوگ اب تک ہندوستان میں اور ایشیا کے بہت سے دوسرے حصوں میں محبت کے ساتھ یاد کرتے ہیں، بدھ کی تعلیم کو پھیلانا اپنا مقصد بنا لیا۔ اور اپنی پوری توجہ اس بات میں صرف کی کہ لوگوں میں حسنِ عمل اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو، اور ملک میں ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن میں رعایا کی بھلائی ہو۔ اشوک صرف واقعات پر بے تعلقی کے ساتھ نظر رکھنے اور غور و فکر میں مصروف رہنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ رعایا کے کاموں میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیتا اور ہر وقت ان کے لئے تیار رہتا تھا۔

"ہر وقت اور ہر جگہ میں کھانا کھا رہا ہوں یا حرم سرا میں ہوں، خواب گاہ میں،

یا خلوت خانہ میں، اپنی گاڑی میں یا محل کے باغوں میں، میں کہیں بھی ہوں سرکاری مخبروں کو چاہیئے کہ وہ مجھے رعایا کے کاموں کی اطلاع دیں ..... ہر جگہ اور ہر وقت مجھے رعایا کی بھلائی کے لیئے کام کرنا چاہیئے۔"

اشوک کے سفیر اور قاصد عراق، مصر، مقدونیا، سیرین اور یپیرس گئے اور بدھ کا پیغام وہاں پہنچایا۔ وہ وسط ایشیا، برما اور سیام میں بھی پہنچے۔ اشوک نے اپنے بیٹے اور بیٹی مہیندرا اور سنگھ متر کو لنکا بھیجا۔ ہر جگہ لوگوں کی عقل اور اُن کے جذبات پر اثر ڈالا گیا۔ کہیں سختی اور زبردستی نہیں ہوئی۔ اشوک بودھ مت کا سچا پیرو تھا اور اس لیئے اس کے دل میں دوسرے عقیدوں کی عزت اور اُن کے لیئے رواداری کا جذبہ موجود تھا۔ ایک فرمان میں اس نے یہ اعلان کیا کہ "ہر مذہب کسی نہ کسی وجہ سے عزت کا مستحق ہے۔ دوسرے کے مذہب کی عزت کر کے انسان اپنے مذہب کا مرتبہ بڑھاتا ہے اور دوسروں کے مذہب کی خدمت کرتا ہے۔"

بودھ مت ہندوستان میں بہت تیزی سے پھیلا اور کشمیر سے لنکا تک اس کے بے شمار پیرو ہو گئے۔ وہ نیپال کے اندرونی حصوں میں اور پھر تبت، چین اور منگولیا تک پہنچ گیا۔ ہندوستان میں اس مت کے پھیلنے کے دو نتیجے ہوئے۔ لوگوں نے گوشت خوری اور شراب خوری چھوڑ دی۔ اس سے پہلے برہمن اور چھتری دونوں گوشت کھاتے اور شراب پیتے تھے۔ اب جانوروں کی قربانی بھی ممنوع ہو گئی۔

اشوک نے دوسرے ملکوں میں سفیر بھیج کر روابط پیدا کیئے۔ اُس سے ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات بھی ضرور بڑھے ہوں گے۔ بعض شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ختن میں ہندوستانی نوآبادی تھی۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں اور خاص کر ٹکشلا میں دوسرے ملکوں کے طالب علم تعلیم حاصل کرنے آتے تھے ۔

اشوک کو تعمیرات کا بہت شوق تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے بعض بڑی تعمیروں میں غیر ملکوں کے کاریگروں سے بھی مدد لی تھی ۔ اشوک کے زمانے کے بعض ستونوں کو دیکھ کر اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے ۔ لیکن اُس زمانے کی اکثر تعمیرات میں نمایاں طور پر ہندوستانی فن تعمیر کے نشانات ملتے ہیں ۔

پاٹلی پتر میں اشوک کے محل میں بہت سے ستونوں والا ایک بڑا کمرہ تھا، اس کا تھوڑا سا حصہ آثار قدیمہ کے کچھ ماہروں نے کوئی تیس برس ہوئے کھود کر باہر نکالا ہے ۔ ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے افسر ڈاکٹر اسپونر نے اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ " یہ کمرہ اتنی محفوظ حالت میں تھا کہ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی ۔ لکڑی کے لٹھے اتنے ہی چکنے اور صحیح سالم تھے جیسے اب سے دو ہزار برس پہلے رہے ہوں گے ۔" آگے چل کر ڈاکٹر اسپونر نے لکھا ہے کہ " یہ پرانی لکڑی اتنی اچھی حالت میں تھی کہ اس کے کناروں کے جوڑ تک نظر نہیں آتے تھے ۔ جس کسی نے بھی یہ عجیب و غریب بات دیکھی بے اختیار تعریف کی ۔ پوری عمارت اتنی صحت اور اہتمام کے ساتھ بنائی گئی تھی کہ اس کا مقابلہ آج کل بھی ہونا مشکل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مختصر یہ کہ یہ عمارت، اس طرح کے کام کی انتہائی تکمیل کا نمونہ تھی ۔"

ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جو عمارتیں نکلی ہیں اُن کے لکڑی کے ستون اور شہتیر بھی بہت اچھی حالت میں ملے ہیں ۔ یہ بات یوں تو ہر ملک میں حیرت انگیز ہوتی لیکن ہندوستان میں خاص کر اور بھی زیادہ اس لئے کہ ہندوستان کی آب و ہوا لکڑی کو گلا دیتی ہے اور طرح طرح کے کیڑے اُسے کھا جاتے ہیں ۔

اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی پر کسی طرح کا مسالہ لگا کر اُسے تیار کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات اب تک ایک راز ہے کہ وہ مسالہ کیا تھا۔

پاٹلی پتر (پٹنہ) اور گیا کے بیچ میں نالندا یونیورسٹی کے کھنڈر پڑے ہیں۔ یہ بات اب تک تحقیق نہیں ہوئی کہ یہ یونیورسٹی کس زمانے میں تھی۔ اشوک کے زمانے میں اس کی موجودگی کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

اکتالیس سال تک ہندوستان پر محنت اور جفاکشی سے حکومت کرنے کے بعد ۲۳۲ قبل مسیح میں اشوک کا انتقال ہوا۔ اس کے متعلق ایچ۔ جی۔ ولز نے اپنی کتاب "Outline of History" میں لکھا ہے:۔

"تاریخ کے صفحوں میں جن لاکھوں بادشاہوں کے نام نظر آتے ہیں اور اعلیٰ حضرت، جہاں پناہ، فلک بارگاہ کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں، ان میں اشوک کا نام سب سے زیادہ روشن ہے ـــ ایک ستارے کی طرح سب سے الگ اور سب سے زیادہ چمک دار۔ ولگا سے جاپان تک اُس کا نام اب تک عزت و حرمت سے لیا جاتا ہے۔ چین، تبت اور ہندوستان میں اس کی عظمت کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی قسطنطین اور شارلمین کے نام بھی نہیں سنے، اُن کے دلوں میں بھی اشوک کے نام کی یاد موجود ہے۔"

پانچواں باب

دوران زمانہ

۱۔ قومیت اور سامراج گپت بادشاہوں کے عہد میں

موریا سلطنت رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور اس کی جگہ شنگ بادشاہوں نے لے لی لیکن اس خاندان کی حکومت بہت تھوڑے سے علاقے پر تھی۔ جنوب میں بڑی بڑی خودمختار ریاستیں پیدا ہو رہی تھیں اور شمال میں ہندی یونانی کابل سے پنجاب کی طرف بڑھتے آرہے تھے۔ مینینڈر کی سرکردگی میں انھوں نے پاٹلی پتر پر بھی حملہ کیا لیکن انھیں یہاں بہت بری طرح شکست ہوئی۔ مینینڈر کو ہندوستان کی فضا نے اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ بودھ مت کا پیرو ہو گیا اور بادشاہ ملندا کے نام سے مشہور ہوا۔ بودھ مت کی کہانیوں میں اس کا جا بجا ذکر ہے اور اسے قریب قریب ایک مہاتما کی طرح یاد کیا گیا ہے۔ ہندی اور یونانی تہذیب کے میل سے گندھارا کے (افغانستان اور سرحد کا علاقہ) یونانی بدھ آرٹ کی تخلیق ہوئی۔

صوبۂ متوسط میں سانچی کے قریب بس نگر کے مقام پر پہلی صدی قبل مسیح کا بنا ہوا ایک پتھر کا مینار ہے، اس پر سنسکرت کا ایک کتبہ نقش ہے۔ اس سے ہمیں یونانی کے رفتہ رفتہ ہندی رنگ میں رنگے جانے کی مختصر کیفیت معلوم ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب میں جذب ہو گئے۔ اس کتبہ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:-

" دیوتاؤں کے دیوتا' واسدیو (وشنو) کے نام کا یہ مینار، ڈیئن کے بیٹے ہیلیوڈورس کا بنوایا ہوا ہے۔ ہیلیوڈورس ٹکسلا کا رہنے والا تھا اور اُسے یونانیوں کے بادشاہ اینٹی الیکیڈس نے بھگ بھدر کے پاس اپنے راج کے چودھویں برس میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔"

" تین غیر فانی ہدایتیں، اگر انسان اُن پر پوری طرح عمل کرے، تو اُسے بہشت میں لے جاتی ہیں — ضبطِ نفس، ایثار اور راست بازی۔"

وسط ایشیا میں شکوں یا سیستانیوں نے وادیِ جیجوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یوچی قوم (Yuah Chih) نے مشرق کی طرف سے آکر انھیں یہاں سے نکال بھگایا اور وہ شمالی ہند کی طرف آگئے۔ ان شکوں نے ہندوستان آکر بودھ مت یا ہندو مت اختیار کر لیا۔ یوچی کے گروہ میں سے کشن نامی ایک قبیلے نے دوسروں پر غلبہ حاصل کر لیا اور رفتہ رفتہ بڑھ کر شمالی ہند میں داخل ہو گئے۔ اُنھوں نے شکوں کو ہرا کر اُنھیں اور دکن کی طرف دھکیل دیا اور یہ لوگ دکن اور کاٹھیاوار کے علاقوں میں جا بسے۔ اب کشن لوگوں نے سارے شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا کے خاصے بڑے حصے میں ایک مضبوط اور دیرپا سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سے کچھ ہندو ہو گئے لیکن زیادہ لوگوں نے بودھ مت اختیار کر لیا۔ ان کے خاندان کے مشہور بادشاہ کنشک کو بھی بودھ ادب میں خاصی اہم جگہ دی گئی ہے، اور اُس کے زبردست کارناموں اور قومی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ گو کنشک بذاتِ خود بودھ تھا لیکن سرکاری مذہب ایک مخلوط مذہب تھا جس پر زرتشت مذہب کا بھی تھوڑا سا اثر تھا۔ یہ سرحدی حکومت جو عام طور پر کشن سلطنت کے نام سے مشہور تھی اور جس کا دارالسلطنت موجودہ پشاور اور ٹکسلا کے قریب واقع تھا، بہت سی قوموں

کے لوگوں کے میل جول کا مرکز بن گئی۔ یہاں ہندوستانیوں کا ملاپ سیتانیوں سے، ایرانیوں سے، یونانیوں سے، ترکوں سے، چینیوں سے ہوتا تھا اور یہ سب تہذیبیں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی تھیں۔ اور ان سب اثرات نے مل کر سنگ تراشی اور مصوری کا ایک خاص طرز پیدا کر دیا۔ یہی زمانہ تھا جب تاریخی نقطۂ نظر سے، ہندوستان اور چین میں ربط ضبط پیدا ہوا اور ۶۴ء میں سفیروں کی ایک جماعت چین سے ہندوستان آئی۔ اُس زمانے میں چین نے ہندوستان کو جو سب سے پہلے تحفے دیے وہ فاشپاتی اور آڑو تھے۔ گو یہ تحفے معمولی تھے لیکن بے حد خوشگوار۔ صحرائے گوبی کے کنارے ترخان اور کچا میں ہندی، چینی اور ایرانی تہذیب نے مل جل کر بڑی دلفریب شکلیں اختیار کیں۔

کُشن عہد میں ایک زبردست اختلاف نے بودھ مت کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام مہاین تھا اور دوسری کا ہن ین۔ ان دونوں جماعتوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے اور جیسا کہ ہندوستان کا قاعدہ ہے بڑے بڑے جلسوں میں دونوں جماعتوں میں بحث مباحثے شروع ہو گئے۔ ان میں ہندوستان کے ہر حصے سے لوگ شریک ہونے کے لئے آتے تھے۔ کشمیر، حکومت کے دارالسلطنت سے بالکل قریب تھا اور ان بحثوں کے علاوہ مختلف طرح کی تمدنی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔ ان اختلافات میں ایک نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ نام ناگرجن کا ہے، جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ ناگرجن بڑی عظیم الشان شخصیت کا مالک تھا اور بودھ مت کا زبردست عالم ہونے کے علاوہ ہندی فلسفے کا بھی بہت بڑا فاضل تھا۔ اور اسی شخص کے علم و فضل اور شخصیت کی بدولت مہاین جماعت کو کامیابی ہوئی، اور اسی جماعت کے عقائد چین میں پھیلے۔ لنکا اور برما میں ہن ین گروہ کے عقائد عام ہوئے۔

کُشن لوگوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی رنگ میں رنگ لیا تھا اور وہ اس تہذیب کے بڑے حامی اور سرپرست تھے۔ پھر بھی اُن کی حکومت کے خلاف ملک میں ایک اندرونی جذبہ کام کرتا رہا اور جب کچھ عرصے بعد نئے نئے قبیلے ہندوستان میں داخل ہوئے تو چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اس قومی تحریک نے ایک باقاعدہ شکل اختیار کرلی اور چندرگپت نام کے ایک دوسرے بڑے بادشاہ نے باہر سے آنے والوں کو نکال کر ہندوستان میں ایک وسیع اور بااثر حکومت قائم کرلی۔

اس طرح ۳۲۰ء میں گپت شہنشاہوں کا زمانہ شروع ہوا اور اس خاندان میں یکے بعد دیگرے کئی بڑے بادشاہ ہوئے جنھوں نے ایک طرف میدانِ جنگ میں کامیابیاں حاصل کیں اور دوسری طرف علوم وفنون کو ترقی دی۔ پے درپے بیرونی حملوں نے ملک میں باہر سے آنے والوں کے خلاف مخالفت کا شدید جذبہ پیدا کردیا تھا، اور برہمنوں اور چھتریوں کے پُرانے طبقے نے بھی اب اپنے وطن اور اپنی تہذیب کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس کیا۔ اب جو بیرونی اثرات ہندوستانی تہذیب میں گھُل مل چکے تھے، اُنھیں تو کسی نہ کسی طرح گوارا کرلیا گیا لیکن ہر نئے آنیوالے کی سخت مخالفت اور مدافعت کی گئی اور ساری توجہ اس بات کی طرف مرکوز ہوگئی کہ ہندوستان میں پُرانے برہمنی آدرشوں کی بنیاد پر ایک زبردست متحدہ سلطنت قائم کی جائے۔ لیکن اب وہ پہلا سا اعتمادِ نفس باقی نہیں رہا تھا اور برہمنی آدرشوں میں ایک ایسا کٹرپن پیدا ہوگیا تھا جو ان کی فطرت کے منافی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان جسمانی اور ذہنی، دونوں حیثیتوں سے ایک چار دیواری میں مقید ہوکر بیٹھ رہا ہے۔

لیکن اس چار دیواری میں بڑی وسعت تھی۔ اس سے پہلے، اُس زمانہ میں جب آریا لوگ آریا ورت یا بھارت ورش میں داخل ہوئے تھے تو ہندوستان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس نئی آنے والی قوم اور اُس کی تہذیب اور ملک کے قدیم باشندوں اور ان کی تہذیب میں امتزاج کس طرح پیدا کریں۔ ہندوستانی ذہن نے غور و فکر کر کے اس کا ایک مستقل حل نکال لیا اور اُس حل کی مدد سے ہند آریائی تہذیب کی مضبوط بنیادیں کھڑی کیں۔ دوسرے بیرونی عناصر ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں آکر جذب ہو گئے۔ اُن کے آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ گو ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان تجارتی اور بعض دوسرے تعلقات تھے، لیکن وہ ان تعلقات سے متاثر ہوا۔ وہ اپنے معاملات کی طرف متوجہ رہا اور جو کچھ دوسرے ملکوں میں ہو رہا تھا اُس کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ لیکن مختلف طرح کی اور مختلف رسم و رواج والی قوموں کے متواتر حملوں نے اُس کے سکون کو درہم برہم کر دیا اور اُسے ان خلل اندازیوں کی طرف توجہ دینی ہی پڑی اس لئے کہ ان سے نہ صرف اُس کی سیاسی تعمیر بلکہ سماجی بنیادیں اور تمدنی آدرش متزلزل ہونے لگے تھے۔ اس کا ردعمل 'قومیت' کی شکل میں نمودار ہوا اور اس میں 'قومیت' کی ساری قوت بھی موجود تھی اور اُس کی ساری تنگ نظری بھی۔ مذہب اور فلسفہ، تاریخ اور روایت، رسم اور رواج کا وہ مجموعہ جو ہندوستان کی اُس وقت کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور جسے ہم برہمنیت یا (آگے چل کر) ہندوویت کہہ سکتے ہیں، اس قومیت کا مظہر بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مذہب صحیح مفہوم میں قومی مذہب تھا اور سماج اور تمدن کے وہ سارے فطری مطالبات پورے کرتا تھا جنھیں آج بھی ساری دنیا میں قومیت کی بنیاد کہا جاتا ہے۔ بودھ مت بھی جو ہندوستانی فکر کی پیداوار تھا اپنا قومی پس منظر رکھتا تھا۔ اس کے لئے ہندوستان وہ متبرک سرزمین تھی جہاں

مہاتما بدھ پیدا ہوئے تھے اپنے مذہب کی تلقین کی اور انتقال کیا اور جہاں مشہور فاضلوں اور پروہتوں نے اس مذہب کو پھیلایا تھا۔ لیکن بودھ مت، بنیادی طور پر، بین الاقوامی عقیدہ تھا ــــ ساری دنیا کا مذہب۔ اور جوں جوں یہ ترقی کرتا اور پھیلتا رہا، اور بھی بین الاقوامی بنتا رہا۔ اور اس لیے بالکل قدرتی بات تھی کہ برہمنی عقیدہ ہی ہندوستان کی قومیت کا صحیح مظہر بنتا۔

یہ مذہب اور فلسفہ ہندوستان کے دوسرے مذہبوں اور قومی اور نسلی عناصر کے معاملہ میں بے حد رواداراور فراخ دل تھا اور ان سب کو اپنے وسیع دائرے میں سمیٹتا جاتا تھا لیکن باہر سے آنے والوں کا وہ سخت مخالف ہو گیا اور انھیں اپنے سے دور رکھنے کی کوشش میں مصروف رہنے لگا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کی جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی اس میں شہنشاہیت کی جھلک پیدا ہو گئی، اس لیے کہ جب 'قومیت' کی قوت بڑھ جاتی ہے تو وہ عموماً یہی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ گپتوں کا عہد، علم و فضل، تہذیب اور زندگی کے ہر شعبے میں قوت اور زندگی کا حامل تھا، اور اس لیے اس نے ان شہنشاہی رجحانات کو تیزی سے ترقی دی۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ سمدر گپت کو ہندوستانی نپولین کا لقب دیا گیا ہے۔ علمی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی گپت عہد بے حد پر شکوہ اور شاندار تھا۔

چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے سے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد تک شمال میں گپت خاندان کی زبردست اور خوش حال سلطنت قائم رہی۔ اس کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد تک بھی اسی خاندان کے حکمراں ہندوستان پر حکومت کرتے رہے لیکن ان سب کی زندگی محض دوسروں کے حملوں کا مقابلہ کرنے میں گذری اور سلطنت رفتہ رفتہ چھوٹی ہوتی رہی۔ وسط ایشیا کے نئے حملہ آور برابر ہندوستان میں آتے اور ان پر حملے کرتے رہے۔ سب سے پہلے ہُن قوم کے لوگ آئے اور جس طرح

انھوں نے یورپ میں لوٹ کھسوٹ کی تھی اسی طرح ہندوستان کو بھی تباہ و برباد کیا۔ ان کے ظالمانہ برتاؤ اور وحشیانہ طرز عمل نے ہندوستانیوں میں جوش پیدا کیا اور یشودرمن کی سپہ سالاری میں ان پر ایک متحد اور متفق حملہ کیا گیا۔ اس حملے نے ہُن قوم کی قوت کو ختم کر دیا اور اُن کا سردار مہرگل قید کر دیا گیا۔ لیکن گپت خاندان کے بادشاہ بالادتیہ نے اپنے مُلک کے طریقوں کے مطابق اس کے ساتھ کریمانہ سلوک کیا اور اُسے ہندوستان سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ مہرگل نے اس کریم النفسی کا بدلہ اس طرح دیا کہ دوبارہ ہندوستان آیا اور اپنے محسن پر حملہ آور ہوا۔

لیکن شمالی ہندوستان میں ہُن قوم کی حکومت بہت مختصر مدت یعنی کوئی پچاس سال تک رہی۔ لیکن بہت بعد تک ان میں سے بہت سے چھوٹے بڑے سردار ہندوستان میں رہے اور کوئی نہ کوئی فتنہ و فساد اُٹھاتے رہے اور آخرکار یہ بھی ہندوستانیت کے بے پایاں سمندر میں مل گئے۔ ان میں سے کچھ سرداروں نے ساتویں صدی عیسوی میں جارحانہ حرکتیں کیں۔ لیکن قنوج کے بادشاہ ہرش وردھن نے انھیں کچل ڈالا اور اس کے بعد شمالی ہند اور وسط ہند میں ایک زبردست سلطنت قائم کرلی۔ وہ بودھ کا پکا پیرو تھا لیکن اس کی مہاین جماعت سے تعلق رکھتا تھا جو بہت سی حیثیتوں سے ہندو مذہب سے مشابہ تھی۔ اُس نے بودھ مت اور ہندو مذہب دونوں کی مدد کی۔ چین کا مشہور سیاح ہوین تسانگ (یا یوان چوانگ) اسی کے عہد میں (۶۲۹ء میں) ہندوستان آیا تھا۔ ہرش وردھن شاعر اور ڈرامانگار تھا اور اس نے اپنے دربار میں بہت سے شاعر اور فن کار جمع کر لئے تھے۔ اس طرح اس کا دارالسلطنت اُجینی، تمدنی سرگرمیوں کا ایک مشہور مرکز بن گیا تھا۔ ہرش ۶۴۸ء میں مرگیا۔ یہ زمانہ عین وہی زمانہ ہے جب اسلام عرب کے ریگستانوں سے نکل کر تیزی کے ساتھ افریقہ اور ایشیا میں پھیلتا جا رہا تھا

۲- جنوبی ہند

جنوبی ہند میں ایک ہزار برس سے بھی کچھ زیادہ سے یعنی جب سے موریا سلطنت کمزور ہونی شروع ہوئی تھی، بعض بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوتی رہی تھیں۔ آندھروں نے شکوں کو شکست دی اور آگے چل کر کُشن قوم کے بادشاہوں کے ہم عصر رہے۔ اس کے بعد مغرب میں چلوکیہ سلطنت آئی اور اس کے بعد "راشٹر کوٹ" سلطنت بنی۔ ذرا جنوب کی طرف بڑھ کر پلّووں کی حکومت تھی اور اسی عہد میں ہندوستانیوں نے باہر جا جا کر نوآبادیاں قائم کیں۔ اس کے بعد چولا سلطنت قائم ہوئی جو جنوب کے تقریباً سارے حصّے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے لنکا اور جنوبی برما کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ 'چولا' خاندان کا آخری نامور بادشاہ راجندر ۱۰۴۴ء میں مرا۔

جنوبی ہند دو چیزوں کی وجہ سے مشہور تھا — اپنی نفیس صنعتوں کے لئے اور بحری تجارت کے لئے۔ جنوبی ہند کی سلطنتیں بحری قوتیں تھیں اور ان کے جہاز دور دور کے ملکوں کو سامانِ تجارت لے جاتے تھے۔ ان سلطنتوں میں یونانی نوآبادیاں تھیں اور بعض جگہ روم کے سکّے بھی برآمد ہوئے ہیں۔ چلوکیہ سلطنت کے سفیر فارس کے صفوی بادشاہوں کے دربار میں جایا کرتے تھے۔

ہندوستان پر جو متواتر حملے ہوئے اُن سے جنوب پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑا لیکن بالواسطہ اثر یہ ہوا کہ شمال سے بہت سے لوگ جنوب میں جا جا کر بس گئے اور ان بسنے والوں میں بہت سے اچھے کاریگر اور ماہرین فن

تھے۔ اور اس طرح جنوبی ہند، ہندوستان کی پرانی فنی روایات کا مرکز بن گیا اور شمال پر باہر سے آنے والے نئے نئے رجحانات کا اثر پڑتا رہا۔ یہ عمل بعد کی صدیوں میں اور بھی شدید ہو گیا اور جنوب "ہندومت" کا قوی مرکز بن گیا۔

۳۔ پُرامن ارتقا اور جنگ کے طریقے

ہندوستان پر جو پے درپے حملے ہوتے رہے اور ایک سلطنت کے بعد دوسری سلطنت قائم ہوئی، اُس کا مختصر حال بیان کر دینے سے اُس زمانے کے ہندوستان کی حالت کے متعلق غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ طویل تھا۔ اور اس ایک ہزار سال میں بیرونی حملوں کے علاوہ ملک میں امن اور سکون اور باقاعدہ حکومت کے بہت سے دور گذرے ہیں۔ موریا، کشن اور گپت اور جنوب میں آندھرا، چلوکیہ، راشٹرکوٹ وغیرہ حکمرانوں کے ایسے خاندان ہیں جنھوں نے دو دو سو، تین تین سو سال تک حکومت کی ہے — (اور یہ مدت اس مدت کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے جب سے انگریز ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں)۔ بادشاہوں کے یہ سارے خاندان ہندوستان کے ملکی باشندوں کے تھے۔ اور وہ خاندان بھی (مثلاً کشن خاندان) جو شمال کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، یہاں آکر گھل مل گئے اور انھوں نے یہاں کے تمدن کو اپنا تمدن بنا کر، ہندوستان پر بالکل اسی طرح حکومت کی جیسے خود یہاں کے رہنے والوں نے۔ ان حکمرانوں کے زمانے میں ایسی ریاستوں میں جن کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں، کبھی کبھی چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو جاتی تھیں، لیکن

ملک کی عام حالت ایسی ہی تھی جیسی کسی پُرامن حکومت کے زمانے میں ہوتی ہے۔ ان سلطنتوں کے حکمراں ملک کی فنی اور تمدنی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کو اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے تھے۔ اور ان سرگرمیوں کا اثر سلطنت کی حدود سے باہر نکل کر ہندوستان کے مختلف حصوں تک پہنچتا رہتا تھا، اس لئے کہ سارے ہندوستان کی علمی اور تمدنی فضا تقریباً ایک ہی سی تھی۔ مذہب یا فلسفے کے معاملے میں اگر کسی ایک جگہ کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا تھا تو ہندوستان کے ہر حصے میں اس پر بحث مباحثوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

جس زمانے میں دو حکومتوں کے درمیان لڑائی چھڑی ہوتی تھی، یا سلطنت کی حدود میں انقلاب برپا ہوتا تھا تو اس وقت بھی عوام کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ پرانے زمانے کے کاغذات میں اس طرح کے معاہدے موجود ہیں جن میں حکمرانوں نے گاؤں کی خود مختار پنچایت سے یہ عہد کیا ہے کہ جنگ کے زمانے میں وہ فصلوں کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اگر غیر ارادی طور پر فصلوں کو کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ اس کا تاوان ادا کریں گے۔

قدیم ہند آریائی عہد میں لڑائی کے جو قاعدے مقرر تھے اُن کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ وہ قاعدے یہ تھے کہ لڑائی میں کوئی ناجائز طریقہ نہ اختیار کیا جائے، اور جو لڑائی نیک مقصد کے لئے لڑی جارہی ہے اُس میں شروع سے آخر تک راست بازی سے کام لیا جائے۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ ان قاعدوں پر عمل کس حد تک کیا جاتا تھا۔ زہریلے تیروں اور چھپے ہوئے ہتھیاروں کا استعمال منع تھا۔ اسی طرح سوتے ہوئے آدمیوں کو، قیدیوں کو، پناہ مانگنے والوں کو مارنے کی سخت ممانعت تھی۔ یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ لڑائی

میں اچھی عمارتوں کو مسمار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس خیال میں چانکیہ کے وقت سے تبدیلی ہونے لگی تھی۔ اس لئے کہ چانکیہ کا خیال تھا کہ اگر دشمن کو شکست دینے کے لئے فریب وریاکاری اور تباہی و بربادی کے طریقوں سے کام لینا ضروری ہے تو ان سے یقیناً کام لینا چاہیئے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ چانکیہ نے لڑائی کے ہتھیاروں کا ذکر کرتے ہوئے ارتھ شاستر میں ایک ایسے ہتھیار کا ذکر کیا ہے جس سے ایک وقت میں سو آدمیوں کو مارا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض اڑا دینے والی چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چانکیہ نے خندقوں کی لڑائی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ یہ بتانا ممکن نہیں کہ ان چیزوں کی صحیح شکل و صورت کیا ہوگی۔ میرے خیال سے تو یہ اشارے سحر اور جادو کی کہانیوں کی طرف ہیں۔ یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس زمانے میں بارود موجود ہوگی۔

ہندوستان کو اپنی طویل تاریخ میں تباہی اور بربادی کے ان گنت دوروں سے گذرنا پڑا ہے — آگ، تلوار یا قحط سالی نے اُسے تباہ و برباد کر دیا اور اس تباہی و بربادی سے ملک کا اندرونی نظام پارہ پارہ ہوگیا۔ پھر بھی اس کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان تباہیوں اور بربادیوں سے کہیں زیادہ امن اور سکون اور عیش و عشرت کے زیادہ طویل دور دیکھے ہیں — اُن سے کہیں زیادہ طویل جتنے یورپ کو نصیب ہوئے۔ یہ بات ہر زمانہ کے لئے صحیح ہے حتیٰ کہ جو زمانہ ترکوں اور افغانوں کے حملوں سے شروع ہو کر مغل حکومت کے آخری دور تک جاری رہا اس میں بھی زیادہ تر امن اور سکون کی حکمرانی تھی — یہ خیال کہ امن اور سکون ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز لائے بڑا عجیب و غریب فریب ہے۔ یہ صحیح

ہے کہ جب انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو ہندوستان اپنی انتہائی پستی میں تھا اور اس کا سیاسی اور اقتصادی شیرازہ بالکل بکھرا ہوا تھا۔ اور حقیقت میں اس حکومت کے یہاں قائم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

۴۔ ہندوستان میں آزادی کا جذبہ

"مشرق نے طوفان کے آگے سر جھکا دیا، وہ گہرے اطمینان اور بے نیازی میں ڈوبا رہا۔ گرجتے ہوئے لشکر اس کی برابر سے نکل گئے اور وہ پھر فکر میں ڈوب گیا۔" یہ ایک شاعر کا قول ہے جو اکثر دہرایا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشرق، یا اس کا وہ حصہ جسے ہندوستان کہتے ہیں، ہمیشہ سے غور و فکر کا شیدائی رہا ہے اور اکثر اس نے ایسی چیزوں کے متعلق سوچا ہے جنھیں وہ لوگ جو اپنے کو "عملی" کہتے ہیں، فضول اور بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہندوستان نے ہمیشہ فکر کی اور مفکروں کی تعظیم کی ہے، اور تلوار کے دھنی یا دولت کے مالک کو کبھی اُس سے برتر نہیں جانا۔ اپنی پستی کے زمانے میں بھی اس نے فکر کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھا اور اسی میں اُسے راحت ملی۔

لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہندوستان ہمیشہ طوفانوں کے آگے سر جھکائے کھڑا رہا یا گذرتے ہوئے لشکروں کی گرج کی طرف سے بے خبر اور بے نیاز رہا۔ اُس نے ہمیشہ ان طوفانوں اور لشکروں کا مقابلہ کیا ہے۔ اکثر ان مقابلوں میں اُسے کامیابی ہوئی ہے اور کبھی کبھی ناکامی۔ لیکن وہ ناکامی کو بھولا نہیں اور اس کی یاد کو دل میں لئے ہوئے اگلے مقابلے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ان لشکروں کا مقابلہ اس نے دو طرح کیا — یا تو ان سے لڑ کر انھیں مار بھگایا یا اگر بھگا نہ سکا تو انھیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ اُس نے سکندر کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور

اس کی وفات کے فوراً بعد یونانی فوجوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔ اُس کے بعد اس نے ہند یونانیوں اور ہند سیتھیوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور آخر کار ہندوستان میں پھر ایک قومی حکومت قائم ہوگئی۔ اس نے کئی نسل تک ہُن قوم کا مقابلہ کیا اور اُنھیں ہندوستان سے باہر نکالتا رہا۔ جو باقی رہ گئے وہ ہندوستانی تہذیب میں گھل مل گئے۔ جب عرب ہندوستان آئے تو وہ دریائے سندھ کے پاس ٹھیر گئے۔ ترک اور افغان بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور کئی صدیوں بعد دہلی کے تخت پر اُن کا پورا قبضہ ہو سکا۔ یہ جدو جہد ایک طویل اور مسلسل جدو جہد تھی۔ یہ جدوجہد جاری رہی اور اس کے ساتھ ساتھ جذب و امتزاج کا عمل بھی جاری رہا، یہاں تک کہ حملہ آور بھی اسی حد تک ہندوستانی بن گئے جیسے خود یہاں کے رہنے والے۔

ہندوستان میں مختلف عناصر کو شیر و شکر کرکے ایک متحدہ قومی تہذیب بنالینے کی جو خاصیت تھی اس کا سب سے بڑا نمائندہ اکبر تھا۔ اکبر نے اپنے آپ کو ہندوستانی رنگ میں ڈبو لیا اس لئے اس کے غیر ملکی ہونے کے باوجود ہندوستان اس کی طرف مائل ہوگیا اور اُسے اپنا بنا لیا۔ اور اس چیز نے اُسے ہندوستان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیادیں قائم کرنے کا موقع دیا۔ جب تک اس کے جانشین اسی کے بنائے ہوئے راستہ پر چلتے رہے اور انھوں نے اپنے آپ کو ہندی مزاج کے مطابق رکھا ان کی سلطنت قائم رہی۔ جب انھوں نے اس راستے کو چھوڑ کر قومی ارتقا کے دھارے کی مخالفت کی تو سلطنت بھی درہم برہم ہوگئی۔ نئی تحریکیں شروع ہوئیں، قومیت نے ایک نیا جنم لیا۔ لیکن مطمح نظر محدود تھا۔ اس لئے وہ کوئی مستقل صورت اختیار نہ کرسکیں اور مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان نئی تحریکوں کو وقتی طور پر کامیابی ہوئی لیکن ان کی نظر ہمیشہ ماضی کی طرف رہی اور انھوں نے اس ماضی کو زندہ کرنا چاہا۔ اور اس بات پر غور نہیں کیا کہ زمانہ آگے بڑھ چکا ہے اور

ماضی حال کی جگہ نہیں لے سکتا۔ خاص کر اس صورت میں کہ ہندوستان کا حال بھی جمود اور انتشار کا ترجمان تھا۔ اُس کا رشتہ بدلتی ہوئی دنیا سے ٹوٹ چکا تھا اور دنیا اُسے پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی کہ مغرب میں ایک نئی اور زیادہ اہم اور بامعنی دنیا جنم لے رہی ہے۔ نئے رجحانات، نئے طریق کار اور نئی قوتیں برسرِعمل ہیں۔ برطانیہ اس دنیا کی نمائندگی کر رہا تھا جس سے وہ قطعی بے خبر تھے۔ اس بے خبری کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ کو کامیابی ہوئی۔ لیکن ابھی شمال میں برطانیہ کے قدم اچھی طرح نہ جمنے پائے تھے کہ غدر پڑ گیا اور اس نے 'جنگ آزادی' کی شکل اختیار کرلی اور آزادی کی اس جنگ نے برطانوی حکومت کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ آزادی کا یہ جذبہ ہندوستان کے دل میں ہمیشہ سے رہا ہے اور اس نے بیرونی قوتوں کے آگے سر جھکانے سے انکار کیا ہے۔

۵۔ ترقی یا سلامتی

ہم ہمیشہ سے تنہائی پسند رہے ہیں۔ ہمیں اپنے ماضی پر اور تمدنی میراث پر ہمیشہ سے ناز رہا ہے اور ہمیشہ اس تمدنی ورثے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہم نے اس کے گرد دیواریں بنائی ہیں، رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ لیکن اس قومی احساس اور ذات پات کی سختیوں کے باوجود، دوسری قوموں کی طرح جنھیں اپنی نسل کے خالص ہونے پر ناز ہے ہم بھی بہت سی قوموں کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں — آریا، دراوڑی، تورانی، سامی اور منگول۔ آریا ہندوستان میں پے در پے متعدد ہلّوں میں آئے اور دراوڑوں میں آ کر گھل مل گئے۔ ان کے بعد ہزاروں برس تک متعدد دوسری قوموں اور نسلوں کے قبیلے اور گروہ ہندوستان

میں آتے رہے — ایرانی، یونانی، باختری، پارتھی، سیتھی، کُشن، یوچی، ترک، ترک منگول اور اسی طرح بہت سی قوموں کے لوگ چھوٹے بڑے گروہوں میں ہندوستان آتے اور اسے اپنا وطن بناتے رہے۔ ڈاڈول نے اپنی کتاب "انڈیا" میں لکھا ہے کہ "خونخوار اور جنگجو قبیلوں نے بار بار اس کے (ہندوستان کے) شمالی میدانوں پر حملے کئے، یہاں کے حکمرانوں کو فاش شکستیں دیں، شہروں پر قبضہ کرکے اُنھیں تباہ و برباد کیا، نئی سلطنتیں قائم کیں، نئے دارالسلطنت بنائے اور پھر انسانیت کی اونچی لہریں اُنھیں اپنے ساتھ بہالے گئیں — اور وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے صرف دو نشانیاں چھوڑ گئے، ایک تو بدیسی خون جس کا اثر روز بروز کم ہوتا گیا دوسرے بعض رسم و رواج جو آہستہ آہستہ اپنے زبردست ماحول میں جذب ہو کر رہ گئے۔"

لیکن یہ زبردست ماحول کس چیز نے پیدا کیا تھا؟ کچھ تو جغرافی اثرات اور مقامی آب و ہوا نے لیکن اس سے کہیں زیادہ کسی قوی اندرونی تحریک نے، کسی پُر زور جذبے نے یا زندگی کی اہمیت کے اُس زبردست احساس نے جو ہندوستان کے تحت الشعور میں اس وقت سے جاگزیں تھا جب اس کی تاریخ کی ابتدا ہوئی تھی اور اس میں شباب اور زندگی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ یہ جذبہ اتنا قوی تھا کہ جو بھی اس کے سامنے آتا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور خواہ اس سے کتنا ہی مختلف ہو اس کے رنگ میں ڈوب جاتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لہر، یہ جذبہ، یہ شعلہ جس نے اس ملک کی تہذیب کو روشنی بخشی اور تاریخ کے ہر دور میں اس کے باشندوں کے دلوں کو گرماتا رہا تھا، کیا تھا۔

بظاہر زندگی کے اس جذبے یا تصور کی تلاش جس نے ہندوستانی تہذیب کو ترقی کی راہ دکھائی، ایک بے معنی جسارت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ فرد

کی زندگی کسی ایک چیز سے نہیں بلکہ سینکڑوں چیزوں سے متاثر ہوتی ہے۔ پھر قوم یا تہذیب کی زندگی تو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ لاکھوں تصورات ہیں جو کسی طوفان زدہ جہاز کے منتشر اجزا کی طرح ہندوستان کے سینے پر تیرتے پھر رہے ہیں، اور یہ خیالات آپس میں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ خیالات کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں سے کچھ کو اکٹھا کر کے ہم ایک نظریہ کو صحیح ثابت کر سکتے ہیں اور پھر اسی آسانی سے ان بکھرے ہوئے اجزا میں سے کچھ دوسرے ٹکڑے لے کر اسی نظریہ کو غلط اور بے بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ یوں تو یہ بات کسی نہ کسی حد تک ہر ملک میں ممکن ہے لیکن ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں اب تک مُردہ چیزیں کثرت کے ساتھ زندہ چیزوں سے لپٹی اور الجھی ہوئی ہیں، یہ اور بھی آسان ہے۔ اس کے علاوہ ان مظاہر کو جو نہایت پیچیدہ ہیں سیدھی سادی قسموں میں تقسیم کرنے میں صریحی طور پر یہ خطرہ ہے کہ ہم حقیقت سے دور ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں فکر اور عمل کی نشوونما کے مختلف مدارج میں بیّن فرق شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ عموماً ایک خیال بہت آہستہ آہستہ بدل کر دوسرا خیال بنتا ہے بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تصورات کی ظاہری صورت بدل جاتی ہے مگر ان کے معنی وہی رہتے ہیں۔ اکثر وہ بدلتی ہوئی دُنیا سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور اُس کے لئے ایک بوجھ بن جاتے ہیں۔

ہم برابر بدلتے رہے ہیں، اور کسی عہد میں بھی ہم ویسے نہیں رہے جیسے اس سے پہلے کے عہد میں تھے۔ آج نسلی اور تمدنی حیثیت سے ہم اُس سے بالکل مختلف ہیں جیسے کبھی پہلے تھے۔ دُنیا کے دوسرے حصوں کی طرح ہندوستان میں بھی تغیر کا قدم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن میں اس حقیقت کی طرف سے بھی آنکھیں نہیں بند کر سکتا کہ چینی اور ہندی تہذیب

میں زندہ رہنے کی اور اپنے آپ کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لینے کی عجیب و غریب صلاحیت ہے۔ اور بہت سی تبدیلیوں اور بحرانوں کے باوجود ان دونوں نے مدتوں اپنی بنیادی شخصیت اور انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ یہ چیز اس وقت ممکن نہیں ہو سکتی جب تک زندگی اور طبیعی ماحول میں ہم آہنگی نہ ہو۔ جس چیز نے بھی ان دونوں تہذیبوں کے اصلی رنگ کو قائم رکھا، خواہ وہ اچھی ہو یا بری یا اچھائی یا برائی کا معجون مرکب، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں بے پناہ قوت اور سکت تھی، ورنہ وہ اتنی مدت تک ہرگز باقی نہ رہ سکتی۔ غالباً اس کی افادیت ایک مدت ہوئی ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ایک بوجھ اور رکاوٹ بن کر رہ گئی ہے یا شاید یہ بات ہو کہ بعد کے زمانوں میں جو تصرفات ہوتے رہے انھوں نے اس کی روح کو کچل دیا ہو اور اب ایک خالی اور بے جان خول کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔

ہمیشہ سے ترقی کے تصور اور تحفظ اور سلامتی کے تصور میں کسی نہ کسی حد تک کشمکش اور اختلاف رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ترقی تبدیلی کی خواہاں ہے اور تحفظ ایک گوشۂ عافیت کا طالب ہے جو تغیرات کی زد سے باہر ہو، جہاں زندگی اسی انداز پر چلتی رہے جس پر اب تک چل رہی ہے۔ ترقی کا تصور، مغرب میں بھی عہد جدید میں پیدا ہوا ہے اور نسبتاً نیا ہے۔ قدیم اور وسطی تہذیبوں کا تصور یہ تھا کہ عہدِ زریں ابتدا میں گذر چکا ہے اور اس کے بعد برابر تنزل ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی ہمیشہ ماضی کو سراہا گیا ہے اور اس لئے یہاں کی تہذیب کی بنیاد تحفظ اور سلامتی پر قائم تھی اور اس نقطۂ نظر سے یہ تہذیب مغرب کی ہر تہذیب سے زیادہ کامیاب رہی۔ وہ سماجی نظام جس کی بنیاد کی تقسیم ذات پات اور مشترک خاندان کے اصولوں پر قائم تھی اس مقصد

کے لئے مفید ثابت ہوا۔ اس نے جماعت کو استحکام بخشا اور ان افراد کی جو بڑھاپے یا بیماری یا اور کسی قسم کی معذوری کی وجہ سے اپنا بوجھ آپ نہ اُٹھا سکتے ہوں، حفاظت کی۔ یہ نظام کمزوروں کی حمایت کرتا ہے مگر قوی افراد کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ جو سماج اس نظام کی بنیاد پر قائم ہے اس میں معمولی اور اوسط درجے کے لوگ فائدے میں رہتے ہیں مگر وہ لوگ مارے جاتے ہیں جو غیر معمولی طور پر اچھے یا بُرے ہیں۔ وہ اونچے اور نیچے کو ایک سطح پر لے آتا ہے اور انفرادیت کو بڑھنے یا پنپنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور بے حد عجیب ہے کہ ہندوستانی فلسفہ تو حد درجہ انفرادیت پسند ہے اور اس کا مقصد سراسر فرد کی اندرونی تکمیل ہے لیکن ہندوستان کا سماجی نظام اس کے برخلاف اجتماعی ہے اور اس کی توجہ فرد کی طرف نہیں بلکہ جماعت کی طرف ہے۔ فرد کو اس بات کی پوری آزادی تھی کہ وہ جو چاہے سوچے اور جس بات پر چاہے اعتقاد رکھے لیکن اُسے سماجی اور اجتماعی رسوم کا پابند رہنا پڑتا تھا۔

اس پابندی کے باوجود جماعتی زندگی میں خاصی لچک بھی تھی اور کوئی قانون یا سماجی قاعدہ ایسا نہیں تھا جسے رسم و رواج بدل نہ سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ نئی جماعتیں، رسم و رواج، عقیدے اور عمل کی نئی راہیں اختیار کر سکتی تھیں۔ ان اختلافات کے باوجود وہ بڑی سماجی جماعت کی رکن ہو سکتی تھیں۔ ہندوستان کی سماجی زندگی میں یہی لچک اور مطابقت پذیری تھی جس نے بیرونی عناصر کے جذب کرنے میں مدد دی۔ ان سب چیزوں کی تہ میں ایک بنیادی اخلاقی نصب العین، زندگی کا فلسفیانہ نظریہ اور دوسروں کے ساتھ رواداری کا جذبہ تھا۔ جب تک ہندوستانی زندگی میں تحفظ اور سلامتی کو آخری مقصد سمجھا گیا، اس زندگی کا سارا نظام بڑی کامیابی سے چلتا رہا، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب

معاشی تبدیلیوں نے اس نظام کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا اس نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنا کر قائم رکھا۔ صرف ایک چیز ہے جس نے اس نظام کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور وہ سماجی ترقی کا نیا تصور ہے۔ اس نئے تصور کے مطابق زندگی پرانے فرسودہ اور جامد خیالات کے محدود دائرے میں گھری ہوئی نہیں رہ سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے مغرب میں ہوا۔ یہ تصور مشرق کے کہنہ نظام کی بنیادیں ہلا رہا ہے۔ آج گو مغرب میں ترقی اور ارتقا کے تصور کی حکمرانی ہے، لیکن امن اور سلامتی کی خواہش برابر بڑھتی جا رہی ہے ہندوستان میں اسی امن اور سلامتی کے فقدان نے لوگوں کو زندگی کی فرسودہ راہیں چھوڑنے پر آمادہ کیا ہے اور اب وہ ترقی کی ایسی راہ ڈھونڈھ رہے ہیں جو انھیں امن اور سلامتی کی منزل پر پہنچا دے۔

ہندوستانی زندگی کے قدیم اور وسطی زمانوں میں لوگ ترقی کے اس تصور سے نا آشنا تھے۔ لیکن زندگی میں تغیر اور اس تغیر سے مطابقت کی ضرورت کا احساس عام تھا اور اسی احساس نے ترکیب و امتزاج کا جذبہ پیدا کیا۔ یہ امتزاج صرف باہر سے ہندوستان میں آنے والے مختلف عناصر ہی میں نہیں ہوا بلکہ فرد کی خارجی اور داخلی زندگی میں، انسان اور فطرت میں، بھی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت تک نہ مختلف جماعتوں کے درمیان ایسے خلیج حائل تھے جیسے آج کل ہیں اور نہ اتنے شدید اختلافات تھے۔ اسی متحدہ تمدنی پس منظر نے ہندوستانی کو جنم دیا اور اس کی کثرت میں وحدت کا رنگ بھرا۔ سیاسی عمارت کی بنیاد گاؤں کی خود اختیارانہ زندگی کے نظام پر قائم تھی۔ بادشاہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے لیکن گاؤں کا یہ بنیادی نظام بدستور قائم رہتا تھا۔ باہر سے آکر ہندوستان میں بسنے والے اور نئے حملہ آوروں کی وجہ سے سطح پر کچھ تموج

سا پیدا ہو جاتا تھا لیکن سطح کے نیچے زندگی کا دھارا بدستور بہتا رہتا تھا۔ سلطنت خواہ کتنی ہی استبدادی اور جابرانہ کیوں نہ ہو، رسم و رواج اور آئین کی بندشیں طرح طرح سے اس کی مطلق العنانی کی روک تھام کرتی رہتی تھیں اور گاؤں والوں کے حقوق میں کوئی بادشاہ مداخلت نہ کر سکتا تھا۔ ان روایتی حقوق کی بدولت فرد اور جماعت، دونوں کو یک گونہ آزادی حاصل تھی۔

آج کل ہندوستان کے باشندوں میں راجپوت سب سے بڑھ کر ہندوستانیت کے نمائندے ہیں اور ہندوستانی تہذیب پر فخر کرتے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں راجپوتوں نے بہادری اور جاں بازی کے جو کارنامے دکھائے ہیں وہ اس تہذیب کا ایک جیتا جاگتا عنصر بن گئے ہیں۔ حالانکہ ان راجپوتوں میں بہت سے ہند سیتھی نسل کے ہیں اور کچھ کا سلسلہ ہن قوم سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں جاٹوں سے زیادہ مضبوط اور اچھا کوئی کسان نہیں۔ وہ دل و جان سے اپنی زمین سے وابستہ ہیں، کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اُن کی زمین کو ہاتھ لگائے۔ اس کی اصل نسل بھی سیتھی ہے۔ یہی حال کاٹھیاوار کے کشیدہ قامت اور حسین کسان کاٹھی کا ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں میں سے بعض کے متعلق یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی نسل کا سلسلہ کس سے ملتا ہے۔ بعض کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اُن کی اصل نسل خواہ کچھ ہو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ سب کے سب اب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان کی تہذیب میں سب کا برابر حصہ ہے اور ان میں سے ہر ایک ہندوستان کی گذشتہ روایتوں کو اپنی روایتیں سمجھتا ہے۔

ان ساری باتوں سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ ہر قوم اور نسل کے لوگ جو ہندوستان آئے اور آکر یہاں کی زندگی میں گھل مِل گئے، انھوں نے

ہندوستان کو کچھ نہ کچھ دیا اور اس سے بہت کچھ لیا ـــ اور اس لین دین سے اُنھوں نے اپنی طاقت بھی بڑھائی اور ہندوستان کی قوت میں بھی اضافہ کیا۔ باہر سے آنے والوں میں سے جنھوں نے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا اور ہندوستان کی زندگی اور اس کے بوقلموں تمدن میں حصہ نہیں لیا وہ کوئی پائدار اثر نہ ڈال سکے اور بہت جلد فنا ہو گئے۔ بعض اوقات اُنھوں نے اپنے ساتھ ہندوستان کو بھی نقصان پہنچایا۔

۶۔ ہندوستان اور ایران

اُن بہت سی قوموں میں سے جنھوں نے مدتوں ہندوستانیوں کی زندگی اور تہذیب پر اپنا اثر ڈالا ہے سب سے پُرانے ایرانی ہیں۔ ہندوستان اور ایران کا رشتہ ہند آریائی تہذیب کی ابتدا سے بھی پہلے کا ہے۔ اس لئے کہ ہند آریائی اور ایرانی اصل میں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا ابتدائی مرکز ایک ہی تھا۔ آگے چل کر دونوں نے دو راستے اختیار کئے اور دو الگ الگ قومیں بن گئے۔ اس لحاظ سے ان دونوں قوموں کا مذہبی اور لسانی پس منظر بھی ایک ہی تھا۔ ویدک مذہب میں بہت سی باتیں زرتشتی مذہب سے ملتی جلتی ہیں اور ویدک سنسکرت اور پہلوی زبان ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ نظر آتی ہیں۔ کلاسیکی سنسکرت اور فارسی دو الگ الگ مقامات پر پلیں اور بڑھیں لیکن اُن کے بہت سے لفظوں کے مادے ایک ہی ہیں۔ دونوں زبانوں پر اور اُن کے آرٹ اور تہذیب پر دو الگ الگ فضاؤں اور ماحولوں کا اثر پڑتا رہا۔ اس لئے فارسی آرٹ پر ایران کی سرزمین اور وہاں کے مناظر کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور ایران کی فنی روایتیں ان خصوصیات کی حامل ہیں۔ اسی طرح ہند آریائی فن کی روایتیں

اور اُس کے آورش پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں، گھنے جنگلوں اور شمالی ہند کے دریاؤں سے پیدا ہوئے۔ ایران کی تمدنی بنیادیں بھی، ہندوستانی تمدن کی بنیادوں کی طرح گہری اور مضبوط تھیں اور اس لئے اس نے بھی اپنے حملہ آوروں کو اپنے رنگ میں رنگ کر اکثر انھیں ان تمدنی روایات میں جذب کر لیا۔ عربوں نے جب ساتویں صدی عیسوی میں ایران کو فتح کیا تو وہ بھی ماحول کے اثرات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرب کی زندگی کے سادہ طریقوں کو چھوڑ کر ایران کے پُرتکلف تمدن کو اپنا لیا۔ جس طرح فرانسیسی زبان یورپ میں تمدنی روایات کی حامل سمجھی جاتی تھی، اسی طرح فارسی بھی ایشیا کے خاصے بڑے حصے میں متمدن قوموں کی زبان بن گئی۔ ایرانی آرٹ اور تہذیب مغرب میں قسطنطنیہ سے لے کر مشرق میں صحرائے گوبی تک پھیل گئی۔

ہندوستان پر ایران کا اثر مدتوں تک مسلسل پڑتا رہا اور افغان اور مغل حکمرانوں کے عہد میں فارسی ہندوستان کی درباری زبان بن گئی۔ یہ بات برطانوی عہد کے شروع زمانے تک قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ساری جدید زبانوں میں فارسی کے لفظ کثرت سے موجود ہیں۔ یہ بات اُن زبانوں کے لئے تو قدرتی سی تھی، جن کی اصل سنسکرت ہے، اور خاص کر 'ہندوستانی' کے لئے جو ایک مخلوط زبان ہے — لیکن جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں پر بھی فارسی کا اثر پڑا۔ پرانے زمانے میں ہندوستان میں فارسی کے بعض بہت اچھے شاعر گذرے ہیں اور آج کل بھی ہندوستان میں فارسی کے بڑے بڑے عالم موجود ہیں — جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم تمدن اور ایران اور عراق کے عصری تمدن میں باہمی ربط و تعلقات تھے۔ ان تینوں

تہذیبوں کی بعض مُہروں اور تصویروں میں حیرت انگیز یکسانی اور مشابہت سے بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کے تعلقات اس زمانے سے بھی پہلے سے تھے۔ اوستا میں ہندوستان کا نام آیا ہے اور ایک جگہ شمالی ہند کے تھوڑے بہت حالات بھی موجود ہیں۔ اسی طرح رگ وید میں کہیں کہیں فارس کا ذکر ہے اور فارس کے لوگوں کو 'پارشو' اور 'پارسک' کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے' انھیں لفظوں سے لفظ 'پارسی' نکلا ہے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اور ایران کو بہت قدیم زمانے سے ایک دوسرے سے روایتی دلچسپی تھی۔ سائرس اعظم کے عہد سے اور زیادہ تعلقات کی شہادتیں ملتی ہیں۔ سائرس ہندوستان کی سرحد (غالباً کابل اور بلوچستان) تک آیا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں جب دارا ایران کا شہنشاہ تھا تو اس کی سلطنت شمالی مغربی ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں سندھ اور غالباً مغربی پنجاب کا کچھ حصہ شامل تھا۔ اس عہد کو کبھی کبھی ہندوستانی تاریخ کا زرتشتی عہد کہا جاتا ہے۔ اور اس کا اثر دور دور تک تھا۔ اس زمانے میں یہاں سورج کی پرستش کو رواج دیا گیا۔

دارا کی سلطنت میں ہندوستان کا جو صوبہ تھا وہ اس کی سلطنت کا سب سے زیادہ خوشحال اور آباد حصہ تھا۔ اُس زمانے کا سندھ آج کل کے ریگستانی سندھ سے بالکل مختلف تھا۔ ہیروڈوٹس نے ایک جگہ اس زمانہ کی ہندوستانی دولت اور آبادی کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہندوستان دارا کو کتنا خراج دیتا تھا۔ "ہندوستان کی آبادی دنیا کے ہر حصے سے زیادہ ہے: ہندوستانی اپنی آبادی کی نسبت سے بھی زیادہ خراج دیتے تھے۔" (یعنی دس لاکھ پونڈ سے بھی کچھ زیادہ۔) ہیروڈوٹس نے اس کی تفصیل بھی بتائی ہے کہ ایران کی

فوج میں کتنے پیدل سپاہی، کتنے سوار اور کتنے رتھ تھے۔ آگے چل کر ہاتھیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

ساتویں صدی قبل مسیح سے بھی کچھ پہلے سے اور اس کے مدتوں بعد تک کے زمانوں میں اس طرح کی شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور ہندوستان کے درمیان ہمیشہ سے تجارتی تعلقات تھے۔ خاص کر ہندوستان اور بابل میں نوبت پہلے سے تجارت ہوتی تھی اور تاجر خلیج فارس کے راستے سے آتے جاتے تھے۔[۵]
چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد سے سائرس اور دارا کے حملوں کی وجہ سے ہندوستان اور فارس میں براہ راست تعلقات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ سکندر کی فتح کے بعد کئی صدیوں تک ایران یونانیوں کے قبضہ میں رہا۔ لیکن ہندوستان اور ایران کے تعلقات اس زمانے میں بھی قائم رہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اشوک کے زمانے کی عمارتوں میں نقش رستم کے اثرات موجود ہیں۔ مخلوط یونانی اور بودھ آرٹ میں بھی جو شمالی مغربی ہندوستان اور افغانستان میں پروان چڑھا ایرانی اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں گپت عہد میں بھی، یعنی چوتھی اور پانچویں صدیوں میں ہندوستان اور ایران کے تعلقات قائم رہے۔

کابل، قندھار اور سیستان جو اکثر سیاسی حیثیت سے ہندوستان ہی کے حصے رہے ہیں، ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے میل ملاپ کے مرکز تھے۔ پارتھی عہد میں ان مقامات کو 'سفید ہند' کہا جاتا تھا۔ ان علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی فاضل جیمس ڈارمسٹیٹر نے لکھا ہے کہ "ہندوستانی تہذیب ان علاقوں پر

---

۵ Prof. A. V. Williams Jackson: Cambridge History of India, Vol. I, P. 324.

چھائی ہوئی تھی ۔ اور حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی قبل اور ایک صدی بعد یعنی دو صدیوں تک ان علاقوں کو "سفید ہند" کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا اور حقیقت میں اسلامی فتوحات سے پہلے یہ علاقے ایران سے کہیں زیادہ ہندوستان سے متاثر تھے۔"

شمال میں تاجر اور سیاح انھیں علاقوں سے آتے تھے۔ جنوبی ہند سمندر کے سہارے جیتا تھا اور اس کے اور دوسرے ملکوں کے درمیان بحری تجارت کے تعلقات تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک جنوبی سلطنت اور فارس کے صفوی بادشاہ باہم ایک دوسرے کے یہاں سفیر بھیجا کرتے تھے۔

ترکوں، افغانوں اور مغلوں نے ہندوستان فتح کیا تو ہندوستان اور مغربی ایشیا کے درمیان تعلقات اور تیزی سے بڑھنے لگے۔ پندرھویں صدی میں (تقریباً اسی زمانے میں جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور تھا) سمرقند اور بخارا میں تیموری نشاۃ ثانیہ کا دور دورہ تھا اور اس میں ایرانی رنگ کی بہت گہری آمیزش تھی۔ بابر بھی تیموری نسل کا شہزادہ تھا۔ وہ ہندوستان آیا اور دہلی کے تخت پر قابض ہوگیا۔ یہ زمانہ سولھویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا اور اسی زمانے میں صفوی حکمرانوں کے زیر سایہ ایران میں علم و فن کی بیداری کا پورا جوش و خروش تھا۔ یہ عہد ایرانی علم و ہنر کا سنہری عہد مشہور ہے۔ ہمایوں ایک صفوی بادشاہ کے پاس پناہ اور مدد لینے کے لئے گیا تھا اور اسی کی مدد سے ہندوستان واپس آیا تھا۔ مغل شہنشاہوں نے ہر عہد میں ایران سے بہت گہرے روابط رکھے اور ان کے عہد میں ایران کے عالم فاضل اور مشہور فن کار برابر ایران سے ہندوستان آتے رہے اور مغلوں کے پُرشکوہ اور پُرعظمت دربار نے انھیں شہرت اور دولت دونوں چیزوں سے

مالا مال کیا۔

ہندوستان میں ایک نئے فن تعمیر کا احیا ہوا ۔۔۔ ایک ایسا فن جسے ہندی آدرشوں اور ایرانی اثرات کی آمیزش نے بنایا تھا۔ دہلی اور آگرہ کی سرزمین حسین اور عالیشان عمارتوں سے معمور ہوگئی۔ اِن عمارتوں میں سب سے زیادہ مشہور تاج محل ہے۔ اس کے متعلق ایک مشہور فرانسیسی فاضل گروسے نے لکھا ہے کہ "ایران کی روح ہندوستان کے قالب میں مجسم ہوگئی ہے۔"

دُنیا کی تاریخ میں اس طرح کی بہت کم مثالیں ہیں، جن میں دو قوموں اور ملکوں کے تعلقات کا رشتہ شروع سے لے کر آخر تک اتنا قریبی اور اتنا گہرا رہا ہو جتنا ایران اور ہندوستان کا۔ بدقسمتی سے اس گہرے اور باعزت رشتے کی آخری یاد جو ہمارے ذہن میں ہے نادر شاہ کا حملہ ہے جو اُس نے اب سے دو سو برس پہلے کیا تھا، یہ ایک قہر الٰہی تھا جو تھوڑے دن کے لئے ہندوستان پر نازل ہوگیا تھا۔

اس کے بعد انگریز ہندوستان آئے اور اُنھوں نے مغرب کی طرف کے سب دروازے بند کر دئے اور اس طرح وہ ساری راہیں جو ہمیں ایشیا کے ہمسایوں سے ملاتی تھیں مسدود ہوگئیں۔ سمندر کے نئے نئے راستے کھُل گئے اور ان راستوں نے ہمیں یورپ سے اور خاص کر انگلستان سے زیادہ قریب کردیا۔ لیکن ایران، وسط ایشیا اور چین سے ہندوستان کے تعلقات کا پُرانا سلسلہ قریب قریب ختم سا ہوگیا۔ اور ابھی حال ہی میں نئے ہوائی راستوں کے کھُلنے سے اس پُرانے رشتے کی تجدید ہونی شروع ہوئی ہے۔ برطانوی حکومت کے جو اثرات ہندوستان پر پڑے اُن میں سے ایک بے حد اہم اور بے حد افسوسناک یہ بھی ہے کہ ہندوستان یک بیک ایشیا کے باقی سارے ملکوں سے الگ اور

بے تعلق ہو گیا۔[1]

اس کے باوجود، جدید ایران سے نہ سہی، مگر قدیم ایران سے ایک رشتہ برابر قائم رہا۔ اب سے تیرہ سو برس پہلے جب اسلام ایران میں داخل ہوا تو زرتشتی مذہب کے ہزاروں لاکھوں پیرو ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے۔ ہندوستان نے اُن کی آؤ بھگت کی اور وہ مغربی ساحل پر آ کر بس گئے۔ وہ اپنے رسم و رواج اور مذہب کے پابند رہے۔ نہ کسی نے اُن کے معاملات میں دخل دیا اور نہ اُنھوں نے کسی اور معاملات میں مداخلت کی۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ یہ نئے آنے والے (جنھیں ہم پارسی کہتے ہیں) کتنی خاموشی اور سکون کے ساتھ ہندوستان کی زندگی کے سانچے میں ڈھل گئے۔ انھوں نے اسے اپنا گھر بنا لیا اور پھر بھی سب سے الگ تھلگ رہ کر اب تک اپنے پُرانے طرز اور طریقوں کے پابند ہیں۔ پارسیوں کو

---

[1] پروفیسر ای۔ جے۔ ایپسن نے لکھا ہے کہ "جو طاقت ساری چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ملا کر ایک زبردست نظام حکومت کا جزو بنا سکی ہے، وہ صرف بحری طاقت ہے۔ چونکہ بحری طاقت بحری راستوں کی نگراں اور نگہبان ہوتی ہے اس لئے امن اور سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ خشکی کے سارے راستے بند کر دیئے جائیں۔ جو ملک ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں (یعنی افغانستان، بلوچستان اور برما) اُن کے سلسلے میں برطانیہ کی یہی پالیسی رہی ہے اور اس طرح سیاسی اتحاد کا لازمی نتیجہ دوسرے ملکوں سے علیحدگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ علیحدگی ہندوستان کی تاریخ میں ایک بالکل نئی چیز ہے جو ابھی حال ہی میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا سنگِ میل ہے جو حال کو ماضی سے جدا کرتا ہے۔"

Cambridge History of India Vol. I, P. 52.

اپنی ذات کے باہر شادی کرنے کی ممانعت تھی اور بہت کم مثالیں ایسی ہیں، جن میں اس کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ ہندوستان کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی اس لیے کہ یہاں بھی عموماً لوگ اپنی ہی ذاتوں میں شادی بیاہ کرتے تھے۔ پارسیوں کی آبادی ہندوستان آ کر بہت کم بڑھی اور اب بھی اُن کی تعداد صرف ایک لاکھ کے قریب ہے۔ انھوں نے تجارت میں بے حد ترقی کی اور ان میں سے بہت سے آج ہندوستانی صنعت کے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایران سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور وہ پورے ہندوستانی ہیں۔ پھر بھی انھوں نے اپنی پُرانی روایتوں کو اور اپنے پُرانے وطن کی یاد کو نہیں چھوڑا۔

ایران میں حال ہی میں قبل اسلامی ایرانی تہذیب کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی زبردست تحریک شروع ہوئی ہے۔ اس تحریک کا تعلق مذہب سے نہیں۔ اس کی بنیاد قومی اور تمدنی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ایرانی اپنی قدیم تہذیب اختیار کریں اور اس پر فخر کریں۔

دنیا کے حالات اور مفاد کی یکسانی اور ہم آہنگی اب ایشیائی ملکوں کو ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔ یورپ کے غلبے کا دور ایک بھیانک خواب کی طرح ختم ہو چکا ہے اور پُرانے تصورات نئے سرے سے زندہ ہو کر قدیم تعلقات اور مشترک سرگرمیوں کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ اور اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ جس طرح ہندوستان رفتہ رفتہ چین سے قریب ہوتا جا رہا ہے اسی طرح عنقریب وہ ایران سے بھی قریب ہو جائے گا۔

دو مہینے ہوئے ایران کے تہذیبی مشن کے لیڈر نے الہ آباد میں کہا تھا "ایرانی اور ہندوستانی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک ایرانی کہانی میں ایک

جدائی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ایک مشرق کی طرف چلا گیا دوسرا مغرب کی طرف۔ مدتوں کی جدائی سے دونوں کے خاندان ایک دوسرے کو بالکل بھول گئے۔ لیکن ایک چیز تھی جو دونوں میں اب بھی یکساں تھی۔ دونوں اپنی اپنی بانسریوں پر کچھ پرانے سُر جو انھیں یاد رہ گئے تھے بجاتے تھے۔ صدیوں کی جدائی کے بعد بھی پرانے نغمے سن کر ایک نے دوسرے کو پہچانا اور دونوں گھرانے پھر آپس میں مل کر ایک ہوگئے ـــــ اسی طرح آج ہم ہندوستان آئے ہیں اور وہی پرانے سر الاپ رہے ہیں کہ انھیں سُن کر ہمارے ہندی بھائی ہمیں پہچان لیں اور پھر ایرانی بھائیوں کے سینے سے لگ جائیں۔"

۷۔ ہندوستان اور یونان

قدیم یونان کو یورپی تہذیب کا سرچشمہ بتایا جاتا ہے اور مشرق اور مغرب کے بنیادی فرق کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس بحث کے اکثر حصے مجھے مبہم اور بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ زمانے پہلے تک یورپ کے بہت سے مفکروں کا خیال تھا کہ دنیا میں جتنی کام کی یا اہم چیزیں ہیں وہ یونان یا روم کی مرہون منت ہیں۔ لیکن پروفیسر ای۔ آر۔ ڈاڈس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "یونانی تہذیب کی پرورش اصل میں مشرقی پس منظر اور فضا میں ہوئی" اور (سوائے کلاسیکی فاضلوں کے ذہن کے) وہ کسی جگہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس اثر سے آزاد اور علیحدہ نہیں کر سکا۔"

یورپ میں علم و فضل مدتوں یونانی، عبرانی اور لاطینی زبانوں تک محدود رہا۔ اور ان زبانوں کے ادب نے دنیا کے سامنے جو تصویر پیش کی وہ بحیرۂ روم کے گرد و پیش کی دنیا کی تھی۔ ان زبانوں کے بنیادی خیالات پرانے رومی تصورات

کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، گو ان میں ضرورت اور موقع کے مطابق تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ یہی خیالات مورخوں اور سیاست دانوں کے تصورات پر چھا گئے، انھیں تصورات نے تہذیب کے ارتقا پر اثر ڈالا، اور ایک حد تک علمی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوئے۔ افلاطون اور ارسطو ذہنوں پر اس درجہ غالب آگئے کہ جب یورپ کو مشرق کے کسی علمی کارناموں کا تھوڑا بہت علم ہوا تو اس نے ان کے قبول کرنے میں تامل کیا۔ غیر محسوس طور پر ان سے تعصب برتا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بنائی ہوئی تصویر کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ جب فاضلوں کا یہ حال تھا تو عوام کا کیا ذکر ہے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ مشرق اور مغرب میں ضرور کوئی اہم بنیادی فرق ہے۔ یورپ کے صنعتی نظام اور اس کی پیدا کی ہوئی مادی ترقی نے عام لوگوں کی نظر میں مشرق اور مغرب کے فرق کو اور بھی گہرا اور نمایاں کر دیا اور عجیب وغریب عقلی تاویلات سے کام لے کر رفتہ رفتہ یونان کو جدید یورپ اور جدید امریکا کا مورث سمجھا جانے لگا۔ دنیا کی قدیم تاریخ کے متعلق جو نئے نئے انکشافات ہوئے انھوں نے بعض مفکروں کے خیالات میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی، لیکن جہاں تک عام لوگوں کا تعلق تھا جن میں پڑھے لکھے اور اَن پڑھ دونوں شامل تھے، اُن کے ذہنوں میں صدیوں پہلے کے پُرانے تصورات ہی جاگزیں رہے۔ اُن کے ذہنوں کی اوپری سطح پر تصورات کے بھوت منڈلاتے اور ان کے تہ خانوں میں غائب ہو جاتے جو ذہنوں نے اپنے لئے تعمیر کر رکھے تھے۔

'مشرق' اور 'مغرب' کے لفظوں کو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ میرے نزدیک تو مشرق اور مغرب میں اس سے زیادہ فرق نہیں کہ یورپ اور امریکا صنعتی حیثیت سے بہت آگے نکل گئے ہیں اور

ایشیا اس لحاظ سے پیچھے ہے۔ صنعتیت، دنیا کی تاریخ میں اپنے قسم کی پہلی چیز ہے اور جتنا اس نے دُنیا کو بدلا ہے اور برابر بدل رہی ہے، کسی اور چیز نے نہیں بدلا۔ قدیم یونانی تہذیب اور موجودہ یورپی اور امریکی تہذیب میں کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ یونانی ادب یا دوسرے قدیم ادب عہد جدید کے اس تصور سے قطعاً بے گانہ ہیں کہ زندگی کی سب سے اہم حقیقت، عیش و آرام ہے۔ یونانی، ہندوستانی، چینی اور ایرانی ہمیشہ ایک ایسے عقیدے اور زندگی کے لیے فلسفے کے جویا رہتے تھے جو اُن کی ساری عملی سرگرمیوں کے لئے مشعل ہدایت بن سکے اور زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کر دے۔ اس آدرش کی جھلک ان قوموں کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتی ہے۔ ادب، فن اور باقی سارے ادارے اسی آدرش کی رہنمائی میں پیدا ہوئے ہیں اور ان سب میں توازن اور تکمیل کا احساس موجود ہے۔ غالباً قدیم تہذیبوں کا یہ تصور پوری طرح صحیح نہیں، ممکن ہے انکی واقعی زندگی ان آدرشوں سے بہت مختلف ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ موجودہ یورپ اور امریکا اپنے نقطۂ نظر میں یونان سے کتنے مختلف اور کتنے دور ہیں۔ پھر بھی اپنی فرصت کے لمحوں میں وہ یونانی تہذیب کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ دور کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں —— یہ کوشش شاید کسی اندرونی خواہش کی تسکین کے لئے یا موجودہ زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں سے گھبرا کر کسی نخلستان میں پناہ لینے کے لئے کی جاتی ہے۔

ہمیشہ سے مشرق اور مغرب کے ہر ملک اور ہر قوم کی ایک انفرادی شخصیت، ایک مخصوص پیام رہا ہے، اور ہر ایک نے زندگی کے مسائل کو اپنے خاص انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونان بھی ایک مخصوص اور مستقل شخصیت، ایک

باوقار اور عظیم الشان شخصیت رکھتا ہے۔ یہی حال ہندوستان، چین اور ایران کا ہے۔ قدیم یونان اور قدیم ہندوستان ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، پھر بھی ان میں بہت کچھ مشترک تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے بہت سے اختلافات کے باوجود قدیم ہندوستان اور قدیم چین میں ایک فکری تعلق اور رشتہ تھا۔ ان سب کی نظر میں وسعت، رواداری اور فراخی تھی، زندگی میں اور فطرت کی گوناگوں رنگینی اور اس کے حیرت فزا حسن میں مسرت کا احساس، آرٹ کی محبت اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ دانش مندی جو پشتہا پشت کے تجربوں کا نچوڑ ہوتی ہے۔ ہر ایک نے اپنے نسلی اور قومی امتیاز کے مطابق اور اپنی مخصوص قدرتی فضا میں رہ کر ترقی کی شاہراہ طے کی اور زندگی کے کسی ایک خاص پہلو کو، دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی۔ اس اہمیت کے مدارج ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے۔

یونانی شاید ماضی اور مستقبل سے زیادہ حال کے شیدائی تھے اور انھیں اُس حسن میں جو قدرت نے اُن کے چاروں طرف بکھیر رکھا تھا، اور اُس حسن میں جو خود انھوں نے اپنے لیے پیدا کیا تھا مسرت اور ہم آہنگی محسوس ہوتی تھی۔ ہندوستانی بھی موجودہ زندگی سے لطف اٹھاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ اُن کی نظریں زندگی میں کسی گہرے معنی کی جویا رہتی تھیں اور اُن کے ذہن کسی گہرے مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف۔ چینی ان اسرار و رموز کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے لیکن اپنی دانشمندی کی بدولت ان میں الجھنے سے بچتے تھے۔ تینوں اپنے اپنے طریقے سے زندگی کے حسن اور کمال کے اظہار کی کوشش کرتے تھے۔

تاریخ نے ہمیں یہ بات بتائی ہے کہ ہندوستان اور چین کی بنیادیں زیادہ مضبوط اور مستحکم تھیں اور اس لیے انھیں نسبتاً زیادہ ثبات بھی حاصل ہوا۔ وہ اب تک

زندہ ہیں، گو انقلابات نے اُن کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے اور ان کا مستقبل مبہم اور غیر یقینی ہے۔ قدیم یونان اپنی ساری آب وتاب کے باوجود تھوڑے دنوں میں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ صرف اس کے کارنامے باقی رہ گئے، یا وہ اثرات جو اُس نے دوسرے تمدنوں پر ڈالے یا اُس شعلۂ مستعمل کی یاد جو تھوڑی دیر بھڑک کر بجھ گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ 'حال' میں اس قدر محو رہا کہ بہت جلد افسانۂ ماضی بن گیا۔

اگرچہ یورپ کی ساری قومیں اپنے آپ کو یونانی روح کی وارث سمجھتی ہیں لیکن حقیقت میں ان کے مقابلے میں ہندوستان فکر ونظر کے لحاظ سے قدیم یونان سے زیادہ قریب ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ بات اس لئے نہیں آتی کہ ہم نے کچھ بندھے ٹکے تصورات دوسروں سے لے لئے ہیں اور اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان فلسفے اور الٰہیات میں ڈوبا ہوا ہے، اس دنیا سے بے تعلق اور دوسری دنیا کے خوابوں میں محو۔ جو لوگ ہم سے یہ باتیں کہتے ہیں وہ چاہتے بھی یہی ہیں کہ ہندوستان فکر میں ڈوبا ہوا اور فلسفیانہ تخیل میں محو پڑا رہے، تاکہ انھیں ان خیالی پلاؤ پکانے والوں کی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہ رہے اور وہ بے کھٹکے ساری دنیا پر اور اس کی دولت پر قابض ہو جائیں اور اس سے لطف اٹھائیں ـــــ بے شک! ہندوستان یہ سب کچھ رہا ہے لیکن وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی رہا ہے۔ اس میں بچپن کی سادگی اور معصومیت رہی ہے، اُس میں شباب کا جوش اور لاابالی پن رہا ہے اور اُس میں عقل ودانش کی وہ پختگی رہی ہے جو دکھ سکھ کے لمبے تجربوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اور بار بار وہ اپنے اس بچپن، اس شباب اور بڑھاپے کی تجدید بھی کرتا رہا ہے۔ اس کی طویل عمر اور بھاری بھرکم ڈیل ڈول نے اس میں کاہلی اور سستی پیدا کر دی، بُری رسموں اور

بدنما رواجوں نے اس کے جسم میں گھن لگا دیا، ان گنت طفیلیوں نے اُس کا خون چوس لیا۔ لیکن اس ناتوانی کے باوجود ہزاروں برس کی روایتوں کی قوت اور ایک قدیم قوم کی تحت الشعوری دانش مندی نے اُسے اب تک برقرار رکھا ہے۔ ہم بالکل بوڑھے ہیں اور ناکامی کی اَن گنت گذری ہوئی صدیاں ہم سے سرگوشیاں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ہم بار بار نئے سرے سے جوان ہوتے رہے ہیں گو ماضی کے خوابوں کی یاد کبھی ہمارے دل سے محو نہیں ہوئی۔

جس چیز نے اس طول طویل مدت میں ہندوستان کی زندگی اور قوت کو برقرار رکھا وہ ضرور کوئی پُراسرار نظریہ یا مخفی علم نہیں۔ اس کی زندگی کا راز محبت اور انسانیت ہے، بوقلموں اور وسیع النظر تہذیب ہے اور زندگی اور اس کے اسرارِ سربستہ کا گہرا علم ہے۔ اس کی قوت نمو کا سرچشمہ وہ شاندار علم وفن ہے جس نے عہد بہ عہد اسے نئی زندگی بخشی ہے ــــ وہ علم وفن جس کا صرف تھوڑا سا حصہ ہم تک پہنچا ہے اور بہت بڑا حصہ یا تو زمین کے نیچے دفن ہے یا قدرت اور انسان کی دست درازیوں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ ایلیفنٹا کے غاروں میں 'تریموُرتی' کے نام سے جو مجسمہ ہے اُسے ہم خود 'ہندوستان' کا مجسمہ کہہ سکتے ہیں، پرشکوہ اور پرقوت جس کی آنکھوں میں بلا کی تاثیر اور علم و دانش کی گہرائی ہے جو اپنی بلندی سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ اجنتا کے نقش ونگار محبت، نشاط زندگی اور ذوقِ حسن سے معمور ہیں اور ان میں ایک گہری حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے جو فہم وادراک سے بالاتر ہے۔

جغرافی حیثیت سے اور آب وہوا کے لحاظ سے یونان ہندوستان سے مختلف ہے۔ یونان میں نہ دریا ہیں، نہ جنگل اور نہ ہرے بھرے گھنے درخت، جن سے ہندوستان کا چپہ چپہ بھرا پڑا ہے۔ سمندر کی گہرائی اور اس کی مسلسل بدلتی

ہوئی فطرت نے یونانیوں پر ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ گہرا اثر ڈالا —
سوائے ان تھوڑے سے لوگوں کے جو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں رہتے
تھے۔ ہندوستان کی زندگی ایک بڑے براعظم کی زندگی رہی ہے — وسیع
میدانوں اور بلند پہاڑوں کی زندگی، بڑے دریاؤں یا گھنے جنگلوں کی زندگی۔ یونان
میں بھی کچھ پہاڑ تھے اور یونانیوں نے ان میں سے اُلمپس پہاڑ کو اپنے دیوتاؤں
کا استھان بنا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستانیوں نے اپنے دیوتاؤں اور
اپنے سادھوسنتوں کے لئے ہمالیہ کی بلندیاں چنیں۔ دونوں نے اپنی زندگی میں
اساطیر کی تخلیق کی اور یہ اساطیر تاریخ میں اس طرح گھل مل گئے کہ حقیقت اور
افسانے میں امتیاز مشکل ہوگیا۔ قدیم یونانیوں کے متعلق مشہور ہے کہ نہ وہ عشرت پسند
تھے اور نہ راہب اور تارک الدنیا، نہ وہ عیش و عشرت سے اس طرح گھبراتے
تھے جیسے وہ کوئی بدی یا گناہ ہو، اور نہ وہ آج کل کے لوگوں کی طرح عیش و
عشرت کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے تھے۔ اُن کی زندگی میں وہ رکاوٹیں نہیں
تھیں جن میں ہم گرفتار ہیں، وہ تیز روزندگی کے قدم بہ قدم چلتے تھے، اور جو کچھ
کرتے تھے اُس میں دل وجان سے محو ہو جاتے تھے اس لئے اُنھیں دیکھ کر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شاید ہم سے زیادہ زندگی تھی۔ ہندوستان کی زندگی کے
متعلق کچھ اسی طرح کا خیال اُس کے پرانے ادب کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ ہندوستان
میں زندگی کا تصور رُہبانی تھا دجیسا کہ آگے چل کر یونان میں بھی ہوگیا تھا) لیکن
یہ صرف تھوڑے سے لوگوں تک محدود تھا اور اس کا اثر عام زندگی پر نہیں پڑا تھا۔
آگے چل کر جین مت اور بودھ مت کے اثر سے اس تصور کو زیادہ اہمیت حاصل
ہوگئی۔ لیکن اُس وقت بھی وہ زندگی کے پس منظر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کرسکا۔
یونان اور ہندوستان، دونوں جگہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زندگی جیسی بھی ہے

غنیمت ہے، اس کو جہاں تک ہو سکے اچھی طرح بسر کرنا چاہیئے۔ اس کے باوجود دونوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ایک باطنی زندگی بھی ہے جو اس ظاہری زندگی سے برتر ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں تجسس اور فکر کا مادہ پیدا ہو گیا۔ لیکن اس تجسس اور تحقیق میں معروضی تجربے سے اتنا کام نہیں لیا جاتا جتنا منطقی استدلال سے اور اس کی بنا بعض تصورات پر تھی جنھیں بدیہی سمجھ کر بے چون وچرا قبول کر لیا گیا تھا۔ یہ طریقہ صرف ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہ تھا، بلکہ نئے علمی طریقے کے رواج سے پہلے ہر جگہ استدلال کا انداز یہی تھا۔ یہ فکر و تحقیق غالباً چند لکھے پڑھے لوگوں تک محدود تھی، لیکن عام شہریوں پر بھی اس کا تھوڑا بہت اثر ضرور پڑتا تھا اور وہ بھی ایک جگہ جمع ہو کر فلسفیانہ مسائل پر اسی طرح گفتگو کرتے تھے جیسے زندگی کے دوسرے کام۔ اُس زمانے میں بھی ہندوستان کی زندگی (خاص کر دیہاتوں میں) آج کل کی طرح اجتماعی تھی۔ جیسے لوگ بازاروں میں، مندروں یا مسجدوں کے احاطوں میں، کنوؤں کی جگت پر، پنچایت گھر میں، دن بھر کی خبریں سننے سنانے یا اپنی روزانہ کی ضرورت سے متعلق گفتگو کرنے کو اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہی حال اس زمانے میں بھی تھا اور اس طرح لوگ اپنی رائیں قائم کرنے اور انھیں دوسروں پر ظاہر کرنے کے عادی تھے۔ اور انھیں اس طرح کے بحث مباحثوں کے لئے وقت بھی کافی مل جاتا تھا۔

یونان کے بہت سے مہتم بالشان کارناموں میں سے ایک یعنی تجربی سائنس کا آغاز ایسا ہے جس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آتی۔ خود یونان میں سائنس کو اتنا فروغ نہیں ہوا جتنا اور ملکوں میں جو یونانی تہذیب سے متاثر تھے اور ۳۰۰ قبل مسیح سے ۱۲۰ قبل مسیح تک کی دو صدیاں اسکندریہ میں سائنس کے

ارتقا اور مشینی ایجادوں کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ ہندوستان اس معاملے میں قدیم یونان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور ایک ہندوستان کیا سترھویں صدی تک جب کہ سائنس کی غیر معمولی ترقی شروع ہوئی کوئی ملک بھی نہیں کرسکتا تھا، یہاں تک کہ روم نے بھی جس کی سلطنت اتنی وسیع تھی، جس کا سکہ دنیا میں ہر جگہ بیٹھا ہوا تھا، جسے یونانی تہذیب سے اتنا قریبی تعلق تھا، اور جسے دنیا کی مختلف قوموں کے علم اور تجربے سے فائدہ اُٹھانے کے اتنے مواقع حاصل تھے، سائنس، ایجاد اور مشینی ترقی کے سلسلے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ یورپ میں کلاسیکی تہذیب کے زوال کے بعد عہد وسطیٰ میں صرف عربوں نے سائنٹفک علوم کی شمع کو روشن رکھا۔

اسکندریہ میں علمی سرگرمیوں اور ایجادوں کا یہ جوش وخروش سماجی حالات، یعنی بڑھتی ہوئی سماج کی ضرورتوں اور جہازرانی کی ترقی کا نتیجہ تھا، بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان میں حساب اور جبر ومقابلہ کے طریقے، صفر کے نشان کا استعمال اور ہندسوں کی مقامی قیمت کا اصول نتیجہ تھا سماجی ضروریات بڑھتی ہوئی تجارت اور زندگی کی پیچیدہ تنظیم کا۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ علمی روح قدیم یونانیوں میں قومی حیثیت سے موجود تھی۔ اُن کی زندگی غالباً روایتی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھی اور وہ اپنے فلسفیانہ فکر کی مدد سے انسان اور قدرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ فکر کا یہی نقطۂ نظر ہے جو قدیم یونان اور ہندوستان میں یکساں طور پر موجود تھا۔ یونان میں بھی، ہندوستان کی طرح سال میں کئی تہوار ہوتے تھے۔ ان تہواروں کی بنیاد بھی بدلتے ہوئے موسموں پر تھی اور اس طرح ان تہواروں کی مدد سے انسان قدرت کے مزاج اور کیفیت سے ہم آہنگ رہتا تھا۔ ہندوستان میں یہ

پُرانے تہوار اب بھی بہار اور فصلوں کے کٹنے کے زمانے میں منائے جاتے ہیں۔ دیوالی، خزاں کے خاتمہ پر، ہولی، گرمی کی رُت شروع ہونے سے پہلے اور دوسرے تہوار رامائن اور مہا بھارت کے سورماؤں کی یادگار ہیں۔ ان میں سے بعض کے موقع پر اب بھی ناچ گانے ہوتے ہیں ــــ اب بھی لوگ گیت گاتے اور ناچتے ہیں، اور کرشن اور گوپیوں کے ناچ کی نقل 'رس لیلا' کے نام سے کرتے ہیں۔

پُرانے ہندوستان میں عورتیں، سوا بادشاہوں اور سرداروں کے خاندانوں کے، کہیں بھی عام زندگی سے بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ نہیں تھیں۔ بلکہ ہندوستان کے مقابلہ میں یونان میں، مردوں اور عورتوں میں زیادہ علیحدگی تھی۔ پُرانی ہندوستانی کتابوں میں جگہ جگہ عالم اور فاضل عورتوں کا تذکرہ ہے۔ یہ عورتیں عام مباحثوں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ یونان میں، شادی کی حیثیت ایک باہمی سمجھوتہ یا معاہدے کی سی تھی، لیکن ہندوستان میں شادی کو ایک مقدس اور مستقل تعلق سمجھا جاتا تھا۔

یونانی عورتوں کی ہندوستان میں بے حد قدر تھی۔ اُس زمانے کے ناٹکوں میں شاہی دربار کی کنیزیں عموماً یونانی دکھائی گئی ہیں۔ ہندوستان کے بندرگاہ بری گازا (بڑوچ) میں یونان سے جو چیزیں آتی تھیں اُن میں "مطرب لڑکے اور حسین کنیزیں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میگاسھنیز نے چندرگپت موریا کی زندگی کے حالات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "بادشاہ کا کھانا عورتیں پکاتی ہیں اور عورتیں ہی اُسے شراب پلایا کرتی ہیں جو عام طور پر سب ہندوستانی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔" اس شراب کا تھوڑا بہت حصہ یقینی طور پر یونان سے آتا ہوگا اس لئے کہ تامل زبان کے ایک شاعر نے ایک جگہ "اُس ٹھنڈی اور خوشبودار شراب" کا ذکر کیا ہے جو "یونانی اپنے جہازوں میں لاتے تھے۔" ایک یونانی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ پاٹلی پُتر کے بادشاہ

(غالباً اشوک کا باپ بندوسار) نے اینٹوکس کو ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اُس کے لئے خوش ذائقہ شراب، خشک انجیر اور ایک سوفسطائی فلسفی خرید کر بھیج دے۔ اس پر اینٹوکس نے جواب دیا کہ "ہم آپ کو شراب اور انجیر ضرور بھیج دیں گے لیکن یونان کے قانون کے مطابق کسی سوفسطائی کو بیچا نہیں جا سکتا۔"

یونانی ادب سے یہ بات بھی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ مردوں کے درمیان جنسی تعلقات کو بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ ان تعلقات میں ایک رومانی لذت محسوس کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جوانی میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ یہی حالت ایران میں تھی اور فارسی ادب میں اس طرح کے بے شمار اشارے موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بات ایک مستقل ادبی روایت بن گئی کہ محبوب کا ذکر تذکیر کے ساتھ کرنے لگے۔ سنسکرت ادب میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مردوں میں باہمی جنسی تعلقات کو نہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور نہ ایسے تعلقات ہندوستان میں عام تھے۔

یونان اور ہندوستان میں اس وقت سے باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے جب سے تحریری تاریخ کا وجود ہے۔ بعد کے زمانوں میں ہندوستان اور یونانی مغربی ایشیا کے درمیان گہرے روابط تھے۔ اُجینی (آج کل کا اجین) میں قدیم زمانے میں جو فلکی رسدگاہ تھی اُس کا سلسلہ مصر کے شہر اسکندریہ سے ملا ہوا تھا۔ تعلقات کے اس طویل زمانے میں لازمی طور پر دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے خیالات اور تہذیب سے بہت سے اثرات لئے ہوں گے۔ ایک یونانی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کچھ ہندوستانی عالم یونان گئے تھے اور انھوں نے سقراط سے کچھ سوالات کئے تھے۔ فیثا غورث

پر ہندوستانی فلسفہ کا خاص طور پر اثر پڑا اور پروفیسر ایچ۔جی۔راؤلنسن نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ "مذہب، فلسفہ اور ریاضی کے تقریباً سارے وہ نظریے جن کی تعلیم فیثا غورثیوں نے دی ہے چھٹی قبل مسیح میں ہندوستانیوں کو معلوم تھے"۔یورپ کے کلاسیکی فاضل اَروِک نے افلاطون کی کتاب "ریاست" کی جو تشریح اور تفسیر کی ہے، اُس کی بنیاد اس نے ہندوستانی فکر پر رکھی ہے۔[۵] غناسطیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اصل میں یونانی افلاطونی فلسفہ اور ہندوستانی فکر کے امتزاج اور آمیزش کی ایک کوشش ہے۔ تیانا کا رہنے والا فلسفی اپالونیس غالباً عیسوی سنہ کے ابتدائی زمانے میں ٹکشلا کی یونیورسٹی آیا تھا۔

مشہور سیاح اور عالم البیرونی جو وسط ایشیا کے شہر خراسان میں پیدا ہوا تھا گیارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا۔ اُس نے یونانی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس لئے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں بغداد میں اس فلسفے کا بڑا چرچا تھا۔ ہندوستان آکر اس نے سنسکرت سیکھی، تاکہ اُس کی مدد سے وہ ہندوستانی فلسفے کا مطالعہ کرسکے۔ اس نے یونانی اور ہندوستانی فلسفے میں جو مشترک باتیں دیکھیں اُن کا حال اُس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے اور ایسی سنسکرت کتابوں کے حوالے بھی دئے ہیں جن میں یونانی ہیئت اور رومی ہیئت سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

---

[۵] Zimmern نے اپنی کتاب 'Commonwealth 'The Greek میں اَروِک کی کتاب 'Plato (1920) 'The Message of' کا ذکر کیا ہے۔ میری نظر سے یہ کتاب نہیں گذری۔

یونانی اور ہندوستانی تہذیبیں برابر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہیں اور لازمی طور پر دونوں کے انداز میں اس اثر سے تھوڑے بہت فرق بھی پیدا ہوئے۔ لیکن یہ دونوں تہذیبیں اپنی اپنی جگہ پر ایسی مستحکم تھیں کہ اس باہمی تاثر سے اُن کی انفرادی خصوصیات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی اور ان دونوں کا ارتقا اُن کے انفرادی انداز میں جاری رہا۔ کچھ سال پہلے تک مصنفوں اور مورخوں کا عام رویہ یہ تھا کہ وہ ہر چیز کی ابتدا کا سہرا یونان یا روم کے سر رکھتے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں اس رویّے کے خلاف ردّعمل ہوا ہے اور لکھنے والوں نے ایشیا اور خاص کر ہندوستان کے صحیح مرتبے کو اہمیت دینی شروع کر دی ہے۔

پروفیسر ٹارن نے لکھا ہے کہ "مجموعی حیثیت سے ہم اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ ایشیا والوں نے یونان سے جو کچھ لیا وہ محض خارجی تھا، اس کا تعلق ظاہری شکل اور ہیئت سے تھا۔ اُس نے یونان سے صرف قالب لیا ہے، روح نہیں۔ اس لئے کہ ایشیا کو اس بات پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا کہ روحانی حیثیت سے اُس میں یونان سے زیادہ سکت ہے، اور اس لحاظ سے اس کی عمر یونان سے زیادہ ہوگی اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔" آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ "ہندی تہذیب میں اتنی قوت اور سکت تھی کہ اس نے اپنے آپ کو یونانی تہذیب کے اثر سے محفوظ رکھا، لیکن بظاہر اس میں اتنی قوت نہیں تھی (سوائے مذہب کے میدان کے) کہ وہ یونان پر اس طرح اثر ڈال سکے جیسے کلدانی تہذیب نے ڈالا۔ پھر بھی ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ بعض حیثیتوں سے ہندوستان شریکِ غالب تھا۔" "اگر دنیا میں یونان کا وجود بھی نہ ہوتا تب بھی بُدھ کے مجسمے کو چھوڑ کر، تاریخ ہندوستان کی سب اہم چیزیں ویسی ہی ہوتیں جیسی ہوئیں۔"

یہ خیال دلچسپ ہے کہ بُت پرستی ہندوستان میں یونان سے آئی۔ ویدک

دھرم ہر طرح کی بُت پرستی یا اصنام پرستی کا مخالف تھا۔ اس عہد میں دیوتاؤں کے
کے لئے مندر تک نہیں تھے۔ ویدک دھرم سے پہلے ہندوستان کے بعض قدیم مذہبوں
میں بُت پرستی کے رواج کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ رواج بھی عام نہ تھا۔ بودھ مت
بھی اپنے ابتدائی دور میں بُت پرستی کا سخت مخالف تھا اور بُدھ کی شبیہ اور اُن کے
مجسمے بنانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ لیکن افغانستان اور اُس کے آس پاس کے
علاقوں میں یونانی فن کا اثر موجود تھا اور اس اثر نے رفتہ رفتہ ہندوستانی عقیدے پر
غلبہ حاصل کر لیا۔ شروع شروع میں بُدھ کے مجسمے نہیں بنائے گئے بلکہ "اپالو"
کے مجسمے بنے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ خود بدھ کی مورتیاں بننے لگیں۔ اس چیز
نے ہندو دھرم پر بھی اثر ڈالا اور یہاں بھی بُت پرستی کی ابتدا ہوگئی ۔ گو ویدک
دھرم بھی اس اثر سے محفوظ رہا۔ فارسی یا اردو میں 'بُت' کا لفظ اب تک مستعمل
ہے اور یہ لفظ غالباً 'بُدھ' کے لفظ سے نکلا ہے۔

انسانی ذہن کو ہمیشہ سے انسانی زندگی، قدرت اور کائنات میں کسی نہ
کسی طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنے کا خیال ستاتا رہا ہے۔ یہ خواہش خواہ مناسب ہو
یا نامناسب، بہرحال ذہن کی کسی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ پرانے فلسفی
بھی اس جستجو میں سرگرداں رہے اور نئے سائنس دانوں میں بھی یہی اندرونی جذبہ
کارفرما ہے۔ ہمارے سارے منصوبے اور ساری تجویزیں، تعلیمی، سماجی اور سیاسی
تنظیم کے سارے نظریے اتحاد اور ہم آہنگی کی اسی زبردست خواہش کے پیدا
کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اب کچھ مفکروں اور فلسفیوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ یہ
بنیادی تصور غلط اور بے بنیاد ہے، اور اس غیر ارادی کائنات میں اتحاد یا
تنظیم جیسی کسی چیز کا وجود نہیں۔ ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو، لیکن اس میں ذرا بھی شبہ
کی گنجائش نہیں کہ اگر یہ نظریہ غلط اور بے بنیاد بھی تھا تب بھی اس سے ہندوستان

میں، یونان میں اور دنیا کے اور بہت سے حصوں میں مفید نتیجے حاصل ہوئے، زندگی میں توازن، ہم آہنگی اور لطافت پیدا ہوئی۔

۸ - قدیم ہندی ناٹک

یورپ کی تحقیق نے جب سے قدیم ہندوستانی ڈراما کا پتہ چلایا، لوگوں نے یہ رائے دینی شروع کر دی کہ ڈرامے کی ابتدا یونان میں ہوئی اور ہندوستانی ڈرامے پر بھی یونانی ڈرامے کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ رائے بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ سکندر کے حملے کے بعد ہندوستان کی سرحد پر یونانی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں۔ غالب قیاس ہے کہ ان ریاستوں میں یونانی تھیٹر ڈرامے دکھاتے رہے ہوں گے۔ انیسویں صدی کے محققوں نے مدتوں اس مسئلے کی چھان بین اور اس پر بحث کی ہے۔ اور اب متفقہ طور پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ ہندوستانی ناٹک کی ابتدا، اس کے بنیادی خیالات اور اس کا ارتقا، یہ ساری چیزیں کسی بیرونی اثر سے متاثر نہیں ہوئیں۔ اس کی ابتدائی شکل رگوید کے اُن بھجنوں اور مکالموں کو کہا جا سکتا ہے جن میں تھوڑا بہت ڈرامائی عنصر موجود ہے۔ رامائن اور مہا بھارت میں بھی جا بجا ناٹکا کے حوالے ہیں۔ اس ناٹک نے سب سے پہلے کرشن کی روایتوں کے ناچ گانے کی شکل میں جنم لیا۔ چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح کے مشہور قواعد داں پینی نے ڈرامے کی کچھ شکلوں کا ذکر کیا ہے۔

نٹ شاستر کے نام کی ایک کتاب میں جو تیسری صدی عیسوی میں لکھی گئی، ناٹک کے فن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ماخذ اسی موضوع کی دوسری کتابیں ہیں۔ ایسی کتاب صرف اسی صورت میں

لکھی جا سکتی تھی کہ ڈرامے کے فن نے پوری ترقی کر لی ہو اور ڈرامے عام طور پر لوگوں کو دکھائے جاتے ہوں۔ اس لئے یقین ہے کہ اس کتاب سے پہلے بھی اس فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہوگا، اور صدیوں کے ارتقا کے بعد ڈرامے نے وہ شکل اختیار کی ہوگی جس کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ حال ہی میں چھوٹا ناگپور میں زمین کے نیچے سے ایک قدیم ناٹک گھر کے آثار برآمد ہوئے ہیں، یہ ناٹک گھر دوسری صدی قبل مسیح کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نت شاستر میں ناٹک گھروں کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ ناٹک گھر بالکل اسی کے مطابق ہے۔

یہ بات اب تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ سنسکرت ڈراما تیسری صدی قبل مسیح تک ایک باقاعدہ اور مستحکم شکل اختیار کر چکا تھا۔ بلکہ بعض فاضلوں کا خیال ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح ہی میں اس نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ اب تک جو ڈرامے ملے ہیں اُن میں برابر پہلے کے مصنفوں اور اُن کے ڈراموں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ڈرامے اب ناپید ہیں۔ ان ڈراموں میں جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے ایک کا نام 'بھاش' تھا۔ اس کی سب ڈراما نگاروں نے بے حد تعریف کی ہے۔ اس صدی کے شروع میں اس کے تیرہ ڈراموں کا پتہ چلا ہے۔ لیکن اب تک جو قدیم سے قدیم سنسکرت ڈرامے ہمیں مل سکے ہیں، وہ 'اشوگھوش' کے ہیں۔ یہ مصنف عیسوی سنہ کے ذرا پہلے یا اس کے شروع ہونے کے ذرا بعد کا ہے۔ 'اشوگھوش' کے جو ڈرامے ملے ہیں وہ پورے نہیں ہیں بلکہ کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے ادھر اُدھر کے ٹکڑے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ مسودے صحرائے گوبی کے کنارے بسے ہوئے شہر 'ترفان' میں ملے ہیں۔ 'اشوگھوش' بودھ مت کا ایک پرہیزگار رہبر و تھا اور اس نے بُدھ چرتر کے نام سے بدھ کی ایک سوانح عمری

بھی لکھی ہے، جو بہت مشہور ہے اور مدتوں ہندوستان، چین اور تبت کے لوگوں میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اس کتاب کا چینی ترجمہ قدیم زمانے میں ایک ہندی فاضل نے کیا تھا۔

ان نئی تحقیقوں سے قدیم ہندی ڈرامے کی تاریخ پر ایک نئی روشنی پڑی ہے اور عین ممکن ہے کہ آئندہ کے انکشافات اور تحقیقات سے ہندوستانی تہذیب کے اس دلکش پہلو پر اور گہری روشنی پڑ سکے۔ اس لئے کہ جیسا کہ سلویں لوی نے اپنی کتاب 'Le Theatre Indien' میں لکھا ہے "ڈراما اُس تہذیب یا تمدن کا صحیح ترین عکس ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈراما زندگی کے حقائق کی تصویر پیش کرتا ہے، وہ اس تہذیب اور تمدن کا نچوڑ ہوتی ہے اور اس تصویر کو ہم اُس کے مجموعی تاثرات کی علامت کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستانی زندگی کی صحیح تصویر بھی ہمیں اُس کے ڈرامائی آرٹ میں نظر آتی ہے اس لئے کہ اس میں اُس کے عقائد، اس کے رسوم اور اس کے ارادوں کا پورا پورا عکس ہے۔"

یورپ کو سب سے پہلے قدیم ہندوستانی ڈراما کا علم اُس وقت ہوا جب ۱۷۸۹ء میں سر ولیم جونس کا کیا ہوا، کالیداس کے ناٹک "شکنتلا" کا ترجمہ شائع ہوا۔ یورپ کے علمی حلقے میں اس انکشاف سے ایک ہیجان سا برپا ہو گیا اور پے در پے اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ سر ولیم جونس کے ترجمے سے جرمن، فرانسیسی، ڈینی اور اطالوی زبانوں میں ترجمے شائع کئے گئے۔ گوئٹے، اس ناٹک سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے 'شکنتلا' کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کی۔ گوئٹے نے 'فاؤسٹ' کی جو تمہید لکھی ہے اُس کا خیال بھی اُس کے دل میں 'کالی داس' کی تمہید سے پیدا ہوا۔ اُس زمانے میں سنسکرت ڈراما میں اس طرح کی تمہیدیں لکھنے کا عام رواج تھا۔ [۱]

(۱؎ نوٹ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کالی داس کو سنسکرت ادب کا سب سے بڑا شاعر اور ڈراما نگار تسلیم کیا گیا ہے۔ پروفیسر سلوین لیوی نے اس کے متعلق لکھا ہے "کالی داس کا نام ہندوستانی

(نوٹ صفحہ گذشتہ) ہندوستانی مصنف عام طور پر اس بات کے شائق ہیں کہ وہ ہندوستانی ادب اور فلسفے کی تعریف میں یورپین فاضلوں کی تحریروں سے اقتباس اور حوالے دیتے ہیں کسی حد تک میں بھی اس مرض کا شکار ہوا ہوں۔ اس کے مقابلے میں، اس سے بالکل مختلف قسم کے، اقتباس اور حوالے دینا یقیناً زیادہ آسان ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے فاضلوں نے ہندوستانی فکر اور فلسفے کے متعلق جو انکشافات کئے اُن کی بنا پر اُن کے قلم سے پُرجوش تعریفیں نکلیں۔ عام طور پر ان انکشافات سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو کمی اب تک یورپ کی تہذیب پوری نہیں کر سکی تھی وہ ان انکشافات سے پوری ہو گئی۔ لیکن جلد ہی اس خیال کا ردعمل شروع ہوا اور لوگوں نے طرح طرح کے شبہات ظاہر کر کے ان نئے خیالات اور نظریوں پر تنقیدیں کیں۔ تنقید کرنے والوں کا خیال یہ تھا کہ فلسفہ ایک غیر متشکل اور منتشر سی چیز ہے۔ اختلاف کی دوسری وجہ ناپسندیدگی کا وہ جذبہ تھا جو ہندوستانی سوسائٹی کے ذات پات کے کٹر نظام کے خلاف عام ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے متعلق موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں ہندوستان کے پُرانے ادب کے متعلق کم علمی اور بے علمی پر مبنی تھیں۔ خود گوئٹے جیسا مفکر بھی ہمیشہ ایک رائے پر قائم نہ رہا۔ اور اس نے گو اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندی فکر مغربی تہذیب کی ایک زبردست محرک بنی لیکن اس کی تاثیر کی گہرائی سے وہ ہمیشہ منکر رہا۔ ہندوستان کے متعلق یورپ کے مفکروں میں یہ 'دوئی' اُن کے نقطۂ نظر کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ رومین رولاں نے 'جسے میں یورپ کے تمدن کے بہترین عناصر کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں' چند برس ہوئے ہندوستانی فکر کی بنیادوں کا ایک ہمدردانہ اور صحیح تجزیہ کیا ہے۔ اُس کے نزدیک مشرق اور مغرب انسانی روح کی ابدی (دیکھئے صفحہ آئندہ)

شاعری کی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس شاعری کا جوہر ہے ڈراما اور رزمیہ شاعری آج تک اس کی روشن اور تاباں شخصیت سے دنیا کو منور کر رہے ہیں سرسوتی کے سپوتوں میں کالیداس ہی ایک ایسا ہے جسے ایک ایسا شاندار کارنامہ پیش کرنے کا فخر حاصل ہے، جس پر ہندوستان کو ناز ہے اور جس کی تعریف ساری دُنیا کی زبان پر ہے۔ 'شکنتلا' کا سورج اجین کے افق سے طلوع ہوا اور کئی صدیوں بعد اُس نے دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک نور ہی نور پھیلا دیا، اور ولیم جونز نے اس سورج کی جوت مغرب تک پھیلائی۔ کالیداس دنیا کے شاعروں کی اُس صف میں کھڑا ہے، جس میں کا ہر شخص ایک خاص عہد کی انسانی روح کا نچوڑ ہے۔ یہ سارے نام مل کر تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں بلکہ دراصل وہ خود تاریخ ہیں۔"

کالیداس نے اس کے علاوہ بعض اور ڈرامے اور کچھ طویل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس کے زمانے کا تعین یقین کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن غالباً وہ گپت خاندان کے بادشاہ چندر گپت وکرماجیت دوم کے عہد میں چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں اجینی میں رہتا تھا۔ روایت ہے کہ وہ اُس کے دربار کے نورتنوں میں سے ایک تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کی زندگی میں اُس کے مرتبے کی صحیح قدر و منزلت ہوئی۔ وہ اُن خوش نصیب لوگوں میں سے تھا جنھیں زندگی نے ایک چہیتی اولاد کی طرح پالا اور اُس نے زندگی کی تیزی اور تندی

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کشمکش کے مختلف پہلوؤں کی دو تصویریں ہیں ــــ اس مضمون پر ہندستانی فکر کے ساتھ مغرب کا ردعمل) شانتی نکیتن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر الکس آرنسن نے تحقیقی اور عالمانہ باتیں لکھی ہیں۔

سے زیادہ اُس کے حُسن و لطف کا مزا چکھا۔ اس کی کتابوں سے زندگی کی بے پایاں اُلفت اور قدرت کے حسن و لطف کے شدید ولولہ کا اظہار ہوتا ہے۔

کالیداس کی طویل نظموں میں سے ایک کا نام 'میگھ دُوت' یا 'بادلوں کا پیامی' ہے۔ ایک عاشق کسی قید میں اپنے محبوب کی جدائی سے پریشان ہے۔ برسات کے دنوں میں وہ بادل کے ایک ٹکڑے سے کہتا ہے کہ میری تمناؤں کا پیام میری محبوبہ تک پہنچا دو۔ اس نظم کی اور کالیداس کی امریکی فاضل رائڈر نے بے حد تعریف کی ہے۔ وہ نظم کے دو حصوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "پہلا حصہ مناظر فطرت کی دلکش مصوری ہے لیکن یہ مصوری بھی انسانی جذبات کی گہرائی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دوسرا حصہ انسان کے دل کی تصویر ہے لیکن اس تصویر کا حاشیہ فطرت کی رنگینی سے بنایا گیا ہے۔ دونوں حصے اس طرح ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسا حصہ زیادہ اچھا ہے۔ جو لوگ اس مکمل اور پُرتاثیر نظم کا مطالعہ کرتے ہیں ان میں سے کچھ کے دل پر پہلا حصہ اثر کرتا ہے اور کچھ کے دل پر دوسرا۔ جو کچھ یورپ کی سمجھ میں انیسویں صدی تک بھی نہ آیا اور جو کچھ اب تک بھی وہ پوری طرح سمجھ نہیں سکا' وہ کالیداس نے پانچویں صدی میں سمجھ لیا تھا ــــ دنیا انسان کے لئے نہیں بنی' انسان اُس وقت صحیح معنوں میں بلندی حاصل کرتا ہے جب وہ اس زندگی کی عظمت اور حقیقت سے آشنا ہو جائے جو انسانی زندگی سے پرے ہے۔ اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لینا کالیداس کی ذہنی قوت کا کرشمہ ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی فنی قابلیت۔ شاعرانہ روانی کی دُنیا میں کمی نہیں' ذہنی جودت بھی کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ لیکن جب سے دنیا شروع ہوئی ہے' ان دونوں قوتوں کا امتزاج اور اتحاد شاید ایک درجن سے زیادہ

مرتبہ نہیں ہوا۔ اور کالیداس میں چونکہ یہ امتزاج بدرجۂ اتم موجود تھا اس لئے ہم اُسے اناکرین، ہوریس اور سیشلی کے ساتھ، بلکہ سوفاکلیز، ورجل اور ملٹن کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔"

غالباً کالیداس سے بہت پہلے ایک مشہور ڈراما اور لکھا گیا تھا — شدرک کا ڈراما ' میرچھ کاٹک ' یا مٹی کی گاڑی۔ ایک لطیف اور مصنوعی ڈراما۔ لیکن اس تصنع کے باوجود اس میں حقیقت کی ایک ایسی جھلک ہے جو دل پر اثر کرتی ہے اور جس سے اُس زمانے کی تہذیب اور تخیل کی تصویر ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ تقریباً ۴۰۰ء میں، چندر گپت ثانی کے عہد میں ایک اور مشہور ڈراما بھی لکھا گیا۔ یہ ڈراما وشاکادت کا لکھا ہوا ڈراما ' مدرا راکشس ' تھا۔ اس ڈرامے کا موضوع خالص سیاسی ہے۔ اس میں نہ محبت کے جذبے کی ترجمانی ہے اور نہ کوئی مذہبی کہانی۔ اس کا پس منظر چندر گپت موریا کا عہد حکومت ہے اور چندر گپت کا وزیر اعظم اور ارتھ شاستر کا مصنف چانکیا اُس کا ہیرو ہے۔ بعض حیثیتوں سے یہ تمثیل آج کل کے زمانے کے لئے موزوں معلوم ہوتا ہے۔

بادشاہ ہرش جس نے ساتویں صدی میں ایک نئی سلطنت کی بُنیاد ڈالی، ڈراما نگار تھا اور اس کے لکھے ہوئے تین ڈرامے ہمارے پاس ہیں۔ ۸۰۰ء کے قریب ایک اور شخص تھا جس کا نام ' بھبھوتی ' تھا۔ یہ بھی سنسکرت ادب کا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی تحریروں کا ترجمہ بہت دشوار ہے اس لئے کہ اس کی تحریروں کا حسن اس کی زبان اور طرز بیان میں ہے۔ لیکن یہ مصنف ہندوستان میں بے حد مقبول ہے اور صرف کالیداس کو اس لحاظ سے اس پر سبقت حاصل ہے۔ ولسن نے جو کسی زمانے میں آکسفورڈ

یونیورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر تھا؛ ان دونوں کے متعلق لکھا ہے "جیسی پُرترنم اور پُرشکوہ زبان بھبوتی اور کالیداس کی نظموں کی ہے ایسی زبان کا تصور بھی ایک ناممکن بات ہے۔"

سنسکرت ڈرامے کا دھارا اسی زور شور سے صدیوں تک بہتا رہا، لیکن مراری کے بعد، یعنی نویں صدی عیسوی کے شروع سے اس میں نمایاں طور پر تنزل کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ تنزل اور انحطاط صرف ڈرامے ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈرامے میں اس انحطاط کی ایک وجہ یہ تھی کہ افغانوں اور مغلوں کے عہد میں حکومت نے اس کی سرپرستی نہیں کی۔ اس لئے کہ اسلام میں ڈرامے کے آرٹ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور اس ڈرامے کا انداز اتنا علمی اور پُرتصنع تھا کہ جب تک اسے حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہو اس کا پھلنا پھولنا ممکن نہیں تھا۔ گو یہ ممکن ہے کہ سیاسی تبدیلیوں نے بالواسطہ اس پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالا ہو، لیکن انحطاط اور تنزل کی توجیہہ کی یہ دلیل میرے نزدیک بالکل بودی اور بے بنیاد ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سنسکرت ڈراما میں انحطاط کے آثار ان سیاسی تبدیلیوں سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ سیاسی تبدیلیاں کئی صدیوں تک صرف شمالی ہند تک محدود رہیں۔ اگر ڈراما میں کچھ قوت نمو باقی ہوتی تو وہ آسانی سے جنوب میں اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا تھا۔ افغانی، ترکی اور مغل حکمرانوں کا رویہ ہندوستانی تہذیب کے معاملے میں نمایاں طور پر فیاضانہ اور مربیانہ رہا ہے سوا اُن مختصر وقفوں کے جب مذہبی تقشف کا زور رہا، ہندوستانی موسیقی کو مسلمان درباروں اور وزیروں امیروں نے جوں کا توں اپنا لیا اور اسے بڑے جوش و خروش سے

ترقی دی۔ یہاں تک کہ ہندوستانی موسیقی کے بڑے بڑے ماہر اکثر مسلمان ہی گذرے ہیں۔ ادب اور شاعری کی بھی سرپرستی کی گئی اور کئی مسلمانوں کا شمار ہندی کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ بیجا پور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ نے ہندوستانی موسیقی پر ایک کتاب ہندی میں لکھی تھی۔ ہندوستانی شاعری اور موسیقی میں ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی بے شمار تلمیحات ہیں پھر بھی مسلمانوں نے انھیں اپنا لیا اور پرانی تمثیلیں اور استعارے برابر جاری رہے۔ اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے بُت تراشی کے، مسلمان بادشاہوں نے (چند کو چھوڑکر) ہندوستان کے ہر فن کو ترقی دی۔

سنسکرت ڈرامے کا انحطاط اس لئے ہوا کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ہر چیز پر انحطاط اور زوال آچکا تھا۔ اور ہندوستانی ذہن اپنی قوتِ تخلیق کھو رہا تھا۔ اُس کا زوال اور انحطاط تو افغانوں اور ترکوں کے دہلی کے تخت پر قابض ہونے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آگے چل کر سنسکرت کو فارسی زبان سے مقابلہ کرنا پڑا — اس لئے کہ فارسی بادشاہوں اور وزیروں کی زبان بن چکی تھی۔ سنسکرت ڈراما کے انحطاط کی ایک اور ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنسکرت کے ڈراموں کی زبان اور لوگوں کی روزمرہ کی زبان میں جو خلیج تھی وہ برابر زیادہ سے زیادہ چوڑی ہوتی جارہی تھی اور ۱۰۰۰ء تک عوام کی زبانوں نے، جن سے ہماری موجودہ زبانیں نکلی ہیں، ادبی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سنسکرت ڈراما عہد وسطیٰ میں بھی برابر لکھا جاتا رہا اور اس کا سلسلہ کچھ دن پہلے تک جاری رہا۔ ۱۸۹۵ء میں شکسپیر کے ڈرامے Midsummer

Nights Dream کی بنیاد پر ایک ڈراما سنسکرت میں شائع ہوا۔ پرانے ڈراموں کے مسودے اب تک برابر مل رہے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں پروفیسر سلوین لِوی نے جو فہرست تیار کی تھی اس میں ۱۰۹ مصنفوں کے ۳۷۷ ڈراموں کے نام درج تھے۔ حال ہی میں ایک اور فہرست تیار کی گئی ہے اس میں ۶۵۰ ڈراموں کے نام ہیں۔

(کالیداس اور دوسرے مصنفوں کے لکھے ہوئے) پرانے ڈراموں میں دو یا دو سے زیادہ زبانیں استعمال کی گئی ہیں، ایک سنسکرت اور دوسرے ہندوستان کی پراکرتیں یا عوام کی زبانیں۔ ڈراما میں پڑھے لکھے لوگ سنسکرت میں گفتگو کرتے ہیں اور اَن پڑھ عوام اور عورتیں عموماً پراکرت میں۔ شاعرانہ اور ادبی ٹکڑے، جن کی ان ڈراموں میں کثرت ہے سنسکرت میں ہیں۔ زبانوں کا یہی میل جول تھا جو ڈراموں کو عوام میں مقبول بناتا تھا۔ یہ طریقہ ایک ادبی زبان اور عوام پسند فن کے مطالبات کے درمیان سمجھوتہ تھا۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے قدیم سنسکرت ڈراما ایک ایسے آرٹ کی نمائندگی کرتا ہے جو پڑھے لکھے لوگوں اور شاہی درباروں اور اُن کے امیروں وزیروں کے لئے مخصوص تھا۔ سلوین لِوی نے لکھا ہے کہ قدیم سنسکرت ڈراما بعض باتوں میں فرانسیسی زبان کے المیہ ڈراموں سے ملتا جلتا ہے۔ فرانسیسی کے المیہ ڈراموں کا موضوع اس طرح کا ہوتا تھا کہ عوام کو اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی، اور اس لئے اس ڈرامے کے مخاطب ایک خاص طبقہ کے لوگ تھے۔ اس کی پہنچ عوام تک نہیں تھی۔ یہی حال سنسکرت ڈرامے کا تھا۔

لیکن اس اونچے معیار کے ادبی ناٹک کے علاوہ ہندوستان میں عوام کے لئے بھی ایک طرح کا ناٹک تھا۔ اس کی بنیاد عموماً مذہبی صحیفوں کی اُن

روایتوں یا اخلاقی کہانیوں پر مبنی ہوتی تھی جن سے عوام اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔
ان ناٹکوں میں ظاہری آب و تاب زیادہ ہوتی تھی اور ڈرامائی عنصر بہت کم۔ یہ ناٹک ایک خاص علاقے کے عوام کی زبان میں لکھے جاتے تھے اور اُسی خاص علاقے کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ بہ خلاف اس کے سنسکرت ڈرامے چونکہ سارے ہندوستان کی علمی زبان میں لکھے جاتے تھے، اس لئے اُن کا رواج سارے ہندوستان میں ہوتا تھا۔

یہ سنسکرت ڈرامے بلاشبہ اسٹیج کے لئے لکھے جاتے تھے۔ اس لئے ان میں مختلف طرح کی ہدایات درج ہوتی تھیں، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کے بیٹھنے کے متعلق بھی ہدایات دی جاتی تھیں۔ یونان کے طریقے کے خلاف، ان ڈراموں میں عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ یونانی اور سنسکرت دونوں میں قدرت کی موجودگی اور انسان اور قدرت کے قریبی تعلق کا لطیف احساس موجود ہے۔ ان ڈراموں میں غنائی عنصر کا غلبہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کو انسانی زندگی کا ایک لازمی اور اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔ یونانی ڈراما کا مطالعہ کرتے وقت انسان کے سامنے بہت سے ایسے رسوم اور فکر اور زندگی کے بہت سے ایسے طریقے آتے ہیں، جن سے اس کے سامنے فوراً پرانے ہندوستانی طریقوں کی تصویر پھر جاتی ہے۔ پھر بھی بنیادی طور پر یونانی ڈراما سنسکرت ڈرامے سے مختلف ہے۔

یونانی ڈراما کی بنیاد زندگی کا رنج والم ہے یعنی بدی کا مسئلہ۔ انسان تکلیف کیوں اُٹھاتا ہے؟ دنیا میں بدی کیوں ہے؟ مذہب کا معمہ، خدا کا معمہ۔ انسان کی حالت بھی کتنی قابلِ رحم ہے، زمانے کے ہاتھوں میں ایک کھلونا، جو قسمت کی طاقت کے آگے اپنی بے مقصد اور اندھا دھند کوششوں میں لگا ہوا ہے۔
"وہ قانون جو بدلتا نہیں، قائم رہتا ہے، صدیوں تک ـــــ، انسان کو دُکھ

اٹھاکر سبق سیکھنا چاہیے، اور اگر وہ خوش قسمت ہے تو اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگا۔

"خوش نصیب ہے وہ، تھکے ہوئے سمندر کے سینے پر
جس نے بادو باراں کو رخصت کیا اور پناہ کی جگہ پالی۔
خوش نصیب ہے وہ، جو اپنی کوششوں سے
سلامتی سے نکل آیا۔ اس لیے کہ زندگی کے فن کے نقوش بڑے عجیب و غریب ہیں۔
ایک بھائی چاہتا ہے کہ دولت اور مرتبہ میں دوسرے سے آگے نکل جائے۔
لاکھوں آدمی اس زندگی کے سینے پر چلتے پھرتے اور تیرتے ہیں
اور لاکھوں اُمیدیں اور تمنائیں ان کے دلوں میں مچلتی ہیں
ان کی تمنا پوری ہو جاتی ہے یا ان کی تمنا پوری نہیں ہوتی
امیدیں مردہ ہو جاتی ہیں یا وہ نئے سرے سے زندہ ہوتی ہیں
لیکن جس نے یہ جان لیا ـــ
اس زندگی کے سفر میں
کہ زندگی مسرت ہے، اُس نے اپنی جنت پالی۔"

انسان دکھ سہہ کر سبق حاصل کرتا ہے، اور وہ یہ سیکھتا ہے کہ زندگی کا مقابلہ کس طرح کرے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ یہ بھی سیکھتا ہے کہ یہ راز سربستہ رہے گا۔ اُسے اپنے سوالوں کا جواب کبھی نہیں مل سکتا اور نہ وہ نیکی بدی کے معمہ کو حل کر سکتا ہے۔

"اس بھید کی ان گنت شکلیں ہیں۔
اور خدا بہت سی چیزوں کو زندگی دیتا ہے

مرحوم تمنائیں اور خوف

انسان جس انجام کا منتظر ہے وہ نہیں آتا

اور پھر راہ ایسی جگہ نظر آجاتی ہے جہاں انسان کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔[1]

سنسکرت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو یونان کے المیہ ڈراما کی عظمت، شکوہ اور تاثیر کی ہمسر ہو سکے۔ اصل میں سنسکرت میں کوئی المیہ ڈراما ہی نہیں اس لیے کہ ان کے انجام پسند نہیں کیے جاتے تھے۔ سنسکرت کے ڈرامے میں اس طرح کی بنیادی حقائق سے بحث نہیں کی جاتی، ڈراما نگار عام مذہبی عقائد کو اپنا موضوع بنانے پر اکتفا کرتے ہیں — ان عقائد میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً تناسخ کا مسئلہ اور سبب اور نتیجے کا تعلق۔ اس عقیدے کے مطابق حادثہ یا وہ بدی جس کا کوئی سبب نہ ہو وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ اس لیے کہ انسان کو اس زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کے پچھلے جنم کے کسی نہ کسی واقعہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی قوت اندھا دھند اپنا عمل نہیں کرتی وہ کسی نہ کسی سبب کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس کا کسی واقعے یا حادثے کی مدافعت کی کوشش کرنا بالکل بے سود اور بے معنی چیز ہے۔ فلسفی اور مفکر عقیدے کی سادہ توجیہات سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ ان واقعات کی تہ کو پہنچنے اور ان حقیقی سبب کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں لیکن عام زندگی پر یہی عقائد چھائے ہوئے ہیں اور عوام انھیں کے پابند ہیں اس لیے ڈراما نگار بھی ان کے خلاف قلم نہیں اٹھاتے۔

---

[1] میں نے یہ اقتباس پروفیسر گلبرٹ مرے کے ان ترجموں سے لیے ہیں جو انھوں نے یوریپیڈیز کی کتابوں کے کیے ہیں۔ پہلا ترجمہ The Bacchae سے لیا گیا ہے اور دوسرا 'Alcestis' سے۔

سنسکرت ڈراما اور سنسکرت شاعری دونوں ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ ہیں، اور انھوں نے بہت کم اس سے انحراف کیا ہے۔ ڈراما لکھنے کے لئے کچھ سخت قواعد مقرر تھے اور ڈراما نگاروں کے لئے ان کا توڑنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ان ڈراموں میں یہ نہیں ہوتا کہ لوگ چپ چاپ قسمت کے آگے سر جھکا دیں۔ ان کا ہیرو ہمیشہ ایک باہمت انسان ہوتا ہے جو زندگی کی کشمکش کا دلیری سے مقابلہ کرتا ہے۔ 'مدرا راکشش' میں چانکیہ حقارت آمیز لہجے میں کہتا ہے "صرف جاہل انسان قسمت پر بھروسا کرتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر بھروسا کرنے کے بجائے' ستاروں سے مدد چاہتے ہیں" ان ڈراموں میں تھوڑا سا تصنع ہے۔ ہیرو ہمیشہ ہیرو رہتا ہے اور بدمعاش ہمیشہ بدمعاشی کی حرکتیں کرتا ہے۔ دونوں کے راستے مقرر ہیں، کوئی درمیانی راستہ نہیں۔

اس کے باوجود ان ڈراموں میں پُرتاثیر ڈرامائی مواقع ہیں، دلکش مناظر ہیں اور زندگی کا ایک ایسا پس منظر، جو خواب کی سی تصویر معلوم ہوتی ہے، حقیقت کی حقیقت اور افسانے کا افسانہ۔ اور ان ساری چیزوں کو شاعر کے تخیل نے رنگین اور پُرشکوہ طرزِ بیان کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ ان ڈراموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں زندگی ہمیشہ پُرامن اور پُرسکون رہی ہے (خواہ حقیقت میں ایسا ہو یا نہ ہو)، پُرامن' پُرسکون اور مستحکم گویا وہ اپنی حقیقت سے آشنا ہے اور اُسے اپنے سارے سوالوں کا جواب مل چکا ہے۔ زندگی نرم اور دھیمی رفتار سے چل رہی ہے، تُند و تیز ہوائیں اور گذرتے ہوئے طوفان بھی صرف اس کی اوپری سطح میں ہلکی سی جنبش پیدا کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان ڈراموں میں یونانی المیہ ڈراموں کے سے خوفناک اور پُرہیبت طوفان نہیں۔ لیکن ان میں بشریت ہے' اور یہ جمالیاتی ہم آہنگی اور منطقی توازن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ سلوین لیوی

نے لکھا ہے کہ ناٹک یا ہندوستانی ڈراما ہندوستانی ذہن کی سب سے لطیف اور سب سے حسین تخلیق ہے۔

پروفیسر اے۔ بی کیتھ نے لکھا ہے کہ "سنسکرت ڈراما کو ہم جائز طور پر ہندوستانی شاعری کی بلند ترین تخلیق اور ادب کے اعلیٰ سے اعلیٰ تصور کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں جو ہندوستان کے خود آگاہ ادیبوں کے ذہن میں تھا۔۔۔۔۔ برہمن، جسے دوسرے معاملات کی طرح اس سلسلے میں بھی بہت کچھ بُرا بھلا کہا گیا ہے، ہندوستان کے ممتاز علمی کارناموں کا سرچشمہ تھا۔ جس طرح اُس کے ذہن نے ہندوستانی فلسفہ پیدا کیا، بالکل اسی طرح اس کی دانش نے ڈراما کے نازک اور پُر تاثیر فن کی تشکیل کی۔"

شدرک کے ناٹک 'مرچھ کٹیک' کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۴ء میں نیویارک میں اسٹیج پر دکھایا گیا تھا۔ اخبار 'نیشن' کے نقاد ڈراما مسٹر جوزف وڈکرچ نے اس کے متعلق لکھا تھا کہ "اگر انسان کہیں اُس 'خالص فنی تھیٹر' کا نظارہ کرنا چاہتا ہے جو اب تک محض نظریوں کی صورت میں موجود تھا تو اُسے اس ناٹک کو دیکھنا چاہیے۔ یہ ڈراما ہے جسے دیکھ کر انسان مشرق کی اس حقیقی دانش کا تصور کرسکتا ہے جو محض فلسفیانہ نظریوں تک محدود نہیں، بلکہ اپنی کشش اور تاثیر میں اُس عیسائیت سے کہیں زیادہ گہری اور کہیں زیادہ سچی ہے، جسے عبرانی اثر کے کٹرپن نے محض رسمی بنا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ ڈراما نہایت پُر تصنع ہونے کے باوجود حد سے زیادہ پُر تاثیر ہے اس لیے کہ یہ حقیقت پسندی پر نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کا مصنف خواہ کوئی ہو، اور خواہ وہ چوتھی صدی کا ہو یا آٹھویں صدی کا، وہ انسان تھا، نیک اور دانش مند انسان۔ اس کی نیکی اور دانش مندی اُس قسم کی نہیں تھی جیسی کسی ناصح مشفق کی زبان سے یا قلم

سے ٹپکی پڑتی ہے بلکہ دل کی نیکی اور دانش مندی تھی۔ اس انسان کے دل میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ شباب کی بہارِ حسن اور عشق و محبت کے لئے بے پایاں ہمدردی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ پختہ کار مصنف اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک تفریحی قصہ جو ذہانت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو انسانی ہمدردی، خود اعتمادی اور نیک دلی کے اظہار کا ذریعہ بن سکتا ہے .... اس طرح کا ڈراما صرف ایسا ہی تمدن پیدا کر سکتا ہے جسے استحکام حاصل ہو چکا ہو۔ جب کوئی تہذیب اپنی زندگی کے سارے مسائل کا حل سوچ چکی ہو تو پھر وہ اسی طرح کا پُر سکون اور سادہ مشغلہ تلاش کرتی ہے جیسا یہ ڈراما ہے۔ میکبتھ اور آتھیلو کی شخصیتیں خواہ کتنی ہی پُر عظمت اور پُر جوش کیوں نہ ہوں لیکن ان میں وحشت کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے کہ شکسپیر کے ہاں جو شدتِ جذبات اور شورشِ تخئیل پائی جاتی ہے وہ عہدِ وحشت کے اخلاقی تصورات اور عہدِ جدید کی ذکاوتِ احساس کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ خود ہمارے عہد کا حقیقت پسند ڈراما بھی اسی طرح کی الجھن اور انتشار سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن جب زندگی کے مسائل حل ہو جاتے ہیں، اور جذبات اور خواہشات عقل و دانش کے فیصلوں کے تابع بن جاتے ہیں تو صرف حُسنِ ادا اور حسنِ بیان باقی رہ جاتا ہے ..... کلاسیکی عہد کے بعد یورپ کے کسی عہد میں بھی ہمیں کسی کتاب میں روحِ تمدن کا اس قدر مکمل نمونہ نظر نہیں آتا۔[۵]

---

۵ میں نے یہ طویل اقتباس آر۔ ایس۔ پنڈت کے اس دیباچہ سے لیا ہے جو انھوں نے "مدرا راکشش" کے ترجمے کے شروع میں لکھا ہے۔ اس ترجمے میں بہت سے دلچسپ نوٹ اور ضمیمے شامل ہیں۔ میں نے اس باب کی تیاری کے سلسلے میں اکثر Sylvain Levi کی کتاب Le Théatre Indien (Paris 1890) (دیکھئے خود آئندہ)

۹۔ سنسکرت کی قوتِ حیات اور پائداری

زبان کی حیثیت سے سنسکرت الفاظ کے ذخیرے سے مالامال، رنگین اور پُرتکلف ہے۔ پھر بھی اس میں انتہائی درجے کی باقاعدگی ہے اور اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو سختی کے ساتھ ان قاعدوں کے دائرے میں محدود رکھا ہے جو اب سے دو ہزار چھ سو برس پہلے پنینی نے مقرر کیے تھے۔ یہ برابر بڑھتی اور پھیلتی، بنتی اور سنورتی رہی لیکن اپنی اصلیت سے دور نہیں ہوئی۔ سنسکرت ادب کے انحطاط کے زمانے میں، اس کی قوت اور اسلوب بیان کی بے ساختگی میں فرق آگیا اور یہ دور از کار تشبیہوں اور استعاروں اور پیچیدہ طرزوں میں پھنس کر رہ گئی۔ گریمر کے جس قاعدے کے مطابق لفظوں کے مرکب بنانے میں آسانی ہوتی تھی اُسے لوگوں نے اپنی صناعی دکھانے کا آلۂ کار بنا لیا، اور لفظوں کے ایسے مرکب بنانے لگے جو کئی سطریں گھیر لیتے ہیں۔

سر ولیم جونز نے ۱۷۸۴ء میں اسی سلسلے میں لکھا تھا کہ "سنسکرت زبان (خواہ اس کی اصل کچھ بھی ہو) اپنی ساخت کے اعتبار سے بے حد حیرت انگیز ہے: یونانی زبان سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ جامع اور کثیر اللغات، اور دونوں سے زیادہ نفیس اور لطیف۔ اور افعال کے مادوں اور قواعد کی ہیئت میں دونوں سے اس قدر مشابہت رکھتی ہے کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مشابہت اتنی

(بقیہ نوٹ صفحۂ گذشتہ) اور A. Berriedale Keith کی کتاب Sanskrit Drama (Oxford 1924) سے مدد لی ہے اور دونوں کتابوں سے اقتباس بھی لئے ہیں۔

زیادہ قریبی اور یقینی ہے کہ اگر کوئی ماہر لسانیات ان زبانوں کا جائزہ لینے بیٹھے تو اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان تینوں کا کوئی مشترک ماخذ ہے جو اب شاید دنیا میں باقی نہیں .....“

ولیم جونز کے بعد بہت سے انگریز، فرانسیسی، جرمن اور دوسرے یوروپی فاضلوں نے سنسکرت کا مطالعہ کیا اور ایک نئے علم، تقابلی لسانیات کی بنیاد ڈالی۔ جرمن فاضل اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے اور انیسویں صدی میں انھیں فاضلوں نے سنسکرت زبان کے متعلق قابل قدر تحقیقات کی۔ ہر جرمن یونیورسٹی میں ایک یا دو پروفیسروں کی نگرانی میں سنسکرت کا شعبہ موجود تھا۔ ہندوستانی فاضلوں نے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیقات کی لیکن چونکہ وہ عربی یا فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں سے واقف نہ تھے اس لئے ان کی تحقیق پر پرانا رنگ چھایا ہوا ہے۔ یورپ کی تحریک اور تاثیر سے ہندوستان میں تحقیق کا ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور ہندوستانیوں نے یورپ (عموماً جرمنی) جاکر تحقیق کے نئے طریقوں اور تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کے نئے اصولوں کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان ہندوستانی فاضلوں میں یورپ کے محققوں کے مقابلے میں بعض خوبیاں تھیں اور بعض خامیاں۔ خامی تو سب سے بڑی یہ تھی کہ ان کے ذہن میں کچھ تصورات جو انھیں اپنے بزرگوں اور قومی روایتوں سے ورثے میں ملے تھے جاگزیں تھے اور یہ ہمیشہ بے لاگ تنقید کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔ اور خوبی یہ کہ وہ سنسکرت کی تصنیف کے اصل مفہوم کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے تھے، اور ان کے لئے اس ماحول اور فضا کا تصور بھی ممکن تھا، جس میں یہ تصنیف پیدا ہوئی، اور اس لئے وہ تصنیف کے مجموعی ماحول سے زیادہ ہم آہنگ ہو سکتے تھے۔

زبان محض گرامر یا لسانیات کا نام نہیں بلکہ بہت بڑی چیز ہے۔ وہ ایک قوم یا تہذیب کی روح کی شاعرانہ تعبیر اور اس فکر و تخیل کی مجسم صورت ہے جس سے

اس تہذیب نے تشکیل پائی۔ لفظوں کا مفہوم بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور پرانے خیال نئے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں، لیکن ان کی ظاہری شکل، اُن کے بیرونی لباس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کسی پرانے لفظ یا فقرے کا مفہوم سمجھنا بڑی دشوار بات ہے، اور اس سے بھی زیادہ دشوار اس کی روح میں داخل ہونا۔ اور اس لئے اگر ہم چاہیں کہ اس پُرانے مفہوم کی جھلک ہمیں نظر آجائے یا ہم اس پُرانے زمانے کے لوگوں کے ذہن کی کوئی تصویر بنا سکیں تو ہمیں ایک خاص قسم کے شاعرانہ تصور اور رومانی نظر سے کام لینا پڑے گا۔ زبان جتنی زیادہ جامع اور کثیر اللغات ہوگی اتنی ہی یہ دقت اور زیادہ ہو جائے گی۔ دوسری کلاسیکی زبانوں کی طرح سنسکرت میں بھی لیسے لفظ کثرت سے ہیں جن میں شاعرانہ حسن بھی ہے اور گہری معنویت بھی۔ زبان الفاظ کے ساتھ بے شمار تصورات وابستہ ہیں اور اس لئے ان کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں نہیں ہو سکتا جس کی روح اور اندازِ فکر سنسکرت سے مختلف ہے۔ اس کی گرامر اور اس کے فلسفے میں بھی ایک شاعرانہ لطافت ہے۔ سنسکرت کی ایک پُرانی لغت بھی اشعار کی صورت میں ترتیب دی گئی ہے۔

ہم میں سے جن لوگوں نے سنسکرت کا مطالعہ کیا ہے اُن کے لئے بھی اس قدیم زبان کی روح کو سمجھنا یا گذرے ہوئے زمانے کی زندگی کی پوری تصویر بنا لینا کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن دوسروں کے مقابلے میں ہمارے لئے یہ کام زیادہ آسان ہے اس لئے کہ ہم ان پُرانی روایتوں کے وارث ہیں اور پُرانی دنیا اب بھی ہمارے تصور پر چھائی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی ساری جدید زبانیں سنسکرت کی اولاد ہیں اور ان کے لفظوں میں بڑا سرمایہ اور اظہار و بیان کے اکثر انداز انھیں اپنی ماں سے ملے ہیں۔ سنسکرت شاعری اور فلسفے کے بہت سے پُرمغز اور پُرمعنی لفظ آج تک ہماری اکثر زبانوں کے عام اور روزمرہ الفاظ ہیں۔ اور گو سنسکرت مدتوں

سے عوام کی زبان کی حیثیت سے ختم ہو چکی ہے، لیکن اب بھی اس میں حیرت انگیز قوت نمو موجود ہے۔ اور یہی سب باتیں ہیں جن کی وجہ سے سنسکرت، غیر ملکوں کے لوگوں کے لئے، خواہ وہ کتنے ہی عالم فاضل کیوں نہ ہوں، بے انتہا مشکل اور دقیق زبان ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے عالم اور فاضل بہت کم ایسے ہیں جو شاعر بھی ہوں اور زبان کی تعبیر و تفسیر کے لئے ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے جو عالم بھی ہو اور شاعر بھی۔ اس طرح کے فاضلوں سے، جیسا کہ ایم۔ بارتھ نے کہا ہے ہمیں ایسے "ترجمے ملتے ہیں جو اس حد تک لفظی ہوتے ہیں کہ وہ صحیح ترجمے نہیں رہتے۔"

حالانکہ 'تقابلی لسانیات' کے مطالعے نے بے حد ترقی کی ہے اور سنسکرت زبان اور ادب کے متعلق بے انتہا تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن شاعرانہ اور رومانی نقطۂ نظر سے ادب کے جس مطالعے کی ضرورت ہے، اس لحاظ سے یہ کام کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کسی ایک سنسکرت کتاب کا ترجمہ بھی ایسا نہیں جسے واقعی اچھا، یا صحیح کہا جا سکے۔ اس کام میں ہندوستانیوں اور غیر ملکیوں کو کسی نہ کسی وجہ سے یکساں طور پر ناکامی ہوئی ہے۔ اور یہ بڑی افسوسناک بات ہے اس لئے کہ اس طرح دنیا ایک ایسی چیز سے محروم ہے، جو حسن، تخیل اور گہرے فکر سے معمور ہے ___ اور جو نہ صرف ہندوستان کی میراث ہے بلکہ پوری نسلِ انسانی کی میراث بننے کے قابل ہے۔

انگریزی مترجموں نے 'انجیل' کے مستند نسخے کا ترجمہ جس ضبط و احتیاط، ادب واحترام اور بصیرت سے کیا ہے، اس نے نہ صرف دنیا کو ایک عظیم الشان کتاب دی، بلکہ اس نے انگریزی زبان کو زندگی اور عظمت بخشی۔ یورپ کے فاضلوں اور شاعروں نے کئی کئی پشتوں تک محبت اور خلوص کے ساتھ جانفشانی کی اور یونانی اور لاطینی کی کلاسیکی تصنیفات کے نفیس ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں

شائع کیے اور اس طرح عوام بھی اس قدیم تہذیب اور اس کی وافر دولت کے شریک اور حصہ دار بن گئے۔ اپنی بے مزہ زندگی میں بھی انھوں نے حسن اور نیکی کی جھلک دیکھ لی۔ بدقسمتی سے سنسکرت میں یہ کام اب تک نہیں ہوا۔ یہ کام کب ہوگا، اور ہوگا بھی یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے فاضلوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے، اور ان کے علم و فضل میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ہمارے یہاں شاعروں کی بھی کمی نہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور یہ خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری تخلیقی صلاحیتیں نئی نئی راہیں اختیار کر رہی ہیں، اور زمانہ کے ہم پر جو نت نئے تقاضے ہیں، وہ ہمیں اتنی فرصت نہیں دیتے کہ ہم اطمینان سے اپنے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر سکیں۔ خاص کر ہندوستان میں ہماری نظر اور بہت سی چیزوں کی طرف ہے، اور ہمیں کھوئی ہوئی دقت کی تلافی کرنی ہے۔ پرانے زمانے میں ہم نے مدتوں اس کلاسیکی ادب کے کیف و سرور میں گذارے ہیں، لیکن اب ہم میں تخلیقی صلاحیت باقی نہیں اور اس لیے وہ کتابیں بھی ہم میں وہ ولولہ پیدا نہیں کرتیں جن کے ہم عاشق اور شیدائی تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی کلاسیکی کتابوں کے ترجمے اسی طرح برابر شائع ہوتے رہیں گے، فاضل اس بات کی طرف پوری توجہ دیں گے کہ سنسکرت کے لفظوں اور ناموں کا املا صحیح طور پر لکھا جائے اور ان پر سارے اعراب بھی لگے ہوئے ہوں۔ ان ترجموں میں کثرت سے نوٹ بھی ہوں گے، تشریحات بھی ہوں گی اور مختلف نسخوں کے مقابلے بھی۔ مختصر یہ کہ ان ترجموں میں ہر چیز ہوگی، اور ہر چیز میں پوری جانفشانی اور توجہ سے کام لیا جائے گا — لیکن اس تصنیف کی روح اس میں موجود نہ ہوگی۔ جو چیز کبھی زندگی اور مسرت کی ترجمان تھی، حسین و جمیل، پُر ترنم، تخیلی جوش سے مملو، وہ اب سپاٹ، فرسودہ اور بے معنی بن کر

رہ جائے گی حسن و شباب سے خالی۔ اس میں محقق کے کمرے کی گرد اور آدھی رات کے دھوئیں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ سنسکرت کب سے ایک مردہ زبان بنی، یعنی لوگوں نے اسے بولنا کب سے چھوڑ دیا۔ کالی داس کے زمانے میں بھی یہ عوام کی زبان نہیں تھی، گو پڑھے لکھے لوگ اسے سارے ہندوستان میں بولتے تھے۔ اس کی یہ حالت صدیوں تک رہی اور اسی حالت میں وہ جنوبی مشرقی ایشیا اور وسط ایشیا کی ہندوستانی نوآبادیوں میں پہنچی۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں کمبوڈیا میں سنسکرت کے ڈرامے ہوتے تھے۔ کچھ رسموں کے موقعوں پر سیام میں اب تک سنسکرت کا استعمال جاری ہے۔ ہندوستان میں بھی سنسکرت نے استحکام اور استقلال کا جو ثبوت دیا وہ حیرت انگیز ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں جب افغان بادشاہوں نے دہلی کے تخت پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں فارسی درباری زبان کی حیثیت سے عام ہوگئی اور رفتہ رفتہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے اسے سنسکرت کے مقابلے میں اپنانا شروع کر دیا۔ ملک کی عام زبانیں بھی رفتہ رفتہ ادبی شکل اختیار کر گئیں۔ اس کے باوجود سنسکرت جاری رہی، گو اس میں اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ۱۹۳۷ء میں ٹریونڈرم میں اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر ایف۔ ایف۔ تھامس نے بتایا تھا کہ قدیم زمانے میں سنسکرت ایک اتحاد آفریں قوت تھی اور اب تک ہندوستان میں اس کا استعمال عام ہے۔ اس موقع پر انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ سنسکرت کی کسی سادہ شکل، یا بنیادی سنسکرت کو ہندوستان کی عام قومی زبان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے اس موقع پر میکس ملر کی ایک رائے پیش کرکے اس کی تائید کی تھی۔ میکس ملر نے کہا ہے کہ "ہندوستان

کے حال اور ماضی میں اتنا عجیب و غریب تسلسل ہے کہ متعدد اور متواتر سماجی انقلابوں، مذہبی اصلاحوں اور بیرونی حملوں کے باوجود، سنسکرت ہی ایک ایسی زبان ہے جو اس وسیع ملک کے تقریباً ہر حصہ میں بولی جاتی ہے ..... آج کل بھی، انگریزی راج اور انگریزی تعلیم کے ایک صدی کے اثرات کے بعد، ہندوستان میں سنسکرت کے سمجھنے والے تعداد میں اس سے زیادہ ہیں، جتنے ڈانٹے کے وقت میں یورپ میں لاطینی کے سمجھنے والے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ ڈانٹے کے زمانے میں یورپ میں لاطینی سمجھنے والوں کی تعداد کتنی تھی، اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ آج کل ہندوستان میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو سنسکرت زبان سمجھتے ہوں۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ سنسکرت سمجھنے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے، اور خاص کر جنوب میں۔ جو لوگ آج کل کی ہند آریائی زبانوں (یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ) میں سے ایک سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اُن کے لئے آسان سنسکرت کا سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ یہاں تک کہ اُردو میں بھی (جو ہند آریائی زبان ہے) تقریباً ۸۰ فی صدی لفظ ایسے ہیں جن کا ماخذ سنسکرت ہے۔ چونکہ سنسکرت اور فارسی میں لفظوں کے مادے تقریباً ایک ہی ہیں، اس لئے یقین کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی خاص لفظ سنسکرت سے نکلا ہے یا فارسی سے۔ یہ حال تو ہند آریائی زبانوں کا ہے۔ لیکن زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جنوب کی دراوڑی زبانوں میں بھی، (جن کی اصل سنسکرت سے بالکل مختلف ہے) کم سے کم آدھے لفظ ایسے ہیں جو سنسکرت سے لئے گئے ہیں یا جن پر سنسکرت کا اثر ہے۔

ڈراموں کے علاوہ، متعدد موضوعوں پر سنسکرت میں تصانیف کا سلسلہ متوسط زمانہ، بلکہ موجودہ زمانے تک جاری رہا۔ بلکہ آج کل بھی کبھی کبھی سنسکرت کی نئی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور کتابوں کے علاوہ رسالے بھی۔ ان کتابوں اور

رسالوں کا معیار اونچا نہیں اور نہ ان سے سنسکرت کے ادب میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔
لیکن تعجب کی بات صرف یہ ہے کہ سنسکرت کا اثر اتنی طویل مدت تک لوگوں کے
دلوں پر قائم رہا۔ کبھی کبھی بعض جلسوں میں سنسکرت ہی میں تقریریں کی جاتی ہیں، گو
ایسے موقعوں پر سامعین کی تعداد محدود اور مخصوص ہوتی ہے۔

سنسکرت کا مسلسل رواج اور استعمال یقینی طور پر جدید ہندوستانی زبانوں کے
معمولی ارتقا میں مُخل ہوا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ان زبانوں کو مبتذل سمجھتے تھے اور
ان کا خیال تھا کہ یہ زبانیں کسی تحقیقی یا عالمانہ تصنیف کے لئے موزوں نہیں۔ اس
کام کے لئے صرف سنسکرت کو اور آگے چل کر فارسی کو موزوں سمجھا جاتا تھا۔ اس
رکاوٹ اور دقت کے باوجود مختلف صوبوں کی زبانیں مستقل شکل اختیار کرتی رہیں،
اور کئی صدیوں کے ارتقا کے بعد وہ ادبی ہو گئیں اور ان کا اپنا مستقل ادب بن گیا۔

ابھی حال ہی میں جب تھائی لینڈ میں کچھ نئی ٹکنکل، سائنٹفک اور سرکاری
اصطلاحوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو بہت سی اصطلاحیں سنسکرت سے لے کر
اپنا لی گئیں۔

پُرانے ہندوستانی "آواز" کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کی نثر
اور نظم دونوں کی تصنیفوں میں ایک خاص طرح کا ترنم اور موسیقیت ہوتی تھی۔ اس
بات کی خاص طور پر کوشش کی جاتی تھی کہ لفظوں کو صحیح مخرج سے ادا کیا جائے اور
اور اس مقصد کے لئے باضابطہ اصول اور قاعدے مقرر تھے۔ یہ چیز اس لئے اور
بھی زیادہ ضروری تھی کہ پُرانے زمانے میں تعلیم زبانی دی جاتی تھی اور لوگوں کو پوری
پوری کتابیں زبانی یاد کرنی پڑتی تھیں اور اس طرح یہ کتابیں ایک نسل سے دوسری
نسل تک پہنچتی تھیں۔ پہلے لفظوں کی آواز کو اہمیت دی جاتی تھی، لیکن اس کے
بعد آواز اور مفہوم میں تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کا نتیجہ بعض موقعوں

پر تو بے حد لطیف اور خوش گوار ہوا اور بعض موقعوں پر بھونڈا، بھدا اور مصنوعی۔ ای۔ ایچ۔ جانسٹن نے اسی چیز کے متعلق لکھا ہے کہ "ہندوستان کے کلاسیکی شاعر لفظوں کی صوتی کیفیت کے بارے میں بے حد حساس ہیں اور اس کی مثال دوسرے ملکوں کے ادب میں مشکل سے ملتی ہے۔ لفظوں کی نازک اور لطیف ترکیب سے بعض دفعہ سننے والے کو ایک ابدی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن بعض مصنف آواز اور مفہوم کی مطابقت کی کوشش اس حد تک کرتے ہیں کہ نزاکت اور لطافت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ شاعروں نے بعض اوقات نظم کی ترکیب و ترتیب میں اس قدر تصنع سے کام لیا ہے کہ اس کا سارا ترنم ختم ہو گیا ہے"[1]

آج کل بھی ویدوں کے جن منتروں اور بھجنوں کو پڑھا جاتا ہے، اُن کے پڑھنے میں پرانے زمانے کے مقرر کیے ہوئے قاعدوں کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے۔

جدید ہندوستانی زبانوں کی اصل سنسکرت ہے اور اس لیے اُنھیں ہند آریائی زبانیں کہتے ہیں۔ ان زبانوں کے نام یہ ہیں: ہندی، اُردو، بنگالی، مرہٹی، گجراتی، اُریا، آسامی، راج شاہی (ہندی کی بدلی ہوئی ایک شکل) پنجابی، سندھی، پشتو، کشمیری۔ دراوڑی زبانیں یہ ہیں: تامل، تلگو، کناری اور ملایالم۔ یہ پندرہ زبانیں مل کر سارے ہندوستان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ہندی، اور اس کی دوسری شکل اُردو، سارے ہندوستان پر پھیلی ہوئی ہے، اور ان علاقوں میں بھی جہاں بولی نہیں جاتی سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] E. H. Johnston's translation of Asvaghosa's Buddhacarita (Lahore 1936.)

ان کے علاوہ کچھ پہاڑی اور جنگلی علاقوں کے رہنے والے اپنے محدود حلقوں میں بعض مقامی اور غیر ترقی یافتہ زبانیں بولتے ہیں۔ اور یہ بات (جو اکثر کہی جاتی ہے) کہ ہندوستان میں پانچ سو یا اس سے بھی زیادہ زبانیں ہیں محض ماہر لسانیات کے تخیل کی پیدا کی ہوئی ہے یا مردم شماری کے کمشنر کے دماغ کا اختراع ہے۔ جس نے مقامی زبانوں کی معمولی معمولی بدلی ہوئی صورتوں یا آسام بنگال کی پہاڑیوں کی ایسی زبانوں کو جنھیں مشکل سے چند سو یا چند ہزار آدمی بولتے ہیں ایک علیحدہ زبان قرار دے دیا ہے۔ یہ سیکڑوں برائے نام زبانیں اصل میں ہندوستان کی مشرقی سرحد اور برما کے مشرقی علاقوں کی مقامی زبانیں ہیں مردم شماری کے محکمے والے جن اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں ان کے مطابق یورپ میں بھی سیکڑوں زبانیں ہیں چنانچہ جرمنی کی مردم شماری میں غالباً ساٹھ زبانیں درج کی گئی تھیں۔

ہندوستان میں زبان کا جو مسئلہ ہے اُسے زبانوں کی اس کثرت اور تنوع سے کوئی تعلق نہیں۔ سارا جھگڑا اور تنازع اصل میں اُردو ہندی تک محدود ہے ― اور یہ اصل میں ایک زبان ہے جس نے دو ادبی شکلیں اور دو رسم الخط اختیار کر لیے ہیں۔ بولنے میں، دونوں میں مشکل سے کوئی فرق ہے۔ لکھنے میں، خاص کر اس وقت جب ادبی اور علمی انداز اختیار کیا جائے، یہ خلیج وسیع ہو جاتی ہے۔ اس بات کی کوشش کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے کہ دونوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ دور ہو جائے اور ایک مشترک زبان بن جائے۔ اس زبان کو عموماً ہندستانی کہا جاتا ہے اور یہ ہندوستان کی عام زبان بنتی جا رہی ہے۔

پشتو، جو ہند آریائی زبانوں میں سے ایک ہے اور جس کا ماخذ سنسکرت ہے، شمالی مغربی صوبہ اور افغانستان کی زبان ہے۔ اس پر فارسی کا اثر، ہماری

ساری زبانوں سے زیادہ پڑا ہے۔ پچھلے زمانے میں اس علاقے میں سنسکرت کے بہت سے مفکر، عالم فاضل اور قواعد داں گذرے ہیں۔

لنکا کی زبان سنگھالی ہے۔ یہ زبان بھی ہند آریائی زبان ہے اور اس کا ماخذ بھی براہِ راست سنسکرت ہے۔ لنکا کے باشندوں نے نہ صرف اپنا مذہب، بودھ مت، ہندوستان سے لیا، بلکہ نسل اور زبان میں بھی وہ ہندوستانیوں سے قریب ہیں۔

یہ بات اب پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ سنسکرت کا رشتہ یورپ کی کلاسیکی اور جدید زبانوں سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ سلافی نسل کی زبانوں کے بہت سے مادے اور مشتقات سنسکرت سے ملتے جُلتے ہیں۔ یورپ کی سب زبانوں میں جو زبان سنسکرت سے سب سے قریب ہے وہ لتھونیا کی زبان ہے۔

۱۰۔ بودھ مت کا فلسفہ

کہا جاتا ہے کہ بُدھ، جس علاقے میں رہتے تھے وہاں کی پراکرت (جس کا ماخذ سنسکرت تھا) یعنی عوام کی زبان استعمال کرتے تھے۔ وہ سنسکرت یقیناً جانتے ہونگے لیکن انھوں نے ہمیشہ عوام کی زبان بولی، تاکہ اس طرح وہ لوگوں کے دلوں تک پہنچ سکیں۔ اسی پراکرت سے وہ پالی زبان نکلی، جس میں بودھ مت کی مذہبی کتابیں ہیں۔ بدھ کے مکالمے، اُن کے حالات اور ان کے مباحث، ان کی وفات کے بہت مدت بعد پالی زبان میں لکھے گئے تھے۔ اور لنکا، برما اور سیام میں، جہاں بودھ مت کی ہن یان صورت رائج ہے، یہی پالی تحریریں مذہب کی بنیادی چیزیں ہیں۔

بدھ کے سیکڑوں برس بعد ہندوستان میں نئے سرے سے سنسکرت کا رواج عام ہوا تو بودھ عالموں نے اپنی مذہبی اور فلسفیانہ کتابیں سنسکرت میں لکھنی

شروع کیں۔ اشوگھوش کی کتابیں اور اُن کے ڈرامے، جو اصل میں بودھ مت کی تبلیغ کے لئے لکھے گئے تھے، سنسکرت ہی میں ہیں۔ ہندوستان کے بودھ عالموں کی یہ سنسکرت کی کتابیں چین، جاپان، تبت اور وسط ایشیا پہنچیں، جہاں بودھ مت کی مہایان صورت رائج تھی۔

جس زمانے میں بدھ پیدا ہوئے، وہ زمانہ ہندوستان میں ذہنی جوش اور فلسفیانہ تجسس کا تھا۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ ساری دنیا میں یہی حالت تھی۔ اسی زمانے میں لاؤزے، کنفیوشس، زرتشت اور فیثا غورث بھی گزرے ہیں۔ مادیت، بھگوت گیتا، بودھ مت، جین مت اور اس کے علاوہ ہندوستانی فکر کے اور بہت سے میلانات جنھوں نے آگے چل کر فکر کے مختلف نظاموں کی شکل اختیار کی اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ فلسفیانہ فکر کی ایک تہ پر دوسری چڑھتی رہی، ایک فکر نے دوسری فکر پیدا کی اور کہیں کہیں یہ مختلف فکریں ایک دوسرے سے دست و گریباں بھی ہوئیں۔ بودھ مت کے فلسفے کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور فکر کے مختلف سلسلے بڑھتے اور پروان چڑھتے رہے۔ خود بودھ مت میں بھی مختلف شاخیں پیدا ہوگئیں اور ان مختلف شاخوں نے فکر کی مختلف نہجوں کی بنیاد ڈالی۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ فلسفیانہ فکر کا انحطاط شروع ہوگیا اور اس کی جگہ متکلمانہ اندازِ نظر اور نزاعی مناظروں اور بحث مباحثوں نے لے لی۔

بدھ نے بار بار اپنے پیرووں کو الٰہیاتی مسائل کی بحثوں میں پڑنے سے منع کیا ہے۔ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "آدمی جس چیز کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اس کے متعلق خاموش رہے۔" اگر انسان کو حق کی تلاش ہے تو وہ اُسے زندگی میں مل سکتا ہے، اُن چیزوں کی بحثوں میں نہیں جو زندگی کے دائرے سے باہر ہیں اور اس لیے انسانی فہم و ادراک سے پرے۔ بدھ زندگی کے اخلاقی پہلو پر

زور دیتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ لوگ الٰہیاتی اور مابعدالطبیعی موشگافیوں میں پڑ کر اخلاقی پہلو سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ بودھ مت کے ابتدائی دور میں کسی حد تک بدھ کے اس عقلی فلسفیانہ نقطۂ نظر اور تجرباتی تحقیق و تجسس کا پرتو موجود ہے۔ تجربے کی دنیا میں "ذات محض" کا تصور محال ہے، اس لیے اس کو ترک کر دیا گیا۔ اسی طرح "خالق مطلق" کے تصور کو بھی جسے منطقی طور پر ثابت کرنا ممکن نہیں۔ پھر بھی تجربہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ایک لحاظ سے حقیقت رکھتا ہے ــــ لیکن ایسی حقیقت جو متحرک ہے اور سیال ہے اور ہمیشہ ایک نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہے۔ اور اس لیے بدھ کی فکر حقیقت کے درمیانی مدارج کی قائل ہے اور انھیں کو بنیاد بنا کر نفسیاتی تجسس شروع کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

بدھ، پرانے عقیدے سے باغی تھے، پھر بھی انھوں نے ہندوستان کے قدیم عقیدے سے پوری طرح قطع تعلق نہیں کیا۔ اس سلسلے میں رہنر ڈیوڈز نے لکھا ہے کہ "گوتم ہندو پیدا ہوئے، ہندو رہ کر پلے بڑھے، ہندو جیے اور ہندو ہی مرے ۔ ۔ ۔ گوتم کی الٰہیات اور اُن کے اصولوں میں زیادہ باتیں ایسی ہیں جو ہندوستان کے قدیم مذہبی نظاموں میں ملتی ہیں۔ اُن کی اخلاقیات کا بہت بڑا حصہ ہندو مت کی کسی نہ کسی کتاب میں پہلے سے موجود ہے۔ گوتم کی جدت یہ نہیں کہ انھوں نے نئی باتیں کہیں۔ اُن کی جدت یہ ہے کہ انھوں نے بار بار کہی ہوئی باتوں کو گھٹا بڑھا کے، ان میں ترمیم کر کے یا ان میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کر کے انھیں نیا کر دیا۔ برابری اور انصاف کے جن اصولوں کو بڑے بڑے ہندو مفکر مانتے چلے آئے تھے انھیں گوتم نے ان کے منطقی نتیجوں تک پہنچایا۔ گوتم کے اور دوسرے مفکروں کے طریقے میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ گوتم نے ہر چیز کو گہرے خلوص اور بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی اور بہبودی کے جذبے سے دیکھا اور

دکھایا ہے۔"[۵۵]

اس کے باوجود بدھ نے اپنے زمانے کے رسمی اور روایتی مذہب کے طریقے کے خلاف بغاوت کا بیج بو دیا۔ لوگوں کو جو اعتراض تھا وہ بدھ کے نظریے یا فلسفے پر نہیں تھا۔۔ اس لئے کہ فکر کا ہر نظریہ، جب تک کہ وہ محض نظریے کی حد تک محدود رکھا جائے، قدیم ہندو عقیدے کی تحت میں آسکتا ہے۔۔ بلکہ انھیں یہ شکایت تھی کہ بدھ نے سماجی نظام میں خلل ڈال دیا۔ مذہب کے پرانے نظام میں فکری حیثیت سے بڑی آزادی اور صد درجے کی لچک تھی اور اس میں ہر فکر کو سمویا جاسکتا تھا، لیکن عمل میں یہ بے حد سخت اور تنگ نظر تھا، اور عمل کے میدان میں ذرا سی آزادی یا بے راہ روی بھی پسند نہیں کی جاتی تھی۔ اور اس لیے 'بودھ مت' کو لازمی طور پر اس پرانے عقیدے سے الگ ہو کر چلنا پڑا۔ بدھ کی وفات کے بعد یہ دوری اور بھی زیادہ بڑھتی گئی۔

بودھ مت کے ابتدائی دور کے انحطاط کے بعد اس کی اس صورت نے جو ہن یان کہلاتی تھی ترقی کرنی شروع کی۔ ہن یان عقیدے کے لوگوں نے بدھ کو دیوتا بنالیا اور ان کی پرستش دیوتا یا خدا کی طرح کرنے لگے۔ شمالی مغربی علاقے میں جو یونانی رہتے تھے انھوں نے بدھ کے مجسمے بھی بناڈالے۔ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان میں 'برہمنیت' اور 'سنسکرت' کے علم وفضل کا احیا شروع ہوا۔ 'ہن یان' اور 'مہایان' عقیدہ والوں میں آپس میں نزاعی بحث مباحثے ہونے

---

[۵۵] یہ اقتباس اور اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں میں نے سر ایس۔ رادھا کرشنن کی کتاب "انڈین فلاسفی" سے لی ہیں۔ (George Allen & Unwin, London, 1940)

لگے اور ان کا سلسلہ آخر زمانے تک برابر جاری رہا یہاں تک کہ ہن یان عقیدہ والے ملک (لنکا، برما اور سیام) چین اور جاپان والوں کے بودھ عقیدے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور یہی رویہ چین اور جاپان والوں کا، لنکا، برما اور سیام کے رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

ہن یان فرقہ، کسی نہ کسی حد تک، بودھ مت کے قدیم عقیدے پر قائم رہا اور اس نے اسے پالی زبان میں ایک جگہ مرتب بھی کرلیا۔ مہایان عقیدہ کے لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور ہر ملک کے طریقوں اور رواجوں کے ساتھ رواداری برتتے اور اپنے آپ کو اس ملک کے مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق بناتے رہے۔ ہندوستان میں اس نے ملک کے عام مذہب سے قریب آنا شروع کردیا۔ اور چین، جاپان اور تبت میں بھی ہر جگہ کے حالات کے مطابق ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ بعض بڑے بڑے بودھ مفکروں نے گوتم بدھ کے اس لاادری نقطۂ نظر کو چھوڑ دیا جو انھوں نے روح کے وجود کے متعلق اختیار کیا تھا، اور کھلم کھلا اس نقطۂ نظر سے انکار کرنے لگے۔ ان بودھ مفکروں کے ستاروں کے جھرمٹ میں 'نگ ارجن' کی شخصیت ایک درخشندہ ستارے کی طرح نمایاں طور پر واضح نظر آتی ہے۔ نگ ارجن کا شمار ان بلند مرتبہ مفکروں میں ہے جن سے ہندوستان کا نام روشن ہے نگارجن کا زمانہ عیسائی عہد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ کنشک کا ہم عصر تھا۔ اسی نے 'مہایان' عقیدوں کی تدوین و ترتیب کی۔ نگ ارجن کے فکر میں حیرت انگیز قوت، جوش اور جسارت ہے۔ اور وہ مختلف چیزوں سے بے باکی کے ساتھ ایسے نتیجے نکال لیتا ہے جو دوسروں کو بظاہر شرمناک اور نفرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے منطقی استدلال میں اتنی سختی اور تندی ہے کہ وہ بعض اوقات اس استدلال کے جوش و خروش میں ایسے نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے جو خود اس کے اپنے معتقدات کی تردید

کر دیتے ہیں۔ "خیال خود اپنا ادراک نہیں کر سکتا اور وہ اپنی حد سے باہر جا کر کسی دوسرے خیال کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔ کائنات سے الگ کوئی خدا نہیں، اور نہ خدا سے الگ کوئی کائنات' دونوں یکساں طور پر ظاہر و موجود ہیں۔" اس طرح استدلال کرتے کرتے وہ ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچ کر کچھ باقی نہیں رہتا، نہ حق و باطل میں کوئی امتیاز رہے، اور نہ کسی چیز کے سمجھنے اور نہ سمجھنے میں کوئی فرق، اس لئے کہ کسی کو 'غیر حقیقی' کے متعلق کوئی غلط فہمی کیسے ہو سکتی ہے؛ کوئی چیز حقیقی نہیں۔ "دنیا کا وجود محض ایک ظاہری چیز ہے۔ یہ صفات اور علائق کا ایک تصوری نظام ہے' جس کے ہم قائل تو ہیں لیکن معقول طریقے سے اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ لیکن ان سارے تجربات کی تہ میں وہ کسی ایسے وجود کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے' جو مطلق ہے' اور ہماری فکر کی حدود سے باہر ہے۔ اس لئے کہ ہمارا موضوع فکر بنتے ہی وہ وجود اضافی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے[۱]۔"

---

[۱] یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کی اکیڈیمی آف سائنز کے پروفیسر Th. Stcherbatsky نے اپنی کتاب 'The conception of Budhist Nirvana' (Leningrad 1927) میں لکھا ہے کہ نگ ارجن کا شمار "دنیا کے بڑے مفکروں" میں ہونا چاہئے۔ وہ اس کے "حیرت انگیز" طرز بیان کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ طرز بیان "دلچسپ ہے' دلیر اور بے باک ہے اور کبھی کبھی گستاخی کی حد تک جسارت آمیز۔" وہ نگ ارجن کے خیالات کا مقابلہ بریڈلے اور ہیگل کے خیالات سے کرتا ہے۔ "نگ ارجن کی تثلیث اور مسٹر بریڈلے کے اس نظریے میں جس کے مطابق وہ ظاہری دنیا کے ہر تصور کو رد کر دیتے ہیں' حیرت انگیز یکسانی نظر آتی ہے — اشیا اور صفات' دنیاوی علائق' زمان و مکان' تغیر' توجیہ' حرکت اور نفس و ذات سب چیزیں مسٹر بریڈلے کے نزدیک قابل رد (دیکھئے صفحہ آئندہ)

بودھ فلسفے میں اکثر اس وجود مطلق کو شُنیتا یا عدم (شُنیہ سنسکرت میں صفر کا مترادف ہے) کہا گیا ہے لیکن یہ تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو ہمارے ذہنوں میں نیستی کے متعلق قائم ہے[1] اپنے تجربے کے محدود دائرے میں اسے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) ہیں۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے بریڈلے کے فلسفے کو بالکل صحیح قسم کا 'مدھیہ میکا' کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس یکسانی سے بھی زیادہ یکسانی اور مشابہت ہمیں ہیگل کے منطقی طریقے اور ناگ ارجن کے طرز استدلال میں نظر آتی ہے۔

Stcherbatsky نے بودھ مت کے فلسفے اور جدید سائنس کے نظریوں میں بھی بعض مشابہتوں کا ذکر کیا ہے ـــ خاص کر 'ناکارگی' کے طبیعیاتی قانون کے مطابق کائنات کی جو آخری صورت ہوگی وہ اس تصور سے ملتی جلتی ہے جو بودھ مت کے فلسفے نے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں Stcherbatsky نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ U. S. S. R. کے صوبہ ٹرانس بائی کیلیا میں بیورٹیس کے مقام پر ایک نئے جمہوریہ کی بنیاد ڈالی گئی تو وہاں کے محکمۂ تعلیم کے ارباب حل وعقد نے مذہب کے خلاف ایک تحریک شروع کی اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جدید سائنس کائنات کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اس جمہوریہ میں جو 'مہایان' عقیدہ کے بودھ راہب رہتے تھے انھوں نے اس تحریک کے جواب میں ایک رسالہ نکالا اور اس میں اس بات پر زور دیا کہ بودھ مت والے سائنس کی واقفیت کے بغیر بھی مادیت سے ناآشنا نہیں ہیں بلکہ ان کے مذہب کی ایک جماعت نے ایک مادی فلسفے کو نشو ونما دی ہے۔

[1] پروفیسر Stcherbatsky نے بودھ مت کے متعلق مختلف زبانوں کے اصلی ماخذوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس لئے اس موضوع پر اُن کی رائے سب سے مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'شُنیتا' کا مفہوم وہی ہے جو اضافیت کا۔ دنیا کی ہر شے اضافی اور دوسری چیزوں پر

'عدم' کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے نہیں لیکن الہیاتی زبان میں اس کا مفہوم ایک ایسی شے ہے جو ادراک سے ماورا ہو اور محیطِ کل۔ ایک مشہور بودھ فاضل نے کہا ہے کہ "شنیتا ہی کی بدولت ہر چیز ممکن ہوتی ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی چیز ممکن نہیں۔"

ان سب باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الہیاتی یا بعد الطبیعی فکر ہماری کس حد تک رہبری کر سکتی ہے، اور بودھ کتنے صاحب بصیرت تھے کہ انھوں نے اس طرح کی قیاس آرائیوں کے خلاف سخت تنبیہ کی ہے۔ لیکن انسانی ذہن اپنے آپ کو مقید نہیں کرنا چاہتا اور ہمیشہ علم کے اس منتہا تک پہنچنا چاہتا ہے جس کے متعلق اُسے یقین ہے کہ وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بودھ فلسفے میں الہیات اور مابعد الطبیعیات کو جگہ دی گئی ہے لیکن ان مسائل کے حل کرنے کا انداز نفسیاتی ہے۔ ایک دوسری چیز جو انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے وہ ذہن کی نفسیاتی کیفیتوں کے متعلق بدھ کی گہری بصیرت ہے۔ جدید نفسیات میں انسان کے تحت الشعور کی جو بحث ہے، بدھ کے ذہن میں وہ بالکل واضح ہے اور اس کے متعلق جو بحثیں کی گئی ہیں اُن سے انتہائی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ ان پرانی تدبیروں میں سے ایک عجیب و غریب ٹکڑا مجھے دکھایا گیا ہے۔ اس ٹکڑے کو دیکھ کر انسان کے

منحصر ہے اس لئے وہ بجائے خود مطلق نہیں۔ اس لئے وہ 'شنیہ' (یا صفر) ہے۔ لیکن اس ظاہری دنیا سے پرے لیکن اس کا احاطہ کئے ہوئے بھی ایک شے ہے اور اسے ہم مطلق کہہ سکتے ہیں۔ ہم اس کا تصور یا اس کی تشریح دنیاوی یا محدود اصطلاحوں میں نہیں کر سکتے اور اس لئے اسے 'شنیتا' کہتے ہیں (جس کا مفہوم ہے ایسا یا ویسا ہونا) اس مطلق کو شنیتا بھی کہتے ہیں۔

ذہن میں فوراً نئی نفسیات کے نظریے عقدۂ اوڈیپس (Oedipus Complex) کا تصور آجاتا ہے۔ گو بدھ نے اس نفسیاتی نظریے کو بالکل مختلف انداز سے دیکھا ہے۔[۱]

بودھ مت میں فلسفے کے چار مستقل سلسلے پیدا ہوگئے۔ ان میں سے دو سلسلوں کا تعلق اس کی ہن یان شاخ سے تھا اور دو کا مہایان شاخ سے۔ فلسفے کے ان چار سلسلوں کی ابتدا اپنشدوں سے ہوئی۔ لیکن یہ سلسلے ویدوں کی سند کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ ویدوں کی سند سے انکار ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے فلسفے کے ان سلسلوں اور فلسفے کے اُن ہندو نظاموں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے، جو تقریباً اسی زمانے میں شروع ہوکر رائج ہوتے جا رہے تھے۔ فلسفے کے یہ ہندو نظام، اگرچہ عام طور پر ویدوں کو تسلیم کرتے ہیں اور ایک لحاظ سے ان کے پیرو ہیں، لیکن اُنھیں خطا سے بری نہیں جانتے۔ اس لئے کبھی کبھی ان فلسفوں نے ویدوں کے اثر سے الگ ہوکر اپنی اپنی راہیں اختیار کی ہیں۔ چونکہ وید اور اپنشد بہت سے افکار کا مجموعہ ہیں، اس لئے بعد کے مفکروں کو ان میں تاویلیں کرنے کے بہت موقعے ملے اور ان میں سے ہر ایک نے

---

[۱] یہ ٹکڑا وسبندھو کی کتاب 'ابھی دھرم کوش' میں ہے۔ یہ کتاب پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں لکھی گئی تھی اور اس میں سارے قدیم نظریوں اور روایتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی۔ وہ اب ناپید ہے۔ لیکن اس کے ترجمے چینی اور تبتی زبانوں میں موجود ہیں۔ چینی ترجمہ ہندوستان کے مشہور چینی سیاح یوئین چوانگ کا کیا ہوا ہے۔ اس چینی ترجمے کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا ہے (پیرس — لووین ۱۹۲۶ء) اچاریہ نریندر دیو، جو جیل میں میرے ساتھی ہیں اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی سے ہندی اور انگریزی میں کر رہے ہیں انھوں نے اس کتاب کا یہ ٹکڑا مجھے دکھایا۔ یہ ٹکڑا کتاب کے تیسرے باب میں ہے۔

اپنی اپنی پسند کے مطابق بعض پہلوؤں پر کم اور بعض پر زیادہ زور دیا، اور انھیں کی بنیادوں پر اپنے نظامِ فکر کی بنیاد ڈالی۔

پروفیسر رادھا کرشنن نے بودھ فکر کے منطقی انداز کے چار سلسلوں کی تشریح اس طرح کی ہے۔ اس کی ابتدا ایک طرح کی ثنوی الٰہیات سے ہوئی، جس میں علم کو اشیا کے براہِ راست احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگلی منزل میں، خیالات کو حقیقت کے ادراک کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور اس طرح ذہن اور اشیاء کے درمیان ایک طرح کا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ فکر کی یہ دونوں منزلیں ہن یان شاخ کے فلسفے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مہایان فلسفہ ایک منزل اور آگے بڑھا، اس نے ان اشیا کے وجود سے انکار کر دیا جن پر تصورات مبنی ہیں۔ اس نے تجربے کو محض تصورات کے سلسلے کی ایک زنجیر قرار دیا۔ اس فکر میں اضافیت اور نفس تحت الشعور کے تصورات شامل ہو گئے۔ آخری منزل ناگ ارجن کا 'مدھیہ میکا' یا 'درمیانی راہ' کا فلسفہ ہے جنہیں ذہن بھی تحلیل ہو کر خیال بن جاتا ہے، اور ہمارے پاس خیالات اور تصورات کی غیر یقینی شکلوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، اور ہم اُن کے متعلق کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

اور اس طرح اس فکر کی آخری منزل میں ہم عدم تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ 'عدم' ایسی چیز ہے جس کا تصور انسان کے محدود ذہن کے لیے ممکن نہیں اور اسی لیے اس کی تشریح کی جاسکتی ہے نہ تعریف۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک قسم کا شعور یا 'وجین' ہے۔

گو نفسیاتی اور الٰہیاتی تجزیہ کے مطابق غیر مرئی دنیا یا 'وجودِ مطلق' کا تصور محض شعور کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یا اس کی ہستی نیست کی مترادف بن جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہماری محدود دنیا میں اخلاقی

علائق ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اپنی ذاتی زندگی میں اور دوسروں کے تعلقات میں اخلاق کا پابند رہنا اور اچھی زندگی گذارنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس زندگی اور عناصر کی اس دنیا میں ہم عقل، علم اور تجربے سے کام لے سکتے ہیں اور ہمیں ان چیزوں سے کام لینا چاہئے۔ 'غیر محدود' یا 'وجود مطلق' ہم اسے خواہ کسی نام سے بھی پکاریں، ان علائق سے ماورا ہے اور اس لئے اس کے معاملے میں ہم عقل، علم اور تجربہ کی مدد نہیں لے سکتے۔

۱۱۔ بودھ مت کا اثر ہندو مت پر

بدھ کی تعلیم کا اثر پرانے آریائی مذہب اور عوام کے عقائد پر کیا پڑا؟ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس تعلیم نے ملک کی مذہبی اور قومی زندگی پر زبردست اور مستقل اثرات ڈالے۔ شاید بدھ نے اپنے متعلق کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال رہے ہیں، وہ تو غالباً اپنے آپ کو صرف مصلح سمجھتے تھے لیکن اُن کی پرکشش شخصیت اور اس پُر تاثیر پیغام نے جو اس وقت کے بہت سے سماجی اور مذہبی رسوم کا مخالف تھا، لوگوں میں پروہتی نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بدھ نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ موجودہ سماجی اور معاشی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے اس نظام کی بنیادی باتوں کو صحیح جان کر صرف ان خرابیوں کو بُرا کہا جو اس کے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ اُن کے اس جذبے نے قدرتی طور پر انھیں ایک سماجی باغی کی حیثیت دے دی۔ چونکہ برہمن موجودہ نظام کو جاری رکھنے کے خواہش مند تھے اس لئے لازمی طور پر ان کے دل میں بدھ کی طرف سے غصے کی آگ بھڑک اٹھی، حالانکہ بدھ کی تعلیم میں ایک بات بھی ایسی نہیں جسے وسعتِ نظر سے کام لے کر ہندو فکر میں آسانی

سے نہ مویا جا سکے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ یہاں برہمنوں کے اقتدار کو خطرہ تھا اور وہ اسے کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے۔

یہ بات غور کرنے کی ہے کہ بودھ مت نے سب سے پہلے مگدھ میں اپنے قدم جمائے۔ مگدھ شمالی ہند کا وہ حصہ ہے جہاں برہمنوں کا اثر بہت کم تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے مغرب اور شمال کی طرف پھیلنا شروع کیا اور بہت سے برہمن بھی اس میں شامل ہو گئے۔ شروع شروع میں بودھ مت کی تحریک چھتریوں کی تحریک تھی جس میں عوام کی کشش کے لئے بھی بہت سی باتیں موجود تھیں۔ آگے چل کر اس نے جو فلسفیانہ اور الہیاتی راہ اختیار کی وہ غالباً برہمنوں کے اس تحریک میں شامل ہونے کا اثر اور نتیجہ تھا۔ یا ممکن ہے اس کی خاص وجہ یہ ہو کہ بودھ مت کی 'مہایان' شاخ نے بودھ برہمنوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا اور اپنے آپ کو آریا عقیدہ کی مختلف مروجہ صورتوں کے مطابق ڈھال لیا اور ان دونوں چیزوں سے اس میں فلسفیانہ اور الہیاتی عناصر پیدا ہو گئے۔

بودھ مت نے ہندوستانی زندگی کو بھی سیکڑوں طریقوں سے متاثر کیا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ یہ مذہب اپنی پوری قوت اور زندگی کے ساتھ ایک ہزار برس سے بھی زیادہ زمانے تک سارے ہندوستان میں پھیلا رہا۔ اس طویل مدت میں جب ہندوستان میں اس کا انحطاط ہو رہا تھا، بودھ مت کے بہت سے عناصر ہندو مذہب اور ہندوستانی زندگی اور فکر میں جذب ہو چلے تھے۔ گو لوگوں نے مذہب کی حیثیت سے بودھ مت کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا لیکن اس کے گہرے اور مستقل نقوش نے قومی زندگی کے ارتقا پر زبردست اثرات ڈالے۔ اس مستقل اثر کا تعلق فلسفیانہ نظریوں یا مذہبی عقائد سے ذرا بھی نہیں تھا۔ اصل میں بودھ کے فلسفے اور ان کے مذہبی آدرشوں کے اخلاقی، سماجی اور عملی پہلوؤں نے

لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا اور اُن کی زندگیوں پر غیر فانی نقوش چھوڑے۔ بالکل اسی طرح جیسے عیسائیت کے اخلاقی آدرشوں نے یورپ کو متاثر کیا، اور اسلام کے اسلامی، معاشی اور عملی نقطۂ نظر نے ان لوگوں پر بھی اپنے اثرات ڈالے جو اس کے مذہبی رسوم اور عقائد کے پابند نہیں تھے۔

ہندوستان کا آریائی مذہب بنیادی طور پر ایک قومی مذہب تھا اور اسی خاص ملک کے لئے مخصوص اور محدود۔ چنانچہ اس کے معاشی مذہبی نظام میں بھی اسی قومی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ اس مذہب میں نہ تبلیغ کی مہمیں تھیں، نہ دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کی کوششیں، اور نہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں کو تسخیر کرنے کا خیال۔ یہ اپنے خاموش اور غیر ارادی انداز میں ہندوستان ہی میں پلتا بڑھتا اور نئے آنے والوں اور پرانے رہنے والوں کو اپنے حلقے میں داخل کرتا رہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ رفتہ رفتہ نئی ذاتیں اور نئی جماعتیں بھی بنتی رہیں۔ بیرونی دنیا کی طرف سے بے نیازی اس زمانے میں کچھ قدرتی سی تھی، اس لئے کہ آمد و رفت کے ذرائع کم بھی تھے اور دشوار بھی اور اس لئے بیرونی ملکوں سے ربط ضبط کے موقع بھی نایید تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تجارت کے سلسلے میں اس طرح کے تعلقات عام تھے لیکن ان تعلقات سے ہندوستان کی زندگی اور اس کے طریقوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہندوستانی زندگی کا سمندر بجائے خود مکمل تھا اور اس قدر وسیع کہ اس کے مختلف دھارے اپنی اپنی جگہ پوری آزادی کے ساتھ بہتے تھے۔ وہ خود اپنی ہستی کے شعور میں مگن تھا اور باہر کی دنیا سے بے خبر اور بے نیاز۔ اس گہرے اتھاہ سمندر کے سینے سے ایک نیا چشمہ پھوٹا — تازے اور شفاف پانی کا چشمہ، جس نے سمندر کی خاموش اور وسیع سطح پر ایک ایک ہلچل پیدا کر دی اور خود انسان اور قدرت کی بنائی ہوئی ساری حدوں اور رکاوٹوں کو چیرتا پھاڑتا بہت دور نکل گیا۔ گوتم بدھ کی تعلیم کے اس چشمہ کا رخ قوم کی طرف

تھا، لیکن اس کی نظر قوم کی حدوں سے بھی آگے بہت دور تک دیکھ رہی تھی۔ یہ نیک اور سچی زندگی کی ایک پکار تھی — اور یہ پکار ذات پات، ملک اور قوم کی رکاوٹوں کی قائل نہ تھی۔

اس زمانے کے ہندوستان کے لئے یہ طرز خیال بالکل نیا تھا۔ اشوک پہلا شخص تھا جس نے بدھ کی تعلیم پر وسیع پیمانے پر عمل کیا، اور اس نے دوسرے ملکوں کو تبلیغی سفیر بھیجے۔ ہندوستان کو پہلی مرتبہ دنیا کے وجود کا احساس ہوا، اور غالباً یہی احساس تھا جس کی بنا پر شروع کی عیسوی صدیوں میں ہندوستان نے بڑے پیمانے پر نوآبادیاں بسانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ہندو بادشاہوں نے سمندر کے رستے سے لوگوں کو ادھر اُدھر بھیجا اور اس طرح رفتہ رفتہ برہمنی مذہب اور آریائی تہذیب کے ہندوستان سے باہر جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک ایسی تہذیب کے لئے جس کا دائرہ اپنے ملک تک محدود تھا اور جس نے لوگوں کو ذاتوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے الگ کر دیا، یہ ایک عجیب بات تھی اس لئے اس سے اس کے بنیادی تصورات میں فرق پیدا ہونے لگا۔ تصورات کا بنیادی فرق کچھ بودھ مت کے اثر سے پیدا ہوا اور کچھ ان بیرونی تعلقات اور روابط سے۔ ہندومت میں اس سے پہلے بھی حد سے زیادہ زندگی اور قوتِ نمو تھی، لیکن اس سے پہلے اس نے کبھی بیرونی ممالک کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اب اس نئے مذہب کی ہمہ گیری نے اس کی قوت میں اور بھی اضافہ کیا اور یہی قوت اسے دور دراز ملکوں میں لے گئی۔

بہت سی رسوم اور جانوروں کی قربانیاں جو ویدک دھرم کے ساتھ وابستہ تھیں بالکل ختم ہو گئیں۔ "اہنسا" کا تصور ویدوں اور اپنشدوں میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ بودھ مت نے اس پر اور زیادہ زور دیا اور جین مت نے اس سے بھی زیادہ۔ لوگوں کی نظر میں زندگی کی عزت بڑھ گئی اور وہ جانوروں سے شفقت اور مہربانی سے پیش

آنے لگے۔ ان سب نیک کاموں کی تہ میں، زندگی کو بہتر اور بلند تر بنانے کا جذبہ کارفرما تھا۔

بدھ زہدِ خشک اور ترکِ لذات کی اخلاقی اہمیت کے مخالف تھے۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی تعلیم انسان میں زندگی کی طرف سے یاس کا جذبہ پیدا کر دیتی تھی۔ خاص کر ہن یان، عقیدے کے لوگوں کا نقطۂ نظر یہی تھا اور اس سے بھی زیادہ جین مت کا۔ اس تعلیم میں آخرت پرستی پر زیادہ زور تھا اور یہ انسان کو دنیا سے بھاگنے اور اس کے بارے نجات حاصل کرنے کی طرف مائل کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے تجرد اور نباتی مشرب کو فروغ ہوا۔ یہ سارے خیالات ہندوستان میں بدھ سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ان کو اس طرح سے اہمیت کبھی نہیں دی گئی تھی۔ پرانا آریائی آدرش زندگی کی ہمہ گیری پر زور دیتا تھا۔ صرف طالب علمی کا زمانہ پرہیزگاری اور ضبطِ نفس کا زمانہ سمجھا جاتا تھا؛ اور گرہست، زندگی کی ساری سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ لیتا تھا اور اس میں جنسی تعلقات بھی شامل تھے۔ تیسری منزل میں انسان رفتہ رفتہ زندگی کی دلچسپیوں کو چھوڑ کر قومی خدمت اور تکمیلِ نفس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ صرف زندگی کے آخری دور میں، انسان بڈھا ہو جاتا تھا تو زندگی کے سارے علائق سے الگ ہو کر سنیاس کی زندگی بسر کرتا تھا۔

پرانے زمانہ میں، جن لوگوں کو رہبانی زندگی سے دلچسپی ہوتی تھی وہ جنگلوں میں جا کر اپنے گھر بنا لیتے تھے اور ان کے گرد طالب علموں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا لیکن بودھ مت کے شروع ہوتے ہی جا بجا بڑی بڑی خانقاہیں قائم ہو گئیں اور ان خانقاہوں کے اردگرد اچھی خاصی بستیاں بسنے لگیں۔ آجکل جس صوبے کا نام بہار ہے، وہ بھی اصل میں "وہار" کے لفظ سے بنا ہے، جس کے معنی خانقاہ کے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقے میں کتنی کثرت سے خانقاہیں ہوں گی۔ یہ

خانقاہیں درسگاہیں ہوتی تھیں اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے ملحق ہوتی تھیں۔

صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ سارے وسط ایشیا بھر میں کثیر تعداد میں بڑی بڑی خانقاہیں تھیں اسی طرح کی ایک خانقاہ بلخ میں تھی جس میں ایک ہزار راہب رہتے تھے۔ اس خانقاہ کو 'نو وہار' یا نئی خانقاہ کہتے تھے اور اسی لفظ کو فارسی میں بدل کر 'نوبہار' کرلیا گیا تھا۔

بودھ مت چین، جاپان اور برما وغیرہ میں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ پھلا پھولا اور ان ملکوں میں اس کا اثر بھی زیادہ عرصے تک رہا۔ پھر سوال یہ ہے کہ آخرت پرستی کا جذبہ ان ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں کیوں زیادہ پیدا ہوا؟ مجھے اس کی صحیح وجہ معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ملک کی قومی روایات میں اتنی قوت تھی کہ انھوں نے مذہب کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا، مثلاً چین کے پاس وہ قومی روایات جو اُسے کنفوشس، لاؤتسے اور بعض دوسرے فلسفیوں کے افکار سے حاصل ہوئی تھیں۔ پھر ایک دوسری یا شاید یہ بھی تھی کہ چین اور جاپان نے بودھ مت کی مہایان شاخ کو اختیار کیا تھا اور یہ ہن یان کے مقابلے میں کم یاس پسند تھی۔ ہندوستان پر جین مت کا بھی خاصا اثر پڑا، جو سارے فلسفوں سے زیادہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔

لیکن بودھ مت نے ہندوستان اور اس کے سماجی نظام پر ایک ایسا عجیب وغریب اثر ڈالا جو اس کے اندازِ نظر اور فکر سے بالکل مختلف اور متضاد تھا۔ یہ اثر ذات پات سے متعلق تھا۔ بودھ مت ذات پات کے نظام کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کے بنیادی اصول کا مخالف نہیں تھا۔

بدھ کے زمانے میں ہندوستان کے ذات پات کے نظام میں خاصی لچک تھی اور اس میں وہ سختی اور کٹرپن نہیں پیدا ہوا تھا جو بعد کے زمانوں میں نظر آتا

ہے۔ نسل اور پیدائش سے کہیں زیادہ اہمیت انسان کی ذاتی قابلیت، اُس کے کردار اور پیشے کو دی جاتی تھی۔ بدھ نے اکثر برہمن کا لفظ قابل، مخلص اور باضابطہ انسان کے لیے استعمال کیا ہے۔ چھندگاں اُپنسد میں ایک کہانی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ذات پات اور جنس کے رشتے کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

یہ کہانی ستیہ کام نامی ایک شخص کی ہے، جس کی ماں کا نام جبالا تھا۔ ستیہ کام گوتم نامی ایک (بدھ نہیں) بزرگ کا مرید ہونا چاہتا تھا۔ جب وہ اس ارادے سے گھر سے چلنے لگا تو اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ "ماں! میرا گوتر (خاندان یا نسل) کیا ہے؟" اس کی ماں نے جواب دیا "اپنی جوانی کے زمانے میں جب میں گھر میں لونڈیوں کی طرح کام کرتی پھرتی تھی، تم میرے پیٹ میں آگئے اور مجھے معلوم نہیں کہ تم کس خاندان کے ہو۔ میرا نام جبالا تھا اور تم ستیہ کام ہو۔ اس لئے تم کہہ سکتے ہو کہ تم 'ستیہ کام جبالا' ہو یعنی ستیہ کام' جبالا کا بیٹا۔"

اس کے بعد ستیہ کام اس فقیر کے پاس گیا اور فقیر نے اُس سے اس کا خاندان پوچھا۔ اس نے وہی جواب دے دیا جو اپنی ماں سے سُن کر آیا تھا۔ یہ سن کر فقیر نے کہا "سچے برہمن کے سوا اور کوئی اتنی سچی بات نہیں کہہ سکتا۔ جاؤ، بیٹے، لکڑیاں چن لاؤ۔ میں تمھیں اپنا شاگرد بنا دُوں گا۔ تم سچ سے نہیں ہٹے۔"

غالباً بدھ کے زمانے تک صرف برہمنوں ہی کی ذات ایسی تھی جو ذات کے معاملے میں سخت اور کٹر تھی۔ چھتریوں، یا حاکم جماعت کو اپنی ذات اور اُس کی روایتوں پر ناز تھا، لیکن ان کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے یا جماعت کے لئے کھلا ہوا تھا جو حاکموں کے زمرے میں آجائے۔ باقی لوگ ویش یا کسان تھے اور کسانی کو ایک باعزت پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کچھ اور پیشے ور ذاتیں بھی تھیں۔ معلوم

ہوتا ہے کہ نیچ ذات کے لوگ یا اچھوت بہت کم تعداد میں تھے اور اس میں صرف وہ لوگ شامل تھے جو جنگلوں میں رہتے تھے یا جو مُردوں کو اٹھانے اور جلاتے تھے۔

جین مت اور بودھ مت نے اہنسا پر زور دیا تو کسانی کا پیشہ بھی نیچ پیشہ سمجھا جانے لگا اس لئے کہ زمین جوتنے میں بہت سی جانیں چلی جاتی تھیں۔ اور یہ پیشہ، جس پر ہند آریائی ناز کرتے تھے، ملک کے کچھ حصوں میں لوگوں کی نظر سے گر گیا۔ اور زندگی میں کاشتکاری کی اتنی اہمیت ہونے کے باوجود، کاشتکار کو سماجی نظام کی سیڑھی میں بہت نیچی جگہ ملی۔

اور اس طرح جس بودھ مت نے پروہتوں اور مذہب کی بہت سی رسموں کے خلاف صرف اس لئے بغاوت کی تھی کہ ان سے کچھ انسانوں کا مرتبہ زندگی میں گھٹ جاتا ہے اور انھیں اپنی زندگی کو بلند بنانے کے موقعے حاصل نہیں رہتے، وہ غیر ارادی طور پر کسانوں کی ایک بڑی جماعت کی تذلیل کا باعث بن گیا۔ بودھ مت کو اس کا ذمہ دار قرار دینا غلطی ہے اس لئے کہ اس کا یہ اثر ہندوستان کے علاوہ اور کہیں نہیں ہوا۔ ہندوستان کے ذات پات کے نظام ہی میں بنیادی طور پر کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اس نے یہ شکل اختیار کی۔ اہنسا، جین مت کا محبوب عقیدہ تھا اس لئے اس نے ذات کے اس تصور کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ اور بودھ مت اس معاملے میں جین مت کا شریک اور مددگار رہا۔

۱۲۔ بودھ مت ہندو دھرم میں گھل مل گیا

آٹھ یا نو سال ہوئے جب میں پیرس میں تھا آندرے مالرو نے گفتگو شروع کرتے ہی مجھ سے ایک عجیب سوال کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کونسی چیز تھی جس کی مدد سے ہندو دھرم نے ہزاروں سال کے منظم بدھ مذہب کو بغیر کسی جدو

جد کے ہندوستان سے نکال باہر کیا؟ اور بغیر خوں ریز مذہبی جنگوں کے ہندو دھرم کے لیے یہ بات کیسے ممکن ہوئی کہ اس نے ایک مقبول عام مذہب کو اپنے اندر جذب کرلیا؟ ہندو دھرم میں کونسی ایسی اندرونی قوت اور طاقت تھی جس کے زور پر اُس نے یہ حیرت انگیز کام انجام دیا؟ اور کیا ہندوستان میں اب بھی وہی قوت اور زور باقی ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ یقیناً اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور عظمت حاصل کرلے گا۔

اس سوال میں کوئی عجیب وغریب بات نہیں تھی۔ ایک فرانسیسی مفکر کے لئے جو ردعمل بھی ہو یہ سوال عین اس کی فطرت کے مطابق تھا۔ لیکن یورپ اور امریکا میں کتنے آدمی ہوں گے جن کے دلوں میں اس طرح کے سوال پیدا ہوتے ہونگے؟ ان کے ذہن پر تو موجودہ زندگی کے مسائل اس طرح مسلط ہیں کہ انھیں اس کی فرصت نہیں۔ ان مسائل سے مالرو بھی بے خبر اور غافل نہیں تھا لیکن اس کا زبردست اور تخلیقی ذہن ہر جگہ روشنی کا جویا رہتا تھا — خواہ یہ روشنی کہیں بھی ملے، حال میں، ماضی میں، خیال میں، گفتگو میں، تحریر میں یا ان سب سے زیادہ عمل میں، زندگی اور موت کے کھیل میں۔

مالرو کے لئے یہ سوال غالباً محض علمی سوال یا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ سوال اُس کے ذہن اور فکر پر چھایا ہوا تھا اور اسی لئے جوں ہی میری اس کی ملاقات ہوئی، اس نے پوری بے باکی سے یہ سوال مجھ سے پوچھ لیا۔ یہ سوال ایسا تھا جو خود میرے دل کے گوشوں سے نکلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح کے سوال میں بھی اکثر اپنے آپ سے کیا کرتا تھا لیکن جو سوال مالرو نے مجھ سے کیا اس کا میرے پاس کوئی ایسا جواب نہ تھا جس سے میں اُسے یا خود اپنے آپ کو مطمئن کرسکوں۔ یوں تو اس کے بہت سے جواب ہیں اور بہت سی تاویلیں ہیں۔ لیکن ان سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

تاریخی واقعات سے کم از کم یہ بات تو ظاہر ہے کہ بودھ مت کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے لڑائیاں نہیں لڑی گئیں۔ کبھی کبھی کسی ہندو حکمراں یا بودھ سنگھ (راہبوں کی جمعیت) میں مقامی طور پر کچھ اختلافات اور جھگڑے البتہ ہو جاتے تھے۔ یہ اختلافات عموماً کسی سیاسی بنا پر ہوتے تھے اور ان کا اثر وقتی یا فروعی ہوتا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بودھ مت اور ہندو دھرم کی تاریخ میں ایسا زمانہ کوئی بھی نہیں ہوا جس میں بودھ مت نے ہندو دھرم کے اثر کو بالکل ختم کر دیا ہو۔ جس زمانے میں بودھ مت اپنے پورے عروج پر تھا اُس زمانے میں بھی ہندو دھرم سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بودھ مذہب ہندوستان میں فطری موت مرا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنا روپ بدل کر اور کچھ بن گیا۔ کیتھ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہندوستان میں اس کی حیرت انگیز صلاحیت ہے کہ جو کچھ کسی دوسرے سے لیتا ہے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔" اگر یہ بات ان چیزوں کے متعلق صحیح ہو سکتی ہے جو ہندوستان نے دوسرے ملکوں سے لیں یا دوسرے ذرائع سے اس کے پاس پہنچیں، تو اُن چیزوں پر اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جو خود اس کے اپنے ذہن اور فکر کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ صرف یہی نہیں کہ بودھ مت ہندوستان کی پیداوار تھا، بلکہ اس کا فلسفہ بھی عام ہندوستانی فکر اور ویدانت کے فلسفے سے ملتا جلتا تھا بلکہ اپنشدوں نے تو پروہتی اور رسوم کے طریقوں کو برا کہنے کے علاوہ ذات پات کی اہمیت کو بھی بہت کم کرنے کی کوشش کی ہے

برہمنیت اور بودھ مت اپنے اصولی اختلاف اور نزاع کے باوجود برابر ایک دوسرے سے قریب تر آتے گئے — فلسفے میں بھی اور عام عقائد میں بھی۔ خاص کر بودھ مت کی "مہایان" شاخ تو برہمنی نظام اور طریقوں

سے بہت زیادہ قریب تھی۔ اور اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنے اخلاقی عقائد پر قائم رہ کر اپنے آپ کو ہر سانچے میں ڈھال سکے۔ برہمنیت نے بدھ کو 'اوتار' بنا دیا۔ بودھ مت نے بھی یہی کیا۔ یہی وجہ تھی کہ 'مہایان' عقیدہ رفتہ رفتہ بہت زیادہ پھیل گیا لیکن جوں جوں یہ زیادہ پھیلتا گیا اس کی امتیازی خصوصیت ختم ہوتی گئی۔ راہبوں کے سنگھ بہت دولت مند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے۔ ان میں ضبط اور قاعدہ بالکل باقی نہ رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے۔ اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا باقاعدہ تنزل شروع ہو گیا۔ اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسٹر رہز ڈیوڈز نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے "ان مریضانہ تخیلات کے گہرے سایے میں آکر، گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے۔ ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا۔ اس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ اور ہر نئے قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا یہاں تک کہ ساری فضا میں ذہن کی ان پر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الٰہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔"[1]

یہی بات ان "مریضانہ تخیلات" اور "ذہن کی اُن پر فریب تخلیقوں" کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن میں برہمنیت اور اُس کی شاخیں اس وقت مبتلا تھیں۔

بودھ مت ہندوستان میں اس وقت شروع ہوا جب یہاں سماجی اور روحانی احیا اور اصلاح کا دور دورہ تھا۔ اس نے لوگوں میں زندگی کی ایک نئی

---

[1] رادھاکرشنن کی کتاب "انڈین فلاسفی" سے اقتباس۔

روح پھونک دی۔ اس نے عوام میں نئی قوتوں اور صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا اور اُن کے لئے قیادت کی نئی راہیں کھول دیں۔ اشوک کی سرپرستی میں یہ مذہب تیزی سے پھیلنا شروع ہوا اور سارے ہندوستان پر چھا گیا۔ اُس نے ہندوستان سے باہر بھی قدم نکالے اور اس کے بعد سے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بودھ عالموں کی آمد و رفت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ اور جب بدھ کے تقریباً ایک ہزار سال بعد پانچویں صدی عیسوی میں چینی سیاح فاہیان ہندوستان آیا تو اس نے دیکھا کہ بودھ مت کو ہندوستان میں بڑا فروغ حاصل تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مشہور سیاح یوئین چوانگ ہندوستان آیا تو اس نے بودھ مت میں انحطاط کے آثار دیکھے۔ گو اس زمانے میں بھی بعض علاقوں میں اس کا خاصا دور دورہ تھا۔ بودھ مفکروں اور راہبوں کی ایک بڑی تعداد رفتہ رفتہ ہندوستان سے چین منتقل ہو گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں گپت شہنشاہوں کے عہد میں برہمنیت نے اور ہندو تہذیب نے نیا جنم لیا۔ اس نشاۃ ثانیہ میں بودھ مت کی مخالفت کا کوئی جذبہ شامل نہیں تھا لیکن اس نے برہمنیت کی قوت کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ ایک لحاظ سے یہ بودھ مت کی آخرت پرستی کے خلاف ردعمل تھا۔ گپت شہنشاہی کے آخری دور میں ہن قوم کے حملوں نے حکومت کو تہذیب و تمدن کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دی۔ اور گو آخر میں ان بادشاہوں نے ہن قوم کو ہندوستان سے باہر نکال دیا لیکن ملک کی قوت کم ہو چکی تھی اور انحطاط کا سایہ اس کے سر پہ منڈلانے لگا تھا۔ اس کے بعد کئی دور ایسے آئے جو تہذیبی حیثیت سے شاندار تھے اور ان عہدوں میں ہندوستان نے بعض عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا کیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے برہمنیت اور بودھ مت

دونوں میں تنزل آگیا اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہوگئیں۔ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ بودھ مت برہمنیت میں گھل مل گیا لیکن اس طرح خود اس کی اپنی حیثیت اور شخصیت میں بڑا فرق پیدا ہوگیا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں شنکر آچاریہ نے، جس کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے مفکروں میں ہوتا ہے، ہندو سنیاسی اور راہبوں کے لئے مٹھوں کا سلسلہ شروع کیا۔ بودھ مت والوں نے اپنے "سنگھوں" کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، 'مٹھ' اسی کی بدلی ہوئی شکل تھے۔ اس سے پہلے برہمنوں میں 'سنیاسیوں' کی اس طرح کی کوئی جمعیت یا تنظیم موجود نہ تھی۔

ایک عام مذہب کی حیثیت سے بودھ مت ہندوستان میں ختم ہوگیا، صرف مشرقی بنگال اور سندھ میں اس کی کچھ بگڑی ہوئی صورتیں باقی رہ گئیں۔

۱۳۔ ہندوستان کا فلسفیانہ نقطۂ نظر

ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے، اور ہر نیا خیال بدلتی ہوئی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسانی خیالات کی حرکت اور رفتار میں ایک منطقی ترتیب بھی نظر آتی ہے لیکن عموماً ہر طرح کے نئے پرانے خیالات ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں جن میں ہم آہنگی نہیں ہوتی بلکہ اکثر تضاد ہوتا ہے۔ خود فرد کا ذہن بھی اضداد کا مجموعہ ہے اور وہ اپنے ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں پیدا کر سکتا۔ اسی طرح ایک ایسی قوم جس کے اندر مختلف گروہ تہذیبی ارتقا کی مختلف منزلوں میں ہیں، قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے ہر دور کے خیالات، عقائد اور افعال و اعمال کی نمائندگی کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کا ظاہری عمل موجودہ عہد کے سماجی اور تہذیبی سانچے میں ڈھلا ہوا

ہو۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کے دھارے سے الگ ہو کر کہیں دور جا پڑیں ۔ ہا لیکن اس ظاہری عمل کی سطح کے نیچے ابتدائی عقیدے اور لا عقلی تصورات موجود ہوں ۔ جو ملک صنعتی حیثیت سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں، اور جہاں ہر شخص نئی سے نئی ایجاد سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہے، وہاں بھی ایسے عقائد اور خیالات موجود ہیں جنھیں عقل قبول نہیں کرتی ۔ ہوسکتا ہے کہ ایک سیاست داں فہم اور ذہانت سے خالی ہونے کے باوجود اپنے کام میں کامیاب ہو، ایک وکیل قابل قانون داں اور ہیر دکار ہونے کے باوجود، دوسرے مسائل میں بالکل کورا ہو ۔ یہاں تک کہ سائنس داں بھی، جو حقیقی مفہوم میں اس نئے زمانے کا نمائندہ ہے بعض اوقات اپنے مطالعے کے کمرے یا معمل سے باہر نکل کر سائنس کے طریقے اور نقطۂ نظر کو بالکل بھول جاتا ہے ۔

ان معاملات کا بھی جو مادی حیثیت سے ہماری روزانہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں یہی حال ہے ۔ فلسفہ اور الٰہیات کے مسائل کا ہماری زندگی کے معمولات سے بہت کم تعلق ہے ۔ ہم میں سے اکثر کے لئے یہ مسائل ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، تاوقتیکہ ہمارے ذہن نے فکری حیثیت سے باضابطہ تربیت نہ حاصل کی ہو ۔ اس کے باوجود ہم میں سے ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک فلسفۂ زندگی رکھتا ہے جو خود اس کی فکر کا نتیجہ ہے یا اس نے اسے ورثتاً پایا ہے یا دوسروں سے سن کر اپنا لیا ہے ۔ کبھی ہم فکری کشمکش سے بچنے کے لئے، کسی مذہبی عقیدے میں، قومی زندگی کے کسی تصور میں یا محض انسانی ہمدردی کے کسی مبہم یا سکون بخش خیال میں پناہ لیتے ہیں ۔ اکثر یہ ساری باتیں اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں انسان کے ذہن میں ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں ــــ خواہ ان میں کوئی ربط و تعلق نہ ہو ــــ اور ان ساری چیزوں

کی موجودگی ہم میں متعدد شخصیتیں پیدا کردیتی ہے، اور ہر شخصیت اپنی اپنی جگہ عمل میں مصروف رہتی ہے۔

گو پرانے زمانے میں زندگی کی سطح آج کل کی سطح سے بہت نیچی تھی (اُن چند شخصیتوں کو چھوڑ کر جو یقیناً بے حد بلند اور ممتاز تھیں) لیکن اس زندگی میں انسانی شخصیت میں نسبتاً زیادہ اتحاد اور ہم آہنگی تھی۔ زندگی کے اس طویل عبوری دور میں، جس میں سے ہو کر انسانیت کو گذرنا پڑا ہے، ہماری شخصی زندگی کا اتحاد منتشر اور پارہ پارہ ہو گیا ہے، لیکن ہمیں اب تک اس کے بجائے دوسری شخصیت نہیں مل سکی۔ ہم نے اب تک مذہب کے اذعانی عقیدے کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، ہم اب تک فرسودہ رسموں اور رواجوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر بھی یہ سمجھتے اور یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہم سائنٹفک طریقوں کے پابند ہیں۔ سائنس نے زندگی تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ شاید بہت تنگ و تاریک ہے۔ اس نے زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کی طرف سے اغماض برتا ہے اور اسی لئے وہ زندگی کو کوئی ایسی چیز نہ دے سکی جس سے اس میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ شاید سائنس اب رفتہ رفتہ اپنی نظر کو وسعت دے رہی ہے، اور اب انسانی شخصیت کو ایک ایسی ہم آہنگی میسر آنے والی ہے، جس کی سطح پچھلی ہر سطح سے بلند و بالا ہو گی۔

لیکن یہ مسئلہ اب پہلے سے کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ بن گیا ہے، اس لئے کہ اس کی حدیں انسانی شخصیت سے آگے بڑھ چکی ہیں۔ انسانی شخصیت میں ہم آہنگی پیدا کرنا، قدیم اور وسطی عہد کی محدود زندگی میں شاید زیادہ آسان بات تھی۔ ان دنوں گاؤں اور شہر کی اس چھوٹی سی دنیا میں، جہاں سماجی تنظیم اور اخلاق کی قدریں مقرر تھیں اور فرد اور جماعت دونوں باہر کے طوفانوں

سے محفوظ اور مامون، اپنی خودکفیل زندگیاں بسر کرتے تھے لیکن آج فرد کی شخصیت کا دائرہ پھیل کر عالمگیر حیثیت اختیار کر چکا ہے، سماجی تنظیم کے مختلف تصورات کا آپس میں تصادم ہو رہا ہے اور ان تصورات کے پیچھے کسی نہ کسی فکر اور فلسفے کا سہارا بھی موجود ہے۔ تیز و تند ہوائیں ایک سمت سے ایک طوفان اُٹھاتی ہیں اور مخالف سمت سے دوسرا طوفان۔ اس لئے اگر فرد اپنی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے ساری دنیا کے سماجی نظام کی ہم آہنگی کا سہارا ضروری ہے۔

ہندوستان میں، دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ، سماجی تنظیم کا قدیم تصور اور وہ فلسفۂ زندگی جس پر یہ تصور مبنی ہے، آج تک قائم ہے۔ اگر ان تصورات میں کوئی ایسی خوبی نہ ہوتی جو سماج کو مستحکم رکھنے اور اُسے زندگی کے حالات کے مطابق بنانے میں مدد دے رہی ہے تو ان کا اس طرح قائم رہنا ممکن نہیں تھا۔ مگر اسی کے ساتھ اگر ان میں کوئی ایسا عیب نہ ہوتا جو اس خوبی پر غالب آگیا ہے تو وہ اس طرح زندگی سے بے تعلق ہو کر اس کے لئے رکاوٹ اور بوجھ نہ بن جاتے اور زندگی یوں ناکام نہ رہتی۔ لیکن بہرصورت ہم ان تصورات کو دنیا سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیں انھیں دنیا کے وسیع پس منظر میں دیکھنا اور اس کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ضروری ہے۔

ہیول نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں مذہب محض ایک اذعانی اصول نہیں، بلکہ اس کی حیثیت انسانی کردار کے لئے ایک عملی مفروضے کی سی ہے، جسے روحانی ترقی کے مختلف مدارج اور زندگی کے مختلف حالات کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔" اذعانی عقیدہ، زندگی سے الگ رہ کر بھی قائم اور باقی رہ سکتا ہے لیکن انسانی کردار کے عملی مفروضات کے لئے

زندگی کا ہم عنان ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی نشو ونما میں حائل ہوتے ہیں۔ اس طرح کے مفروضات کی غایت وجود یہی ہے کہ وہ قابلِ عمل ہوں، اپنے آپ کو زندگی کے مطابق بنانے اور بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جب تک ان میں یہ ساری باتیں موجود ہیں وہ اپنے مقصدِ معینہ کو پورا کرتے ہیں۔ اور اگر وہ زندگی کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کر لیں، یا سماجی ضروریات سے اپنا رشتہ توڑ کر زندگی سے دور جا پڑیں تو اس کی ساری قوت اور اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

الہیاتی نظریے اور افکار صرف زندگی کے ان تغیر پذیر پہلوؤں ہی کو اپنا موضوع نہیں بناتے بلکہ ان کی نظر اس مستقل حقیقت کی طرف بھی ہوتی ہے جو زندگی کی ظاہری حدوں سے پرے ہے۔ اور اسی لیے ان نظریوں میں ایک طرح کا استقلال ہوتا ہے اور بیرونی تبدیلیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں لیکن یہ نظریے اس ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں جن میں ان کا ارتقا ہوا اور ان انسانی ذہنوں کی تخلیق جنھوں نے انھیں سوچا۔ اگر ان نظریوں کا اثر عام ہو جائے تو یہ پوری قوم کے فلسفۂ زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ ہندوستان میں گو فلسفے کے بلند تر مسائل صرف ایک مخصوص اور محدود طبقے کی میراث بن گئے، پھر بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اس نے عام لوگوں میں بہت رواج پایا اور قومی رجحان اور میلان کی تشکیل میں اس کا بہت بڑا حصہ تھا۔

اس تشکیل میں غالباً بودھ فلسفے نے بھی نمایاں حصہ لیا اور عہد وسطیٰ میں اسلام نے قومی رجحان پر، براہ راست اور بالواسطہ، اپنے نقوش چھوڑے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم اور غالب اثر ہندوستانی فلسفے کے ان چھ نظاموں کا پڑا جنھیں اصطلاح میں "درشن" کہتے ہیں۔ ان نظاموں میں سے بعض

اپنی جگہ پر بودھ افکار سے متاثر ہوئے۔ یہ چھ درشن اپنے اپنے انداز اور نتائج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، گو ان سب میں بہت سے خیالات مشترک بھی ہیں۔ ان درشنوں، کے فکری نظاموں میں کثرت پرستی بھی ہے، خدا پرستی بھی، خالص وحدت پرستی بھی اور ایک ایسا نظام بھی جو خدا کے وجود کی طرف سے بالکل بے نیاز ہے اور اپنی بنیاد ارتقا کے ایک نظریے پر قائم کرتا ہے۔ ان درشنوں میں تصوریت پسندی بھی ہے اور واقعیت پسندی بھی۔ ان میں پیچیدہ اور ہمہ گیر ہندوستانی ذہن کے مختلف پہلو، اپنی وحدت اور کثرت کا منظر دکھاتے ہیں۔ میکس مُلر نے ایک جگہ ان دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے "........ مجھ پر یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو گئی .... کہ ان چھ نظاموں کے تنوع اور اور اختلاف کی تہ میں قومی فلسفے کا ایک مشترک سرمایہ موجود ہے..... جس میں سے ہر مفکر نے اپنے اپنے مقصد کے مطابق اخذ و اکتساب کیا ہے۔"

ان سب نظاموں میں ایک مفروضہ مشترک ہے اور وہ یہ کہ کائنات ایک مرتب اور منظم شے ہے جو قانون کے مطابق چلتی ہے، اور اس کی تہ میں ایک زبردست ہم آہنگی موجود ہے۔ اس طرح کا کوئی نہ کوئی مفروضہ ایک ضروری سی چیز ہے ورنہ کائنات کی تشریح کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں۔ گو سبب اور نتیجے کے قانونوں کا عمل برابر جاری رہے، پھر بھی انسان کو اتنی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی تقدیر کی تشکیل خود کر سکے۔ ان فلسفوں میں تناسخ کا عقیدہ موجود ہے اور بے غرض محبت اور بے لوث عمل پر زور دیا گیا ہے۔ عقل اور منطق پر بھروسہ کیا گیا ہے اور دلائل میں ان دونوں سے پوری مدد لی گئی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ وجدان اکثر ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر رہبر ثابت ہوتا ہے۔ جن معاملات میں عقل و ادراک سے کام لیا جا سکتا ہے

ان میں دلائل کا انداز شروع سے آخر تک عقلی ہے۔ پروفیسر کیتھ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ " فلسفے کے یہ نظام بنیادی طور پر عقیدے میں راسخ ہیں اور مذہبی صحیفوں کو مقدس اور مستند تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ زندگی کے مسائل کا جائزہ بشری نقطۂ نظر سے لیتے ہیں اور مذہبی صحائف کا استعمال محض اس لئے ہوتا ہے کہ ان نتائج کو جو بغیر ان کی مدد کے حاصل کئے جاتے ہیں بلکہ اکثر ان کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے۔

۱۴۔ فلسفے کے چھ نظام (درشن)

اگر ہم ہندوستانی فلسفے کے نظاموں کا جائزہ لینا چاہیں تو ہمیں بودھ کے زمانے سے پہلے ابتدا کرنی پڑتی ہے۔ ان نظاموں نے، جن میں سے بعض برہمنی مذہب سے وابستہ ہیں اور بعض بودھ مت سے، آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو نشو و نما پائی۔ کبھی یہ ایک دوسرے پر اعتراض کرتے تھے اور کبھی ایک دوسرے سے افکار و تصورات اخذ کرتے تھے۔ اس طرح عیسوی سنہ کے شروع ہونے سے پہلے فلسفے کے متعدد نظاموں میں سے چھ برہمنی نظام ایک باقاعدہ مرتب شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا میلان اور نقطۂ نظر دوسرے سے مختلف ہے اور ہر ایک کا استدلال علیحدہ، پھر بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں، بلکہ ایک بڑے نظام کے مختلف حصے ہیں۔

یہ چھ نظام ان ناموں سے مشہور ہیں: (۱) نیائے (۲) ویشیشک (۳) سانکھ (۴) یوگ (۵) میمانسا اور (۶) ویدانت۔

نیائے کا انداز تحلیلی اور منطقی ہے۔ حقیقت میں نیائے کے معنی ہیں منطق یا صحیح استدلال کا علم۔ یہ بہت سی حیثیتوں سے ارسطو کے قیاسِ منطقی

سے ملتا جلتا ہے گو دونوں میں آپس میں کچھ بنیادی اختلافات بھی ہیں۔ 'نیائے' کے منطقی اصولوں کو باقی سارے نظاموں میں بھی تسلیم کیا جاتا تھا، اور قدیم اور متوسط دوروں میں اور ذہنی تربیت کے لئے 'نیائے' کی تعلیم دی جاتی تھی، بلکہ آج تک ہندوستان کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں اس کا رواج ہے۔ نئی تعلیم نے اسے مردود قرار دے دیا ہے لیکن جہاں کہیں پرانے طریقے سے سنسکرت کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں 'نیائے' اب بھی نصاب کا ایک ضروری حصہ سمجھا جاتا ہے۔ 'نیائے' کو نہ صرف فلسفے کے مطالعے کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا تھا بلکہ ہر پڑھے لکھے آدمی کی ذہنی تربیت کے لئے بھی اسے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ کی تعلیم میں جو درجہ اور اہمیت ارسطو کی منطق کو حاصل تھی وہی حیثیت نیائے کی ہندوستان کے قدیم طرز تعلیم میں تھی۔

یہ طریقہ گو موجودہ زمانے کی تحقیق و تفتیش کے سائنٹفک طریقے سے بالکل مختلف تھا، لیکن اپنے خاص انداز میں یہ بھی تنقیدی اور سائنٹفک تھا۔ محض عقیدے پر بھروسا کرنے کے بجائے وہ علم کی تنقیدی نظر سے چھان بین کرتا اور منطقی انداز میں استدلال کے مختلف مدارج طے کرکے نتیجے پر پہنچتا تھا۔ اس کے ساتھ تھوڑے بہت عقائد بھی ضرور شامل تھے — ایسے عقائد اور مفروضات جو منطقی عمل کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ بنیادی طور پر ایک بات فرض کرلینے کے بعد یہ طریقہ اس بات پر اپنی منطق کی عمارت کھڑی کرتا تھا۔ مثلاً یہ بات فرض کرلی گئی تھی کہ زندگی اور قدرت میں ایک طرح کا باہمی اتحاد اور ہم آہنگی ہے۔ خدا، افراد کی ارواح اور جواہر فرد سے مرکب کائنات کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ فرد نہ محض جسم سمجھا جاتا تھا اور نہ محض روح بلکہ ان دونوں کے اتحاد اور امتزاج کا نتیجہ۔ حقیقت کو ارواح اور مادی فطرت کا مرکب تصور کیا

جاتا تھا۔

ویشیشک نظام بہت سی باتوں میں 'نیائے' سے ملتا جلتا ہے۔ یہ فلسفہ افراد اور اشیا کے علیحدہ وجود پر زور دیتا ہے اور کائنات کے جوہری نظریے کا قائل اور ترجمان ہے۔ دھرم یا قانونِ اخلاق، اس فلسفے کے نزدیک، کائنات پر حکمراں ہے اور یہ پورا نظام اسی نظریے کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں خدا کے وجود کا صاف صاف اقرار نہیں کیا گیا۔ نیائے کا فلسفہ، ویشیشک کا فکری نظام اور ابتدائی بودھ فلسفہ بہت سے نقطوں پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان سب کا انداز اور رجحان واقعیت پسندانہ ہے۔

سانکھ نظام، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے کپیلا نے (ساتویں صدی قبل مسیح میں) بہت سے قدیم اور بدھ سے پہلے کے متعدد افکار کو ملا کر تشکیل دیا تھا، خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ رچرڈ گاربے نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "کپیلا کے فلسفے میں، دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ، انسانی ذہن کی مکمل آزادی اور اپنی قوت پر کامل بھروسے کا اظہار ہوتا ہے۔"

بودھ مت کی ترقی کے بعد سانکھ ایک مرتب اور مربوط نظامِ فکر بن گیا۔ یہ نظریہ خالص فلسفیانہ اور الہیاتی تصور ہے اور ایسے ذہنوں کا پیدا کیا ہوا ہے جنھیں خارجی مشاہدات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ دراصل ان چیزوں کا جو اس کی پہنچ سے باہر ہیں مشاہدہ ممکن بھی نہ تھا۔ بودھ مت کی طرح سانکھ کا راستہ بھی عقلی تفتیش تجسس کا راستہ تھا۔ اس تحقیقی انداز کی وجہ سے اس اندازِ فکر میں خدا کے وجود کا کوئی نہیں۔ یہ نہ شخصی خدا کا قائل ہے نہ غیر شخصی خدا کا، نہ اس میں وحدت وجود کا ذکر ہے نہ وحدانیت پرستی کا۔ اس کا عام میلان دہریت کی طرف تھا۔ یہ مذہبی توہم پرستی کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اس فکر کے مطابق

کائنات خدا کی تخلیق نہیں بلکہ ارتقا کا ایک مسلسل عمل ہے، جو روح اور مادہ یا روحوں کے اتصال اور تصادم سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ارتقا کا یہ عمل برابر جاری وقائم رہتا ہے۔

سانکھ کو دُویت یا دوئی کا فلسفہ کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنی عمارت کی بنیاد دو علتوں پر رکھی ہے: پراکرتی یعنی متغیر اور محرک فطرت یا قوت اور پُرش یعنی وہ روح جو بدلتی نہیں، بلکہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ کائنات میں پُرشوں یا روحوں کی ایک لامحدود تعداد موجود ہے۔ 'پُرش' جو بجائے خود غیر متحرک ہے، اس کے اثر سے پراکرتی کا ارتقا ہوتا ہے اور یہ عمل ایک مسلسل ہستی کے وجود کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ علت اور غایت کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اثر یا نتیجہ علت میں پنہاں اور موجود ہے۔ سبب اور نتیجہ ایک ہی شے کی دو صورتیں ہیں — ایک ترقی یافتہ اور دوسری غیر ترقی یافتہ۔ لیکن ہمارے عملی نقطۂ نظر سے سبب اور اثر یا علت اور نتیجہ دو مختلف اور جداگانہ چیزیں ہیں، گو بنیادی طور پر اُن میں ایک طرح کی یکسانی ہے۔

منطقی استدلال کا یہ سلسلہ اسی طرح چلا گیا ہے، اور اس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ کس طرح غیر مرئی پراکرتی یا قوت، پُرش یا شعور کے اثر اور علیت کے اصول کی تحت میں عناصر کی پیچیدہ اور متنوع شکل اختیار کرتی ہے اور اسی طرح تغیر اور ارتقا کا یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ کائنات کے ہر پست و بلند میں اتحاد اور تسلسل کا تعلق قائم ہے۔ یہ سارا تصور الہیاتی اور مابعد الطبیعی ہے، اور براہین کا سلسلہ جو کسی مفروضے پر قائم کیا گیا ہے، اسی طرح دور تک چلتا رہتا ہے، طول طویل، پیچیدہ اور مدلل۔

پتان جلی کا 'یوگ' کا نظام فکر، جسم اور ذہن کی تربیت کا ایک طریقہ ہے۔ اس طریقے سے ذہن کی نفسیاتی اور روحانی تربیت ہوتی ہے۔ پتان جلی نے نہ صرف اس نظام فکر کی بنیاد ڈالی بلکہ اس نے پینینی کی سنسکرت گرامر کی ایک بہت اچھی شرح بھی لکھی ہے۔ اس شرح کا نام "مہا بھاشیہ" ہے اور اسے بھی سنسکرت کلاسیکی ادب میں تقریباً وہی درجہ حاصل ہے جو پینینی کی کتاب کو۔ لینن گراڈ کے پروفیسر Stcherbatsky نے لکھا ہے کہ "پینینی کی گرامر اور پتان جلی کی مہا بھاشیہ، ہندوستان کے سائنٹفک طرز فکر کی نمایاں مثال ہے۔"[ط۵]

یوگ کا لفظ یورپ اور امریکا میں اچھی طرح متعارف ہے۔ حالانکہ اس کا صحیح مفہوم قطعی نہیں سمجھا جاتا اور لوگ سمجھتے ہیں کہ 'یوگ' بدھ کی طرح بیٹھ کر اپنی ناف کو تکے جانے یا اور اسی طرح کی عجیب و غریب حرکتیں کرنے کا نام ہے۔[ط۶] کچھ لوگ یہ عجیب و غریب حرکتیں سیکھ کر مغرب والوں کے سامنے اپنے آپ کو اس علم کا ماہر ظاہر کرنے لگتے ہیں اور ہنگامہ جو لوگوں کی کمزوری اور ضعیف الاعتقادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یوگ کا طریقہ ان جسمانی قلابازیوں سے

ط۵ یہ بات ابھی تحقیقی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ قواعد داں پتان جلی وہی شخص ہے جو 'یوگ' کے نظام فکر کا بانی ہے۔ نحوی پتان جلی کا زمانہ یقینی طور پر دوسری صدی قبل مسیح ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ 'یوگ سوتروں' کا مصنف دوسرا شخص تھا اور وہ اس پتان جلی کے دو یا تین سو برس بعد ہوا ہے۔

ط۶ 'یوگ' کے معنی ہیں "اتحاد یا اتصال"۔ غالباً اس کا مادہ بھی وہی ہے جو انگریزی کے لفظ Yoke کا۔

بالکل مختلف چیز ہے، اور اس کی بنیاد اس نفسیاتی تصور پر ہے کہ ذہن کی صحیح تربیت سے انسان شعور کے بعض بلند مدارج حاصل کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت یا کائنات کا کوئی الہیاتی نظریہ نہیں بلکہ ایک طریقہ ہے جس کی مدد سے انسان خود اپنے آپ چیزوں کی حقیقت سے واقف ہو سکے۔ گویا یہ ایک تجرباتی نظریہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تجربہ کرنے کے لیے کون سے حالات سب سے زیادہ مناسب اور موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفے کا ہر نظام خواہ اس کا نقطۂ نظر کچھ بھی ہو، اسے اپنا سکتا ہے۔ سانکھ فلسفے کے ' دہری ' پیرو بھی اس طریقے سے کام لے سکتے ہیں۔ بودھ مت نے ' یوگ ' تربیت کا اپنا ایک الگ طریقہ نکالا تھا، جو بعض حیثیتوں سے اس طریقے سے مشابہ تھا اور بعض حیثیتوں سے مختلف۔ پتان جلی کے یوگ کے نظام کا نظریاتی پہلو نسبتاً کم ہے۔ اصل میں اہمیت اس کے عملی پہلو کی ہے۔ خدا پر ایمان رکھنا، اس نظام فکر کا کوئی لازمی جزو نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا خیال ہے کہ خدا پر ایمان اور اس کے ساتھ گہری عقیدت پیدا کرنے سے ذہن میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے اور یہ یکسوئی عملی نقطۂ نظر سے ایک اہم چیز ہے۔

یوگ کے طریقے کے پیروؤں کا خیال ہے کہ اپنی آخری منزلوں میں یہ طریقہ انسان میں وجدانی بصیرت اور ایک ایسی روحانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، جس کا صوفی اکثر ذکر کرتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ حالت واقعی اس طرح کی کوئی بلند ذہنی کیفیت ہے، جو انسان کے لیے بصیرت کی راہ کھول دیتی ہے، یا محض ایک خود فراموشی اور خود فریبی۔ ممکن ہے پہلی بات بھی صحیح ہو، لیکن دوسری بات یقیناً صحیح ہے اس لیے کہ جہاں تک انسان کے ذہن کا تعلق ہے، بے قاعدہ یوگ نے بعض اوقات بے حد افسوسناک نتائج

پیدا کیے ہیں۔

لیکن دھیان اور استغراق کی ان آخری منزلوں تک پہنچنے سے پہلے، انسان کو جسمانی اور ذہنی ریاضت کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ جسم کو صحت مند، سڈول، خوبصورت، ٹھوس اور مضبوط ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے کچھ جسمانی ورزشیں مقرر کی گئی ہیں۔ اسی طرح سانس لینے کے بھی بہت سے طریقے ہیں تاکہ انسان کو سانس پر بھی تھوڑی بہت قدرت حاصل ہو سکے اور وہ معمولاً گہرا اور لمبا سانس لے سکے۔ شاید "ورزشوں" کا لفظ اس عمل کے لئے زیادہ موزوں لفظ نہیں اس لئے کہ اس میں جسم کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ ان کے لئے صحیح لفظ 'آسن' ہے۔ اور ان آسنوں کو اگر باقاعدگی سے کیا جائے تو ان سے جسم کی صحیح تربیت تو ہو جاتی ہے لیکن اس میں تھکن نہیں پیدا ہوتی۔ اپنے جسم کو صحت مند رکھنے کے لئے ہندوستان کا یہ مخصوص طریقہ بے حد قابل تعریف ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ ہم اس کا مقابلہ ان عام طریقوں سے کریں جن میں انسان کو اتنی بھاگ دوڑ اور اچھل کود کرنی پڑتی ہے کہ سارا جسم شل ہو جاتا ہے اور سانس پھولنے لگتا ہے۔ کشتی، تیراکی، سواری، تیر اندازی، سیر و شکار، جی جتسو اور اس طرح کے بہت سے تفریحی مشاغل کے علاوہ دوڑ دھوپ اور کود پھاند کے یہ طریقے بھی ہندوستان میں عام طور پر رائج ہیں۔ 'آسن' کا پرانا طریقہ شاید ہندوستان کے لئے زیادہ موزوں ہے اور ہندوستان کے فلسفیانہ میلانات سے ہم آہنگ۔ آسن کی 'ورزش' کرتے وقت بھی انسان اپنے سکون اور اطمینان کو قائم رکھتا ہے۔ کسی قسم کے ذہنی انتشار یا بے جا صرف قوت کے بغیر جسم کی چستی اور صحت حاصل ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ 'آسن' ہر عمر کے لوگوں کے لئے موزوں ہیں اور ان میں سے کئی آسن ایسے ہیں جنھیں بوڑھے

بھی کر سکتے ہیں۔

'آسن' تعداد میں بہت زیادہ ہیں' اور پچھلے کئی برسوں میں جب بھی مجھے موقع ملا ہے میں ان میں سے بعض سادے آسنوں پر عمل کرتا رہا ہوں۔ اور چونکہ مجھے اس زمانے میں زیادہ تر ایسے ماحول میں رہنے کا اتفاق ہوا جو جسم اور دماغ دونوں کے لئے ناسازگار تھا' اس لئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان آسنوں سے مجھے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ یہ چند آسن' اور سانس کی کچھ ورزشیں میرا معمول رہی ہیں۔ ان 'آسنوں' کی مشق میں میں نے اس ابتدائی منزل سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی' جو صرف جسم کے لئے مخصوص ہے اور اسی لئے میرا دماغ اب بھی ہمیشہ کی طرح سرکش ہے' اور اکثر بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔

جسم کی تربیت کے ساتھ (جس میں صحیح غذا کا استعمال اور نامناسب غذا کا ترک بھی شامل ہے) اخلاقی ضبط کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ اس میں 'اہنسا' راست گوئی اور پاک بازی وغیرہ شامل ہیں۔ 'اہنسا' کا مفہوم محض جسمانی تشدد کے ترک سے زیادہ وسیع ہے۔ جسمانی تشدد کے ترک کے علاوہ بغض اور نفرت سے بچنا بھی 'اہنسا' کا لازمی جزو ہے۔

یہ ساری باتیں انسان کو 'حواس ظاہری' کے ضبط پر قادر کرتی ہیں۔ اس کے بعد گیان دھیان کا نمبر آتا ہے۔ اور سب سے آخر میں اجتماع خیال کی منزل آتی ہے' جس کے بعد مختلف طرح کی وجدانی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

'ویکانندنے' جو موجودہ زمانے میں 'یوگ' اور 'ویدانت' کے بہت بڑے ترجمان ہیں یوگ کے تجرباتی پہلو پر بار بار زور دیا ہے' اور اسے عقل کی بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یوگ کے مختلف

مذاہب میں ایک بھی ایسا نہیں جو عقل کو ہاتھ سے جانے دے۔ ان میں سے کوئی انسان کو فریب میں مبتلا ہونے یا کسی قسم کے جوگیوں کے ہاتھ کا کھلونا بننے کی تعلیم نہیں دیتا .... ان میں سے ہر ایک انسان سے کہتا ہے کہ اپنی عقل و فہم کے سہارے پر چلو اور اسے مضبوطی سے پکڑو۔" خواہ یوگ اور ویدانت اپنے مقصد میں سائنس کے مقصد سے مشابہ ہوں، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کا میدانِ عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور اسی لئے ان میں بہت سے اہم فرق پیدا ہوگئے ہیں۔ یوگ کے نزدیک روح صرف ذہنی قوتوں تک محدود نہیں۔ "فکر حقیقت میں عمل ہے اور صرف عمل اپنی فکر کو کسی قابل بنا سکتا ہے۔" یوگ الہام اور وجدان کا قائل ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں چیزیں فریب میں مبتلا نہیں کرتیں۔ اس سوال کا جواب وویکانند نے اس طرح دیا ہے کہ الہام کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ عقل کے منافی نہ ہو۔ "جس چیز کو ہم الہام کہتے ہیں وہ فہم کی ارتقائی منزل ہے۔ وجدان کا راستہ عقل کی راہ سے ہو کر گذرتا ہے ...... صحیح اور حقیقی الہام کبھی فہم و عقل کے منافی نہیں ہو سکتا۔"

"الہام فرد اور جماعت دونوں کی بہبودی کے لئے ہونا چاہئے، کسی کی ذاتی نمود، شہرت اور ترقی کے لئے نہیں۔ اسے ہمیشہ بنی نوع انسان کی بہبودی پر مشتمل ہونا چاہئے اور ذاتی اغراض سے بالکل پاک۔"

اور آگے چل کر وویکانند نے کہا ہے "تجربہ ہی علم کا واحد ذریعہ ہے۔ تفتیش و تجسس کے جن طریقوں سے ہم سائنس میں یا خارجی حقیقتوں کے علم میں کام لیتے ہیں، انھیں سے مذہب میں بھی کام لینا چاہئے۔" "اگر کوئی مذہب اس طرح کی تفتیش و تجسس کا بوجھ نہ اٹھا سکے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ

ایک فضول اور بے معنی وہم تھا۔ اُس کا مٹ جانا ہی بہتر تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مذہب یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ وہ عقل و فہم کے نقطۂ نظر کا پابند ہو کر نہیں رہنا چاہتا ۔۔۔۔ اس لیے کہ کسی دوسرے کے کہنے سے دو کروڑ دیوتاؤں پر اندھا دھند عقیدہ رکھنے کے مقابلے میں انسان کے لیے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ عقل کے دکھائے ہوئے راستے پر چلے اور دہریہ ہو جائے ۔۔۔ ۔۔۔ شاید دنیا میں ایسے پیغمبر گذرے ہیں جنھوں نے احساس کی حدوں سے گذر کر ماورا کی جھلک دیکھ لی۔ لیکن ہم اس بات کو اسی صورت میں مان سکتے ہیں جب ہم بھی یہی کر سکیں ۔۔۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔" کہا جاتا ہے کہ عقل و فہم میں قوت و استحکام نہیں، اور اس سے اکثر غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اگر عقل و فہم میں قوت نہیں تو پھر پروہتوں یا مذہبی پیشواؤں کو کیوں اچھا رہنما اور رہبر سمجھا جائے؟ دویکانند نے ایک جگہ کہا ہے کہ "میں اپنی عقل کی پیروی کروں گا، اس لیے کہ اس کی ساری کمزوریوں کے باوجود، صرف اسی کی رہبری میں حق تک پہنچنے کا امکان ہے ۔۔۔۔۔ اس لیے ہمیں عقل کی رہبری میں چلنا چاہیے اور اُن سے ہمدردی کرنی چاہیے جنھوں نے عقل کی پیروی کی اور کسی عقیدے پر نہیں پہنچ سکے۔" "یوگ کے مطالعے کے لیے کسی عقیدے یا بھروسے کی ضرورت نہیں۔ کسی چیز پر یقین مت کرو جب تک خود ہمیں اس کا تجربہ نہ ہو جائے۔" [1]

دویکانند نے عقل اور فہم کی رہنمائی پر بے حد زور دیا ہے اور اندھی

---

[1] دویکانند کی تحریروں کے جو اقتباس ہم نے لیے ہیں ان میں سے اکثر رومین رولینڈ کی کتاب Life of Vivekananda سے ماخوذ ہیں۔

تقلید کی بار بار مخالفت کی ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ وہ ذہن کی آزادی کے بڑے پُرجوش حامی تھے اور دوسری وجہ یہ کہ انھوں نے اپنے ملک میں تقلید کی بے انتہا خرابیاں دیکھی تھیں "اس لیے کہ میں ایسے ملک میں پیدا ہوا ہوں جہاں تقلید حد کو پہنچ گئی ہے۔" اور انھیں جذبات سے مجبور ہو کر انھوں نے یوگ کے طریقوں اور ویدانت کی تشریح کی ــــ اور اس کا انھیں پورا پورا حق بھی تھا۔ لیکن ان طریقوں میں تجربہ اور عقل کو خواہ کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو، میرے نزدیک ان کا میدانِ فکر عام آدمی کے ذہن کی سطح یا اس کے ادراک سے بہت دور ہے ــــ یہ میدان خاص قسم کے نفسیاتی تجربوں کا میدان ہے، اور اُس دنیا سے قطعی مختلف ہے جسے ہم نے دیکھا اور برتا ہے۔ یہ تجربات صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہیں، عیسائی عارفوں اور ایرانی صوفیوں میں بھی اس طرح کے تجربات اور واردات کی شہادتیں کثرت سے موجود ہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہ تجربے ایک دوسرے سے بڑی حد تک مماثل اور مشابہ ہیں اور جیسا کہ رومن رولینڈ نے کہا ہے کہ "ان مذہبی تجربوں میں ایک ہمہ گیری اور دوامی کیفیت ہے، اور اس کیفیت میں یہ مختلف تجربات نسل، قوم اور زمانے کے اختلاف کے باوجود، ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک انسانی روح کی مستقل ہم آہنگی پر زور دیتا ہے، بلکہ کبھی کبھی انسانی روح کی حدوں سے بھی پرے ان تجربات اور واردات کے عمل کا دائرہ اُن حقائق تک پہنچتا ہے جن سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔"

یوگ ایک ایسا تجرباتی نظامِ فکر ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے نفسیاتی پس منظر کی گہرائیوں کی کھوج لگا کر کچھ تصورات قائم کرے

اور ذہن کو ان تصورات کا پابند بنائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ جدید نفسیات اُس سے کسی حد تک فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک کوشش کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ اربندو گھوش نے یوگ کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے "راج یوگ کی ساری بنیاد اس تصور اور تجربے پر ہے کہ ہمارے نفسی عناصر، مرکب کیفیات، وظائف اور قوتیں منتشر اور تحلیل کی جا سکتی ہیں، انھیں مجتمع کر کے اور نئی تشکیل دے کر ان سے بالکل نئے اور بظاہر غیر ممکن نتیجے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور مقررہ داخلی عمل کے ماتحت انھیں ایک نئی ترتیب دی جا سکتی ہے، اور ان میں ایک نیا امتزاج پیدا کیا جا سکتا ہے۔

فلسفے کے ایک دوسرے نظام کا نام ممانسا ہے۔ یہ اس نظام کا عام انداز رسوم پرستانہ ہے اور یہ کثرت پرستی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانے کے عام ہندو مذہب اور ہندو دھرم پر اس نظام فکر اور اس کے قاعدوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے اور ہندو مذہب میں دھرم یا حسن عمل کا جو تصور ہے اس کا انداز بالکل وہی ہے جو اس نظام فکر کا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ ہندوؤں کی کثرت پرستی بالکل عجیب طرح کی ہے۔ اس کثرت پرستی میں، دیوتاؤں کو اُن کی مخصوص قوتوں کے باوجود تخلیق کے نظام میں انسان سے کم درجہ حاصل ہے۔ ہندوؤں اور بودھ مت والوں دونوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا کی ہیں اُن میں مکمل ذات کے لحاظ سے سب سے اونچا درجہ اور مرتبہ انسان کا ہے۔ دیوتاؤں کو بھی یہ درجہ صرف اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ اُن کی تخلیق قالب انسانی میں ہو۔ یہ عقیدہ کثرت پرستی کے عام عقیدے سے بالکل مختلف ہے۔ بودھ کے پیرو بھی کہتے ہیں کہ صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی معراج پر پہنچ کر

بدھ کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

اس سلسلے کا چھٹا اور آخری نظام 'ویدانت' ہے، جو اپنشدوں سے پیدا ہوا، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں، لیکن اس کی بنیاد ہمیشہ کائنات کے توحیدی تصور پر قائم رہی۔ سانکھ فلسفے کے پرش اور پراکرتی کے تصورات کو، ویدانت میں مطلق حقیقتیں نہیں بلکہ ایک واحد حقیقت یا ذات مطلق کی بدلی ہوئی شکلیں سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی ویدانت کی بنیاد پر شنکراچاریہ نے ایک دوسرے نظام فکر کی بنیاد ڈالی جسے ادویت ویدانت یا غیر ثنوی ویدانت کہتے ہیں۔ یہی فلسفہ آج کل کے ہندو دھرم کے فلسفیانہ رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس فلسفے کی بنیاد خالص وحدت پرستی پر ہے، اور الہیاتی اصطلاح میں اس حقیقتِ واحد کو آتما یا روحِ مطلق کہتے ہیں۔ صرف یہ روحِ مطلق داخلی شے ہے اور باقی سب کچھ خارجی۔ وہ روحِ مطلق کس طرح ہر شے پر محیط ہے؟ کس طرح ذاتِ واحد مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے اور پھر بھی اپنی وحدت پر قائم ہے؟ — ان ساری باتوں کا جواب منطقی دلائل سے نہیں مل سکتا، اس لئے کہ ہمارے ذہن اس محدود دنیا میں گھرے ہوئے ہیں۔ اپنشد نے اس آتما کی تشریح (اگر اسے تشریح کہا جا سکے) اس طرح کی ہے۔ "کُل وہاں ہے، کُل یہاں بھی ہے۔ کُل، کُل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کُل میں سے کُل کو خارج کر لیں، (پھر بھی) کُل باقی رہتا ہے۔"

شنکر نے علم کا ایک نازک اور پیچیدہ نظریہ قائم کیا ہے۔ بعض مفروضات کو بنیاد بنا کر، اس نے منطقی دلائل سے درجہ بدرجہ 'ادویتا' یا غیر ثنویت کا پورا نظام مرتب کیا ہے۔ فرد کی روح کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اصل میں

وہ خود روحِ مطلق کی ایک شکل ہے جو بعض حیثیتوں سے محدود ہے۔ اسے کسی برتن کے اندر گھرے ہوئے 'خلا' سے تشبیہہ دی گئی ہے' اور آتما ہمہ گیر خلا پر محیط ہے۔ عملی مقصد کے لئے' ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا جا سکتا ہے' لیکن یہ علیحدگی ظاہری ہے' حقیقی نہیں۔ اس اتحاد کو مکمل بنانا' یعنی فرد اور روحِ مطلق کے وجود کو ایک تصور کرنا صحیح آزادی ہے۔

عناصر کی یہ دنیا جو ہمیں اپنے آس پاس نظر آتی ہے اس حقیقت کا عکس ہے یا تجربے کی سطح پر اس کی پرچھائیں۔ اس دنیا کو مایا کہا گیا ہے' جس کا غلط ترجمہ لوگوں نے 'فریب یا دھوکا' کیا ہے۔ لیکن یہ 'عدم' نہیں' بلکہ وجود اور عدم کی درمیانی صورت ہے۔ یہ ایک طرح کی اضافی ہستی ہے۔ اور اس طرح شاید اضافیت کا نظریہ ہمیں مایا کے مفہوم سے قریب لے آتا ہے۔ پھر اس دنیا میں نیکی اور بدی کیا ہے؟ کیا یہ بھی محض عکس اور پرچھائیاں ہیں اور ان کی کوئی مادی حیثیت نہیں؟ آخری تجزیے کے بعد ان کا وجود خواہ کچھ بھی ثابت ہو' لیکن تجربوں کی اس دنیا میں یہ اخلاقی امتیازات جائز بھی ہیں اور اہم بھی۔ جہاں افراد کے عمل کا سوال پیدا ہوتا ہے یہ امتیاز بالکل موزوں اور مناسب ہیں۔

محدود تصورات رکھنے والا انسان غیر محدود کو محدود کئے بغیر اُس کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ غیر محدود کے متعلق صرف محدود اور خارجی تصورات قائم کر سکتا ہے۔ تاہم یہ محدود تصور اور خیالات بھی انجام کار غیر محدود اور مطلق کا جزو بنتے ہیں۔ اس لئے کہ مذہب کی ظاہری ہیئت ایک اضافی شے ہے اور ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اپنی اہلیت کے مطابق تصور قائم کرے۔

شنکر کا خیال تھا کہ ذات پات کی بنیاد پر سماجی زندگی کا جو نظام برہمنیت نے قائم کیا ہے وہ قوم کے اجتماعی تجربے اور شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن

اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر شخص، خواہ وہ کسی ذات کا بھی ہو علم کی معراج کو پہنچ سکتا ہے۔

شنکر کے رجحان اور ان کے فلسفے پر نفیِ کائنات کا تصور چھایا ہوا ہے اور یہ فلسفہ، اس آزادیِ نفس کی تلاش کی خاطر جسے وہ ہر شخص کی زندگی کا آخری مقصد سمجھتے تھے، انسان کو دنیا کی سرگرمیوں سے بے تعلقی اور علیحدگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایثارِ نفس اور بے غرضی کی بھی مسلسل تاکید کی گئی ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود شنکر میں خود حیرت انگیز جوشِ حیات اور قوتِ عمل موجود تھی۔ وہ زندگی سے بھاگ کر یا کسی کنجِ عافیت یا جنگل کے کسی گوشے میں چھپ کر اور دوسروں کی زندگی سے بے خبر رہ کر تکمیلِ نفس اور تکمیل ذات کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ جنوبی ہند میں، ملابار کے علاقے میں پیدا ہوئے اور ساری زندگی، بغیر تھکے یا بغیر آرام کیے، سارے ہندوستان کا سفر کرتے رہے اور مسلسل سفر کی یہ زندگی ان گنت لوگوں سے ملنے، اُن سے بحث مباحثے کرنے اور انھیں اپنا ہم خیال بنا کر ان کے دلوں کو اپنے جوش و خروش اور جذبۂ عمل سے معمور کرنے میں گذری۔ شنکر ایسے انسان تھے جنھیں اپنے مقصدِ حیات کا شدید احساس تھا، اور راس کماری سے لے کر ہمالیہ تک، سارے ہندوستان کو وہ اپنا میدانِ عمل سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عمل کا یہ سارا میدان تہذیبی حیثیت سے ایک ہے اور اس کی روح ہر جگہ یکساں ہے، خواہ اس نے خارجی طور پر مختلف شکلیں اختیار کر لی ہوں۔ شنکر نے ہندوستانی فکر کے مختلف میلانات میں امتزاج پیدا کرنے اور اس فکری انتشار کو ایک متحد نظر دینے کی حد سے زیادہ کوشش کی۔ ۳۲ برس کی مختصر عمر میں شنکر نے کئی طویل زندگیوں کا کام

انجام دیا اور ہندوستان پر اپنے توانا ذہن اور ہمہ گیر شخصیت کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے کہ وہ آج تک نمایاں ہیں۔ شنکر کی شخصیت فلسفی اور عالم، لا ادری اور صوفی، شاعر اور درویش کا ایک عجیب و غریب مجموعہ تھی — اور ان سب چیزوں کے علاوہ وہ عملی اصلاح اور تنظیم کی بے مثل قابلیت رکھتے تھے۔ شنکر نے، برہمنی نظام کو سب سے پہلی مرتبہ دس سلسلوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے چار سلسلے اب تک موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کے چار کونوں میں چار مٹھ یا خانقاہیں قائم کیں — ایک جنوب میں سرنگری میں، دوسری مشرقی ساحل پر پوری میں، تیسری مغربی ساحل پر کاٹھیاوار کے شہر دوارکا میں اور چوتھی ہمالیہ کے تقریباً وسط میں بدری ناتھ میں۔ جنوبی ہندوستان کے گرم علاقے کا یہ برہمن ۳۲ سال کی عمر میں، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے قریب کدار ناتھ کے مقام پر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

شنکر نے ہندوستان کی وسیع و عریض سرزمین میں یہ طول طویل سفر ایسے زمانے میں کیے جب سفر نہایت دشوار اور سواریاں تکلیف دہ اور سست رفتار تھیں۔ اس چیز سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ طول طویل سفر، ان سفروں میں ان گنت آدمیوں سے ملاقات، اور ان سے پڑھے لکھے طبقے کی عام زبان سنسکرت میں گفتگو، ایسی چیزیں ہیں جن سے اس دور افتادہ عہد میں بھی ہندوستان کے بنیادی اتحاد اور ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح کے سفر اس زمانے میں اس سے کچھ پہلے کوئی غیر معمولی چیز نہیں سمجھے جاتے ہوں گے۔ سیاسی اختلاف اور انتشار کے باوجود لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے۔ نئی کتابیں سفر کے ذریعے ہر جگہ پہنچ جاتی تھیں اور اس طرح ہر نیا خیال اور ہر نیا نظریہ سارے ملک میں پھیل کر لوگوں کی گفتگو اور بحث مباحثہ کا موضوع بن جاتا تھا۔

پڑھے لکھے لوگوں کا طبقہ ایک خاص طرح کی علمی اور تمدنی زندگی کے رشتے میں منسلک تھا اور عوام کثرت سے تیرتھ کی اُن ان گنت جگہوں کا سفر کرتے رہتے تھے جو قدیم زمانے سے ہندوستان کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ادھر اُدھر کے یہ سفر اور ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کی آپس میں میل ملاقاتیں یقینی طور پر لوگوں کے دل میں ایک مشترک وطن اور مشترک تمدن کے تصور کو اور زیادہ راسخ کرتی ہوں گی۔ سفر صرف اونچی ذات کے لوگوں کا حصہ نہیں تھا۔ تیرتھ یاترا کرنیوالوں میں ہر ذات اور ہر طبقے کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں ان تیرتھ یاتراؤں کی مذہبی اہمیت خواہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُس زمانے میں بھی آج کل کی طرح انھیں خوش باشی اور تفریح اور ملک کے مختلف حصوں کی سیر کا بہانہ سمجھا جاتا تھا۔ تیرتھ کی ان جگہوں پر ملک کے مختلف حصوں کے لوگ آتے جاتے تھے۔ ان کے رسم و رواج، طور طریقے، لباس، زبان سب چیزیں آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی تھیں۔ پھر بھی اس اختلاف کے باوجود اُنھیں اس مشترک رشتے کا شدید احساس تھا جو انھیں ایک جگہ لاکر جمع کرتا تھا یہاں تک کہ شمال اور جنوب کی زبانوں میں آپس میں جو شدید فرق تھے، وہ بھی اس میل ملاپ میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈال سکتے تھے۔

یہ ساری باتیں شنکر کے زمانے میں ہوتی تھیں اور شنکر یقینی طور پر ان سے واقف بھی تھے۔ اور اس قومی اتحاد اور مشترک احساس کو اور زیادہ قوی اور مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے علم، فکر اور مذہب کو اپنا خاص میدان بنالیا اور پورے ملک میں ایک زیادہ مستحکم قسم کی فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علم و فکر کی بلند سطح کو چھوڑ کر، شنکر نے اکثر عوام کی نچلی سطح پر رہ کر اُن کی رسوم پرستی کے طلسم کو توڑا اور اپنے فلسفیانہ حرم کا دروازہ ان لوگوں

کے لیے کھول دیا جو اس میں داخل ہونے کے اہل تھے۔ ہندوستان کے چار
کونوں میں مٹھوں کے قیام سے بھی غالباً شنکر ہندوستان کی متحدہ تمدنی حیثیت
کے تصور کو زیادہ واضح اور مستقل بنانا چاہتے تھے۔ یہ چاروں جگہیں پہلے
بھی ہندوستان کے ہر حصے کے لوگوں کی زیارت گاہیں تھیں اور اب زیادہ ہو گئیں۔
قدیم ہندیوں نے تیرتھ کے لئے کیسی اچھی جگہوں کا انتخاب کیا۔ تقریباً
ہر زمانے میں وہ حسنِ فطرت کی دولت سے مالا مال رہتی ہیں۔ کشمیر میں امرناتھ
کی برفانی چوٹی ہے، اور جنوب میں راس کماری کے بالکل قریب رامیشورم کے
مقام پر کماری دیوی کا مندر ہے۔ بدری ناتھ ہیں اور ہردوار ہمالیہ کے قدموں
میں ملحقا ہوا، جہاں سے گنگا اپنی پرشور وادیوں کے پیچ و خم سے اتر کر میدان
میں قدم رکھتی ہے۔ اور پریاگ (یا الہ آباد) جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے،
جمنا کے کنارے پر بسے ہوئے متھرا اور بندرابن، جن سے کرشن کی روحانی
کہانیاں وابستہ ہیں، اور بدھ گیا جہاں بدھ کو 'روشنی' حاصل ہوتی تھی،
اور ان کے علاوہ، جنوبی ہند میں اور بہت سی جگہیں۔ پرانے مندروں، اور
خاص کر جنوب کے مندروں میں سے اکثر میں پرانے زمانے کی سنگ تراشی اور
مصوری کے نقوش موجود ہیں۔ اور ان تیرتھوں کی سیر کرنے والے کی نظر
میں پرانے ہندی آرٹ کی ایک صحیح تصویر بن جاتی ہے۔

شنکر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں بودھ مت کی
مقبولیت کو ختم کر دیا اور آگے چل کر برہمنیت نے اُسے اپنے سایۂ عاطفت میں
لے لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شنکر سے بھی بہت پہلے، بودھ مت کا اثر ہندوستان
میں بہت گھٹ چکا تھا۔ شنکر کے مخالف، بہت سے برہمنوں نے تو اُنھیں
برہمن کے بھیس میں بدھ کہا ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ شنکر پر

بودھ مت نے خاصا اثر ڈالا۔

۱۵۔ ہندوستان اور چین

چین اور ہندوستان بودھ مت کی بدولت ایک دوسرے سے قریب آئے اور ان دونوں نے آپس میں طرح طرح کے رشتے قائم کئے۔ یہ بات بیقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ چین اور ہندوستان کے یہ تعلقات اشوک سے پہلے بھی تھے یا نہیں۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ ہندوستان اور چین کے درمیان بحری تجارت کا سلسلہ پہلے ہی سے قائم ہوگا اس لئے کہ چینی ریشم ہندوستان آیا کرتا تھا۔ پھر بری راستوں سے بھی لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ غالباً بہت قدیم زمانوں سے چلا آتا ہے اس لئے کہ ہندوستان کی مشرقی سرحد کے علاقوں کے باشندوں کی شکل و شباہت منگولوں سے ملتی جلتی ہے۔ نیپال میں تو یہ شباہت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن آسام اور بنگال میں بھی یہ اثرات خاصے واضح ہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تعلقات کی شمع اصل میں اشوک کی تبلیغی جماعتوں نے روشن کی۔ اور جوں جوں بودھ مت چین میں پھیلتا گیا، سیاحوں اور عالموں کی آمد رفت بڑھتی رہی۔ اور اس طرح ہندوستان اور چین کے درمیان آمد و رفت کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار برس جاری رہا۔ یہ سیاح اور عالم، گوبی کے ریگستانوں میں ہوکر، وسط ایشیا کے میدانوں اور پہاڑوں کے راستوں سے اور ہمالیہ کی چڑھائیوں پر چڑھ کر، سفر کرتے رہے — طویل طویل، سخت اور پُرخطر سفر۔ ان پُرخطر اور دشوار گذار راہوں میں بہت سے ہندوستانیوں اور چینیوں نے اپنی جانیں دیں — یہاں تک کہ ایک بیان کے مطابق ان سیاحوں اور مسافروں میں سے

۹ ویں صدی راہ کی سختیوں کی نذر ہو گئے۔ جو لوگ ان دشواریوں پر فتح پا کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے، ان میں سے اکثر نے اپنا وطن چھوڑا اور پردیس میں بس گئے۔ خشکی کے ان راستوں کے علاوہ ایک راستہ اور بھی تھا۔ یہ راستہ بھی خطروں سے محفوظ اور مامون تو نہیں تھا لیکن چھوٹا ضرور تھا — یہ راستہ ہند چینی، جاوا اور سماترا، ملایا اور نکوبار کے جزیروں میں ہو کر تھا۔ لوگ اکثر اس بحری راستے سے بھی سفر کرتے تھے۔ اور عموماً جو لوگ خشکی کے راستے سے آتے تھے، وہ بحری راستے سے واپس آتے تھے۔ بودھ مت اور ہندوستانی تہذیب وسط ایشیا کے تقریباً سارے خطے میں اور انڈونیشیا کے متعدد حصوں میں پھیل گئی تھی اور ان سارے علاقوں میں جا بجا کثرت سے خانقاہیں اور درسگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اور اس لئے چین یا ہندوستان سے آنے جانے والوں کے لئے خشکی اور زمین دونوں کے راستوں میں آرام اور آسائش کی کمی نہیں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چینی فاضل ہندوستان پہنچنے سے پہلے راستے میں کچھ مہینوں کے لئے انڈونیشیا کی کسی ہندوستانی نوآبادی میں ٹھیر جاتے تھے تاکہ وہاں رہ کر ہندوستان پہنچنے سے پہلے سنسکرت سیکھ لیں۔

پہلی تاریخی شہادت جس سے کسی ہندوستانی عالم کے چین جانے کا پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ ۶۷ء میں کیشیپ متنگا، شہنشاہ منگتی کے عہد میں، اور غالباً اس کے بلاوے پر، چین گیا تھا۔ اس نے چین جا کر لو دریا کے کنارے 'لو ینگ' کے مقام پر سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس عالم کے ساتھ دھرم رکشا نام کا ایک عالم بھی گیا تھا۔ اور اس کے بعد کے زمانے میں جو مشہور ہندوستانی عالم چین گئے ان میں چند نام یہ ہیں: بدھ بھدرا، جیو بھدرا، کمارجیو، پربارتھ، جیوگپت اور بودھ دھرم۔ ان میں سے ہر عالم کے ساتھ ہر دفعہ کچھ راہب یا شاگرد بھی جاتے رہے۔ اور

بیان کیا جاتا ہے چھٹی صدی میں صرف ' نویانگ ' کے علاقے میں ۳۰۰۰ ہندوستانی راہب اور دس ہزار ہندوستانی گھرانے موجود تھے ۔

یہ ہندوستانی فاضل نہ صرف اپنے ساتھ سنسکرت کے بہت سے مسودے لے گئے، جن کا ترجمہ انھوں نے چینی زبان میں کیا، بلکہ ان میں سے بعض نے خود چینی زبان میں بھی طبع زاد کتابیں لکھیں۔ ان لوگوں نے چینی ادب میں خاصا اہم اضافہ کیا ہے اور بعض نے تو چینی زبان میں شاعری بھی کی ہے ۔ کمارجیو جو سنہ ۴۰۱ء میں چین گیا تھا، بہت سی کتابوں کا مصنف ہے اور اس کی لکھی ہوئی ۴۷ کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ چینی زبان میں اس کے طرز بیان کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے مشہور فاضل ناگ ارجن کی سوانح عمری کا ترجمہ کیا ہے ۔ جیوگپت چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں چین گیا تھا۔ اس نے سنسکرت کی ۳۷ طبع زاد کتابوں کا ترجمہ چینی زبان میں کیا ہے۔ اس کے علم و فضل کی چین میں اتنی قدرومنزلت تھی کہ تانگ خاندان کا ایک شہنشاہ اس کا شاگرد ہو گیا تھا۔

چین اور ہندوستان کے درمیان دو مختلف راستوں سے آمدورفت ہوتی تھی اور چین کے بہت سے فاضل ان راستوں سے ہندوستان آئے ۔ ان آنے والوں میں سے چند جنھوں نے اپنے سفر کے حالات بھی لکھے ہیں، فاہیان، سُنگ ین، ہوین سانگ اور لی سنگ ہیں۔ فاہیان پانچویں صدی میں ہندوستان آیا تھا۔ جب وہ چین میں تھا تو کمارجیو کا شاگرد تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی روانگی سے پہلے جب فاہیان اپنے استاد سے رخصت ہونے کے لیے گیا تو اس نے فاہیان کو تاکید کی کہ وہاں جاکر صرف مذہبی معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کی کوشش مت کرنا، بلکہ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی اور اُن کے

عادات وخصائل کا غور سے مطالعہ کرتا تاکہ چین والے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ فاہیان نے ہندوستان آکر پاٹلی پتر کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔

چینی سیاحوں میں سب سے زیادہ مشہور یوئیں چوانگ گذرا ہے۔ یوئیں چوانگ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا، جب چین میں تانگ شہنشاہوں کی حکومت تھی اور شمالی ہندوستان میں ہرش وردھن سلطنت کر رہا تھا۔ یوئیں چوانگ صحرائے گوبی پار کرکے، ترفان، کوچا، تاش قند، سمرقند، بلخ، ختن اور یارقند ہوتا ہوا ہمالیہ کے راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اپنے سفرنامے میں اس نے اپنے سفر کے کارناموں اور مختلف طرح کے خطروں کے علاوہ وسط ایشیا کے بودھ حکمرانوں اور خانقاہوں کا حال بتایا ہے، اور اس کے علاوہ اُن ترکوں کا بھی، جو بودھ مت کے پکے پیرو تھے۔ ہندوستان آکر اس نے یہاں کے ہر علاقے کا سفر کیا۔ ہر جگہ لوگ اس سے بے حد عزت سے پیش آئے۔ یوئیں چوانگ جس جس جگہ گیا وہاں کی زندگی اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن کا بالکل صحیح مشاہدہ کیا، اور اس سلسلے میں اس نے کچھ بے حد دلچسپ، اور کچھ عجیب وغریب اور بے بنیاد سُنے سنائے واقعات لکھے ہیں۔ وہ کئی سال تک نالندا یونیورسٹی میں بھی رہا۔ یہ یونیورسٹی پاٹلی پتر سے تھوڑی ہی دور واقع تھی، اور اس کی ہمہ گیر علمی فضا کی وجہ سے ملک کے دور دور کے حصوں سے طالب علم یہاں آتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں دس ہزار راہب اور طالب علم رہتے تھے۔ یوئیں چوانگ نے اس یونیورسٹی سے قانون کی فضیلت کی ڈگری حاصل کی اور آخر میں اس یونیورسٹی کا وائس پرنسپل مقرر ہوا۔

یوئیں چوانگ کی کتاب، سی۔ یو۔ کی یا مغربی سلطنت (یعنی ہندوستان)

کے حالات بے حد دلکش تصنیف ہے۔ یوئیں چوانگ ایک حد سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا باشندہ تھا اور ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتا تھا جب چین کا دارالسلطنت سی ان فو علم وفن کا مرکز تھا۔ اس لئے اس نے ہندوستان کی زندگی کے جو حالات لکھے ہیں اور ان پر جو تبصرے کئے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ اس نے ہندوستان کے نظام تعلیم کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تعلیم بالکل ابتدائی درجوں سے شروع ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ کئی مدارج طے کرکے یونیورسٹی کی منزل تک پہنچتی تھی۔ یونیورسٹی میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی انھیں پانچ شاخوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) صرف و نحو (۲) آرٹ اور دستکاری کا علم (۳) طب (۴) منطق اور (۵) فلسفہ۔ یوئیں چوانگ نے ہندوستانیوں کے تحصیل علم کے شوق کی بے حد تعریف کی ہے۔ اس کے لکھے ہوئے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں کسی نہ کسی حد تک ابتدائی تعلیم کا رواج عام تھا اور سارے راہبوں اور پجاریوں کو معلمی کا کام کرنا پڑتا تھا۔ عام لوگوں کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ "عوام حالانکہ فطرتاً کچھ خوش باش اور لاابالی سے ہیں لیکن وہ راست باز اور باعزت ہیں۔ روپیے پیسے کے معاملے میں وہ چالاک اور عیار نہیں ہیں' اور عدل وانصاف کا بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ ..... برتاؤ میں وہ دھوکے باز نہیں ہیں' اور اپنی قسموں اور وعدوں کے پابند ہیں۔ حکومت اور انتظام کے معاملے میں ان میں حیرت انگیز راست بازی پائی جاتی ہے اور ان کے عام سلوک میں نرمی اور خوش مزاجی ہے۔ مجرم اور باغی یہاں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بہت تکلیف دینے والے۔ آگے چل کر یوئیں چوانگ نے لکھا ہے کہ "چونکہ حکومت کی بنیاد شفقت اور مہربانی پر ہے، اس نے نظم ونسق سیدھا سادا ہے۔ .... لوگوں سے زبردستی کام نہیں لیا جاتا .... ٹیکس ہلکے اور کم ہیں۔ .... تاجر اپنے کاروبار کے سلسلے میں ادھر ادھر

آتے جاتے رہتے ہیں۔"

ہوئیں چوانگ جس راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے واپس گیا اور اپنے ساتھ بہت سے مسودے لے گیا۔ اُس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خراسان، عراق اور موصل میں اور شام کی سرحد تک، بودھ کا بہت گہرا اثر تھا۔ حالانکہ یہ زمانہ بودھ مت کے انحطاط کا زمانہ تھا، اور اسلام جو عرب میں شروع ہو چکا تھا، ان سارے علاقوں پر چھا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایرانیوں کے متعلق اس نے بڑی دلچسپ رائے دی ہے کہ وہ "علم و فضل کی طرف توجہ نہیں دیتے، بلکہ آرٹ کے لطیف فنون کے دلدادہ ہیں۔ جو چیزیں وہ بناتے ہیں، وہ ہمسایہ ملکوں میں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔"

صرف اُسی زمانے میں نہیں، بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد ہمیشہ ایران کی توجہ زندگی کے حسن اور لطافت میں اضافہ کرنے کی طرف رہی ہے۔ اور اس لحاظ سے اس نے ایشیا میں دور دور تک اپنا اثر ڈالا ہے۔ صحرائے گوبی کے کنارے پر تُرفان کی چھوٹی سی سلطنت تھی، ہوئیں چوانگ نے اپنے سفرنامے میں اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس عجیب و غریب ریاست کے زیادہ حالات ہمیں حال ہی میں، اثری تحقیقات سے معلوم ہوئے ہیں۔ اس ریاست میں بہت سے تمدن آئے، اور آپس میں گھل مل کر ایک لطیف تمدن پیدا کیا، جس میں چین، ہندوستان، فارس اور یونان کے بہت سے اچھے عناصر شامل تھے۔ یہاں کی زبان ہند یورپی زبان تھی اور اس کا ماخذ ہندوستان اور ایران کی زبانیں تھیں۔ مذہب ہندوستان سے آیا، زندگی کے طریقے چین سے اور خوبصورت استعمالی چیزیں ایران سے۔ یہاں بدھ کے اور دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کے جو خوبصورت مجسمے اور تصویریں ملی ہیں ان کے جسموں پر ہندوستانی لباس ہیں اور سروں پر یونانی کُلاہ ہیں

اور کلغیاں۔ ان دیویوں کے متعلق گروٹسے نے لکھا ہے کہ وہ "ہندی لوچ اور لچک، یونانی نفاست اور چینی کشش کا مجموعہ ہیں۔"

یوئیں چوانگ اپنے ملک پہنچا تو اس کے شہنشاہ اور ہم وطنوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اور یہاں پہنچ کر اس نے اپنی کتاب لکھنے اور ان متعدد مسوودوں کے ترجمے کا کام شروع کر دیا جو وہ اپنے ساتھ ہندوستان سے لایا تھا۔ اس کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ کئی برس پہلے جب ہندوستان جانے والا تھا تو شہنشاہ "تانگ" نے اسے ایک پیالے میں ایک مٹھی خاک گھول کر دی تھی اور دیتے وقت کہا تھا "تم یہ پیالہ پی لو اس لئے کہ اپنے وطن کی ایک مٹھی خاک دوسرے ملکوں کے ہزاروں من سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔"

یوئیں چوانگ کے ہندوستان کے سفر نے، اور اُس کی اُس ہردلعزیزی نے جو اُسے چین اور ہندوستان میں حاصل تھی، دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی تعلقات قائم کرنے میں مدد دی۔ قنوج کے بادشاہ ہرش وردھن اور چینی شہنشاہ تانگ نے آپس میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے سفیر بھیجے۔ چین پہنچنے کے بعد بھی یوئیں چوانگ نے برابر ہندوستان سے اپنا ربط ضبط قائم رکھا۔ وہ اپنے ہندوستانی دوستوں کو خط لکھتا رہا اور ہندوستان کی کتابیں برابر اس کے پاس پہنچتی رہیں۔ اس سلسلے کے دو سنسکرت خط اب تک چین میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک خط ہندوستان کے ایک بودھ فاضل، پرجن دیو نے ۶۵۴ء میں یوئیں چوانگ کو لکھا تھا۔ خط کے شروع میں القاب آداب کے بعد آپس کے دوستوں کا حال اور اُن کے علمی مشاغل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد خط کا مضمون یہ ہے "یہ دکھانے کے لئے کہ ہم اپنے دوستوں کو بھول نہیں جاتے، ہم آپ کو سفید کپڑوں کا ایک جوڑا بھیج رہے ہیں۔ ہم

ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ اور یہ تحفہ بہت حقیر، لیکن آپ اس کی کم حیثیتی کا خیال نہ کریں۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ اسے قبول کرلیں۔ جہاں تک سوتروں اور شاستروں کا سوال ہے، آپ کو ان میں سے جن جن کی ضرورت ہے اُن کی فہرست بھیج دیجیے۔ ہم اُن کی نقل کر کے آپ کے پاس بھیج دیں گے۔" یوئیں چوانگ نے اس خط کا جواب یوں دیا ہے: "مجھے ایک چینی سفیر کی زبانی جو ابھی ہندوستان سے واپس آیا ہے، یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے بڑے معلم شیل بھدر اب اس دنیا میں نہیں۔ اس خبر سے مجھے اتنا رنج ہوا کہ کوئی حد نہیں ..... سوتروں اور شاستروں میں سے جو میں اپنے ساتھ لایا تھا ان میں سے میں نے یوگ چاریہ بھومی شاستر اور بعض دوسری کتابوں کا (یعنی کل ۳۰ کتابوں کا) ترجمہ کرلیا ہے۔ مجھے ایک بات اور آپ سے عرض کردینی چاہیے اور وہ یہ کہ ہندوستان سے واپسی پر جب میں دریائے سندھ کو پار کر رہا تھا تو میری بعض مذہبی کتابوں کی ایک گٹھری وہاں کھوگئی تھی۔ اب میں اس خط کے ساتھ کتابوں کی ایک فہرست بھیج رہا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اگر آپ وہ کتابیں مجھے بھیج سکیں تو بھیج دیجیے۔ میں کچھ حقیر تحفے بھی بھیج رہا ہوں۔ مہربانی کرکے اُنھیں قبول فرمائیے۔"[1]

یوئیں چوانگ نے ہمیں نالندا یونیورسٹی کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں، اور بعض دوسری کتابوں میں بھی اس کے حالات درج ہیں۔ پھر بھی، چند سال گذرے، جب میں نے نالندا کے کھنڈر دیکھے تو اُن کی وسعت دیکھ کر

---

[1] یہ اقتباس میں نے ڈاکٹر پی۔ سی۔ باگچی کی کتاب India and China (Calcutta 1944) سے نقل کیا ہے۔

مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ اب تک نالندا کے کھنڈروں کا صرف تھوڑا سا حصہ زمین کے نیچے سے نکلا ہے، لیکن اس تھوڑے سے حصے میں بھی وسیع و عریض احاطے ہیں جنھیں چاروں طرف سے پتھر کی عالیشان عمارتوں نے گھیر رکھا ہے۔

چین میں یوئیں چوانگ کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد چین کے ایک اور مشہور سیاح، یی چنگ نے ہندوستان کا سفر کیا۔ وہ ۶۷۱ء میں چین سے چلا تھا اور اُسے ہگلی دریا کے کنارے بسے ہوئے شہر تمرالپتی تک پہنچنے میں تقریباً دو سال لگے، اس لیے کہ وہ سمندر کے راستے سے آیا تھا اور سنسکرت سیکھنے کے لیے کئی مہینے تک سماترا کے شہر 'شری بھوگ' (موجودہ پالمبینگ) میں رکا رہا۔ اس سیاح کا سمندر کے راستے سے آنا کسی قدر معنی خیز ہے، اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ اس زمانے میں وسط ایشیا میں سیاسی تبدیلیاں ہو رہی ہوں اور وہ انتشار اور ہنگاموں کا زمانہ ہو۔ اور اس لیے خشکی کے راستے میں جو مہمان نواز خانقاہیں تھیں اُن کا خاتمہ ہو چکا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انڈونیشیا میں ہندی نوآبادیوں کے قیام کی وجہ سے سمندر کا راستہ زیادہ سہل اور آسان بن گیا ہو، اور ہندوستان اور ہندوستانی نوآبادیوں میں تجارتی تعلقات کے علاوہ بعض دوسرے روابط بھی ہوں۔ یی چنگ کے لکھے ہوئے حالات اور بعض دوسرے ذرائع سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایران، ہندوستان، ملایا، سماترا اور چین کے درمیان مستقل طور پر جہازرانی کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ یی چنگ نے کوانگ ٹنگ سے سماترا تک ایک ایرانی جہاز میں سفر کیا تھا۔

یی چنگ نے بھی بہت عرصے تک نالندا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ بھی ہندوستان سے سنسکرت کی کئی سو کتابیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُسے خاص طور پر بودھ مت کے رسوم اور عبادت کے طریقوں سے

دلچسپی تھی اور ان موضوعوں پر اس نے بڑی تفصیل سے باتیں لکھی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اس نے اس زمانے کے عام رسوم، لباس اور کھانے پینے کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس زمانے میں بھی لوگوں کی خاص غذا گیہوں تھے۔ اور جنوب اور مشرق کے لوگ چاول کھاتے تھے۔ گوشت بھی کھایا جاتا تھا لیکن بہت کم (یی چنگ نے غالباً یہ باتیں بودھ راہبوں کے متعلق لکھی ہیں، عوام کے متعلق نہیں) گھی، تیل، دودھ اور ملائی ہر جگہ ملتی تھی اور مٹھائیاں اور پھل بھی کثرت سے کھائے جاتے تھے۔ یی چنگ نے ہندوستانیوں کے متعلق یہ چیز خاص طور پر محسوس کی کہ وہ پاکی کو ایک مذہبی اہمیت دیتے ہیں۔ "ہندوستان اور دوسری قوموں کے درمیان پہلا اور خاص فرق یہ ہے کہ ہندوستانی پاکی اور ناپاکی کے فرق میں بے حد امتیاز کرتے ہیں۔" پھر "ہندوستان میں، چین کی طرح، بچے ہوئے کھانے کو اُٹھا کر رکھ دینے کا قطعی رواج نہیں۔"

یی چنگ نے ہندوستان کو ہمیشہ مغرب (سی فانگ) کہہ کر خطاب کیا ہے، لیکن اس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ لوگ ہندوستان کو آریہ دیش بھی کہتے تھے۔ "آریہ دیش، آریہ کے معنی 'شریف' دیش کے معنی 'علاقہ یا مُلک'، 'شریف ملک' ــــ مغرب کا یہ بھی نام ہے۔ یہ نام اُسے اس لئے دیا گیا ہے کہ یہاں شریف النفس لوگوں کی کثرت ہے اور دوسرے، ہندوستانی اس نام سے اپنے ملک کی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ اسے 'مدھیہ دیش' بھی کہتے ہیں اس لئے کہ یہ ہزاروں ملکوں کے بیچ میں واقع ہے۔ لوگ عام طور پر اس نام سے آشنا ہیں۔ صرف شمالی قومیں (ہو، یا منگول یا تُرک) آریہ دیش کو 'ہندو' کہتی ہیں۔ لیکن یہ نام عام طور پر رائج نہیں۔ یہ محض

مقامی زبان کا دیا ہوا نام ہے اور اس کی خاص اہمیت نہیں۔ ہندوستان کے لوگ اس نام سے قطعاً واقف نہیں اور ہندوستان کے لیے سب سے زیادہ موزوں نام 'آریہ دیش' ہے۔"

پی جنگ نے لفظ 'ہندو' کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ کسی قدر دلچسپ ہے۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ 'اندو' کے معنی چاند کے ہیں اور چینی زبان میں ہندوستان کے لیے جو نام ہے (یعنی 'اندو' دین تو) وہ اسی لفظ سے نکلا ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن یہ نام عام نہیں۔ اب رہا بزرگ چو (چین) کے لیے ہندوستان کے نام "چین" کا سوال، ــــ تو یہ بھی محض نام ہے، اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔" کوریا اور دوسرے ملکوں کے لیے سنسکرت میں جو نام ہیں، پی جنگ نے اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہندوستان اور ہندوستان کی بہت سی چیزوں کی پی جنگ نے بہت تعریف کی ہے۔ لیکن ایک بات اس نے واضح طور پر کہہ دی ہے کہ پہلا درجہ وہ اپنے وطن، چین کو دیتا ہے۔ ہندوستان 'شریف ملک' ہے لیکن اس کا اپنا ملک "خدائی ملک" ہے۔ "ہندوستان کے پانچوں علاقوں کے لوگ اپنی پاکیزگی اور نفاست پر ناز کرتے ہیں۔ لیکن تہذیب کی نفاست، ادب کی لطافت، تمیزداری، اعتدال پسندی، ملاقات اور رخصت کے وقت کے آداب، کھانے میں نفاست مذاق، کریم النفسی اور راست بازی صرف چین میں ہوتی ہے اور کوئی دوسرا ملک ان باتوں میں اس کا ثانی نہیں۔" "داغ کر اور چھید کر زخموں کو اچھا کرنے کے فن، اور نباضی میں ہندوستان کا کوئی حصہ چین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ درازیِ عمر کی دوا چین کے سوا اور کہیں نہیں ملتی . . .

چین اپنے انسانوں کے کردار کی بلندی اور اپنی چیزوں کی خوبی کی بدولت 'خدائی ملک' کہلاتا ہے۔ کیا ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی ایسا شخص ہے، جو چین کا مدّاح نہ ہو؟"

پرانی سنسکرت میں چینی شہنشاہ کے لئے "دیو پتر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یی چینگ نے جو خود سنسکرت کا بڑا فاضل تھا اس زبان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شمال اور جنوب کے ملکوں میں دُور دُور اس زبان کی بڑی عزت ہے ...... "پھر چین اور ہندوستان کے لوگ زبان کے اصلی قواعد آخر کہاں تک سکھائیں گے!"[1] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت کا علم چین میں خاصا مقبول اور عام تھا۔ یہ بات بے حد دلچسپ ہے کہ کچھ چینی فاضلوں نے سنسکرت کے صوتیات کو چینی زبان میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم شون وِن نامی راہب کا ہے، جو تانگ بادشاہوں کے عہد کا چینی ہے۔ اُس نے چینی زبان میں سنسکرت کے قاعدے کے مطابق ابجد کا نیا طریقہ رائج کرنا چاہا تھا۔

ہندوستان میں بودھ مت کے زوال کے بعد ہندی اور چینی فاضلوں کے یہ باہمی تعلقات تقریباً ختم ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً چینی زائر بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے ہندوستان آتے رہے۔

---

[1] یہ اقتباس میں نے جے تکاکوسو کی کتاب 'A Record of the Buddhist Religions as practised in India and the Malay Archipelago (Oxford 1896) سے لئے ہیں۔ یہ کتاب یی چنگ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے سیاسی انقلابات کے زمانے میں، ایک کثیر تعداد میں بودھ راہب، کتابوں کے پشتارے باندھ باندھ کر یا تو نیپال چلے گئے یا ہمالیہ پار کر کے تبت میں جا بسے۔ اور اس طرح ہندوستانی ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ، اس زمانے میں اور اس سے پہلے کے زمانوں میں، رفتہ رفتہ چین اور تبت پہنچ گیا۔ اور اس کا بہت بڑا حصہ حال ہی میں اصل مسودوں کی صورت میں، یا تھوڑے بہت ترجموں کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ چین اور تبت والوں نے ہندوستان کی بہت سی کلاسیکی کتابوں کے ترجمے کر کے انھیں زمانے کی دستبرد سے بچا لیا۔ یہ کتابیں صرف بودھ کے متعلق نہیں، بلکہ برہمنیت کے علاوہ، ہیئت، ریاضی اور طب کے موضوعوں پر بھی ہیں۔ چین میں ونگ پاؤ کے ذخیرے میں اس طرح کی تقریباً ۸۰۰۰ کتابیں ہیں اور تبت تو ان سے بھرا پڑا ہے۔ کبھی کبھی چین، تبت اور ہندوستان کے فاضلوں میں اشتراک عمل بھی ہوتا تھا۔ اس اتحاد اور اشتراک کی سب سے نمایاں مثال بودھ مت کی اصطلاحوں کی وہ لغت ہے جو سنسکرت، چینی اور تبتی تینوں زبانوں میں مرتب کی گئی ہے۔ یہ لغت نویں یا دسویں صدی عیسوی کی تدوین ہے اور اس کا نام "مہاویت پتی" ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کی چھپی ہوئی جو پرانی سے پرانی کتابیں چین میں دریافت ہوئی ہیں اُن میں سنسکرت کی کتابیں بھی ہیں۔ یہ کتابیں لکڑی کے ٹکڑوں پر لفظ کھود کر چھاپی گئی ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں چین میں "شاہی طباعتی کمیشن" مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے قیام کے بعد منگ عہد تک طباعت کے فن نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ ہندوستان اور چین کے فاضلوں کے درمیان اتنے قریبی تعلق تھے اور سیکڑوں برس تک ان تعلقات کی وجہ

سے ایک ملک کی کتابیں دوسرے ملک میں آتی جاتی رہیں، اس کے باوجود یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اور اس بات کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس زمانے میں ہندوستان میں کتابوں کی طباعت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بلاکوں سے چھپائی کا طریقہ تبت نے چین سے سیکھا اور وہ طریقہ غالباً اب تک وہاں رائج ہے۔ یورپ میں چینی کا رواج منگول یا یوان خاندانوں کے زمانے میں (۱۲۶۰ — ۱۳۶۸) شروع ہوا۔ سب سے پہلے جرمنی نے اسے اپنایا اور پندرھویں صدی میں دوسرے ملکوں نے اسے اختیار کیا۔

افغانوں اور مغلوں کے عہد تک، ہندوستان اور چین کے درمیان تھوڑے بہت سیاسی تعلقات کا سلسلہ قائم تھا۔ محمد بن تغلق، سلطانِ دہلی (۱۳۲۶ - ۱۳۵۱) نے مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ کو سفیر بنا کر چینی دربار میں بھیجا تھا۔ اس زمانے میں بنگال نے دہلی کی سلطنت سے الگ ہو کر اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی۔ چودھویں صدی کے وسط میں، چینی حکومت نے ہوشین اور فن شین نامی دو سفیر بنگال کے سلطان کے پاس بھیجے تھے۔ اس کے بعد سے، سلطان غیاث الدین کے عہد میں بنگال سے لگاتار کئی سفیر چین بھیجے گئے۔ یہ زمانہ چین میں منگ شہنشاہوں کا تھا۔ سیف الدین کے زمانے میں ۱۴۱۴ء میں ایک سفارت اپنے ساتھ ہندوستان کے کچھ بیش قیمت تحائف بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان تحائف میں ایک زندہ زرافہ بھی تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ زرافہ ہندوستان میں کیسے آیا۔ غالباً افریقہ سے تحفے کے طور پر آیا ہوگا اور ہندوستان والوں نے اسے ایک نادر شے سمجھ کر منگ شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس زرافے کی چین میں بڑی قدر ہوئی اس لیے کہ کنفوشس

کے پیرو زرافے کو ایک نیک شگون سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہ جانور زرافہ ہی تھا، اس لئے کہ کتابوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس کے علاوہ ریشم کے ایک کپڑے پر اس کی تصویر بھی موجود ہے۔ دربار کے جس مصور نے یہ تصویر بنائی ہے اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ جانور کتنی خوش نصیبوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس نے لکھا ہے "امیر اور غریب سب اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور اسے دیکھ کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔"

ہندوستان اور چین کے درمیان، بودھ عہد میں تجارت کا جو سلسلہ تھا وہ افغانوں اور مغلوں کے عہد میں بھی جاری رہا اور دونوں ملک آپس میں ایک دوسرے سے مال لیتے رہے۔ سوداگروں کے قافلے ہمالیہ کے دروں اور وسط ایشیا کے پُرانے کاروانی راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی مغربی ایشیا کے جزیروں میں ہوکر، بحری راستوں سے بھی تجارت ہوتی تھی۔

ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ کے باہمی ربط ضبط سے چین اور ہندوستان نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا، نہ صرف علم اور فکر کے میدانوں میں، بلکہ زندگی کے علم و فن میں بھی۔ غالباً چین نے ہندوستان کا زیادہ اثر قبول کیا اور اس کے مقابلے میں ہندوستان نے چین کا بہت کم۔ اور یہ بڑی افسوسناک بات ہوئی۔ اس لئے کہ ہندوستان کم سے کم چین سے اس کی عقل دنیاوی سیکھ کر اس کی مدد سے اپنے غیر محدود تخیل کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ چین نے ہندوستان سے بہت کچھ لیا، لیکن اس میں اتنی قوت اور خود اعتمادی تھی کہ اس نے ان چیزوں کو اپنے خاص انداز سے

لیا، اور انھیں اپنی زندگی کے تانے بانے میں ملاکر بالکل اپنا بنا لیا۔[۵] یہاں تک کہ بودھ مت اور اس کے پیچیدہ فلسفے میں کنفوشس اور لاؤزے کے افکار کا رنگ جھلکنے لگا۔ چینیوں میں زندگی کی جو محبت اور اُن کے خمیر میں جو سرخوشی شامل ہے، اُسے بودھ فلسفے کے یاس انگیز نظریے بھی نہ کم کرسکے۔ ایک پرانی چینی کہاوت ہے کہ "اگر حکومت تمھیں پکڑے تو وہ کوڑے مار مار کر تمھاری جان لے گی، اور اگر بدھ تمھیں پالیں تو وہ بھوکا مار مار کر تمھاری جان لے لیں گے!"

سولھویں صدی کے ایک مشہور چینی ناول "بندر" میں (جس کا مصنف ووچِنگ ان ہے اور جس کا ترجمہ انگریزی میں آرتھر ویلے نے کیا ہے) اُن خیالی اور من گھڑت واقعات کا ذکر ہے جو یوئیں چوانگ کو ہندوستان جاتے وقت راستے میں پیش آئے تھے۔ کتاب کا خاتمہ ایک انتساب سے ہوتا ہے جو ہندوستان کے نام ہے "میں اس کتاب کو بدھ کی پاک سرزمین کے نام معنون کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ ہمارے محسن اور معلّم کی مہربانیوں کا بدلہ چکا سکے، یا اُن کے دُکھ کم کرسکے جو گمراہ اور مردود ہیں......"

کئی صدیوں کی جدائی کے بعد، قسمت کی کرشمہ سازی سے چین اور ہندوستان دونوں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سایے میں آگئے۔ ہندستان کو دیر تک اس سایے کے تلے رہنا پڑا۔ چین پر یہ سایہ تھوڑے دن رہا لیکن جاتے جاتے یہاں افیم اور جنگ چھوڑ گیا۔

---

[۵] پروفیسر ہوشی، جو چین کے نشاۃ ثانیہ کی نئی تحریک کے لیڈر ہیں انھوں نے قدیم زمانے میں "چین پر ہندوستانی رنگ" کے متعلق لکھا ہے۔

اور اب قسمت کا چکر پورا ہو چکا اور اب پھر ہندوستان اور چین ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ماضی کی یادیں ذہنوں پر چھا رہی ہیں۔ پھر ایک دوسری طرح کے قاصد ان پہاڑوں کو پار کر کے، جو دونوں کے درمیان حائل ہیں، محبت اور ہمدردی کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچا رہے ہیں۔ پھر دوستی اور محبت کے نئے رشتے قائم ہو رہے ہیں جو ہمیشہ قائم رہیں گے۔

۱۶۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں ہندوستانی نوآبادیاں اور ہندوستانی تہذیب

ہندوستان کو جاننے اور سمجھنے کے لیے انسان کے تصور کو وقت اور مقام کی لامحدود وسعتوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان جو کچھ تھا اور جو کچھ اس نے کیا اس کی ایک جھلک دیکھنا ہو تو تھوڑی دیر کے لیے اس کی موجودہ فلاکت، اس کی تنگ دامانی اور اس کی بدحالی کو بھول جانے کی ضرورت ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے وطن کو جاننے کے لیے انسان کو اس زمانے کی طرف دیکھنا چاہیے جب جسمانی اور مادی قیدوں سے آزاد ہو کر اس نے روحانی بلندی حاصل کی تھی، اور جب اُس کی ضیا پاش اولوالعزمیوں نے مشرقی افق کو نورانی بنا دیا تھا، اور جب بیگانگی کی سرزمینوں میں بھی اس نے یگانگی کے رشتے قائم کر کے انھیں زندگی کی بیداری سے آشنا کیا تھا — آج کل کے زمانے کی طرف نہیں، جب اس نے اپنے آپ کو گمنامی کی محدود دیواروں میں گھیر لیا ہے، اور جب وہ اپنی اس بے فیض گوشہ نشینی پر نازاں ہے، اور جب اس میں ذہن کی وہ مفلسی اور ناداری پیدا ہو گئی ہے، جو ماضی کے تصور کو دہرائے جاتی ہے — اس ماضی کے تصور کو جس میں اب نہ نور باقی ہے اور نہ مستقبل کے

راہیوں کے لئے کوئی پیغام۔"

صرف گذرے ہوئے زمانے کے تصور سے کام نہیں چلتا، بلکہ انسان کو جسمانی حیثیت سے نہ سہی تو کم از کم ذہنی حیثیت سے ایشیا کے ان سارے ملکوں کا سفر کرنے کی ضرورت ہے، جہاں ہندوستان کا اثر مختلف طریقوں سے پھیلا، اور اس طرح پھیل کر اس نے ان ملکوں میں اپنی روحانیت، اپنی قوت اور اپنی حسن پرستی کے غیر فانی نقش چھوڑے۔ ہم میں کتنے ہیں جو اپنے ماضی کے ان پُرعظمت کارناموں سے واقف ہیں اور کتنے ہیں جنھیں یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کی عظمت اور بزرگی صرف اس کے افکار اور اس کے فلسفے ہی میں نہیں بلکہ عمل کے میدان میں بھی اس کا اتنا ہی بڑا حصہ ہے۔ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں نے اپنے وطن سے دور ہو کر بس تاریخ کی تخلیق کی ہے، اُسے ابھی تاریخ میں آنا باقی ہے۔ مغرب کے اکثر رہنے والوں کا اب تک یہ خیال ہے کہ قدیم تاریخ صرف ان ملکوں کی تاریخ تک محدود ہے جو بحر روم کے کنارے واقع ہیں اور متوسط اور جدید دوروں کی تاریخ پر صرف یورپ کے چھوٹے سے جنگ جو براعظم کا قبضہ ہے۔ اور پھر بھی مستقبل کے منصوبے بناتے وقت بھی وہ شاید یہ سوچتے ہیں کہ اصل میں سب کچھ یورپ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اُسے جہاں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

سر چارلس ایلیٹ نے لکھا ہے کہ "یورپ کے مورخوں نے دنیا کی تاریخ میں اس کے صحیح مرتبے کے اندازے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے صرف ہندوستان کے حملہ آوروں کے کارناموں کے دہرا دینے کو تاریخ سمجھ لیا ہے اور اس لئے اس طرح کی تاریخیں پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تصور چھوڑتی ہیں کہ ہندوستانی ایک کمزور، ناتواں اور افسردہ

قوم تھے، اور اپنے سمندروں اور پہاڑوں میں گھرے ہوئے باقی دنیا سے بے خبر اور بے تعلق۔ اس طرح کی تصویر ہندوستان کی فکری فتوحات کو نظر میں نہیں رکھتی۔ حالانکہ اگر اُن دور دراز علاقوں پر نظر کی جائے، جن تک ہندوستانیوں کی پہنچ ہوئی تو ہندوستان کی سیاسی فتوحات بھی کسی طرح حقیر اور کم نہیں۔۔۔ ۔۔۔ گو ہندوستانی فکر کی فتوحات کے مقابلے میں یہ سیاسی یا تجارتی فتوحات بے شک اہم اور قابل ذکر نہیں ہے[۱]

ایلیٹ کو غالباً جنوبی مشرقی ایشیا کی ان متعدد دریافتوں کی خبر نہیں تھی جو پچھلے چند برسوں میں ہوئی ہیں اور جنھوں نے ہندوستان اور ایشیا کے ماضی کے تصور میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ان نئے انکشافات کے علم سے اس کی دلیلوں میں زیادہ قوت پیدا ہو جاتی اور وہ اس بات پر بھی زور دے سکتا تھا کہ فکری فتوحات کے علاوہ، ہندوستان نے دوسرے میدانوں میں بھی دوسرے ملکوں پر جو اثرات ڈالے ہیں وہ کسی طرح کم اہم نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے کوئی پندرہ برس پہلے، جب میں نے جنوبی مشرقی ایشیا کی ایک مفصل تاریخ پڑھی تو کتنی حیرت ہوئی اور کتنا جوش آیا۔ میری نظر کے سامنے ایک نیا منظر آ گیا، تاریخ کی ایک بالکل نئی تصویر اور ہندوستان کے ماضی کے بالکل نئے تصورات سے مجھے اپنی فکر اور تخیل کی ترتیب نئے سرے سے کرنی پڑی۔ چمپا، کمبوڈیا، انگکور، سری وجے، مجاپہیت یکایک خلا میں سے نکل کر نظر کے سامنے آ گئے، ایک مجسم تصویر

---

[۱] Eliot: Hinduism and Budhism Vol. I, P. XII.

بن کر اور جذبے کی اس رنگینی میں ڈوبے ہوئے جو ماضی کو لاکر حال سے ملا دیتی ہے۔

اس بہادر سیلیندر کے متعلق جس کی فتوحات نہ صرف جنگ کے میدانوں تک محدود ہیں، بلکہ اُن سے باہر بھی دور تک پھیلی ہوئی ہیں، ڈاکٹر ایچ۔ جی۔ کوارچ ویلز نے لکھا ہے[۵] "اس بڑے فاتح نے (جس کے کارناموں کا مقابلہ مغربی تاریخ کے بڑے سے بڑے فاتح سے کیا جا سکتا ہے اور جس کی شہرت کا ڈنکا فارس سے چین تک بجتا تھا) دس یا بیس برس کے اندر اتنی وسیع اور قوی بحری حکومت قائم کر لی تھی کہ وہ اس کے بعد بھی پانچ صدیوں تک باقی رہی اور اسی کی بدولت ہندوستانی تہذیب اور آرٹ نے جاوا اور کمبوڈیا کو اپنی حیرت انگیز تاثیر سے مسحور کیا۔۔۔۔۔ اور سوائے چند گنتی کے مشرقی فاضلوں کے اور کسی کو یہ بات معلوم تک نہیں کہ کبھی اس طرح کی بحری سلطنت کا وجود بھی تھا۔" ابتدائی زمانے کے ان آباد کاروں کی یہ جنگی مہمیں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے ہندوستانی کردار اور فہم کی بعض ایسی خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے جن سے دنیا اب تک ناواقف تھی۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہمیت اس تمدن کی ہے جس کی ان آباد کاروں نے ان نو آبادیوں میں بنیاد ڈالی اور جو ان مقامات پر ایک ہزار برس سے بھی زیادہ زمانے تک پھلا پھولا۔

پچھلے پچیس برس کے اندر جنوبی مشرقی ایشیا کے اس وسیع و عریض علاقے کی (جسے بعض لوگوں نے "ہندوستانِ مزید" کے نام سے موسوم کیا ہے)

---

[۵] 'Towards Angkor' Harrap 1937.

تاریخ کے بہت سے واقعات سامنے آئے ہیں۔ اب بھی اس تاریخ کی زنجیر کی بعض کڑیوں کا پتہ نہیں اور واقعات میں بہت سے تناقض بھی ہیں اور مورخ ان کے متعلق برابر مختلف اور متضاد نظریے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے مجموعی پس منظر کا تعلق ہے وہ بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کی تفصیلیں بھی کثرت سے موجود ہیں۔ اس سلسلے میں مواد کی ذرا بھی کمی نہیں۔ اس لئے کہ ہندوستانی کتابوں میں، عرب سیاحوں کے سفرناموں میں، اور ان دونوں سے بھی زیادہ چین کی تاریخی کتابوں میں اس تاریخ کے اشارے اور تفصیلیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے کتبے اور تانبے کی تختیاں بھی ہیں جن سے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ پھر جاوا اور بالی میں کثرت سے اس طرح کا ادبی ذخیرہ بھی موجود ہے جس کا ماخذ ہندوستانی کتابیں یا ہندوستان کے اساطیر اور مذہبی داستانیں ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ اہم قدیم عمارتوں کے شان دار کھنڈر ہیں، خاص کر انگکور اور بروبڈور کے کھنڈر۔[1]

ہندوستانی آبادکاروں نے نوآبادیاں بسانے کا سلسلہ پہلی صدی عیسوی میں شروع کیا اور اس کے بعد سے برابر مشرق اور جنوب مشرق میں ان کے قافلے کے قافلے لنکا، برما، ملایا، جاوا، سماترا، بورنیو، سیام، کمبوڈیا اور

---

[1] اس سلسلے میں زیادہ معلومات فراہم کرنے کے لئے ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار کی کتاب "مشرق بعید میں قدیم ہندوستانی نوآبادیاں" (کلکتہ ۱۹۲۷) اور ان کی تصنیف "سورن دیپ" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ "گریٹر انڈیا سوسائٹی" کی مطبوعات بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہند چینی میں جا جا کر نو آبادیاں قائم کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ فارموسا، جزائر فلپائن اور سلیبیز تک پہنچے اور بعض مڈگاسکر تک۔ ان ساری نو آبادیوں کی زبان مقامی بولی اور سنسکرت کی کھچڑی ہے۔ ہندوستانیوں کو ان ساری بستیوں میں پھیلنے میں کئی صدیاں لگی ہوں گی، اور بہت ممکن ہے کہ یہ ان ساری جگہوں پر براہِ راست ہندوستان سے نہ گئے ہوں بلکہ درمیانی آبادیوں سے آگے بڑھتے چلے گئے ہوں۔ پہلی صدی سے نویں صدی عیسوی تک یہ نو آبادیاں چار بڑے ملکوں میں قائم ہوئیں۔ اور ان کے درمیانی وقفوں میں لوگ تھوڑے تھوڑے کرکے برابر مشرق کی طرف جاتے رہے ہوں گے۔ لیکن ان نو آبادیوں کے قیام کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے قیام میں غالباً حکومت کا منشا اور اس کا انتظام شامل تھا۔ اس لئے کہ مختلف رخوں اور سمتوں میں جو نو آبادیاں قائم کی گئیں ان کا سلسلہ بہ یک وقت شروع کیا گیا، اور عموماً یہ نو آبادیاں ایسے مقامات پر قائم کی گئی ہیں جن کی سیاسی اور تجارتی نقطۂ نظر سے کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہے۔ یہ سب کی سب نو آبادیاں مشہور تجارتی راستوں پر ہیں۔ آباد کاروں نے ان نو آبادیوں کے جو نام رکھے وہ پرانے ہندوستانی نام تھے۔ مثلاً آج کل جس جگہ کو ہم کمبوڈیا کہتے ہیں اُسے اس وقت کمبوجا کہتے تھے، جو قدیم ہندوستان میں گندھار کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس بات سے بھی اس نو آبادی کے قیام کے زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ جس زمانے میں یہ نو آبادی قائم ہوئی تھی اس وقت گندھار (افغانستان)، آریا ہندوستان کا اہم حصہ رہا ہوگا۔

لیکن بھیانک سمندروں کو پار کرکے ان غیر معمولی مہموں کی تحریک کس چیز نے پیدا کی اور ان کی تہ میں کون سا قوی جذبہ کام کر رہا تھا؟

ان نوآبادیوں کے قائم کرنے کا ارادہ کرنے اور اس ارادے کو ایک مرتب اور منظم شکل دینے سے پہلے یقینی ہے کہ مدتوں پہلے سے لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تجارت کے ارادے سے ان مقامات پر آتے جاتے رہے ہوں گے۔ سنسکرت کی بالکل قدیم کتابوں میں جابجا مشرق کے ان ملکوں کے مبہم اشارے ملتے ہیں۔ ان کتابوں میں ان ملکوں اور مقاموں کے جو نام دئے ہوئے ہیں اُن سے اصلی جگہ کا پہچاننا ذرا دشوار بات ہے لیکن کبھی کبھی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً جاوا کا لفظ صاف طور پر " یاوا دویپ " سے بنا ہے۔ یاوا دویپ کے معنی ہیں جو کا جزیرہ۔ اور آج تک بھی 'جو' کا لفظ ہندوستان میں مستعمل ہے۔ پرانی کتابوں میں جو دوسرے نام دئے ہوئے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی دھات یا صنعتی یا زراعتی پیداوار کے نام پر ہیں۔ ان ناموں ہی سے انسان کا ذہن فوراً تجارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر آر۔سی۔ موزمدار نے لکھا ہے کہ " اگر ادب کو عام ذہنوں کا عکس یا آئینہ کہا جاسکتا ہے، تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عیسائی سنہ کے شروع ہونے سے ذرا پہلے اور ذرا بعد ہندوستانیوں میں تجارت اور کاروبار کا جنون سا تھا۔ " اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان کی معاشی اور تجارتی زندگی فروغ پر تھی اور ہندوستانی برابر اپنے مال کے لئے دور دور کی منڈیوں کی کھوج میں لگے رہتے تھے۔

دوسری اور تیسری قبل مسیحی صدیوں میں تجارت نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور اس کے بعد من چلے تاجروں کے قافلوں کے پیچھے پیچھے مبلغوں نے اپنا سفر شروع کیا، اس لئے کہ یہ زمانہ اشوک سے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ سنسکرت میں اس طرح کی بہت سی کہانیاں ہیں جن میں سمندر کے سفر اور جہازوں کی تباہیوں کا

تذکرہ ہے۔ یونانیوں اور عربوں کی تحریروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان
اور مشرق بعید کے درمیان پہلی صدی عیسوی میں بحری آمد و رفت کے تعلقات کا سلسلہ
عام تھا۔ ملایا کا جزیرہ نما اور انڈونیشیا کے جزیرے عین اس راستے میں پڑتے تھے
جس سے چین، ہندوستان، فارس، عرب اور بحیرۂ روم کے علاقوں کے درمیان
تجارت ہوتی تھی۔ لیکن اس جغرافی اہمیت کے علاوہ، ان ملکوں میں بعض قیمتی
جواہرات، دھاتیں، مسالے اور لکڑی کا بھی بیش بہا سرمایہ تھا۔ ملایا، اُس
زمانے میں بھی، آج کل کی طرح، اپنی رانگے کی کانوں کے لئے مشہور تھا۔ غالباً
سب سے پہلے بحری سفروں کا سلسلہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر شروع ہوا۔
اور جہازوں نے کلنگ، بنگال، برما کے راستے سے ملایا کے جزیرہ نما کو جانا شروع
کیا۔ آگے چل کر زیادہ سیدھے اور باقاعدے راستے دریافت ہوئے۔ اور چین
کے بہت سے سیاح اور زائر اسی بحری راستے سے ہندوستان آئے۔ پانچویں
صدی عیسوی میں فاہیان جاوا ہوتا ہوا ہندوستان آیا تھا۔ اور اس نے جاوا کے
متعلق لکھا ہے کہ وہاں ملحدوں کی کثرت ہے۔ اور یہ کہنے سے اس کا مقصد یہ
ہے کہ لوگ برہمنی عقیدے کے پیرو ہیں اور بودھ مت کے نہیں۔

یہ بات یقینی ہے کہ جہاز سازی قدیم ہندوستان کی ایک ترقی یافتہ اور
خوش حال صنعت تھی۔ کتابوں میں اس زمانے کے بنے ہوئے جہازوں کی تفصیلیں
موجود ہیں۔ اور بہت سے ہندوستانی بندرگاہوں کا ذکر بھی ہے۔ دوسری اور
تیسری صدی میں جنوبی ہند (آندھرا) میں جو سکے رائج تھے اس پر دو مستولوں
والے جہاز کی شکل بنی ہوئی ہے۔ اجنتا کی نقاشیوں میں لنکا کی فتح کی تصویریں
بنی ہوئی ہیں اور ان تصویروں میں جہاز ہاتھیوں کو لے جاتے ہوئے دکھائے
گئے ہیں۔ ہندوستان کی وہ بڑی بڑی سلطنتیں جنھوں نے ان ابتدائی ہندوستانی

نوآبادیوں سے رفتہ رفتہ سلطنت کی حیثیت حاصل کرلی تھی، بنیادی طور پر بحری قوتیں تھیں اور انھیں تجارت اور بحری راستوں کے تسلط سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان میں بحری لڑائیاں بھی ہوتی تھیں اور تاریخ میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ان میں سے ایک نے ایک مرتبہ جنوبی ہند کی چول حکومت سے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ لیکن چول خاندان کی سلطنت کا تسلط بھی سمندروں پر مستحکم اور مضبوط تھا اور اس لئے انھوں نے اس مہم کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا جہازی بیڑا بھیج دیا اور اس جہازی بیڑے نے کچھ عرصے کے لئے سیلندر سلطنت کے تسلط کو کم کر دیا۔

۱۰۰۰ء کا ایک کتبہ تامل زبان میں ہے۔ اس کتبے میں "پندرہ سو کی جماعت" کا حوالہ ہے۔ یہ غالباً تاجروں کی کوئی بڑی انجمن تھی اور ان کا ذکر اس کتبے میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے "بہادر انسان، جنھیں قدرت نے ملکوں ملکوں کی سیر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور جو خشکی اور تری کے راستوں سے دنیا کے چھ براعظموں کی گہرائیوں میں گھس کر طرح طرح کی چیزوں کی تھوک اور پھٹکل تجارت کرتے ہیں ـــ مثلاً گھوڑے، ہاتھی، قیمتی جواہرات، عطر اور جڑی بوٹیاں۔

یہ قدیم ہندوستانیوں کی آبادکاری کی مہموں کا پس منظر تھا۔ تجارت، حوصلہ مندی اور توسیع کے اندرونی جذبے نے انھیں ان مشرقی سرزمینوں کی طرف مائل کیا، جنھیں سنسکرت کی پرانی کتابوں میں 'سورن بھومی' یا 'سرزمینِ زر' اور 'سورن دیپ' یا 'جزیرۂ زر' کہا گیا ہے۔ اس نام ہی میں ایک خاص کشش تھی۔ سب سے پہلے کچھ آبادکار گئے اور وہاں جا کر بس گئے، اس کے بعد کچھ اور لوگ گئے اور اس طرح پُرامن آبادکاری کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

ہندوستانیوں کو وہاں جاکر دوسری قوموں سے ملنا پڑا ۔ اور اس میل جول سے
ایک متحدہ تہذیب کی بنیاد ڈالی ۔ اور اس تہذیب نے رفتہ رفتہ ایک مستقل صورت
اختیار کرنی شروع کردی ۔ غالباً یہی زمانہ تھا جب ہندوستان کا سیاسی عنصر
یہاں داخل ہوا ۔ چھتری شہزادوں اور اونچے گھرانوں کے نوجوانوں نے اقتدار
اور خوش باشی کی تلاش میں ان نوآبادیوں کا سفر کیا ۔ ناموں کی مشابہت کو دیکھ کر
بعض مورخوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان آنے والوں میں سے اکثر مالو قبیلے
کے لوگ تھے ۔ اور انھیں سے ملایا قوم کا سلسلہ شروع ہوا، جس نے پورے
انڈونیشیا کی زندگی میں ایک نمایاں حصہ لیا ۔ وسط ہند کا ایک حصہ اب تک مالوہ
کے نام سے مشہور ہے ۔ خیال ہے کہ ابتدائی آبادکار کلنگ کے علاقوں کے
رہنے والے تھے ۔ لیکن آبادکاری کی منظم کوشش پلّو خاندان کے بادشاہوں
کے زمانے میں شروع ہوئی تھی ۔ سیلندر خاندان کے بادشاہ جنھوں نے جنوبی
مشرقی ایشیا میں بہت زیادہ شہرت اور نام وری حاصل کی، اُڑیسہ کے رہنے والے
تھے ۔ اُس زمانے میں اُڑیسہ بودھ مت کا بڑا مرکز تھا لیکن یہاں جس خاندان
کی حکومت تھی وہ برہمنوں کا خاندان تھا ۔

یہ ساری نوآبادیاں دو بڑے ملکوں اور دو بڑے تمدنوں کے درمیان
واقع تھیں ــ چین اور ہندوستان ۔ ان میں سے کچھ ایشیائی سرزمین کا حصہ تھیں
اور ان کی سرحد چینی سلطنت سے ملتی تھی ۔ باقی نوآبادیاں چین اور ہندوستان
کے تجارتی راستے کے درمیان تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان نوآبادیوں پر
دونوں ملکوں کا اثر پڑا اور یہاں ایک متحدہ ہند چینی تہذیب پیدا ہوگئی، لیکن
ان دونوں تمدنوں کی خصوصیات کچھ ایسی تھیں کہ دونوں میں کہیں اختلاف
یا تصادم نہیں پیدا ہوا اور ان دونوں کے ملے جلے نمونے اور مختلف شکلیں

ایک ہی وقت میں نشو و نما پاتی رہیں۔ جو نو آبادیاں ایشیا کی سرزمین پر تھیں ــــ یعنی برما، سیام اور ہند چینی ــــ اُن پر زیادہ اثر چین کا پڑا۔ اور جزیروں اور ملایا کے جزیرہ نما پر ہندوستان کا نقش بیٹھا۔ عموماً طرزِ حکومت اور زندگی کے عام نظریے ان لوگوں نے چین سے لیے اور مذہب اور آرٹ ہندوستان سے۔ برما، سیام اور ہند چینی اپنی تجارت کے لیے چین کے دست نگر تھے اور یہ ملک آپس میں ایک دوسرے کو سفیر بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن کمبوڈیا میں اور انگکور کے کھنڈروں میں اب تک جن فنی اثرات کا نشان ملا ہے وہ خالص ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی آرٹ میں لچک تھی اور اُسے ہر طرح کے حالات کے مطابق ڈھالا جا سکتا تھا۔ اور اس لیے ہر ملک میں یہ ایک نئے انداز سے پھلا پھولا، لیکن اس کا بنیادی نقش وہی رہا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ سر جان مارشل نے "ہندوستانی آرٹ کی حیرت انگیز قوت نمو اور لچک" کا تذکرہ بارہا کیا ہے۔ اور انھوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان اور یونان دونوں کے آرٹ میں یکساں طور پر یہ صلاحیت تھی کہ "جس ملک، قوم یا مذہب سے انھیں سابقہ پڑا، انھوں نے اپنے آپ کو اسی کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا۔"

ہندوستانی آرٹ کے بنیادی تصورات ہندوستان کے مذہبی اور فلسفیانہ رجحانات کے بعض آدرشوں کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اور اس لیے جب ہندوستان سے مذہب ان مشرقی علاقوں میں گیا تو آرٹ کا یہ بنیادی تصور بھی اس کے ساتھ ساتھ گیا۔ غالباً ابتدائی نو آبادیاں برہمنی نو آبادیاں تھیں اور بودھ مت ان میں بعد کو پھیلا۔ اور پھر دونوں یہاں ہمجولیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہے اور ان دونوں نے مل کر عبادت کے بعض مشترک طریقے پیدا کر دیے۔ ان نو آبادیوں کا بودھ مت 'مہایان' قسم کا تھا اور اس کے انداز میں لچک

اور قبول کی صلاحیت تھی۔ اس لیے مقامی عادات اور رسوم سے متاثر ہو کر، دونوں نے اپنے بنیادی عقائد سے ہٹ کر ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ بعد کے زمانے میں ایک برہمنی حکومت اور بودھ حکومت کے درمیان سخت قسم کے تصادم ہوئے۔ لیکن اس تصادم اور اختلاف کی بنیاد مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی مفاد تھا اور لڑائیاں تجارت اور بحری راستوں پر تسلط حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں۔

ان ہندوستانی نوآبادیوں کی تاریخ تقریباً تیرہ سو یا اس سے بھی کچھ زیادہ زمانے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی ابتدا پہلی یا دوسری صدی سے ہوتی ہے اور خاتمہ پندرھویں صدی کے آخر میں۔ شروع کے زمانے کی تاریخ مبہم اور غیر واضح ہے اور سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ختم ہوتی گئیں اور پانچویں صدی تک بڑے بڑے شہر بن گئے۔ آٹھویں صدی تک کچھ بحری سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ یہ سلطنتیں کسی حد تک مرکز بند تھیں لیکن عموماً ان کا برائے نام اقتدار بہت سے علاقوں میں پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ محروسہ علاقے آزاد ہو جاتے اور مرکزی سلطنت پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے سمجھنے میں طرح طرح کی الجھنیں پیش آتی ہیں۔

ان سلطنتوں میں سب سے بڑی سیلندر سلطنت یا سری وجے کی سلطنت تھی۔ یہ سلطنت آٹھویں صدی تک 'ملیشیا' کے بحری اور بری علاقوں میں سب سے زبردست اور قومی سلطنت بن گئی تھی۔ چند برس پہلے تک عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سلطنت کی ابتدا سماترا میں ہوئی

اور وہیں اس کا دارالسلطنت تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ پتہ چلا ہے کہ یہ
ملایا کے جزیرہ نما میں شروع ہوئی تھی۔ جس زمانے میں اس سلطنت کا عروج
تھا، اس زمانے میں اس میں ملایا، لنکا، سماترا، بورنیو، سلیبز، فلپائن، جاوا
کا کچھ حصہ اور فارموسا کا کچھ علاقہ شامل تھا۔ اور غالباً کمبوڈیا اور چمپا بھی
اس کے زیرنگیں تھے۔ یہ حکومت اپنے عقیدے میں بودھ مت کی پیرو تھی۔

لیکن سیلندر خاندان کے اقتدار میں آنے اور یہ بڑی سلطنت بننے
سے پہلے بھی ملایا، کمبوڈیا اور جاوا میں خاصی بڑی بڑی سلطنتیں تھیں۔
آر۔ ولکنسن نے لکھا ہے کہ جزیرہ نما ملایا کے شمالی علاقے میں، سیام کی سرحد
سے قریب، جو وسیع وعریض کھنڈر ہیں، اُن سے "گذرے ہوئے زمانے
میں با اقتدار حکومتوں اور دولت اور آسایش کے بلند معیار کی موجودگی کا
پتہ چلتا ہے۔" چمپا (انام) میں تیسری صدی میں پنڈورنگم نام کا ایک شہر
تھا اور پانچویں صدی میں کمبوجا ایک بہت بڑا شہر تھا۔ نویں صدی میں
ایک زبردست حکمراں، جے ورمن نے کمبوڈی سلطنت قائم کی اور انگکور
کو اس کا دارالسلطنت بنایا۔ کمبوڈیا غالباً وقتاً فوقتاً سلیندر حکمرانوں کے تحت
میں بھی رہا ہے۔ لیکن شاید یہاں ان بادشاہوں کا اثر برائے نام تھا۔ اور
اس لیے نویں صدی میں یہ ایک خود مختار سلطنت بن گیا۔ کمبوڈیا کی سلطنت
کوئی چار سو برس تک قائم رہی اور اسی پر لگاتار کئی بڑے بڑے شہنشاہوں
کی حکومت رہی مثلاً جے ورمن، یشو ورمن، اندر ورمن اور سوریہ ورمن۔
یہ سب بادشاہ عمارتوں کے بھی بے حد شوقین تھے۔ اس سلطنت کا دارالسلطنت
پورے ایشیا میں مشہور تھا اور لوگ اسے "عظیم الشان انگکور" کہتے تھے۔
اس شہر میں دس لاکھ کی آبادی تھی اور وسعت اور شکوہ میں یہ قیصرانِ روم

کے شہر پناہ سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ شہر کے بالکل قریب "انگکور وات" کا عالیشان مندر تھا۔ کمبوڈیا حکومت تیرھویں صدی کے آخر تک قائم رہی۔ اور ایک چینی سیاح نے جو ۱۲۹۶ء میں یہاں آیا تھا اس کے دارالسلطنت کی دولت اور عظمت و شکوہ کا حال بیان کیا ہے۔ لیکن اس سلطنت کا خاتمہ اچانک ہوگیا ــــ اتنا اچانک کہ اس کی بہت سی عمارتیں ادھوری رہ گئیں۔ اس سلطنت پر بیرونی حملے بھی ہوئے اور اندرونی طور پر بھی طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوئیں، لیکن سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ میکانگ دریا کی ریت نے جم جم کر شہر میں داخل ہونے کے راستوں کو دلدل بنا دیا اور اسی طرح شہر رفتہ رفتہ ویران ہوگیا۔

نویں صدی میں جاوا نے بھی سیلندر سلطنت سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ لیکن اس کے باوجود انڈونیشیا میں گیارھویں صدی تک سیلندر سلطنت ہی سب سے بڑی اور سب سے مقتدر حکومت رہی۔ آخر گیارھویں صدی میں جنوبی ہند کی چول حکومت سے اس کی جنگ چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں چول شہنشاہ کی جیت ہوئی اور اس کے بعد سے کوئی پچاس برس تک انڈونیشیا کے بہت بڑے حصے پر ان کا قبضہ رہا۔ پچاس برس بعد جب چول سلطنت کا دور دورہ ختم ہوا تو سیلندر خاندان کی حکومت پھر نئے سرے سے قائم ہوگئی اور کوئی تین سو برس تک ان کی خود مختار حکومت باقی رہی۔ لیکن اب مشرقی سمندروں میں اس کا پہلا سا اقتدار باقی نہیں رہا تھا اور آخر تیرھویں صدی میں اس کا انتشار شروع ہوگیا اور اس انتشار سے جاوا اور سیام کو فائدہ پہنچا۔ انھوں نے رفتہ رفتہ ترقی کرنی شروع کی اور آخر چودھویں صدی کے نصف آخر میں جاوا نے سری وجے کی سیلندر

سلطنت کو پوری طرح فتح کر لیا۔

اب جاوا کی سلطنت کی شہرت اور اس کا اقتدار بڑھ گیا۔ جاوا کی حکومت شروع ہی سے برہمنی عقیدے کی پیرو تھی اور بودھ مت کے پھیل جانے کے بعد بھی جاوا اسی عقیدے پر قائم رہا۔ شروع شروع میں جب جاوا کے آدھے حصے پر سیلندر خاندان کی حکومت تھی تو مجموعی حیثیت سے اس نے ان کا سیاسی اور معاشی اقتدار قبول نہیں کیا۔ جاوا میں زیادہ تر ایسے لوگ آباد تھے جنھیں تجارت کا بے حد شوق تھا اور اسی سلسلے میں وہ برابر سمندر کے سفر کرتے رہتے تھے۔ جاوا والوں کو پتھر کی بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا بھی بہت شوق تھا۔ شروع شروع میں جاوا کی سلطنت کو سنگھاسری کی سلطنت کہتے تھے لیکن ۱۲۹۲ء میں مجاپہیت نام کے ایک شہر کی بنیاد ڈالی گئی، اور اسی نے بڑھ کر 'مجاپہیت' سلطنت کی شکل اختیار کر لی اور سری وجے کے بعد یہی سلطنت جنوبی مشرقی ایشیا کی سب سے مقتدر قوت بن گئی۔ مجاپہیت نے جنگلا خاں کے بھیجے ہوئے سفیروں کی کچھ توہین کر دی اور اس کی سزا میں جنگلا خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ غالباً جاوا والوں نے بارود کا استعمال چینیوں سے سیکھا اور اسی کی مدد سے انھوں نے سب سیلندروں کو شکست دی۔

'مجاپہیت' ایک مرکزی اور بڑھتی ہوئی سلطنت تھی۔ اس سلطنت میں ٹیکسوں کا انتظام بہت زیادہ مرتب اور منظم تھا اور اس میں تجارت اور نو آبادیوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ حکومت میں تجارت اور نو آبادیات کے الگ الگ محکموں کے علاوہ، صحت عامہ، جنگ اور اندرونی معاملات کے انتظام کے لئے علیحدہ علیحدہ محکمے تھے۔

یہاں ایک عدالت عالیہ بھی تھی جس میں کئی جج تھے۔ اس سامراجی حکومت کی تنظیم کو دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کاروبار چین اور ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ یہاں کے مشہور حکمرانوں میں سے ایک شہزادی 'سہتا' تھی۔

مجاپہیت اور سری وجے کے درمیان جو جنگ ہوئی وہ بڑی خونریز اور ظالمانہ تھی۔ اور گو رس میں مجاپہیت کو مکمل فتح حاصل ہوئی، لیکن اس فتح نے دوسری لڑائی کے بیج بو دیے۔ سیلندر سلطنت کی تباہی کے کھنڈروں پر سماترا اور ملاکا میں ملایا کی حکومت کی بنیاد قائم ہوگئی، جس میں عربوں اور نومسلموں کے علاوہ، بعض دوسری قومیں بھی شامل تھیں۔ مشرقی سمندر جو اب تک جنوبی ہند یا ہندوستانی نوآبادیوں کے تحت میں تھے اب عربوں کے ہاتھ میں آگئے۔ ملاکا تجارت اور سیاسی قوت کا ایک زبردست مرکز بن گیا اور ملایا کے جزیرہ نما اور جزیروں میں اسلام پھیل گیا۔ اور اس نئی طاقت نے پندرھویں صدی کے آخر میں مجاپہیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ لیکن چند ہی سال کے اندر، ۱۵۱۱ء میں البقرق کی سرکردگی میں پرتگالی آئے اور انھوں نے ملاکا پر قبضہ کر لیا۔ یورپ، اپنی بڑھتی ہوئی سمندری طاقت کے زور پر مشرق بعید میں پہنچ گیا۔

۱۷۔ ہندوستانی آرٹ کا اثر ہندوستان سے باہر

محقق سلفت کی نظر میں پرانی سلطنتوں اور حاکم خاندانوں کے یہ حالات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن تہذیب اور آرٹ کی تاریخ میں ان کی اہمیت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے

یہ حالات اور بھی زیادہ اہم ہیں اس لئے کہ اصل میں یہ سارے حالات ہندوستان ہی کی سرگرمیوں کے حالات ہیں۔ اور ہندوستان نے ان نوآبادیوں میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے مظاہرے مختلف طریقوں سے کئے۔ اس عہد میں ہمیں ہندوستان کی قوتِ نمو میں ایک طرح کا جوش نظر آتا ہے اور اسی جوش کی رہبری میں ہندوستان دور دراز کے علاقوں میں پھیلا اور اپنے ساتھ نہ صرف اپنے افکار لے گیا، بلکہ اپنے آدرش، اپنا آرٹ، اپنی تجارت، اپنی زبان اور ادب اور حکومت کے طریقے بھی ان ملکوں میں پھیلائے۔ اونچے پہاڑ اور اتھاہ سمندر اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکے اور ہندوستان دنیا سے الگ تھلگ، بے تعلق رہنے کے بجائے ان اونچے پہاڑوں کی بلندیوں اور پُرمنظر سمندروں کی گہرائیوں کو عبور کرتا ہوا باہر نکل گیا اور جیساکہ ایم۔ رینے گروسے نے لکھا ہے کہ اُس نے" ایک وسیع ہندوستان" کی تعمیر کی "جو سیاسی حیثیت سے اتنا ہی کم منظم تھا جتنا، وسیع یونان، لیکن اخلاقی حیثیت سے اتنا ہی متوازن اور ہم آہنگ۔" اور حقیقت میں ملیشیا کی ان سلطنتوں کا سیاسی نظام بھی اونچے درجے کا تھا، گو یہ نظام ہندوستان کے سیاسی نظام کا جزو نہ تھا بلکہ اس سے علیحدہ تھا۔ لیکن گروسے نے ان دور دور کے علاقوں کا ذکر کیا ہے جہاں تک ہندوستانی تہذیب پھیل گئی تھی "مشرقی ایران کے اونچے پلیٹو میں، سرندیا کے نخلستانوں میں، تبت، منگولیا اور منچوریا کے بنجر علاقوں میں، چین اور جاپان کی مہذب سرزمینوں میں، مون اور کھمیر کی غیر مہذب بستیوں میں، ہند چینی کے قبیلوں میں، انڈونیشیا اور ملایا میں ـــ ان ساری جگھوں میں مذہب، آرٹ اور لٹریچر، غرض

ہر اس چیز پر جس کا تعلق وجدان سے ہے، ہندوستان نے اپنی بلند تہذیب کا غیر فانی نقش چھوڑا۔" لہ

ہندوستانی تمدن نے جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں میں خاص کر اپنی جڑیں قائم کر لیں اور اس کی شہادتیں آج بھی اُن ملکوں کے چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ چمپا، انگکور، سری وجے، مجاپہیت اور دوسری جگہوں پر سنسکرت تعلیم کے بڑے بڑے مرکز قائم تھے۔ ان مختلف سلطنتوں اور حکومتوں کے حکمرانوں کے نام خالص ہندی اور سنسکرت ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ وہ لوگ ہندوستانی تھے لیکن یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اُن پر ہندوستانیت کا گہرا اثر تھا۔ سرکاری جشن ہندوستانی طریقے سے منائے جاتے تھے اور ان کی کارروائی سنسکرت میں ہوتی تھی۔ سرکاری افسروں کو سنسکرت کے پُرانے خطاب دیئے جاتے تھے اور ان میں سے بعض خطاب اور عہدے نہ صرف تھائی لینڈ میں، بلکہ ملایا کی اسلامی ریاستوں میں اب تک رائج ہیں۔ انڈونیشیا کے ان پرانے مقامات کا ادب بھی ہندوستانی اساطیر اور داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ جاوا اور بالی کے مشہور ناچ بھی ہندوستان ہی سے لئے گئے ہیں۔ بالی کے چھوٹے سے جزیرے میں پرانی ہندوستانی تہذیب اب تک باقی ہے، یہاں تک کہ ہندو مذہب بھی وہاں آج تک رائج اور قائم ہے۔ فلپائن میں لکھنے کا فن ہندوستان ہی سے گیا تھا۔

کمبوڈیا کی ابجد کا مآخذ جنوبی ہند کی زبانیں ہیں اور اس زبان میں

لہ "Civilisations of the East" by Rene Grousset, Volume II, page 276.

بہت سے سنسکرت لفظوں کو تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اپنا لیا گیا ہے یہاں
کے دیوانی اور فوجداری کے قانون ہندوستان کے قدیم مقنن منو کے قانونوں
کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں۔ بودھ مت کے اثر کے ماتحت ان میں تھوڑی
بہت تبدیلیاں ہوگئی ہیں لیکن ان کی اصل وہی پرانا قانون ہے[۵]

لیکن اصل میں ہندوستان کا اثر سب سے زیادہ، ان قدیم ہندوستانی
نوآبادیوں کے آرٹ اور سنگ تراشی پر نمایاں ہے۔ ہندوستانی فن کے
بنیادی تصور میں، مقامی رنگ کی گہرائیوں نے مل جل کر تھوڑی بہت
تبدیلیاں کیں اور اس امتزاج نے انگکور اور بورو بدور کی پرشکوہ عمارتوں
اور حیرت انگیز مندروں کی تعمیر کی۔ جاوا میں بورو بدور کے مقام پر بدھ کی
زندگی کے پورے حالات پتھروں پر کھُدے ہوئے ہیں۔ دوسرے مقام پر
وشنو، رام اور کرشن کی داستانوں کو اُبھری ہوئی نسبت کاری کی شکل میں
دکھایا گیا ہے۔ مسٹر اوسبرٹ سٹون نے انگکور کے متعلق لکھا ہے "مجھے
یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انگکور اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ
عجیب و غریب چیز ہے، انسانی دانش مندی نے پتھر پر اپنے جو نقوش چھوڑے
ہیں یہ اُس کی ایک نمایاں مثال ہے، اور جو کچھ نظر کو چین میں دکھائی دیتا ہے

---

[۵] A. Leclère — 'Recherches sur les origines brahmaniques des lois Combodgiennes' quoted in B.R. Chatterji's 'Indian cultural Influence in Combodia' (Calcutta 1928.)

اس سے کہیں زیادہ دلنشین، خوبصورت اور رومانی "۔۔۔۔۔۔ ایک ایسے تمدن کی مادی نشانیاں، جس نے چھ صدیوں تک اپنی باعزم پرواز کی بلندیاں دکھائیں، اور پھر اس طرح ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا کہ انسان کی زبان پر اس کا نام تک باقی نہ رہا۔"[1]

انگکور وات کے عظیم الشان مندر کے چاروں طرف ایک بہت بڑا رقبہ ہے اور اس میں مصنوعی جھیلوں اور تالابوں کے، اور ان پر بنی ہوئی نہروں اور پلوں کے پرشکوہ کھنڈر ہیں۔ اور ایک بڑا پھاٹک بنا ہوا ہے جس پر ایک بہت بڑا پتھر کا سر بنا ہوا ہے، حسین، مسکراتا ہوا لیکن پُراسرار کمبودی چہرہ، جس میں دیوتاؤں کی سی قوت اور کشش نمایاں ہے۔"[2] یہ چہرہ، جس پر ایک عجیب قسم کی دلفریب اور ہیجان خیز مسکراہٹ ہے بار بار دکھائی دیتا ہے۔ یہ پھاٹک مندر کی طرف جانے کا راستہ ہے "اس مندر کو دنیا میں سب سے زیادہ پرتخیل، اور حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے، خود انگکور وات سے بھی زیادہ حسین، اس لئے کہ اس کے تصور میں زیادہ روحانیت ہے، جیسے یہ مندر کسی بہت دور کے سیارے میں بسے ہوئے شہر سے اتر کر آ گیا ہو۔۔۔۔ اس میں پُرسحر حسن ہے جو صرف پرشکوہ نظم کے مصرعوں میں ہوتا ہے۔"[3]

انگکور کی تخلیقی تحریک ہندوستان سے آئی، لیکن کھمیری ذہن نے اسے نشوونمادی یا دونوں کے امتزاج سے یہ حیرت انگیز کارنامہ وجود میں آیا۔ جس کمبوڈی بادشاہ نے یہ مندر بنوایا تھا اس کا نام جے ورمن ہفتم بتایا جاتا ہے۔

[1، 2 و 3] یہ تینوں اقتباس ادبرٹ سٹول کی کتاب "Escape with me" - An oriental Sketch Book (1941) سے لئے گئے ہیں۔

یہ نام خالص ہندوستانی نام معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوارج ویلز نے لکھا ہے کہ "ہندوستان کا رہنما تخیل یہاں سے چلا گیا، لیکن اس کا الہامی تصور باقی رہا۔ اور اس الہامی تصور سے کمبوڈی اختراع نے زیادہ وسیع اور زیادہ نئے تصور پیدا کئے۔ ان نئے تصورات میں حیرت انگیز توانائی تھی اور یہ ہندوستانی تصور اور تخیل سے بالکل مختلف بھی تھا، اس لئے اس کا مقابلہ کسی ایسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا جو خالص ہندوستانی فضا میں پیدا ہوئی ہو ...... یہ صحیح ہے کہ کھمیر تہذیب کی عمارت ہندوستانی تخیل اور تصور کی بنیاد پر کھڑی ہوئی" اور اس تخیل اور تصور کی رنگ آمیزی کے بغیر کھمیر اپنے فن اور آرٹ میں زیادہ سے زیادہ وہ وحشیانہ عظمت اور شکوہ پیدا کر سکتے تھے جو وسط امریکا کے مایا قبیلوں کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ "ہندوستانِ مزید" کے کسی اور علاقے میں ہندوستانی تخیل نے اتنے دلنشین اثرات پیدا نہیں کئے جتنے یہاں۔"[1]

اس چیز سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ خود ہندوستان میں بھی یہ تخلیقی قوت رفتہ رفتہ گھٹتی گئی، اس لئے کہ ایک مدت کے بعد زمین میں وہ زرخیزی اور ذہن میں وہ جدت نہ رہی اور نئے خیالات اور نئی تحریکوں کی آبیاری سے محروم رہنے کی وجہ سے تہذیب کی کھیتی سوکھ کر رہ گئی۔ جب تک ہندوستان نے اپنے ذہن کا دروازہ کھلا رکھا، اور اپنی دولت دوسروں کو دیتا اور اپنی کمی دوسروں کی دولت سے پوری کرتا رہا، اس میں

---

[1] ڈاکٹر ایچ۔ جی۔ کوارج ویلز کی کتاب "Towards Angkor" (Harrap 1933) سے ماخوذ۔

تازگی بھی رہی اور قوت اور توانائی بھی۔ لیکن جوں جوں اس نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی خاطر، خلوت پسندی سے کام لیا، اور بیرونی اثرات سے بچنے کی کوشش کی، اُس کی تخلیقی اُپج فنا ہوئی گئی، اور اس کی زندگی مردہ ماضی کی یادوں میں گھری ہوئی بے معنی سرگرمیوں کا غیر دلچسپ مجموعہ بن کر رہ گئی۔ اُس نے خود حسن کی تخلیق کی قوت گنوادی اور اس کی اولاد میں حسن کے احساس کی صلاحیت تک باقی نہیں رہی۔

جاوا، انگکورا اور "ہندوستان مزید" کے مختلف علاقوں میں جو کھدائی اور جدید تحقیقات ہوئی ہے اس کا سہرا یورپ کے ماہرین اثریات اور خاص کر فرانس اور ہالینڈ کے فاضلوں کا ہے۔ غالباً اب بھی بڑے بڑے شہر اور بڑی بڑی یادگاریں خاک کے نیچے تحقیق و انکشاف کی منتظر پڑی ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ کانوں سے معدنیات نکالنے اور سڑکیں بنانے کے لئے سامان حاصل کرنے کی غرض سے ملایا کے اُن اہم علاقوں کو جن میں کثرت سے پُرانے کھنڈر تھے، تباہ و برباد کر ڈالا گیا ہے۔ جنگ اس تباہی اور بربادی میں اور بھی اضافہ کرے گی۔

چند سال ہوئے ایک تھائی (سیامی) طالب علم نے جو ٹیگور کے شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا تھا اور اب تھائی لینڈ واپس جارہا تھا، مجھے ایک خط میں لکھا تھا "میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے آریہ ورت کی اس قدیم اور پُرعظمت سرزمین میں آنے کا موقع ملا اور میں نے اپنی نانی 'بھارت' کے قدموں میں اپنی حقیر ارادت پیش کی، جس کے شفیق بازوؤں میں پل کر میری مادر وطن پروان چڑھی اور اُس نے تہذیب اور مذہب کے حسن اور بلندی کو سراہنا اور چاہنا سیکھا۔" ممکن ہے یہ محض انفرادی

رائے ہو لیکن اس سے اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جنوبی
مشرقی ایشیا کے بہت سے ملکوں میں ہندوستان کی طرف سے کیا جذبات ہیں۔
ہر ملک میں ایک شدید اور تنگ نظر قومیت پیدا ہو گئی جو صرف اپنی طرف
دیکھتی ہے اور دوسروں سے وحشت کرتی ہے۔ ان میں یورپ کے تسلط
اور غلبے کا خوف بھی ہے، اُس سے نفرت بھی، اور اس کے باوجود اُنھیں یورپ
اور امریکا کی تقلید کا شوق ہے۔ وہ ہندوستان کی مجبوری اور غلامی کی وجہ
سے اُس کی طرف سے حقارت کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن اس تحقیر کے پیچھے
ہندوستان کی عزت اور اس سے دوستی کرنے کا خیال بھی موجود ہے۔ اس لئے
کہ پرانی یادیں اب بھی قائم ہیں اور لوگوں کے لئے یہ بھولنا آسان نہیں کہ ایک
زمانہ تھا جب ہندوستان نے مادرانہ شفقت سے ان کی پرورش کی اور انھیں
تہذیب و تمدن کی دولت سے مالا مال کر دیا، جیسے یونانیت، یونان سے نکل کر
رومی ممالک اور مغربی ایشیا میں پھیلی، بالکل اسی طرح، ہندوستان کی تہذیب
بہت سے ملکوں میں پہنچی اور ان پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔

سلوین لوی نے لکھا ہے کہ "ایران سے لے کر بحیرۂ چین تک، سائبیریا
کے برفانی علاقوں سے لے کر، جاوا اور بورنیو کے جزیروں تک، اوشینیا سے
لے کر سقوطرہ تک ہندوستان نے اپنے عقیدے، اپنی روایات اور اپنا تمدن
پھیلایا ہے۔ اُس نے مسلسل کئی صدیوں تک دنیا کی ایک چوتھائی آبادی
پر اپنے غیر فانی نقش چھوڑے ہیں۔ اور اس لئے اُسے حق ہے کہ وہ دنیا
کی تاریخ میں اپنے لئے اُس مرتبے کا مطالبہ کرے جس سے جہالت نے
اب تک اُسے محروم رکھا تھا۔ اور اس طرح اپنے آپ کو دنیا کی اُن بڑی
قوموں کی صف میں کھڑا کر سکے جو انسانیت کی روح کی ترجمان اور مفسر

ہیں۔ [۱]

۱۸۔ پرانا ہندوستانی آرٹ

ہندوستانی تہذیب اور آرٹ اس وسیع پیمانے پر ہندوستان سے باہر پھیلا کہ اس آرٹ کے بعض بہترین نمونے ہمیں ہندوستان کے باہر ہی ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری بہت سی پرانی عمارتیں اور سنگ تراشی کی یادگاریں، زمانے کی دست برد سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ اور اس لئے سر جان مارشل نے لکھا ہے کہ "ہندوستانی آرٹ کو صرف ہندوستان میں رہ کر دیکھنا اس کی ادھوری کہانی جاننا ہے۔ اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں بودھ مت کی ترقی کے زمانے کے وسط ایشیا، چین اور جاپان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہمیں تبت، برما اور سیام میں جاکر اس کی وہ نئی نئی صورتیں اور نئے نئے حسن دیکھنے چاہئیں جو اس نے ان ملکوں میں جاکر پیدا کئے اور ہمیں حیرت اور استعجاب سے آرٹ کے ان شاندار کارناموں پر نظر ڈالنی چاہئے جو اس نے کمبوڈیا اور جاوا میں انجام دئے۔ ان مختلف ملکوں میں ہندوستانی آرٹ کو ایک مختلف قومی رجحان اور ایک مختلف قومی رجحان، اور ایک مختلف مقامی فضا اور ماحول کا سامنا کرنا پڑا اور ان مختلف فضاؤں میں اس نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔" [۲]

---

[۱] یو۔ این۔ گھوسال کی کتاب Progress of Greater Indian Research — 1917-1942 (Calcutta 1943.) سے نقل کیا گیا۔

[۲] From Foreward to Reginald Le May's "Buddhist Art in Siam (Cambridge 1938)

(دیکھئے صفحہ آئندہ)

ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی مذہب اور فکر میں بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ اور اس لیے جب تک انسان کو ان آدرشوں کا تھوڑا بہت علم نہ ہو جو ہندوستانی ذہن کی رہبری کرتے ہیں، اس وقت تک وہ ہندوستانی آرٹ کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ آرٹ اور موسیقی دونوں میں مشرق اور مغرب کے تصور میں بہت زیادہ فرق ہے۔ غالباً زمانہ متوسط کے یورپ کے مصور اور سنگ تراش ہندوستانی آرٹ اور سنگ تراشی کے آدرشوں سے زیادہ ہم آہنگ تھے، بمقابلہ یورپ کے نئے آرٹسٹوں کے، جن کے تصورات کسی حد تک نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد کے دوروں سے متاثر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی آرٹ کے پیچھے ہمیشہ ایک مذہبی جذبہ، اور ایک مابعد الطبیعی نظر کام کرتی ہے اور یہی حال غالباً ان سنگ تراشوں کا ہوگا جنھوں نے یورپ کے بڑے بڑے گرجا گھر بنائے تھے۔ حسن کو ایک داخلی شے سمجھا جاتا ہے، خارجی نہیں۔ اس کا تعلق روح سے ہے، گو یہ اپنے اظہار کے لیے حسین مادی صورت بھی اختیار کرتا ہے۔ یونانی حسن سے خود حسن کی خاطر محبت کرتے تھے، اور انھیں اس میں مسرت بھی حاصل ہوتی تھی اور حقیقت کی معرفت بھی۔ قدیم ہندوستانیوں کو بھی حسن سے محبت تھی، لیکن وہ ہمیشہ اپنے فن کو کسی گہری حقیقت کا ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے، وہ حق کی باطنی کیفیت کو ظاہری شکل دینے کے خواہاں تھے۔ انسان جب ان کے بہت اونچے قسم کے تخلیقی کارناموں کو دیکھتا ہے تو چاہے وہ فن کار کے مقصد کو نہ سمجھ سکے اور اسے اس کا بھی اندازہ نہ ہو کہ ان تخلیقی

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) — quoted by Ghosal in "Progress of Greater Indian Research (Calcutta 1943.)

کارناموں کا بنیادی جذبہ یا تصور کیا ہے، پھر بھی ان کی تعریف کرنے پر مجبور سا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب انسان کے سامنے نسبتاً کم حیثیت کا کارنامہ ہو تو آرٹسٹ کی ذہنی کیفیت سے ناواقفیت، فن کو پوری طرح سمجھنے میں حائل ہوتی ہے۔ جو بات انسان کی سمجھ میں نہیں آتی اس سے اس میں بے چینی کی ایک مبہم سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بے چینی جھنجلاہٹ بن جاتی ہے اور اس سے انسان یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ آرٹسٹ اپنے فن میں کچا ہے اور وہ کامیاب نہیں رہا — یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ جذبہ نفرت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

میں مشرقی یا مغربی آرٹ کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور اس لئے اپنے آپ کو اس کے متعلق کوئی رائے دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں تو اس سے بالکل اسی طرح متاثر ہوتا ہوں جیسے کوئی ناواقف عامی ہو سکتا ہے۔ کسی تصویر یا سنگ تراشی یا عمارت کو دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے، میرے جذبات متاثر ہوتے ہیں اور میں کبھی کبھی اپنے اوپر ایک عجیب کیفیت طاری پاتا ہوں — یا اسے دیکھ کر مجھے بس معمولی سی خوشی ہوتی ہے۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرے لئے اس چیز میں ذرا بھی کشش نہیں ہوتی اور میں اس کے پاس سے یوں ہی گزر جاتا ہوں — یا کبھی اس سے میرے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں ان تاثرات کی صحیح تاویل نہیں کر سکتا، اور نہ فنی تخلیقوں کی اچھائیوں یا برائیوں کے متعلق کوئی مبصرانہ رائے دے سکتا ہوں۔ لنکا میں انورادھاپور میں بدھ کا جو مجسمہ ہے اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور اس مجسمے کی تصویر کئی برس سے برابر میرے پاس رہتی ہے۔ اس کے برخلاف جنوبی ہند کے مندروں کو دیکھ کر، (جن کے نقوش میں بے حد تفصیلیں اور باریکیاں ہیں)، مجھے گھبراہٹ اور

بے چینی سی ہوتی ہے۔

یورپ کے لوگوں نے، جو اصل میں یونانی آرٹ کے ماہر تھے، شروع شروع میں ہندوستانی آرٹ کو یونانی نقطۂ نظر سے جانچنے کی کوشش کی۔ گندھارا اور سرحد کے علاقوں میں یونانی بودھ آرٹ کے جو نمونے تھے انھیں ان مبصروں نے فوراً پہچان لیا اور اس کے بعد اس فیصلے پر پہنچے کہ ہندوستان میں آرٹ کے جو باقی نمونے ہیں وہ اسی کی بگڑی ہوئی اور کمتر درجے کی صورتیں ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اس آرٹ کو ایک نئی نظر سے دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہندوستانی آرٹ کی خود اپنی ایک مستقل حیثیت ہے، اور یہ کسی طرح بھی یونانی بودھ آرٹ کا مرہون منت نہیں۔ بلکہ خود یونانی بودھ آرٹ میں ہندوستانی آرٹ کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ہندوستانی آرٹ کے سلسلے میں یہ نیا نقطۂ نظر انگلستان میں نہیں بلکہ یورپ کے براعظم میں پیدا ہوا تھا۔ عجیب بات ہے ہندوستانی آرٹ اور سنسکرت ادب کی قدر انگلستان سے کہیں زیادہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں کی گئی ہے۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ کیا یہ بات اس افسوس ناک سیاسی تعلق کی پیدا کی ہوئی ہے جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان موجود ہے؟ غالباً یہ خیال بالکل بے بنیاد نہیں، حالانکہ اس کے علاوہ اختلاف کے اور بھی کچھ نہ کچھ بنیادی وجوہ ضرور ہوں گے۔ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہت سے انگریز آرٹسٹ، فاضل اور دوسرے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے صحیح جذبے اور نقطۂ نظر میں ڈوب کر، ہمارے پرانے خزانوں کی تلاش اور جستجو کی ہے اور انھیں دنیا کے سامنے ان کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے۔ پھر بہت سے انگریز ایسے بھی ہیں جن کی سچی محبت اور پر خلوص خدمات کے لئے ہندوستان ان کا ممنون ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں اور

انگریزوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور وہ خلیج برابر زیادہ چوڑی ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستان کی طرف سے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے، کم سے کم میرے نقطۂ نظر سے، پچھلے چند برسوں میں بہت سی ایسی باتیں ہوئی ہیں جنھوں نے ہمارے دلوں میں گہرے گھاؤ ڈال دئے ہیں۔ دوسری طرف بھی شاید کچھ اور وجہوں سے، دلوں کی یہی حالت ہو۔ اور ان وجہوں میں سے ایک اس بات پر غصہ ہے کہ ہم نے انھیں دنیا کے سامنے قصوروار ٹھہرایا ہے، حالانکہ ان کے نزدیک، قصور ان کا نہیں تھا۔ لیکن بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ یہ جذبہ محض سیاست تک محدود نہیں۔ اس نے دلوں میں زیادہ گہرا گھر کرلیا ہے، اور یہ اچانک اُبل پڑتا ہے۔ اور شاید اس جذبے کا سب سے گہرا اثر انگریزوں کے ذہنی طبقے پر ہے۔ ان کے نزدیک، ہندوستان کا باشندہ جرم آدم کا خاص مظہر ہے اور اس کا ہر کام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ایک ہردلعزیز انگریز مصنف نے، (جسے انگریزی فکر اور ذہن کا نمائندہ ذرا مشکل سے کہا جاسکتا ہے) حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے اور یہ کتاب ہر ہندوستانی چیز کے خلاف خباثت آمیز نفرت و حقارت سے بھری ہوئی ہے۔ مسٹر اوسبرٹ سٹول نے، جو اس مصنف سے زیادہ لائق بھی ہیں اور انگریزی فکر کی زیادہ صحیح نمائندگی کرتے ہیں، اپنی تصنیف "اسکیپ و تقدمی (سنہ ۱۹۴۱ء)" میں لکھا ہے کہ "اپنی لاتعداد اور گوناگوں حیرت انگیزیوں کے باوجود، ہندوستان کی فکر ہمیشہ مکروہ رہی"۔ انھوں نے "اس مکروہ اور بھدی خصوصیت" کا بھی ذکر کیا ہے "جو اکثر ہندو آرٹ کے حسن پر پانی پھیر دیتی ہے۔"

مسٹر سٹول کو ہندوستانی آرٹ یا مجموعی طور پر ہندوستان کے متعلق یہ رائے قائم کرنے کا پورا حق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ان کے صحیح جذبات ہیں۔ مجھے بھی ہندوستان کی بہت سی چیزوں سے ایسی ہی نفرت ہے، لیکن ہندوستان کی ہر چیز

کے متعلق میرا یہ خیال نہیں۔ یہ بات قدرتی ہے، اس لئے کہ میں ہندوستانی ہوں اور میں خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہوں، اپنے آپ سے آسانی سے نفرت نہیں کرسکتا لیکن یہ سوال صرف آرٹ کے متعلق کچھ خاص قسم کی رائیں رکھنے کا نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ، پوری قوم کی طرف سے شعوری یا غیر شعوری نفرت اور دشمنی کا اظہار ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ جنھیں ہم نے دکھ پہنچایا ہے، انھیں سے ہم نفرت بھی کرتے ہیں؟

جن انگریزوں نے ہندوستانی آرٹ کو سمجھا اور اُسے تنقید کے نئے معیاروں سے پرکھا ہے، ان میں سے دو لارنس بنیئن اور ای۔ بی۔ ہیول بھی تھے۔ ہیول ہندوستانی آرٹ کے آدرشوں اور ان آدرشوں کے بنیادی جذبے سے بے حد متاثر ہے۔ ہیول نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کسی قوم کا اچھا آرٹ ہمیشہ قومی فکر اور کردار کا صحیح آئینہ ہوتا ہے، لیکن انسان پورے طور پر اس سے اُسی صورت میں لطف اندوز ہوسکتا ہے کہ وہ ان آدرشوں کو اچھی طرح سمجھ لے جو اس آرٹ کی بنیاد ہیں۔ غیر ملکی حکومت چونکہ ان آدرشوں کو اچھی طرح نہیں سمجھتی اور ان کے متعلق صحیح معیار قائم نہیں کرسکتی اس لئے وہ عموماً ایک طرح کی ذہنی منافرت کا بیج بو دیتی ہے۔ "ہندوستانی آرٹ کے پیش نظر محض اہلِ علم کا محدود طبقہ نہیں تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام اس کی مدد سے مذہب اور فلسفہ کے بنیادی تصورات کو سمجھ سکیں۔" "ہندو آرٹ اپنے اس تعلیمی مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے (اور یہ بات ہر اس شخص کو معلوم ہے جسے ہندوستانی زندگی سے پوری واقفیت ہے) کہ ہندوستانی کسان، مغربی نقطۂ نظر سے بالکل جاہل ہونے کے باوجود، دنیا کے سارے زراعت پیشہ لوگوں سے کہیں زیادہ متمدن ہیں۔" [۵]

آرٹ، سنسکرت شاعری اور ہندوستانی موسیقی میں فن کار کا منصب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدرت کی گوناگوں نیرنگیوں میں ہمیشہ اس سے ہم آہنگ رہے، اور اپنے فن کو انسان، قدرت اور کائنات کی بنیادی ہم آہنگی کا ترجمان بنائے۔ یہی بنیادی خیال سارے ایشیائی آرٹ کی خصوصیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایشیا کے مختلف ملکوں کے آرٹ میں اس قدر تنوع اور قومی خصوصیات کی رنگ آمیزی کے پیدا کیے ہوئے اختلافات کے باوجود ایک قسم کی یکسانی نمایاں ہے۔ اجنتا کی خوبصورت نقاشیوں کے علاوہ، قدیم ہندوستان میں مصوری کی کچھ زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ غالباً ان میں سے اکثر زمانے کی دست بُرد سے ختم ہو گئیں۔ ہندوستان کی اصلی عظمت اس کی سنگ تراشی اور فن تعمیر کی بنا پر ہے، بالکل اسی طرح جیسے چین اور جاپان کی شہرت کا دارومدار مصوری پر ہے۔

ہندوستانی موسیقی نے، جو یورپین موسیقی سے بالکل مختلف ہے، اپنے انداز میں نمایاں ترقی کی تھی، اور اس حیثیت سے بھی ہندوستان دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ایک امتیازی درجہ رکھتا تھا، اور اس نے چین اور مشرق بعید کے علاوہ ایشیا کے تقریباً سارے ملکوں کی موسیقی پر اپنا اثر ڈالا۔ اور اس طرح موسیقی بھی فارس، افغانستان، عرب، ترکستان (اور کسی حد تک ان علاقوں میں جہاں عرب تمدن پھیلا، مثلاً شمالی افریقہ) اور ہندوستان کے درمیان تعلق پیدا ہونے کا ایک اور ذریعہ بن گئی۔ ہندوستانی کلاسکل موسیقی

(نوٹ صفحہ گذشتہ) ؎ E. B. Havell: "The Ideals of Indian Art" (1920) Part XIX.

غالباً آج کل بھی ان سب ملکوں میں پسند کی جاتی ہے۔

دیواروں پر تصویروں کا کھودنا یا نقش کرنا ہندوستان کے مذہبی عقیدے کے نزدیک برا سمجھا جاتا تھا، اور اس چیز نے ہندوستان میں اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں آرٹ کی ترقی پر اہم اثر ڈالا۔ وید مورتی پوجا کے خلاف تھے اور بودھ مذہب میں بھی بہت بعد میں بدھ کے پتھر کے مجسمے اور ان کی تصویریں بنانے کا رواج شروع ہوا۔ متھرا کے عجائب گھر میں "بودھ ستوا" کا ایک بہت بڑا پتھر کا مجسمہ ہے، جو طاقت اور قوت سے بھرپور ہے۔ یہ مجسمہ کشن حکمرانوں کے عہد اور پہلی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کا ہے۔

ہندوستانی آرٹ کا ابتدائی دور فطرت پرستی کا دور ہے، اور یہ بات شاید کسی حد تک چینی اثر کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی آرٹ کی تاریخ میں چینی اثر مختلف منزلوں پر ظاہر ہوتا ہے، خاص کر فطرت پرستی کے ارتقا میں ــــ بلکہ اسی طرح جیسے ہندوستانی مثالیت چین اور جاپان پہنچی اور ان دونوں ملکوں پر، اُن کی تاریخ کے بعض اہم دوروں میں، زبردست اثرات ڈالے۔

گپت عہد میں، جسے ہندوستان کی تاریخ کا سنہری زمانہ کہتے ہیں، چوتھی صدی عیسوی سے چھٹی صدی تک، اجنتا کے غار کھودے گئے اور ان میں مینت کاری کی گئی۔ باغ اور بدرمی بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اجنتا کی نقاشیاں بہت خوبصورت ہیں اور جب سے ان کا پتہ چلا ہے، ہمارے زمانے کے مصوروں نے ان کا گہرا اثر لیا ہے۔ ان مصوروں نے زندگی سے منہ موڑ کر، اپنے طرز کو اجنتا کے طرز پر ڈھال لیا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے اکثر ناخوش گوار ہوئے ہیں۔

اجنٹا انسان کو ایک دور افتادہ خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے، جس میں حقیقت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اجنٹا کی تصویریں بودھ راہبوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان راہبوں کے گروؤں نے مدتوں پہلے انھیں بتایا تھا کہ عورتوں سے دور رہو، ان کی طرف دیکھو بھی مت، اس لئے کہ وہ خطرناک ہیں۔ اس کے باوجود ان تصویروں میں عورتیں کثرت سے ہیں، حسین عورتیں، شہزادیاں، گانے والیاں، ناچنے والیاں، بیٹھی ہوئی، کھڑی ہوئی، سنگھار میں لگی ہوئی یا قطاروں میں چلتی ہوئی۔ اجنٹا کی عورتیں ہر جگہ مشہور ہو گئی ہیں۔ ان راہب مصوروں نے زندگی کو اور اس کے چلتے پھرتے ڈرامے کو کتنی اچھی طرح دیکھا بھالا ہوگا، اور کتنی خوبصورتی سے انھوں نے اس کی مصوری کی ہے، بالکل اسی طرح جیسے انھوں نے 'بودھ ستو' کا مجسمہ بنایا ہے، پُرسکون اور دنیاوی عظمت و شکوہ سے بہت بلند۔

ساتویں اور آٹھویں صدی میں، ٹھوس سنگین پتھر کو کاٹ کر ایلورا کے عظیم الشان غار اور ان کے بالکل بیچ میں کیلاش کا شاندار مندر بنایا گیا۔ ہمارے لئے اس بات کا تصور بھی محال ہے کہ انسان کے ذہن میں ایلورا کے غاروں کا تخیل کس طرح پیدا ہوا اور کس طرح اس نے اپنے اس تخیل کو مجسم شکل دی۔ ایلی فینٹا کے غار اور ان کی قوی اور نازک تری مورتی بھی اسی عہد کے کارنامے ہیں — اور جنوبی ہند میں مملاپورم کی عمارتوں کے سلسلے بھی۔

ایلی فنٹا کے غاروں میں شیو نٹ راگ یا 'رقصانِ شیو' کی ایک ٹوٹی ہوئی مورت ہے۔ ہیول نے لکھا ہے کہ اس ٹوٹی پھوٹی حالت میں بھی وہ مورت شاہانہ جلال اور دیوبانی قوتوں کا پیکر ہے۔ گو رقص کی مترنم حیثیتوں

سے غار گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن مجسمہ کے چہرہ پر وہی سنجیدگی، سکون اور دنیا سے بے تعلقی جھلک رہی ہے، جس سے بدھ کا چہرہ منور اور معمور ہے۔"

برٹش میوزیم میں ایک دوسرا "شیونٹ راگ" کا مجسمہ ہے اور اس کے متعلق ایپسٹین نے لکھا ہے "شیو رقص کرتا ہے اور اس رقص میں کائنات کو پیدا کرتا اور اسے مٹاتا ہے۔ اس کے لمبے ٹوٹے، لمبے لمبے جگوں کا تصور نظر کے سامنے لے آتی ہیں، اور اس کی جنبشوں میں افسوں کی سحر طراز قوت ہے۔ محبت کے جذبے کی موت کا غمناک یاس انگیز مرقع برٹش میوزیم کے ایک چھوٹے سے گوشے میں موجود ہے وہ انسانی نظر نے کہیں نہیں دیکھا ہوگا۔ اور یہ مرقع انسانی محبت میں تقدیر کے عنصر کی اتنی صحیح مصوری کرتا ہے کہ کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔ یورپ کی تمثیلیں ان عمیق فنی تخلیقوں کے مقابلے میں ہیچ اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں اور فن کے یہ کارنامے اشاریت کی ظاہری نمائش سے مبرا ہیں، اور صرف بنیادی تصور پر زور دیتے ہیں۔"[1]

بورو بدور، جاوا میں بودھستو کا ایک سر ملا تھا۔ اسے لوگ کوپن ہیگن لے گئے۔ یہ چہرہ حسن کے ظاہری معیار کے مطابق خوبصورت ہے، لیکن جیسا کہ ہیول نے کہا ہے کہ اس میں کوئی اور گہری بات بھی ہے، اور اس میں بالکل آئینے کی طرح، بودھستو کی پاک روح جھلکتی دکھائی دیتی ہے "یہ ایسا چہرہ ہے جس میں سمندر کی گہرائیوں کی خاموشی ہے

---

[1] Epstein: Let there be Sculpture (1942), P. 193.

اور صاف شفاف نیلے آسمان کا سکون : ایک ایسا حسن جو انسان کی حدِ ادراک سے پرے ہے۔"

ہیول نے آگے چل کر لکھا ہے "جاوا کے ہندوستانی آرٹ میں ایک انفرادی خصوصیت ہے جو اُسے اس سرزمین کے آرٹ سے ممتاز کرتی ہے، جہاں سے یہ آیا تھا۔ دونوں میں سکون کا ایک ہی گہرا جذبہ موجزن ہے، لیکن جاوا کے ربانی آدرش میں ہمیں وہ گہری جذباتیت نظر نہیں آتی جو ایلیفنٹا اور ململا پورم کی سنگ تراشی کی خصوصیت ہے۔ ہند جاوی آرٹ میں نسبتاً زیادہ سکون اور مسرت ہے، اور یہ مسرت اس امن اور اطمینان کا نتیجہ ہے جو ہندوستانی آبادکاروں کو اپنے اس نئے وطن میں، ان تند طوفانوں کے بعد حاصل ہوا تھا جن میں ان کے آبا و اجداد اپنے وطن میں صدیوں تک مبتلا رہے تھے۔"[1]

۱۹۔ ہندوستان کی بیرونی تجارت

عیسوی سنہ کے ابتدائی ایک ہزار سال میں ہندوستان کی تجارت دور دور پھیلی ہوئی تھی اور بیرونی ملکوں کی بہت سی منڈیوں پر ہندوستانی تاجروں کا قبضہ تھا۔ پوربی سمندروں پر بھی ہندوستانی تجارت کا تسلط تھا اور اس کا دائرہ بحیرۂ روم تک پہنچتا تھا۔ کالی مرچ اور دوسرے مسالے اکثر ہندوستانی اور چینی جہازوں پر، ہندوستان سے یا ہندوستان کے راستے

---

[1] Haveil: The Ideals of Indian Art (1920), P. 169.

سے ہوکر مغرب کے ملکوں کو جاتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ گاتھ قوم کا سردار الارک روم سے تین ہزار پونڈ کالی مرچیں لے گیا تھا۔ روم کے مصنفوں نے اکثر اس بات پر ماتم کیا ہے کہ سونا لدلد کر روم سے ہندوستان اور مشرقی ملکوں کو جاتا تھا اور اس کے بدلے میں مشرق والے مختلف قسم کے اسبابِ تعیش بھیجتے تھے۔

اس زمانے میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی تجارت آپس میں مال کے مبادلے کی تجارت تھی۔ ہندوستان زرخیز ملک تھا اور یہاں ایسی چیزیں افراط سے ہوتی تھیں جن کی دوسرے ملکوں میں کمی تھی۔ سمندری راستے ہندوستان کے لئے کھلے ہوئے تھے اس لئے وہ اپنا سامان دوسرے ملکوں کو بھیجتا تھا۔ کچھ سامان ہندوستان مشرقی جزیروں سے حاصل کرکے اسے دوسرے ملکوں میں لے جاتا اور اس سے نفع حاصل کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کو کچھ اور آسانیاں بھی تھیں۔ مثلاً جب دنیا کے کسی اور حصے میں کپڑا بننے کا رواج نہیں بھی ہوا تھا تو ہندوستان مدتوں پہلے سے کپڑا تیار کرتا تھا اور یہاں کپڑے کی صنعت نے اچھی خاصی ترقی کرلی تھی۔ اور اس طرح ہندوستانی کپڑا دور دور کے ملکوں کو جاتا تھا۔ ریشمی کپڑا بھی بہت پرانے زمانے سے ہندوستان میں بننا شروع ہوگیا تھا۔ حالانکہ غالباً وہ اتنا اچھا نہیں ہوتا تھا جتنا چینی ریشم، اس لئے کہ چین نے ریشمی کپڑے کی تجارت چوتھی صدی قبل مسیح سے شروع کررکھی تھی۔ ممکن ہے ہندوستانی ریشم کی صنعت نے آگے چل کر اور ترقی کی ہو لیکن غالباً اُس نے بہت زیادہ فروغ کبھی بھی نہیں پایا۔ البتہ کپڑوں کی رنگائی میں ہندوستان نے خاص طور پر ترقی کی اور پکے رنگ بنانے کے طریقے بھی ایجاد کئے۔ ان

ہیں سے ایک طریقہ 'نیل' سے رنگ بنانے کا تھا۔ غالباً رنگ سازی کے اس علم ہی کی بدولت ہندوستان کی بیرونی تجارت کو اتنا فروغ ہوا۔

شروع کی عیسوی صدیوں میں ہندوستان میں علم کیمیا نے جتنی ترقی کی اتنی کسی اور ملک نے نہیں کی۔ میں خود علم کیمیا کے متعلق بہت کم جانتا ہوں، لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ ہندوستان کے کیمیا دانوں اور سائنس دانوں کے قافلہ سالار سر پی۔ سی۔ رے نے "ہندو کیمیا کی تاریخ" لکھی ہے۔ پرانے زمانے میں علم کیمیا، کیمیا سازی اور کچی دھاتیں صاف کرنے کے فنوں میں بالکل قریبی تعلق تھا۔ ہندوستان میں ناگ ارجن نام کا ایک شخص علم کیمیا اور دھاتیں صاف کرنے کے فن کا بڑا ماہر گذرا ہے۔ لوگوں نے محض نام کی یکسانی سے دھوکا کھا کر یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ یہ ناگ ارجن وہی شخص ہے جو پہلی صدی عیسوی میں ایک مشہور فلسفی ہوا ہے۔ لیکن مجھے اس رائے کے ماننے میں بے حد تامل ہے۔

فولاد کو معتدل کرنے کا فن قدیم ہندوستانیوں کو بھی آتا تھا اور ہندوستانی لوہے اور فولاد کی دوسرے ملکوں میں بڑی قدر کی جاتی تھی — خاص کر جنگی ہتھیار بنانے کے لئے۔ لوہے کے علاوہ اور بھی بہت سی دھاتیں اس وقت تک دریافت ہو چکی ہیں اور ان دھاتوں سے مختلف طرح کی چیزوں کے علاوہ ایسے مرکب بھی تیار کئے جاتے تھے جن سے دواؤں کا کام لیا جاتا تھا۔ لوگ عرق نکالنے اور کشتے بنانے کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ طب کے فن نے خاصی ترقی کرلی تھی، اور گو طبی تجربوں کی بنیاد عموماً طب کی پرانی کتابوں پر تھی لیکن متوسط دور تک ان میں نمایاں ترقی ہو چکی تھی۔ تشریح اور عضویات کے علوم کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اور

دوران خون کا تذکرہ ہندوستانی کتابوں میں ہاروے سے بہت پہلے سے موجود ہے۔

علم ہیئت، جو بہت قدیم سائنس ہے، یونیورسٹی کے نصاب کا ایک باقاعدہ مضمون تھا اور اس کے ساتھ نجوم بھی شامل تھا۔ اس زمانے کے لوگوں نے ایک بالکل صحیح تقویم مرتب کی تھی۔ یہ شمسی تقویم ہے لیکن اس کے مہینے قمری ہیں اور اس لیے اسے کبھی کبھی ادھر اُدھر سرکا کر ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح، یہاں بھی پروہتوں یا برہمنوں کو اس تقویم سے خاص لگاؤ تھا اور وہی موسمی تہواروں اور سورج اور چاند کے گرہنوں کا صحیح وقت بتلاتے تھے۔ برہمن اپنے اس علم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور لوگوں کو ایسے عقیدوں اور رسموں کی طرف مائل کرتے تھے جنھیں یہ لوگ اوہام پرستی سمجھتے تھے۔ اور اس طرح لوگوں کی نظر میں ان کا مرتبہ اور درجہ بڑھتا تھا۔ عملی حیثیت سے، علم ہیئت ان لوگوں کے بڑے فائدے کی چیز تھا جو سمندر کے سفر کرتے تھے۔ اور اس علم میں ہندوستان نے جو نمایاں ترقی کی ہے اُس پر پرانے ہندوستانیوں کو فخر تھا۔ یہ لوگ عرب کے علم ہیئت سے بھی واقف تھے، جس کا مرکز اسکندریہ تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ قدیم ہندوستان نے مشینی اوزاروں کے استعمال میں کس حد تک ترقی کی تھی لیکن یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ جہاز سازی کی صنعت اس زمانے میں ہندوستان کی بڑی ترقی یافتہ صنعت تھی اور کتابوں میں مختلف طرح کی 'مشینوں' کا ذکر ہے، خاص کر لڑائی کے مقصد کے لیے۔ اس ذکر سے بعض جوشیلے اور خوش اعتقاد ہندوستانیوں نے اپنے تصور سے طرح طرح کی پیچیدہ مشینیں وضع کر لی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس زمانے

کا ہندوستان مختلف طرح کے آلے بنانے اور انھیں استعمال کرنے کے معاملے میں کسی ملک سے پیچھے نہیں تھا، اور اس کا کیمیا اور دھاتوں کو معتدل کرنے کا علم بھی کسی طرح دوسرے ملکوں سے کم درجہ کا نہ تھا۔ اور یہی چیزیں ہیں جنکی وجہ سے ہندوستان کو تجارت میں اتنا بڑھنے کا موقع ملا اور اس نے کئی صدیوں تک دنیا کی بہت سی منڈیوں پر قبضہ جمائے رکھا۔

غالباً اُسے ایک آسانی اور بھی تھی۔ یعنی ہندوستان میں یونان اور بعض دوسرے مہذب ملکوں کی طرح 'غلام مزدوروں کا رواج نہیں تھا۔ جس نے یونان اور دوسری ابتدائی تہذیبوں کی ترقی میں بڑی رکاوٹ ڈالی تھی۔ ذات پات کے نظام میں گو بہت سی خرابیاں ہیں اور یہ خرابیاں برابر بڑھتی رہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ طریقہ نیچ سے نیچ ذات والوں کے لئے غلامی سے بدرجہا بہتر تھا۔ ہر الگ الگ ذات میں ایک طرح کی مساوات اور آزادی تھی، اور ہر ذات کا کوئی نہ کوئی پیشہ تھا اور یہ اس پیشہ میں لگی رہتی تھی۔ اس چیز سے یہ فائدہ ہوا کہ ہر پیشے والے کو اپنے اپنے کام اور ہنر میں انتہائی مہارت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۲۰۔ قدیم ہندوستان میں ریاضی

ہندوستانی فطرتاً حد سے زیادہ علم دوست اور ٹھوس فکر کے دل دادہ تھے اور اس لئے ان کا ریاضی میں امتیاز حاصل کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یورپ نے اپنا ابتدائی حساب اور جبر و مقابلہ عربوں سے لیا تھا۔ اور اسی لئے عربی ہندسوں کا رواج ہوا۔ لیکن عربوں نے یہ چیزیں ہندوستان سے لی تھیں۔ ہندوستانیوں نے ریاضی میں جو حیرت انگیز ترقی کی تھی اس سے اب سب واقف

ہیں اور اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ حساب اور الجبرا کی بنیاد مدتوں پہلے ہندوستان ہی میں پڑی تھی۔ گنتی گننے کے بھدے چوکھٹے اور رومن یا اسی طرح کے دوسرے ہندسے مدتوں سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے کہ ہندوستان کے دس ہندسوں نے (جس میں صفر بھی شامل تھا) انسانی ذہن کو ان قیدوں سے چھٹکارا دلایا اور گنتی کی اہمیت اور عملی حیثیت واضح طور پر روشن ہوگئی۔ گنتی کے یہ نشان عدیم المثال تھے اور ان سارے نشانوں سے مختلف جو اب تک دوسرے ملکوں میں رائج تھے۔ آج کل یہ نشان اتنے عام ہیں کہ ہم انھیں ایک معمولی سی چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں ترقی اور انقلاب کی ایک طویل داستان چھپی ہوئی ہے۔ یہ ہندسے ہندوستان سے، بغداد ہوتے ہوئے، مغربی دنیا میں پہنچے اور اس سفر کے پورا کرنے میں کئی صدیاں لگیں۔

اب سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے، نپولین کے زمانے میں لاپلاس نے لکھا تھا "کل اعداد کو ظاہر کرنے کے لیے دس نشانوں کو استعمال کرنے کا عجیب و غریب طریقہ ہمیں ہندوستان نے دیا ہے۔ ہر نشان کی اپنی ایک حیثیت بھی ہے اور یہ قیمت کے بڑھانے کا بھی کام دیتا ہے — یہ نشان، جو اب ہمیں بظاہر اس قدر آسان معلوم ہوتے ہیں کہ ہم ان کی صحیح قدر و منزلت کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے، ایک گہری اور اہم فکر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان نشانوں کی سادگی جس نے ہر طرح کی گنتی اور شمار کو اتنا آسان بنا دیا ہے، ایسی خصوصیت ہے جس سے ہمارے حساب کو مفید ایجادوں کی پہلی صف میں جگہ ملتی ہے۔ اس کارنامے کی عظمت کا اندازہ ہم اس طرح لگا سکتے ہیں کہ ارشمیدس اور اپالونیس جیسے قدیم زمانے کے اکابر کا ذہن بھی اس تک نہ پہنچ سکا۔"[۱]

---

[۱] یہ عبارت ہاگبن نے اپنی کتاب Mathematics for the million (London 1942) میں نقل کی ہے۔

جیومٹری، حساب اور الجبرا ہندوستان کے بہت قدیم زمانوں کی ایجادیں
ہیں۔ غالباً یہ چیز ابتدا میں جیومٹری اور الجبرا کی ملی جلی شکل میں شروع ہوئی ہوگی
اور اس سے ویدک قربانیوں کے حساب اور شکلیں بنانے کا کام لیا جاتا ہوگا بہت
پرانی کتابوں میں جیومٹری کے ایک طریقے کا حوالہ موجود ہے جس میں یہ بتایا گیا
ہے کہ اگر ایک مستطیل کا ایک زاویہ اد = س دیا ہوا ہو تو کسی مربع کو
اس مستطیل میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہندو رسموں کے موقعوں پر
جیومٹری کی شکلیں بنانے کا رواج آج تک موجود ہے۔ جیومٹری نے ہندوستان
میں ترقی کی لیکن یونان اور اسکندریہ اس معاملے میں اس سے آگے نکل گئے۔
ہندوستان اصل میں حساب اور الجبرا میں سب سے آگے رہا۔ اعشاریہ کے طریقے
اور صفر کے نشان کے موجد یا موجدوں کا نام اب تک کسی کو نہیں معلوم۔ اب
تک صفر کے استعمال کی جو پرانی سے پرانی شہادت ملی ہے تقریباً دو صدی
قبل مسیح کی ایک مذہبی کتاب میں ہے۔ محققوں کا اندازہ ہے کہ اعشاریہ کا طریقہ
تقریباً عیسائی سنہ کے شروع زمانے میں ایجاد ہوا ہوگا۔ صفر یا 'شُنیہ' کی
شکل شروع شروع میں ایک نقطے کی سی تھی اور بعد میں یہ ایک چھوٹا سا گھیرا
بن گیا۔ پہلے اسے بھی دوسرے عددوں کی طرح ایک عدد سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر
ہالسٹڈ نے اس ایجاد کی اہمیت کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے "صفر کے نشان
کی اہمیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ ایک بے حقیقت 'نیستی' کو ایک مقام
اور نام، ایک شکل اور ایک نشان دینا اور پھر اُسے ایک 'مددگار قوت' بنانا
ہندو قوم کی خصوصیت ہے، جہاں صفر پیدا ہوا۔ صفر کی ایجاد بالکل ایسی ہے
جیسے برقی مشینوں سے 'نِروان' بنا لینا۔ ریاضی کی کوئی اکیلی ایجاد عام
ذہانت اور قوت کی ترقی میں اتنی مددگار ثابت نہیں ہوئی، جتنی صفر

کی ایجاد۔"[1]

جدید دور کے ایک اور ریاضی داں نے اس تاریخی ایجاد کی بے حد تعریف کی ہے۔ ڈانزگ نے اپنی تصنیف "نمبر" میں لکھا ہے "اس پانچ ہزار برس کے طویل زمانے نے بہت سے تمدنوں کی ترقی اور زوال دیکھا، اور ہر تمدن نے اپنے پیچھے ادب، آرٹ، فلسفہ اور مذہب کا ایک 'ترکہ' چھوڑا لیکن گنتی اور شمار کے میدان میں جس سے انسان نے بالکل ابتدائی زمانے سے کام لیا ہے اس کا مجموعی کارنامہ کیا ہے؟ — گنتی کا ایک بے لوچ اور بھدا طریقہ جس نے ترقی کو تقریباً غیر ممکن بنا دیا، اور حساب لگانے کی ایک ایسی محدود ترکیب کہ چھوٹے چھوٹے حساب بھی ماہروں کی مدد کے بغیر نہ ہوسکیں ...... انسان ہزاروں برس تک ان طریقوں کو استعمال کرتا رہا اور اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا، کوئی نئی بات نہیں پیدا کی ...... اگر ہم عہد وسطیٰ کے خیالات کی ترقی کی سست رفتار پر بھی نظر ڈالیں تو اس زمانے میں بھی حساب اور شمار کی ترقی کا میدان بالکل ویران اور سنسان دکھائی دیتا ہے۔ ان ساری باتوں کو نظر میں رکھ کر ہم اس گمنام ہندی کے کارنامے کی اہمیت کا اندازہ لگائیں، جس نے ... سنہ کے بالکل ابتدائی زمانے میں ریاضی میں "قوت" کا اصول وضع

---

[1] G. B. Halstead : " On the Foundation and Technique of Arithmetic ". P. 20 (Chicago 1912) quoted in " History of Hindu Mathematics " by B. Datta and A. N. Singh (1935).

کیا، تو اس کا یہ کارنامہ عالمگیر حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔[1]

ڈینزگ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ یونان کے بڑے ریاضی دانوں نے اس انکشاف کی طرف سے بے نیازی برتی۔ "کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عملی علوم کو حقیر جانتے تھے، یہاں تک کہ اپنے بچوں کی تعلیم بھی غلاموں کو سونپ رکھی تھی؟ اگر یہ بات ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس قوم نے ہمیں جیومٹری دی اور اس علم کو ترقی کی اس منزل تک پہنچایا، اس نے الجبرا کی ابجد تک وضع نہیں کی؟ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ الجبرا جو جدید ریاضیات کی بنیاد ہے ہندوستان ہی میں پیدا ہوا، اور تقریباً اس زمانے میں پیدا ہوا جب گنتی کا موجودہ طریقہ شروع ہوا تھا؟"

اس سوال کا جواب پروفیسر ہوگ بن نے دیا ہے "اس بات کا سمجھنا کہ یہ کام ہندوستانیوں نے کیوں کیا، اور اسے قدیم زمانے کے ریاضی دانوں کے بجائے ایک عملی انسان نے کیوں انجام دیا اور بھی زیادہ ناممکن اس لئے بن جاتا ہے کہ ہم کسی قوم کی علمی ترقیوں کا اندازہ صرف چند لائق افراد کی ذہانت سے لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ سماج کے کس نظام اور رسموں کے کن میلانات میں لائق افراد کی ذہانت کی تخلیق ہوئی۔ جو کچھ ہندوستان میں تقریباً ۵۰۰ء میں پیش آیا وہ اس سے پہلے بھی پیش آچکا تھا ...... اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر تہذیب عوام کی تعلیم کی طرف اتنی ہی توجہ نہ دے جتنی چند لائق افراد

---

[1] Quoted in L. Hogben's "Mathematics for the Million (London 1942.)

کی تعلیم کی طرف، تو گویا وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا سامان کرتی ہے [۵۱]۔"

اور اس لئے ہمیں بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ شاندار ایجادیں کسی غیر معمولی دماغ کی فراست سے وجود میں نہیں آئیں، جو اپنے زمانے سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا، بلکہ حقیقت میں پورے سماج کی ایجاد ہیں اور وقت کی کسی اہم ضرورت کے تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وقت کی اس ضرورت اور تقاضے کے احساس اور اس کو پورا کرنے کے لئے، یقیناً کسی غیر معمولی شخصیت کی ضرورت تھی۔ لیکن اگر یہ ضرورت کا تقاضا موجود نہ ہوتا تو اسے پورا کرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اور اگر ایجاد کر بھی لی جاتی تو لوگ اسے بھول جاتے یا اسے کسی ایسے زمانے کا انتظار کرنا پڑتا جب واقعی لوگوں کو اس کی ضرورت ہو۔ سنسکرت کی پرانی ریاضی کی کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زمانے کو اس ایجاد کی سخت ضرورت تھی اس لئے کہ یہ کتابیں تجارت اور سماجی تعلقات کے بعض ایسے مسائل سے بھری پڑی ہیں جن میں بڑے پیچیدہ حساب کتاب کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان مسائل کا تعلق ٹیکس، قرضے، سود کے علاوہ، شرکت، لین دین، مبادلے اور سونے کے کھرے کھوٹے کے حساب جیسی چیزوں سے ہے۔ سماجی زندگی خاصی پیچیدہ ہو گئی تھی اور کثرت سے آدمی حکومت کے کاموں اور تجارت میں مصروف رہتے تھے۔ اور ایسی صورت میں حساب کے کسی سیدھے سادے طریقے کے بغیر کام چلنا غیر ممکن تھا۔

صفر کے نشان اور اعشاریہ کے طریقے کے استعمال نے ہندوستانی

---

[۵۱] Hogben. "Mathematics for the Million. (London 1942) P. 285.

ذہن کے لئے الجبرا اور حساب کی ترقی کے راستے کھول دیے اور ذہن کو تیزی سے ان راستوں پر چلنے کا موقع ملا۔ کسریں اور کسروں کے ضرب اور تقسیم ایجاد ہوئی۔ اربعہ متناسبہ کا قاعدہ دریافت ہوا اور اسے مکمل کیا گیا۔ مربع، جذر (اور جذر کی علامت √)؛ کعب اور جذر الکعب؛ نفی کا نشان؛ simes کے جدول۔ π کی قیمت ۳٫۱۴۱۶ قرار دی گئی؛ ابجد کے حروف کو الجبرا میں نامعلوم قدروں کے لئے استعمال کیا گیا؛ مفرد اور دو درجی مساوات کے قاعدے وضع کئے گئے؛ صفر کے ریاضیات کی تحقیق ہوئی۔ صفر کی تعریف مختلف طریقوں سے کی گئی مثلاً ا - ا = صفر؛ ا + صفر = ا؛ ا - صفر = ا؛ ا × صفر = صفر۔ اور جب ا کو صفر سے تقسیم کیا جائے تو لا تناہی جواب آئے گا۔ اس کے علاوہ مقدار منفی کا تصور بھی آگیا۔ اس طرح √۴ = ± ۲

یہ اور اس کے علاوہ ریاضیات میں جتنی ترقیاں ہوئیں وہ پانچویں صدی سے لے کر بارھویں صدی تک کے مشہور ریاضی دانوں کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے سے پہلے کی بھی کتابیں ہیں (بودھیاین آٹھویں صدی قبل مسیح : اپستمبا اور کیتیاین پانچویں صدی قبل مسیح) جن میں اقلیدس کے مسئلوں کا ذکر ہے، خصوصاً مثلث، مستطیل اور مربع کے مسائل کا۔ لیکن الجبرا کی جو پرانی سے پرانی کتاب اس وقت موجود ہے مشہور ہیئت داں آریہ بھٹ کی لکھی ہوئی ہے۔ آریہ بھٹ ۴۷۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ آریہ بھٹ نے ہیئت اور ریاضی کی یہ کتاب ۲۳ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ آریہ بھٹ کو بعض لوگ الجبرا کا موجد کہتے ہیں لیکن اس نے اپنے سے پہلے کے مصنفین سے کم سے کم تھوڑی مدد ضرور لی ہوگی۔ ہندوستانی ریاضی میں دوسرا مشہور نام بھاسکر اول

(۵۲۲ء) کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا ریاضی داں برہم گپت (۶۲۸ء) ہوا ہے۔ برہم گپت مشہور ہیئت داں بھی تھا اور اسی نے صفر کے متعلق مختلف قاعدے بنائے اور اس کے علاوہ ریاضی کو بعض اور اہم ترقیاں دیں۔ اس کے بعد مسلسل بہت سے ریاضی داں ہوئے جنھوں نے حساب اور الجبرا کی کتابیں لکھیں۔ پرانے ریاضی دانوں میں آخری بڑا نام بھاسکر دوم کا ہے۔ یہ مصنف ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہیئت اور الجبرا اور حساب پر تین کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی حساب کی کتاب کا نام 'لیلاوتی' ہے اور یہ نام ایک حساب کی کتاب کے لئے کچھ عجیب سا ہے؛ اس لئے کہ 'لیلاوتی' عورتوں کا نام ہے۔ کتاب میں اکثر ایک چھوٹی لڑکی کا نام آیا ہے اور اسے مصنف نے "او لیلاوتی" کہہ کر مخاطب کیا ہے اور پھر اسے ان مسائل کی تعلیم دی ہے جن کا کتاب میں ذکر ہے۔ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لیلاوتی بھاسکر کی لڑکی تھی لیکن اس کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا۔ کتاب کا طرز صاف اور آسان ہے اور چھوٹے بچوں کے لئے اس کا سمجھنا مشکل نہیں۔ اور اسی وجہ سے سنسکرت کے مدرسوں میں یہ کتاب اب تک پڑھائی جاتی ہے۔

اس کے بعد بھی ریاضی کی کتابیں برابر لکھی جاتی رہیں (مثلاً ۱۱۵۰ء میں نارائن اور ۱۵۴۵ء میں گنیش) لیکن ان کتابوں میں پچھلی کتابوں کی باتیں دہرائی گئی ہیں۔ بارھویں صدی کے بعد سے لے کر عہد جدید کے شروع تک ہندوستان میں ریاضی پر بہت کم نیا کام ہوا۔

آٹھویں صدی میں، خلیفہ منصور کے عہد میں (۷۵۳ء سے ۷۷۴ء تک) ہندوستان کے بہت سے فاضل بغداد گئے اور یہ لوگ اپنے ساتھ جو کتابیں لے گئے ان میں ریاضی اور ہیئت کی کتابیں بھی تھیں۔ ہندوستانی ہندسے

غالباً اس سے بھی پہلے بغداد پہنچ چکے تھے۔ لیکن اب ریاضی پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر وہاں پہنچی اور آریہ بھٹ کی اور اس کے علاوہ دوسری کتابوں کے عربی میں ترجمے ہوئے اور ان کتابوں نے عربی دنیا میں ریاضی اور ہیئت کی ترقی پر نمایاں اثر ڈالا اور وہاں ہندوستانی اعداد کا رواج ہوگیا۔ بغداد اُس زمانے میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا اور یونانی اور یہودی فاضل وہاں جمع تھے اور یہ فاضل اپنے ساتھ یونانی فلسفہ، جیومٹری اور سائنس کی کتابیں لائے تھے۔ وسط ایشیا سے لے کر اسپین تک ساری اسلامی دنیا پر بغداد نے اپنا تہذیبی اثر ڈالا اور ہندوستانی ریاضی کا علم عربی ترجموں کے ذریعے سے اس وسیع دنیا میں پھیل گیا۔ عرب اعداد کے نشانات کو "ہندسے" کہتے تھے۔ لفظ ہندسہ کے معنی ہیں ہند کا یا ہند سے تعلق رکھنے والا۔

عربوں کی دنیا سے، غالباً اسپین کی یونیورسٹیوں کے ذریعے نئی ریاضی یورپ کے ملکوں میں پہنچی اور وہاں یورپ کی ریاضی کی بنیاد بنی۔ یورپ میں ان نئے ہندسوں کے استعمال کی مخالفت کی گئی اس لئے کہ انھیں بے دینی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا عام استعمال یورپ میں کئی سو سال کے بعد شروع ہوا۔ سب سے پہلے یہ ہندسے ۱۱۳۴ء کے سسلی کے ایک سکے پر نظر آتے ہیں۔ انگلستان میں سب سے پہلے ان کا استعمال ۱۴۹۰ء میں ہوا۔

بعض شہادتوں سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ ہندوستانی ریاضی، اور خاص کر عددوں کی قوتوں کی شکل میں استعمال ہونے کا رواج مغربی ایشیا میں اس سے بھی پہلے سے شروع ہو چکا تھا جب ہندوستان کی کتابیں بغداد پہنچیں۔ شام کے ایک راہب فاضل نے ایک جگہ کچھ یونانی فاضلوں کے غرور کی

شکایت لکھی ہے، جو شامیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس راہب فاضل کا نام سیورس سیوخت تھا اور یہ دریائے فرات کے کنارے ایک خانقاہ میں رہتا تھا۔ ۶۶۲ء میں اس نے ایک جگہ کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ شامی کسی طرح یونانیوں سے کمتر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ہندوستانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ "میں اس جگہ ہندوؤں کی (جو شامیوں سے بالکل مختلف ہیں) سائنس دانی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا اور نہ ان باریکیوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو انھوں نے ہیئت کے علم میں پیدا کیں، حالانکہ ان کے انکشافات یونان اور بابل والوں کے انکشافات کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اور نہ میں ان کی گنتی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ہر تعریف سے بالاتر ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ گنتی صرف نو علامتوں کی مدد سے گنی جاتی ہے۔ اگر ان لوگوں کو جو صرف یونانی زبان بول کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ سائنس کی معراج کو پہنچ گئے ہیں، ان چیزوں کا علم ہو تو انھیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان کے علاوہ بھی لوگ ہیں جنھیں کچھ آتا ہے۔"[1]

جب ہندوستان کی ریاضی کا ذکر ہو تو انسان کا ذہن فوراً موجودہ زمانے کی ایک غیر معمولی شخصیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ شخصیت سری نواس رامانجم کی ہے۔ رامانجم جنوبی ہند کے ایک غریب برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ انھیں مناسب تعلیم کے موقعے میسر نہیں آئے تھے اس لئے مدراس پورٹ ٹرسٹ میں کلرک ہو گئے۔ لیکن ان کے اندر قدرتی اور غیر معمولی ذہانت کا

---

[1] یہ اقتباس بی دتّا اور اے۔ این۔ سنگھ کی کتاب "ہسٹری آف ہندو میتھیمیٹکس" (۱۹۳۳ء) میں درج ہے۔ اس موضوع پر میں نے اس کتاب سے بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔

ایک ایسا جوش تھا جو کسی طرح دب نہیں سکتا تھا اور وہ فرصت کے وقت میں اعداد اور مساوات (Equations) سے کھیلا کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک ریاضی داں کی نظر ان کی چیزوں پر پڑ گئی اور اُس نے ان کے یہ چھوٹے موٹے کام کیمبرج بھیج دیئے۔ وہاں کے لوگ ان چیزوں سے متاثر ہوئے اور راما نجم کے لئے وظیفہ مقرر ہوگیا۔ انھوں نے کلرکی چھوڑی اور کیمبرج چلے گئے۔ وہاں کے مختصر قیام میں انھوں نے جو کام کیا وہ بے حد قابل قدر تھا اور اس میں حیرت انگیز جدت طرازی تھی۔ انگلستان کی رائل سوسائٹی نے معمولی قاعدوں کو نظر انداز کرکے انھیں اپنا رکن بنایا۔ لیکن اس کے دو ہی سال کے بعد ۳۲ سال کی عمر میں، دق کے مرض میں راما نجم کا انتقال ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ پروفیسر جولین ہکسلے نے راما نجم کو اس صدی کا سب سے بڑا ریاضی داں بتایا ہے۔

راما نجم کی مختصر زندگی اور ان کی موت ہندوستان کی حالت کا آئینہ ہے۔ ہمارے کروڑوں ہم وطنوں میں سے کتنے ہیں جنھیں تعلیم ملتی ہے، کتنے ہیں جو تقریباً فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور وہ تھوڑے سے آدمی بھی جنھیں تعلیم مل جاتی ہے، کسی دفتر میں کلرکی کے امیدوار رہتے ہیں، اتنی کم تنخواہ پر جو انگلستان کے اس بے روزگار کی آمدنی سے بھی کم ہے جو سرکاری خیرات پر پلتا ہے۔ اگر زندگی ان بدنصیبوں کے لئے اپنا دروازہ کھول دے اور اُنھیں کھانا، رہنے کے لئے اچھی جگہ، تعلیم و ترقی کے مناسب موقعے ملیں تو ان کروڑوں میں سے کتنے ہیں جو نامور سائنس داں، معلم، ماہرین صنعت، قائدین صنعت، مصنف اور آرٹسٹ بنیں اور اس طرح ایک نئے ہندوستان اور ایک نئی دنیا کی تعمیر میں حصہ لے سکیں؟

۲۱ - عروج اور زوال

عیسوی سن کے ابتدائی ایک ہزار برس میں ہندوستان نے اَن گنت نشیب و فراز دیکھے — اُسے باہر کے حملہ کرنے والوں سے بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں اور اندرونی انتشار کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اور یہی زمانہ ہے جس میں اس کی قومی زندگی میں بھرپور جوشِ نمو ہے اور ہندوستان مختلف سمتوں میں بڑھتا اور پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ تہذیب بڑھ کر ایک شاندار تمدن کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے مختلف شعبے فلسفہ، ادب، ڈرامہ، آرٹ، سائنس، اور ریاضی انتہائی ترقی کرتے ہیں۔ ہندوستان کی معیشت وسیع ہوتی جاتی ہے اس کا دائرہ نظر وسعت پا کر دوسرے ملکوں تک پہنچتا ہے۔ ایران، چین، وسط ایشیا اور یونانی دنیا سے ہندوستان کے تعلقات بڑھتے ہیں۔ جہاز رانی کا شوق اُسے مشرقی سمندروں کی طرف لے جاتا ہے، یہاں ہندوستان کی نوآبادیاں قائم ہوتی ہیں اور ہندوستانی تہذیب اپنی حدود سے نکل کر دُور دُور پھیل جاتی ہے۔ اس ہزار سالہ عہد کے درمیانی زمانے میں چوتھی صدی سے چھٹی صدی تک گپت سلطنت کا دور دورہ ہوتا ہے اور وہ ان وسیع علمی اور فنی سرگرمیوں کی سرپرست اور مظہر بن جاتی ہے۔ اس عہد کو سنہری یا کلاسیکی عہد کہا گیا ہے۔ اس زمانے کی سنسکرت کتابوں میں ایک خاص سکون و وقار، ایک زبردست خود اعتمادی نظر آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل فخر سے معمور تھے کہ وہ تہذیب و تمدن کے انتہائی عروج کے زمانے میں پیدا ہوئے اور ان میں یہ ولولہ تھا کہ اپنی زبردست علمی اور فنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیں۔

لیکن اس سنہری عہد کے خاتمے پر پہلے ہی کمزوری اور زوال کی علامتیں،
ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ شمالی مغربی راستوں سے سفید ہن ہتے پر ہلّا کرتے
ہیں اور انھیں پیچھے ہٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ برابر آتے رہتے ہیں اور آخر آہستہ
آہستہ اُن کی پہنچ شمالی ہند تک ہو جاتی ہے۔ اور کوئی پچاس برس تک پورے
شمالی ہندوستان میں ان کی حکومت قائم رہتی ہے۔ لیکن گپت خاندان کا آخری
زبردست بادشاہ، وسط ایشیا کے حکمراں یشودھرمن کی مدد سے ہن قوموں پر فتح
پالیتا ہے۔ لیکن طول طویل لڑائی کا سلسلہ ہندوستان کو سیاسی اور جنگی حیثیت سے
بالکل کمزور کر دیتا ہے اور ہنوں کے پورے شمالی ہندوستان میں جابجا آباد
ہو جانے سے ان میں ایک طرح کی اندرونی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہن بھی،
دوسری غیر ملکی قوموں کی طرح ہندوستانی زندگی میں شیر و شکر ہو گئے لیکن انھوں
نے ہند آریائی قوموں کے پرانے آدرشوں کو کمزور کر دیا۔ پرانی کتابیں ہن قوم
کے مظالم اور وحشیانہ سلوک کے تذکروں سے بھری ہوئی ہیں، اور یہ چیزیں
ہندوستانی معیاروں کے نزدیک بالکل اجنبی تھیں۔

ساتویں صدی میں، ہرش کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں نئے
سرے سے سیاسی اور تمدنی زندگی کا احیا ہوا۔ اُجینی (موجودہ اُجین)، جو
گپت شہنشاہوں کا دارالسلطنت رہ چکا تھا، پھر آرٹ اور تہذیب اور ایک
زبردست سلطنت کا مرکز بن گیا۔ لیکن آنے والی صدیوں نے اس کے جاہ و
حشم کو مٹا دیا اور یہ سلطنت بھی ختم ہو گئی۔ نویں صدی میں گجراتی کے مہر بھوج
نے شمالی اور وسطی ہندوستان میں ایک مرکزی اور متحدہ سلطنت قائم کی اور
قنوج کو اس کا دارالسلطنت بنایا۔ ادبی زندگی میں پھر جان پڑی، اور راج شیکھر
اس کی روح رواں بنا۔ گیارھویں صدی کے شروع میں بھوج خاندان نے

ایک اور زبردست اور دلکش شخصیت پیدا کی اور اجین پھر ایک بار ایک زبردست سلطنت کا مرکز بن گیا۔ یہ بھوج حیرت انگیز آدمی تھا اور اس نے بہت سے میدانوں میں امتیاز پیدا کیا۔ وہ قواعد داں اور مدوّن لغت تھا۔ اُسے طب اور ہیئت سے بھی دلچسپی تھی۔ اور اس کے علاوہ شاعر اور ادیب بھی تھا اور بہت سی کتابیں اس سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اس بھوج کا نام ہندوستانی کہانیوں اور داستانوں کا جزو بن گیا ہے اور اُسے عظمت، فیاضی اور علم و دانش کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے کہ بیچ میں کبھی کبھی اچھے دور آئے عام طور پر اس عہد میں ہندوستان میں اندرونی کمزوری کے آثار نمایاں ہیں جس کا اثر نہ صرف اس کی سیاسی حالت پر بلکہ اس کی تخلیقی سرگرمیوں پر بھی پڑا۔ اس کمزوری اور انحطاط کے صحیح زمانے کا تعین دشوار ہے اس لئے کہ انحطاط کا یہ عمل آہستہ آہستہ اور مسلسل طور پر ہوتا رہا اور اس نے شمالی ہند پر جنوب کے مقابلے میں زیادہ جلد اثر کیا۔ بلکہ جنوب رفتہ رفتہ سیاسی اور تہذیبی دونوں حیثیتوں سے زیادہ اہم اور زیادہ قوی بنتا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جنوب حملہ آوروں کے طوفانوں کی زد سے محفوظ رہا اور شاید اسی لئے بہت سے بڑے بڑے مصنف، بڑے بڑے آرٹسٹ اور سنگ تراش شمال کے انتشار سے بچنے کے لئے جنوب کی طرف چلے گئے۔ جنوب کی قوی سلطنتوں اور ان کے شان دار درباروں نے انھیں اپنی طرف کھینچا ہوگا اور انھیں تخلیقی کاموں کے وہ موقعے دئے ہوں گے جو دوسری جگہ انھیں میسر نہیں تھے۔

گو شمال اب پورے ہندوستان پر اس حد تک حاوی نہیں تھا جیسے پُرانے زمانے میں، اور اس کی مرکزی قوت اب بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں

میں بٹ گئی تھی لیکن اس کی زندگی اب بھی تہذیب کی دولت سے مالا مال تھی اور اس میں اب تک تمدنی اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے بہت سے مرکز موجود تھے۔ بنارس، اب بھی ہمیشہ کی طرح مذہبی اور فلسفیانہ فکر کا سرچشمہ تھا۔ اور جب کوئی آدمی کوئی نیا نظریہ پیش کرتا یا پرانے نظریے کی نئی تاویل کرنا چاہتا تھا تو اسے تصدیق و توثیق کے لئے بنارس آنا پڑتا تھا۔ کشمیر مدتوں تک بودھ اور برہمنی تعلیم کا بڑا مرکز رہا ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیاں، اور ان سب میں زیادہ نالندا، اپنے علم و فضل کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھیں۔ جو شخص نالندا میں تعلیم حاصل کر لیتا تھا اُس پر گویا تہذیب کی مہر ثبت ہو جاتی تھی۔ اس یونیورسٹی میں داخلہ بھی آسان نہیں تھا، اس لئے کہ یہاں صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے تھے جو داخلے سے پہلے لیاقت کا ایک خاص معیار پیدا کر لیں۔

اس یونیورسٹی میں فضیلت کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے چین، جاپان تبت، اور بعض لوگوں کے نزدیک کوریا، منگولیا اور بخارا تک سے لوگ آتے تھے۔ مذہبی اور فلسفیانہ مضامین (جن میں بودھ اور برہمنی دونوں عقیدوں کی تعلیم شامل تھی) کے علاوہ دنیاوی اور عملی مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس یونیورسٹی میں آرٹ، فن تعمیر اور طب کے علیحدہ علیحدہ شعبوں کے علاوہ زراعت اور ڈیری اور مویشیوں کی تعلیم کے لئے بھی الگ حصے تھے۔ یونیورسٹی کی علمی زندگی میں بحث مباحثہ اور مناظرے کثرت سے ہوتے تھے۔ ہندوستانی تہذیب کے ہندوستان سے باہر پھیلانے کا کام زیادہ تر نالندا کے عالموں اور فاضلوں ہی نے انجام دیا ہے۔

اس کے علاوہ بھاگلپور کے قریب وکرم شیل یونیورسٹی اور کاٹھیاواڑ میں وبھی یونیورسٹی تھی۔ گپتوں کے عہد میں اُجین یونیورسٹی بھی بہت مشہور

ہوگئی تھی۔ جنوب میں امراوتی یونیورسٹی تھی ۔

لیکن جوں جوں یہ ہزار سالہ دور خاتمے کے قریب پہنچا گیا، تہذیب کی صبح کا نور اور اس کی دوپہر کا جلال ختم ہوگیا، اور شام کے اندھیرے نے اسے گھیرنا شروع کر دیا۔ جنوب میں اب بھی زندگی اور توانائی تھی اور یہ توانائی کئی صدیوں تک باقی رہی۔ ہندوستان سے باہر کی نوآبادیوں میں زندگی کے جوش اور خون کی روانی کا اس کے بعد بھی پانچ سو برس تک وہی زور شور رہا لیکن خود ہندوستان میں دل و دماغ پر افسردگی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جس سے سارا جسم رفتہ رفتہ شل ہوتا جاتا تھا — آٹھویں صدی میں شنکر کے بعد فلسفے کی دنیا میں کوئی زبردست شخصیت نظر نہیں آتی، گو مفسروں اور منطقیوں کی اب بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ (شنکر کا وطن بھی جنوب ہی میں تھا۔) پرانے مفکروں میں تحقیق و جستجو کا جو جذبہ اور ذہنی جد وجہد کی جو خواہش تھی اس کی جگہ نظری منطق اور بے جان مناظروں نے لے لی۔ برہمنی مذہب اور بودھ مت دونوں میں انحطاط شروع ہوگیا اور دونوں میں عبادت کے مبتذل طریقے رائج ہوگئے، اور تنتری عبادت اور یوگ کے طریقوں کی کچھ بگڑی ہوئی صورتیں عام ہوگئیں۔

ادب میں بھو بھوتی (آٹھویں صدی) آخری بڑی شخصیت ہے۔ کتابیں اس کے بعد بھی کثرت سے لکھی گئیں لیکن ان کے طرز بیان میں ابہام اور پیچیدگی ہے — نہ خیال کی تازگی، نہ بیان کی شگفتگی۔ ریاضی میں بھاسکر دوم (بارھویں صدی) کا نام آخری بڑا نام ہے۔ آرٹ میں ای۔ بی۔ ہیول کے خیال میں اس زمانے کے بہت عرصے بعد تک بھی ترقی کا دور دورہ رہا۔ ہیول کی رائے ہے کہ ہندوستانی آرٹ میں اظہار کے طریقوں کی فنی تکمیل

ساتویں آٹھویں صدیوں سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ دو صدیاں ہندوستانی سنگ تراشی اور مصوری کا سنہری زمانہ ہے۔ ساتویں یا آٹھویں صدی سے چودھویں صدی تک کا عہد ہیول کے نزدیک ہندوستان آرٹ کا عظیم الشان دور ہے، اور یہی دور ہے جس میں گاتھک آرٹ نے یورپ میں سب سے زیادہ ترقی کی تھی۔ ہیول نے لکھا ہے کہ سولھویں صدی سے ہندوستان کے قدیم آرٹ کی تخلیقی قوتوں کا نمایاں زوال شروع ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ رائے کس حد تک ٹھیک ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آرٹ کے میدان میں بھی، پرانی روایتوں کو زیادہ مدت تک زندہ رکھنے میں جنوب کا ہاتھ، شمال سے زیادہ ہے۔

آبادکاری کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان سے جو آخری بڑا ہلّہ نویں صدی میں ہوا، لیکن جنوبی ہند کا چول خاندان گیارھویں صدی تک زبردست بحری طاقت رہا اور گیارھویں صدی میں انھوں نے سری وجے کو شکست دی۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کا سرچشمہ رفتہ رفتہ خشک ہو رہا تھا اور اُس کی تخلیقی قوت اور جوش ختم ہوتا جا رہا تھا۔ انحطاط کا یہ عمل بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور کئی صدیوں تک جاری رہا۔ شروع شروع میں یہ انحطاط شمال میں رہا اور پھر جنوب میں بھی پہنچ گیا۔ لیکن اس سیاسی زوال اور تمدنی جمود کی وجہ کیا تھی؟ کیا یہ صرف عمر کا تقاضا تھا، جو شاید انسان کی طرح تمدن اور تہذیب پر بھی حملہ کرتی ہے، یا یہ صرف لہروں کا مدوجزر، جس کا خاصہ ہے، کبھی آگے بڑھنا اور کبھی پیچھے ہٹنا؟ یا اس کی ذمہ داری بیرونی حملوں اور اُن کے پیدا کیے ہوئے اثرات پر تھی؟ رادھاکرشنن نے لکھا ہے ہندوستانی فلسفے کی قوت سیاسی آزادی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ سلوین لیوی نے لکھا ہے "ہندوستان میں آزادی ختم ہوئی تو سنسکرت تہذیب بھی ختم ہوگئی نئی زبانوں

اور نئے ادیبوں نے آریہ ذات پر حملہ کیا اور آخر سنسکرت کو سوائے مدرسگاہوں کے اور کہیں پناہ نہ ملی اور اس نے ایک مصنوعی رنگ اختیار کر لیا۔"

یہ سبھی باتیں سچی ہیں اس لئے کہ سیاسی آزادی جاتی رہتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ تہذیبی زوال ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی نہ کسی طرح کا زوال اور انحطاط پہلے ہی سے موجود نہ ہو تو سیاسی آزادی جائے ہی کیوں؟ کسی چھوٹے سے ملک پر کوئی بڑی طاقت آسانی سے غالب آسکتی ہے، لیکن ہندوستان جیسے عظیم الشان، مکمل اور تمدنی حیثیت سے حد درجہ ترقی یافتہ ملک کو بیرونی حملے اسی صورت میں پامال کر سکتے تھے کہ اس میں پہلے سے زوال اور پامالی کے آثار پیدا ہو چکے ہوں اور یا حملہ آور قوم جنگ کے فن میں بہت زیادہ ماہر اور بڑھی چڑھی ہو۔ درحقیقت ایک ہزار سال کے خاتمے پر اندرونی زوال کے آثار ہندوستان میں صاف نظر آرہے تھے۔

ہر تہذیب کی زندگی میں زوال اور انتشار کے دور بار بار آتے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس سے پہلے ایسے کئی دور آچکے تھے۔ لیکن ہندوستان نے اس زوال اور انتشار کے بعد ہمیشہ اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اپنی زندگی میں پھر نئے سرے سے تازگی پیدا کر لی ــــ کبھی کبھی تھوڑے عرصے کے لئے گوشہ گیری اختیار کر لی اور پھر اس گوشے سے ایک نئی ہمت اور نئی قوت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس مختصر زوال اور انتشار اور اس گوشہ گیری میں بھی ہمیشہ اس میں اندرونی حرکت موجود رہی اور اس حرکت نے اسے ہمیشہ زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مدد دی ــــ ایک نئی زندگی، ماضی سے کسی قدر مختلف لیکن اس کے ساتھ مسلسل اور مربوط۔ کیا ہندوستان میں اب اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی وہ قوت باقی نہیں اور کیا اس کے ذہن میں پہلی سی وہ لچک اور لوچ موجود نہیں

جس نے اُسے گذرے ہوئے زمانے میں ہمیشہ موت سے بچائے رکھا ؟ کیا اس کے کٹر عقیدوں اور سماجی نظام کی سخت زنجیروں نے اس کے ذہن کو بھی سخت اور ٹھس بنا دیا ہے ؟ اس لئے کہ اگر زندگی کا نمو رک جائے تو فکر کی ترقی بھی بند ہو جاتی ہے۔ ہندوستان ہمیشہ سے عمل کی قدامت پرستی اور فکر کی انقلاب پسندی کا عجیب و غریب مجموعہ رہا ہے۔ اور لازمی طور پر فکر کے انقلاب نے عمل کو متاثر کیا، اور عمل کا یہ انقلاب، ماضی کی عزت اور احترام کے باوجود جاری رہا۔ "اگرچہ ان کی نظر پرانے لفظوں پر تھی، لیکن ان کے ذہن ان لفظوں میں نئے معنی کی جستجو میں مصروف تھے۔ ہندوستان بدلتا رہا اور ہندوستان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔" لیکن خیال کی انقلابی اور تخلیقی قوت ختم ہو گئی، اور وہ محض فرسودہ اور بے معنی رسوم کا بُزدل غلام بن کر رہ گیا ــــ پُرانی باتوں کو دہرانے والا نئی چیزوں سے ترساں و ہراساں زندگی جامد بن گئی اور خود اپنی بنائی ہوئی زنجیروں کی اسیر اور پابند ہو کر رہ گئی۔

تہذیبوں کی پامالی و بربادی کی ہمارے سامنے بہت سی مثالیں ہیں اور ان میں سب سے نمایاں یورپ کی کلاسیکی تہذیب کی پامالی ہے، جو روم کی فتح کے بعد یکایک ختم ہو گئی۔ لیکن حملہ آوروں کے قبضے میں آنے سے بہت پہلے سے روم خود اپنی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے تباہی اور بربادی کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کی معاشی تنظیم گھٹ کر اور سمٹ کر بے جان ہو رہی تھی اور مختلف طرح کی تباہیاں اس کے ساتھ ساتھ روم کے سر پر منڈلانے لگی تھیں۔ شہری صنعتیں ختم ہو رہی تھیں، بڑے بڑے شہر رفتہ رفتہ چھوٹے اور بدحال ہو رہے تھے ـــــ اور زمین کی زرخیزی بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ شہنشاہوں نے ان برابر بڑھتی ہوئی مصیبتوں پر فتح پانے کی طرح طرح کی ترکیبیں کیں۔ سوداگروں، دستکاروں اور مزدوروں کے لئے حکومت نے قانون

بنائے اور انھیں خاص خاص کاموں اور پیشوں کا پابند بنایا۔ کام لینے والوں کو اس کی اجازت نہ رہی کہ وہ مزدوروں کے ایک خاص حلقے کے علاوہ دوسرے کاریگروں سے کام لے سکیں۔ اور اس طرح بعض پیشے ذاتیں بن گئے۔ کسان اسامی بن کر رہ گئے۔ لیکن حکومت کی یہ ساری ترکیبیں زوال کو نہ روک سکیں بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور آخر رومن سلطنت کی بنیاد منہدم ہوگئی۔

لیکن ہندوستانی تہذیب کا زوال اس ڈرامائی انداز میں نہیں ہوا۔ اور ان سارے برے حالات کے باوجود اس نے اپنے استقلال اور قوت کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔ تاہم زوال برابر جاری رہا اور اس بات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے کہ عیسوی سنہ کے ابتدائی ایک ہزار سال کے بعد ہندوستان کی سماجی حالت کیا تھی۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کی معاشی تنظیم بالکل ختم ہوچکی تھی اور زندگی کی ہر چیز کا رجحان زوال اور انحطاط کی طرف تھا۔ غالباً یہ صورت حال ان سماجی حالات کا لازمی نتیجہ تھی جو ہندوستان کے خاص قسم کے ذات پات کے نظام نے پیدا کر دئے تھے۔ جو ہندوستانی وطن چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے (مثلاً جنوبی مشرقی ایشیا میں) وہ ذہنیت اور رسوم میں اور معاشی بود و باش میں اتنے سخت اور کٹر نہیں تھے اور اس لئے انھیں پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے موقعے ملے۔ اور اگلے چار پانچ سو برس تک ان آبادیوں میں انھوں نے قوت اور تخلیق کے خوب جوہر دکھائے اور تیزی سے ترقی کی شاہ راہیں طے کیں۔ لیکن ہندوستان میں خلوت پسندی کے جذبے نے تخلیقی قوت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں، اور ہندوستانی زندگی پر ایک تنگ اور محدود نقطۂ نظر چھا گیا۔ زندگی کچھ مقررہ سانچوں میں ڈھل کر رہ گئی — ہر ایک اپنے اپنے حال میں مگن اور دوسروں سے الگ تھلگ اور بے تعلق۔ ملک کے بچاؤ کے

لئے لڑنا صرف چھتریوں کا کام تھا۔ دوسروں کو نہ اس کام سے دلچسپی تھی اور نہ اس میں حصہ لینے کی اجازت۔ برہمن اور چھتری تجارت اور کاروبار کو حقیر اور ذلیل پیشے سمجھتے تھے۔ نیچ ذات والوں کو تعلیم اور زندگی میں ترقی کرنے کے موقعے حاصل نہ تھے، اور انھیں صرف اونچی ذات والوں کی اطاعت گذاری کا سبق سکھایا جاتا تھا۔ گو اس زمانے کا شہری معاشی نظام اور صنعتیں بہت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھیں لیکن حکومت کی بناوٹ بہت سی حیثیتوں سے گری ہوئی تھی۔ غالباً لڑائی کے فنوں میں بھی ہندوستان اب بہت پچھڑ گیا تھا۔ ایسی صورت میں جب تک کہ ان حالات میں تبدیلی کر کے ذہن اور جسم کو ترقی کی نئی نئی راہوں پر چلنے کا موقع نہ دیا جاتا، کوئی نمایاں ترقی ممکن نہ تھی۔ اور ذات پات اس طرح کی ہر تبدیلی کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ ذات پات کے نظام میں بہت سی اچھائیاں ہیں اور اس نے ہندوستانی سماج کو مستحکم بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں تباہی اور بربادی کے جراثیم بھی موجود تھے۔

ہندوستان کے سماجی نظام (اس کے متعلق میں آگے چل کر ذرا تفصیل سے لکھوں گا) نے ہندوستانی تہذیب کو حیرت انگیز استحکام دیا تھا۔ اس نظام سے جماعت میں قوت اور اتحاد اور تنظیم پیدا ہوئی، لیکن یہی نظام اس کے پھیلاؤ اور نسبتاً زیادہ وسیع اتحاد اور تنظیم کے راستے میں حائل ہوا۔ اس نے ہنر اور دستکاری، تجارت اور کاروبار کو ترقی دی لیکن ہر گروہ میں علیحدہ علیحدہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ خاص طرح کے کام خاندانی میراث بن گئے اور ان میں کسی طرح کا نیا پن یا تبدیلی پیدا کرنے کے خیال کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا۔ کام کرنے والا لکیر کا فقیر رہتا تھا اور کسی طرح کی جدت اور ندرت سے کام لینے کی ضرورت

نہ سمجھتا تھا۔ ایک محدود حلقے میں اس چیز نے تھوڑی بہت آزادی پیدا کر دی لیکن یہ آزادی بہت مہنگی پڑی۔ اول تو اس سے عام آزادی کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی اور دوسرے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد مستقل طور پر سماجی نظام کی سب سے نچلی سیڑھی پر رُک کر رہ گئی اور ترقی کی تمام راہیں اس کے لئے مسدود ہو گئیں۔ جب تک یہ نظام سماج کو ترقی اور پھیلاؤ کے موقعے دیتا رہا یہ مفید رہا۔ لیکن جب وہ وسعت کی اُس حد تک پہنچ گیا جہاں تک پہنچنے کی اُسے اجازت تھی، تو وہ ایک جگہ ٹھہر گیا، اور ترقی کی راہوں میں رکاوٹ بن گیا، اور تنزل کا مددگار۔

اور اس چیز کی بدولت ہر طرف تنزل اور انحطاط پیدا ہو گیا — علم میں، فلسفے میں، سیاست میں، لڑائی کے فن اور تجارت میں، بیرونی دنیا سے تعلقات قائم کرنے کے ہنر میں۔ محدود قسم کی جذباتیت ہر چیز پر چھا گئی۔ متحد اور واحد ہندوستان کا وسیع تصور ختم ہو گیا اور اس کی جگہ چھوٹی جماعت اور گروہ کی خود غرضانہ محبت نے لے لی۔ اور سماجی تنظیم محدود و مجبور ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی، جیسا کہ آگے آنے والے زمانے نے ثابت کیا، پرانے نظام میں بلا کی قوت اور استحکام تھا اور ایک حد تک لچک اور مطابقت پذیری بھی۔ اور انھیں خوبیوں نے اُسے زندہ رکھا، اور اس نے نئے سابقوں اور فکر کی نئی لہروں سے فائدہ اُٹھایا اور کبھی کبھی ترقی کی راہوں کی طرف بھی قدم بڑھایا۔ لیکن ترقی کے اس قدم میں ہمیشہ ماضی کی اَن گنت یادوں نے بیڑیاں ڈال دیں اور یہ بڑھتا ہوا قدم رُک کر رہ گیا۔

چھٹا باب

نئے مسائل

۱- عرب اور منگول

جس زمانہ میں ہرش شمالی ہندوستان کی طاقتور سلطنت پر حکومت کر رہا تھا اور چینی عالم ہوان سانگ نالندہ کی درسگاہ میں تعلیم پا رہا تھا عرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ہندوستان میں اسلام ایک مذہبی اور سیاسی طاقت کی حیثیت سے آیا اور یہاں کی تاریخ میں اس نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے، لیکن یہ بات خوب اچھی طرح سے یاد رکھنی چاہیئے کہ اس کے اثر سے تاریخ میں جو تبدیلی ہوئی اُسے کافی مدت لگی، مسلمان ہندوستان کے وسط تک تقریباً چھ سو برس میں پہنچے، اور جس وقت یہاں انھوں نے اپنی سلطنت قائم کی ہے اس وقت تک اسلام اور اس کے علمبردار دونوں بہت کچھ بدل چکے تھے، وہ عرب جنھوں نے اپنی قوت عمل اور اپنے غیر معمولی جوش کی وجہ سے اسپین سے منگولیا کی حدود تک فتوحات کیں اور اپنی شاندار تہذیب کو ان ملکوں میں پھیلایا ہندوستان میں نہ آسکے، وہ بس ہندوستان کے شمالی مغربی کنارے تک پہنچے اور وہیں رہے، اس کے بعد عربوں کی تہذیب کا آفتاب رفتہ رفتہ ڈھلنے لگا اور وسطی اور مغربی ایشیا میں مختلف ترک قبائل نمایاں حیثیت حاصل کرنے لگے، یہی ترک اور افغان قبائل سرحد پار سے اسلام کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت

سے ہندوستان میں لائے ،

میرا خیال ہے کہ اِن واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے چند تاریخیں ہمیں مدد دیں گی اسلام کی ابتدا یوں سمجھئے کہ ہجرت سے ہوئی یعنی سنہ ۶۲۲ء میں جب کہ پیغمبر اسلامؐ نے مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ میں سکونت اختیار کی ، اس کے دس سال بعد اُن کی وفات ہوئی ، شروع کا تھوڑا زمانہ تو عرب کے اندر طاقت مستحکم کرنے میں صرف ہوا ، اس کے بعد وہ حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے جنھوں نے اسلام کے علمبرداروں کو مشرق کی طرف پورے وسط ایشیا میں ، اور مغرب کی طرف کُل شمالی افریقہ ، اور پھر وہاں سے اسپین اور فرانس تک پھیلا دیا ، ساتویں صدی کے ختم تک اور آٹھویں کے شروع زمانہ میں عراق ، ایران اور وسط ایشیا اُن کے قبضہ میں آگئے سنہ ۷۱۲ء میں انھوں نے سندھ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن اس سے آگے نہ بڑھے کیونکہ ہندوستان کے زیادہ زرخیز علاقوں اور سندھ کے درمیان ایک بڑا ریگستان حائل تھا ۔ مغرب میں انھوں نے افریقہ اور یورپ کی اس درمیانی تنگ ابنائے کو عبور کیا جو اُس وقت سے ابنائے جبرالٹر کے نام سے مشہور ہوئی اور سنہ ۷۱۱ء میں اسپین میں داخل ہوگئے ۔ اسپین کی فتح کو پورا کرنے کے بعد پرنیز کے پہاڑوں کو عبور کرکے فرانس میں آگئے ، یہاں سنہ ۷۳۲ء میں چارلس مارٹل نے ٹورس کے مقام پر انھیں شکست دی اور وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے ۔

اِن فتوحات کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ اُس قوم کے کارنامے ہیں جو عرب کے ریگستانوں سے نکلی تھی اور جس نے اب تک تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا تھا ۔ اس طرح غیر معمولی طور پر اُن

کی قوتوں کے ابھرنے کا سبب اُن کے پیغمبر کی وہ شخصیت تھی جس میں عمل
اور انقلاب کی قوتیں بھری ہوئی تھیں اور ان کی یہ تعلیم کہ دنیا کے سب
انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ عرب تہذیب اسلام کے پیدا ہوتے ہی یکایک
وجود میں آگئی۔ مسلمان عالموں کا میلان یہ رہا ہے کہ وہ اسلام سے پہلے
کی عربوں کی تہذیب کو بہت گھٹاتے ہیں اور اُس دور کو جاہلیت کے نام
سے پکارتے ہیں یعنی ایسا زمانہ جس میں جہالت اور توہم پرستی تھی۔ دنیا
کی تمام دوسری تہذیبوں کی طرح عرب تہذیب بھی اپنا ایک ماضی رکھتی
تھی جس کو سامی فونیقی، کرٹیی، کالڈی اور عبرانی نسلوں کی ترقی کے
ساتھ بہت قریب کا تعلق تھا، یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے آپ
کو باقی سامی نسلوں سے الگ کر لیا تھا اور اُن میں آپس کے
جھگڑے بھی رہتے تھے تاہم پورے سامی علاقے کے بسنے والوں میں آپس
کا میل جول اور ربط ضبط پایا جاتا تھا اور کسی حد تک سب کی تہذیب کا پس
منظر ایک ہی تھا، اسلام سے پہلے کی عرب تہذیب نے یمن میں خصوصیت
کے ساتھ نشو و نما پائی۔ پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے وقت عربی زبان بہت
ترقی یافتہ زبان تھی جس میں فارسی الفاظ کے علاوہ ہندی لفظ بھی شامل
تھے۔ فونیقیوں کی طرح عرب بھی تجارت کے سلسلہ میں دور دراز کے سفر
کیا کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے عربوں کی ایک نوآبادی جنوبی چین میں
بھی کینٹن کے قریب تھی۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی قوم میں یقین اور جوش
پیدا کر کے اُن کو ایک نئی زندگی بخشی۔ عرب اپنے آپ کو ایک نئے پیام کا

حال سمجھنے لگے اور اس خیال نے پوری قوم کے اندر وہ جوش اور خود اعتمادی پیدا کر دی جو کبھی کبھی تاریخ کی کایا پلٹ دیتی ہے، اُن کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وسط ایشیا شمالی افریقہ اور مغرب کی سلطنتیں اُس وقت تک کمزور ہو چکی تھیں۔ شمالی افریقہ میں تو اُس زمانہ میں ایسی خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی کہ وہاں کے عیسائی فرقوں میں سیاسی اقتدار کے لئے اکثر آپس میں خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں پھر اُس عیسائیت میں جو اس وقت ان ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی وسعت نظر اور رواداری بالکل نہ تھی، اس کے برعکس اسلام میں رواداری عام تھی اور اس کا یہ پیام تھا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اصل میں یہی چیز تھی جس کی وجہ سے تمام وہ قومیں جو عیسائیت کے آپس کے جھگڑوں سے تنگ آ چکی تھیں ٹوٹ کر مسلمانوں سے آملیں۔

خود وہ تہذیب جسے عرب اپنے ساتھ دور دراز ملکوں تک لے گئے برابر بڑھتی اور بدلتی رہی۔ گو اس تہذیب پر اسلام کے عقائد کا بہت گہرا اثر تھا پھر بھی اسے اسلامی تہذیب کہنا دماغ کو الجھن میں ڈالتا ہے اور غالباً صحیح بھی نہیں ہے، جب سے دمشق مسلمانوں کا پایہ تخت ہوا اُن کی معاشرت کی سادگی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ تصنع آ گیا۔ ان کو اس دور کی تہذیب کو ہم عرب سامی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد بازنطینی اثرات ان کی تہذیب میں نمایاں نظر آنے لگے۔ لیکن جب پایہ تخت بغداد کو منتقل ہوا تو عرب تہذیب پر ایران کی قدیم تہذیب کا سب سے زیادہ اثر ہوا اور اس کی وجہ سے عرب ایرانی تہذیب وجود میں آئی جو بعد میں اُن تمام علاقوں میں پھیل گئی جو عربوں کے قبضہ میں آ گئے۔

عربوں کی یہ سلطنت جو اتنی وسیع تھی اور جس کو عربوں نے باہر پھیلنے

ہیں بہ ظاہر کوئی دشواری بھی پیش نہ آئی تھی ہندوستان میں سندھ سے آگے نہ بڑھ سکی، کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ اُس زمانہ میں بھی ہندوستان اتنا طاقتور تھا کہ وہ باہر کے حملہ آوروں کا مقابلہ کرسکتا تھا؟ غالباً یہی وجہ تھی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ کی فتح کے کئی صدیوں بعد مسلمانوں نے شمالی ہند پر حملہ کیا، اور اس وقفہ کا بہ ظاہر یہی سبب نظر آتا ہے کہ ہندوستان اِن کے حملوں کو روکنے کی طاقت رکھتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا دوسرا سبب عربوں کی اندرونی دشواریاں ہوں، کیونکہ سندھ بغداد کی مرکزی طاقت سے الگ ہوکر ایک چھوٹی سی آزاد اسلامی ریاست بن چکا تھا، بہر حال گو شمالی ہند پر عربوں کا حملہ نہیں ہوا پھر بھی ہندوستان کے اور عربوں کے درمیان تعلقات بڑھتے رہے، سیاح اِدھر سے اُدھر آتے جاتے تھے، سفیروں کے تبادلے ہوتے تھے ہندوستانی علوم خصوصاً ریاضی اور فلکیات کی کتابیں بغداد لے جائی گئیں اور عربی میں اُن کے ترجمے ہوئے پھر بہت سے ہندوستانی طبیب بھی بغداد گئے۔ یہ تجارتی اور تہذیبی تعلقات صرف شمالی ہند کے ساتھ محدود نہ تھے بلکہ جنوبی ہند کی ریاستیں بھی اِن میں شامل تھیں، اور ہندوستان کے مغربی ساحل کے راشٹر کوٹ تو تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

آپس کے اِسی ربط ضبط کی وجہ سے ہندوستانیوں کو اس نئے مذہب یعنی اسلام سے واقفیت ہوئی۔ اسلام کے مبلغ یہاں آئے اور اُن کا خیر مقدم کیا گیا، اس ملک میں مسجدیں بنیں اور اس پر نہ حکومت کی طرف سے اعتراض ہوا، نہ عام باشندوں کی طرف سے، نہ

کبھی کسی قسم کے مذہبی جھگڑے فساد ہوئے، ہندوستان کی یہ بہت قدیم روایت تھی کہ سب مذہبوں کو اور عبادت کے سب طریقوں کو یہاں روا رکھا جاتا تھا، اس طرح اسلام ہندوستان میں سیاسی طاقت بن کر آنے سے کئی صدی پہلے مذہب کی حیثیت سے آچکا تھا۔

خلفائے بنو اُمیہ کے زمانہ میں عربوں کی اس نئی سلطنت کا پایۂ تخت دمشق بنا جو رفتہ رفتہ ایک بڑا شاندار شہر ہو گیا۔ لیکن جلد ہی تقریباً ۷۵۰ء میں خلفائے بنی عباس نے دمشق کے بجائے بغداد کو پایہ تخت بنا لیا، اس کے بعد مسلمانوں میں اندرونی لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اسپین مرکزی حکومت سے الگ ہو گیا اور مدت تک ایک آزاد عرب سلطنت بنا رہا، رفتہ رفتہ پوری سلطنتِ بغداد کمزور ہو گئی اور بہت سی ریاستوں میں بٹ گئی۔ سلجوقی ترکوں نے وسط ایشیا سے آکر اپنا ایسا اثر جمایا کہ ساری سیاسی قوت اُن کے ہاتھوں میں آگئی، خلیفہ بس نام کے لئے باقی رہ گیا جن کے تمام احکام محض ترکوں کی خوشی پر موقوف تھے۔ ادھر سلطان محمود غزنوی جو ایک بڑا دلیر اور باہمت سپہ سالار تھا افغانستان میں طاقت پکڑ گیا۔ وہ تو خلیفہ کی کچھ پروا ہی نہ کرتا تھا بلکہ اکثر اُس پر منہ آتا تھا، اس کے باوجود بغداد اسلامی دنیا کی تہذیب کا مرکز بنا رہا، یہاں تک کہ گو اسپین اس مرکز سے ہزاروں کوس دور تھا پھر بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرتا تھا، اُس وقت یورپ علوم و فنون، سائنس اور عام تہذیب میں بہت پیچھے تھا، یہ صرف عرب اسپین تھا جس نے یورپ کے اُس تمام تاریک دور میں علم اور تحقیق کی شمع کو روشن رکھا اور جس کی تھوڑی سی روشنی یورپ کے دوسرے ملکوں تک بھی پہنچی۔

۱۰۹۵ء میں صلیبی جنگیں شروع ہوگئیں اور تقریباً ڈیڑھ سو برس جاری رہیں، ہلال اور صلیب کے یہ معرکے دراصل محض دو مذہبوں کی جارحانہ جنگ نہ تھی بلکہ جیسا کہ مشہور مورخ جی، ایم ٹری ولیاں کہتا ہے "صلیبی جنگیں اُس شوق کا مذہبی اور عسکری پہلو تھیں جو یورپ کی ازسرِنو ترقی کرنے والی قوتوں کو مشرق کی طرف بڑھنے کے لئے مجبور کر رہا تھا، یورپ نے ان جنگوں میں جو چیز جیتی وہ نہ تو ارضِ مقدس کی مستقل آزادی تھی اور نہ مسیحی دنیا کا کوئی پائدار اتحاد، صلیبی جنگوں کی ساری کہانی اِس بات کی نفی کرتی ہے، ہاں یورپ مشرق سے فنونِ لطیفہ، دستکاریاں، تعیشات، اور علم و تحقیق کا شوق لے کر لوٹا، ظاہر ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے پیٹر دی ہرمٹ پسند کرتا۔

آخری صلیبی جنگ کے ناکامی کے ساتھ ختم ہونے سے پہلے ہی وسطِ ایشیا سے ایک زبردست طوفان اُٹھا یعنی چنگیز خاں کے حملے شروع ہوگئے تھے جنھوں نے مغربی ملکوں کو تاراج کر دیا۔ چنگیز خاں ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوا تھا اور اُس کے یہ حملے جنھوں نے پورے وسطِ ایشیا کو ویران کر دیا ۱۲۱۹ء میں ہوئے۔ اس وقت چنگیز کوئی بچہ نہ تھا۔ اس نے بخارا، سمرقند، ہرات اور بلخ جیسے بڑے شہر جن میں سے ہر ایک کی آبادی ایک لاکھ سے اوپر ہی اوپر تھی اس طرح برباد کئے کہ وہاں کھنڈروں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ وہ روس میں کیو تک پہنچا اور پھر وہاں سے لوٹا، اتفاق سے بغداد اس کے راستے میں نہ پڑا اور اس طرح یہ شہر اس کی تباہ کاریوں سے بچ گیا۔ ۱۲۲۷ء میں اُس کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ ہلاکو تخت پر بیٹھا تو یہ بڑھتا ہوا یورپ تک پہنچا اور ۱۲۵۸ء میں بغداد

بھی اس کے قبضہ میں آگیا ، علوم وفنون کا ، یہ مشہور مرکز جس میں پانچ سو برس تک دنیا کے ہر حصّہ کے علمی خزانے جمع کیے گئے تھے ، ہلاکو کے ہاتھوں ختم ہوگیا ۔ عرب ایرانی تہذیب منگولوں کے دور میں باقی تو رہی لیکن بغداد کا تباہ ہو جانا اس کے لئے بڑا شدید صدمہ تھا ۔ اب اس کا مرکز شمالی افریقہ اور اسپین کو منتقل ہوگیا ، عالموں کے گروہ کے گروہ اپنی کتابیں لے کر قاہرہ اور اسپین چلے گئے اور یہاں پھر علوم وفنون کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا لیکن اسپین خود عربوں کے قبضہ سے نکلتا جا رہا تھا ، ۱۲۳۶ء میں قرطبہ پر زوال آیا اور اس کے بعد ڈھائی سو برس تک غرناطہ کی سلطنت عرب تہذیب کا شاندار مرکز رہی ، ۱۴۹۲ء میں غرناطہ بھی عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور فرڈیننڈ اور ازابیلا نے اسپین میں عرب سلطنت کو ختم کر دیا ، اس کے بعد قاہرہ عرب تہذیب کا خاص مرکز بنا حالانکہ حکومت یہاں ترکوں کی تھی ، ۱۴۵۳ء میں ترک قسطنطنیہ کو فتح کر چکے تھے ، اور یہ فتح اُن تمام قوتوں کے وجود میں آنیکا باعث ہوئی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی محرک بنیں ۔

ایشیا اور یورپ میں منگولوں کی فتوحات نے ایک نئی قسم کے طریق جنگ کی بنیاد ڈالی ، لِڈل ہارٹ کہتا ہے " حملوں کی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے دشمن پر اچانک ٹوٹ پڑتے ہیں ، اپنی فوجوں کو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں ، دشمن پر لشکر کشی کرنے ۔ اور اُس پر پوشیدہ چالوں سے ٹوٹ پڑنے میں منگول دنیا کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ " چنگیز خاں اگر دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار نہیں تو چند سب سے بڑے سپہ سالاروں میں سے ایک

ضرور کہا جا سکتا ہے یورپ اور ایشیاء کی مردانگی اور شجاعت اس کے اور اس کے جانشینوں کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وسطی اور مغربی یورپ منگولوں کے حملوں سے بچ گئے۔ ان منگولوں سے یورپ نے جنگ اور لشکر کشی کے فن سیکھے۔ بارود کا استعمال بھی یورپ والوں نے منگولوں ہی سے سیکھا جو چین سے اسے اپنے ساتھ لائے تھے۔

منگول ہندوستان میں نہیں آئے، وہ دریا سندھ سے اُدھر ہی رہے اور دوسرے ممالک فتح کرتے رہے، جب ان کی بڑی سلطنت پر زوال آیا تو یہ ایشیا میں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گئی۔ ۱۳۶۹ء میں تیمور جو ترک تھا اور اپنے آپ کو ماں کی طرف سے چنگیز کے خاندان سے بتاتا تھا اُٹھا اور اُس نے چنگیز کے حملوں کی یاد تازہ کر دی۔ سمرقند اس کی سلطنت کا پایہ تخت بنا لیکن سلطنت بہت تھوڑے دن چلی، تیمور کے جانشینوں کو جنگی کارناموں کے مقابلہ میں امن اور سکون کی زندگی زیادہ پسند آئی اور وہ فنون کی ترقی میں مصروف ہو گئے، اب وسط ایشیا میں وہ دور شروع ہوا جسے تیموری نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں اور یہی وہ ماحول تھا جس میں بابر جو تیمور ہی کے خاندان سے تھا پیدا ہوا اور اُس نے پرورش پائی بابر نے ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ ہندوستان کے بڑے مغل شہنشاہوں میں سب سے پہلا شہنشاہ تھا۔ اس نے ۱۵۲۶ء میں دہلی فتح کی۔

چونکہ آج کل بعض مسلمانوں کے ناموں کے آگے "خان" لگا ہوتا ہے اس وجہ سے بعض لوگ چنگیز خان کو مسلمان سمجھتے ہیں مگر وہ مسلمان نہیں تھا اُس کے مذہب کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ "شمانیت"

یعنی آسمانی مذہب کا پیرو تھا، مجھے اس مذہب کا کچھ علم نہیں البتہ لفظ "شمانیت" سے لامحالہ خیال ایک عربی لفظ "سمانی" کی طرف جاتا ہے جو بودھوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت لفظ "شرون" سے بنا تھا۔ چونکہ اُس زمانہ میں بودھ مت کی بگڑی ہوئی شکلیں ایشیا کے مختلف حصوں میں رائج تھیں اور ان میں منگولیا بھی شامل تھا اس لئے گمان ہوتا ہے کہ چنگیز نے بھی انھیں اثرات کے ماتحت پرورش پائی ہوگی۔ یہ خیال ہے واقعی عجیب کہ تاریخ کا یہ سب سے بڑا فوجی سپہ سالار اور فاتح بودھ متی تھا خواہ وہ بودھ مت کیسا ہی کیوں نہ ہو!

وسطی ایشیا میں آج بھی ان چار مشہور عام شخصیتوں کے نام لوگوں کی زبان پر ہیں۔ سکندر۔ سلطان محمود، چنگیز خاں اور تیمور۔ ان چار ناموں کے ساتھ اب ایک پانچویں نام کا اور اضافہ ہونا چاہیئے اور وہ "لینن" ہے

(سلہ) بحر آرکٹک کے قریب سائبیریا میں۔ منگولیا میں اور سوویٹ وسط ایشیا کے علاقہ "تانا ٹووا" میں شمانیت آج بھی پائی جاتی ہے۔ اس وقت تو اس کا بنیادی عقیدہ محض روحوں پر اعتقاد ہے اور بہ ظاہر بودھ مت سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں بودھ مت اپنی کسی بگڑی ہوئی شکل میں یہاں رائج رہا ہو اور بعد کو رفتہ رفتہ قدیم توہم پرستی میں اس کے عقائد کھو دئے گئے ہوں، اس کی مثالیں اور بھی ہیں۔ تبت سے جو خالص بودھ متی ملک سمجھا جاتا ہے اپنا خاص قسم کا بودھ مت پیدا کر لیا ہے جسے "لامائیت" کہتے ہیں، اسی طرح منگولیا کی شمانیت میں گوتم بدھ کو زندہ سمجھنے کی روایات موجود ہیں اس طرح شمالی اور وسطی ایشیا میں بودھ مت میں مختلف تبدیلیاں ہوئیں اور رفتہ رفتہ وہ قدیم عقائد میں گم ہو گیا۔

جس کی شخصیت ان چاروں سے بالکل مختلف ہے، اُس نے ایک جنگجو سپاہی کی حیثیت سے دنیا کو فتح نہیں کیا بلکہ اُس نے دنیا کو ایک نیا فلسفۂ حیات دے کر انسانوں کے دماغوں پر حکومت کی اور اِسی وجہ سے آج اُس کے نام کو شہرتِ دوام حاصل ہے۔

۲۔ عرب تہذیب کا فروغ اور ہندوستان سے تعلقات

ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے حصّے اور یورپ میں بھی تھوڑا سا حصّہ فتح کرنے کے بعد اب عرب علم و عمل کے میدانوں کی فتوحات میں مصروف ہوئے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی فکر کی، بہت سے نئے ملک اُن کی مملکت میں شامل ہو چکے تھے اس لئے اب اپنی اس نئی دُنیا کی ضروریات کے لئے اُنھیں نئے طریقے سوچنے کا شوق پیدا ہوا۔ آٹھویں اور نویں صدی کے عربوں کا ذہنی تجسّس، اُن کے عقلی نظرے اور سائینس کی تحقیقات سے اُن کی دلچسپی درحقیقت ہمیں بہت متاثر کرتی ہے۔

عموماً ہر اُس مذہب کے ابتدائی دور میں جس کی بنیاد مقررہ معتقدات اور مسلک پر ہوتی ہے مذہب کے برحق ہونے کا یقین لوگوں پر غالب رہتا ہے۔ عقائد کے معاملہ میں اختلافات کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور نہ اُنھیں آگے بڑھنے دیا جاتا ہے۔ یہی یقین عربوں کو بھی دُنیا کے دور دراز حصّوں تک لے گیا۔ یہاں عربوں کو جو کامیابیاں نصیب ہوئیں اُن سے اُن کے یقین کو بھی ضرور تقویت پہنچی ہوگی، لیکن اِس سب کے باوجود ہم اُنھیں اپنے مقررہ معتقدات اور مسلک کی حدوں سے تجاوز کرتے ہوئے بھی دیکھتے

ہیں، وہ "لاادریت" سے بھی ہم خیال نظر آتے ہیں اور وہ ہر قسم کے ذہنی کارناموں میں بھی وہ اپنا جوش اور اپنی قوتیں صرف کرتے ہیں۔ عرب سیاح جو اپنے زمانہ کے بہترین سیاح تھے دور دراز ملکوں میں یہ دیکھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں کے لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں، اُن کے فلسفہ اور معاشرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے نظریے قائم کرتے ہیں۔

بغداد میں دور دور سے کتابیں لائی گئیں اور عالم بُلائے گئے، خلیفہ منصور نے آٹھویں صدی کے وسط میں علمی تحقیق اور ترجمے کے لئے ایک سرکاری دفتر قائم کیا جہاں یونانی، سریانی، زند، لاطینی اور سنسکرت کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے گئے، شام، ایشیائے کوچک اور لیوانٹ کی خانقاہوں میں قلمی کتابوں کی تلاش کی گئی، اسکندریہ کے پرانے مدرسوں کو مدت سے عیسائی پادری بند کر چکے تھے اور اُن میں رہنے والے عالموں کو وہاں سے نکال چکے تھے، اِن عالموں میں سے بہت سے ایران اور دوسرے مقامات کو چلے گئے تھے بغداد اب اِن سب کے لئے ایک نہایت خوشگوار اور محفوظ جائے پناہ تھا اور یہاں یہ سب اپنے ساتھ افلاطون، ارسطو، بطلیموس اور اقلیدس کا فلسفہ، سائنس اور ریاضی لے کر آئے۔ یہاں نسطوری اور یہودی عالم بھی تھے اور ہندوستانی طبیب، فلسفی اور ریاضی داں بھی، خلیفہ ہارون الرشید اور مامون کی حکومتوں کے سارے زمانہ (آٹھویں اور نویں صدی) میں یہ حالات بدستور جاری رہے اور روبہ ترقی رہے یہاں تک کہ بغداد مہذب دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔

اِس زمانہ میں ہندوستان کے ساتھ بھی عربوں کے تعلقات قائم

ہوئے اور اُنھوں نے ہندوستانی ریاضی، ہیئت اور طب میں بہت کچھ سیکھا۔
بہ ظاہر اِن تعلقات کی ابتدا، زیادہ تر عربوں ہی کی طرف سے ہوئی اور اُنھوں
نے ان سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ لیکن خود ہندوستان نے عربوں سے کچھ
زیادہ حاصل نہیں کیا، ہندوستانی خود بینی میں اس درجہ مبتلا تھے کہ اُنھوں نے
اپنے گوشۂ خلوت سے باہر آنا گوارا نہ کیا اور سب سے الگ تھلگ ہی
رہے، یہ چیز افسوسناک ہے کیونکہ یہ زمانہ بغداد کے ذہنی جوش اور
عربوں کے نشاۃ ثانیہ کا تھا اِس کے اثر سے وہ ہندوستانی دماغ جو اپنی
تخلیقی قوتیں برابر کھو رہا تھا ضرور جاگ اُٹھتا۔"
ذہنی تجسس کا یہ جذبہ اگر اُس وقت کے ہندوستانیوں میں پیدا
ہو جاتا تو وہ بہت جلد محسوس کر لیتے کہ فکر و نظر میں وہ اور عرب غیر نہیں
ہیں۔"

بغداد میں ہندوستانی علم و حکمت کو برامکہ کے بااختیار خاندان سے
بڑی مدد ملی، یہ لوگ ہارون رشید کے وزیر تھے اور یہ خاندان غالباً بودھ
مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوا تھا۔ ہارون رشید کی علالت کے زمانہ میں ہندوستان
سے ایک طبیب بھی جس کا نام مانک تھا بغداد بُلایا گیا، مانک نے بغداد ہی
میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں وہ ایک بڑے شفاخانہ کی نگرانی پر مامور
ہوا۔ عربوں کی کتابوں سے مانک کے نام کے علاوہ چھ اور ہندوستانی
طبیبوں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے جو اِسی زمانہ میں بغداد میں رہتے تھے۔
عربوں نے ہندوستان اور اسکندریہ دونوں کے علم ہیئت میں اضافہ کیا،
مسلمان ہیئت دانوں میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خوارزمی جو نویں
صدی کا مشہور ریاضی داں اور ہیئت داں گزرا ہے اور عمر خیام جو بارہویں صدی کا

ہئیت داں ہے اور ساتھ ہی شاعر بھی ہے۔ طب میں عرب طبیب اور جرّاح پورے یورپ اور ایشیا میں مشہور تھے، ان میں بوعلی سینا خاص طور پر مشہور ہوا یہ بخارا کا رہنے والا تھا، شیخ الاطبا، کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور اس نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ مشہور عرب مفکروں اور فلسفیوں میں ابونصر فارابی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

فلسفہ میں ہندوستان کا اثر کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتا، فلسفہ اور سائنس دونوں کے لئے عربوں نے یونان اور اسکندریہ کی طرف رجوع کیا، افلاطون اور بالخصوص ارسطو نے عربوں کے دماغوں پر بڑا اثر ڈالا اور اس وقت سے آج تک ان دونوں فلسفیوں کا فکر ان کی اپنی کتابوں سے زیادہ اُن عربی حواشی میں ہے جو اسلامیات کے مطالعہ میں نہایت اہم مضامین سمجھے جاتے ہیں۔ اسکندریہ کی اشراقیت نے بھی عربوں کے دماغوں کو بہت متاثر کیا، یونانی فلسفہ کے مادّیت پرست مذہب کے اثرات بھی عربوں تک پہنچے اور انھیں کی وجہ سے عربوں میں عقلیت اور مادّیت کے مذاہب وجود میں آئے۔ عقلیت پسند جماعت نے مذہبی اصول اور احکام کی توجیہ محض عقل کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی اور مذہب کو قریب قریب رد ہی کر دیا۔ یہاں یہ چیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بغداد میں ان تمام متضاد اور مختلف فیہ مسائل اور نظریات پر بحث و تمحیص کی عام اجازت تھی۔ عقل اور مذہب کی یہ آویزش اور اختلاف کُل عرب دُنیا میں پھیل گیا اور اس کے اثرات اسپین تک پہنچے۔ اسپین اختلافات کے سلسلہ میں خدا کا تصور بھی معرضِ بحث میں آیا اور یہ کہا گیا کہ خدا کی ذات اُن تمام صفات سے پاک ہے جن کے ساتھ اُسے عام طور پر متصف کیا جاتا ہے یا انسانی صفات

ہیں ، خدا کو عادل اور کریم کہنا بھی ایسی ہی بے ادبی ہے جس حد تک یہ کہنا کہ خدا کے داڑھی ہے۔

عقلیت سے تشکک اور لا ادریت کی بنیاد پڑی لیکن بغداد کی تباہی کے بعد جب ترکوں کو عروج حاصل ہوا تو رفتہ رفتہ عقلی تجسس کا یہ جذبہ کم ہونے لگا ، پھر بھی عربی اسپین میں عقلی تحریک جاری رہی اور اسپین کے عرب فلسفیوں میں ایک فلسفی تو لا مذہبیت کی حد تک پہنچ گیا ، یہ بارہویں صدی عیسویں کا فلسفی ابن رُشد تھا ، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے تمام مذاہب کی بابت کہتا تھا کہ یہ بچوں کے لئے ہیں یا بے وقوفوں کے لئے ، اور ان پر عمل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعی ابن رشد کا یہ قول ہے یا نہیں اس طرح کی روایات کے پیش نظر یہ سمجھ لینا مشکل نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا ، اُسے اپنے خیالات کی پاداش بھی اُٹھانی پڑی۔ اور بھی بہت سی باتوں کی وجہ سے یہ شخص قابل ذکر ہے ، اُس نے نہایت شدومد کے ساتھ عورتوں کی حمایت کی۔ وہ کہتا ہے کہ سماج میں انھیں مردوں کے دوش بدوش رہنے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ اس کی مستحق ہیں ، اُس نے یہ بھی تجویز کیا کہ وہ لوگ جو لا علاج امراض وغیرہ کی وجہ سے بیکار ہو چکے ہیں ختم کر دیئے جائیں تاکہ سوسائٹی کے کاندھوں سے یہ بوجھ ہلکا ہو۔ اُس زمانہ میں اسپین یورپ کے تمام علمی مراکز سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا اور قرطبہ کے عرب اور یہودی عالم پیرس اور دوسرے مقامات پر بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ عرب حقیقتاً دوسرے یورپ والوں کے متعلق کچھ اچھی رائے بھی نہ رکھتے تھے ، ایک عرب مصنف جس کا نام سعید ہے اور جو ٹولیڈو کا

رہنے والا تھا کوہ (ہمانس) کے شمالی حصہ میں بسنے والے یورپی لوگوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "یہ سرد مزاج کے لوگ ہیں اور بلوغ کو کبھی پہنچتے ہی نہیں۔ ان کا قد و قامت اچھا ہے، رنگ بھی سفید ہے، لیکن نکتہ سنجی اور ذہانت کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی۔"

مغربی اور وسطی ایشیا میں عرب تہذیب و تمدن کے خاص ماخذ دو تھے عرب اور ایران، اور ان دونوں کے اثرات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سموئے گئے کہ سماج کے اعلیٰ طبقوں میں ذہنی جودت بھی پیدا ہوگئی اور اُن کا معیار زندگی بھی بلند ہوگیا، عربی اثر نے ذہنی تجسس کا شوق دلایا اور ایرانی اثر نے زندگی کی لطافتیں، فنون اور عیش پرستی پیدا کی۔ جب بغداد پورے طور پر ترکی اثرات سے مغلوب ہوگیا تو عقلیت اور تحقیقات کا یہ شوق بھی سرد پڑ گیا پھر چنگیز خاں اور منگولوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ سو برس کے بعد وسطی ایشیا پھر نیند سے چونکا اور سمرقند اور ہرات مصوری اور فن تعمیر کے مرکز بنے، یہاں بھی اُسی عرب ایرانی تہذیب کے اثرات تازہ ہوئے۔ لیکن عقلیت اور سائنس سے دلچسپی کی جو روایات عربوں نے چھوڑی تھیں اس تمدن میں بھی پیدا نہ ہوسکیں، اسلام میں اب ایک قسم کا کٹرپن پیدا ہوگیا تھا جو ذہنی فتوحات کے بہ نسبت ملکی فتوحات کے لئے زیادہ موزوں تھا، ایشیا میں اب اس کے نمائندے عرب نہ تھے بلکہ ترک[۵۱] تھے، منگول تھے (جو بعد میں مغلوں

---

۵۱ میں نے اکثر لفظ "ترک" یا "ترکی" استعمال کیا ہے۔ یہاں ممکن ہے پڑھنے والے کو دھوکہ ہو کیونکہ آج کل ترکی کے رہنے والے "ترک" کہلاتے ہیں (بقیہ آئندہ صفحہ پر

کے نام سے موسوم ہوئے) اور کسی حد تک افغان بھی۔ منگولوں نے مغربی ایشیا میں اسلام قبول کر لیا اور مشرق بعید اور وسطی علاقوں میں ان میں سے بہت سے بودھ مت ہو گئے۔

۳۔ محمود غزنوی اور افغان

آٹھویں صدی کے آغاز ہی میں عرب سندھ تک پہنچ گئے اور ۷۱۲ء میں انھوں نے اس صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس سے آگے نہ بڑھے اور یہ صوبہ بھی نصف صدی کے اندر ہی اندر عرب سلطنت سے جدا ہو گیا اور ایک چھوٹی سی آزاد اسلامی ریاست بن گیا۔ اس کے بعد تقریباً تین سو برس تک ہندوستان میں مسلمانوں کے حملے بالکل نہیں ہوئے۔ ۱۰۰۰ء عیسوی کے لگ بھگ افغانستان کے سلطان محمود غزنوی نے جو ایک ترک تھا اور وسط ایشیا میں برسر اقتدار آ گیا تھا ہندوستان پر حملے شروع کئے۔ اس نے کتنی ہی بار ہندوستان پر چڑھائی کی۔ ہر دفعہ قتل و خونریزی کے بعد بہت سا مال و دولت اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گیا۔ خیوا کا ایک ہمعصر عالم البیرونی محمود کے ان حملوں کی بابت کہتا ہے "ہندو ریت کے ذرّوں کی طرح یا پرانی کہانیوں کے مثل جو لوگوں کی زبانوں پر پھیلی ہوتی ہیں ہر سمت تتر بتر ہو گئے اور ہر جگہ اپنے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید قسم کی نفرت اور بیزاری کو پالتے رہے"۔ ہمیں بیرونی کے اس

---

(۱) سلسلہ صوفیہ کے شہنشاہ عثمانی ترکوں کی نسل سے ہیں لیکن ان کے علاوہ ترکوں کی شاخیں بھی تھیں مثلاً سلجوق وغیرہ، وسط ایشیا اور چینی ترکستان وغیرہ کی تمام تورانی نسلیں ترک یا ترکی کہی جا سکتی ہیں۔

شاعرانہ بیان سے اُس بربادی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو محمود کے ہاتھوں ہوئی، ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ محمود نے شمالی ہند کے صرف ایک حصّہ کو لوٹا اور اس میں محض وہ مقامات جو اُس کے راستہ میں تھے، پورا وسطی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان محمود کی دست بُرد سے محفوظ رہا، جنوبی ہند میں اُس وقت بھی اور بعد کو بھی طاقتور چول سلطنت برسرِ اقتدار رہی جس کا سمندری راستوں پر بھی قبضہ تھا اور جس کی حدیں سماترا اور جاوا میں سری وجے تک پہنچتی تھیں۔ مشرقی سمندروں میں بھی ہندوستانی نوآبادیاں خوب پھل پھول رہی تھیں اور کافی طاقتور ہو گئی تھیں۔ سمندری طاقت میں وہ اور جنوبی ہند دونوں شریک تھے، لیکن یہ بحری طاقت شمالی ہندوستان کو بری حملہ سے نہ بچا سکی، محمود ہر حملہ کے بعد غزنی واپس چلا جاتا تھا۔ اُس نے سندھ اور پنجاب اپنی سلطنت میں شامل کر لئے لیکن کشمیر کو فتح نہ کر سکا یہ پہاڑی ملک اُسے اندر آنے سے روکے رہا، اور جب وہ کاٹھیاوار میں سومنات پر حملہ کرکے واپس ہوا ہے تو راجپوتانہ کے ریگستانی علاقوں میں بھی اُسے ایک بڑی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ اُس کا آخری حملہ تھا اور اس کے بعد پھر وہ واپس نہ آیا۔

---

۵۱ ایک فارسی تاریخ "تاریخ سرات" Tr. Bird (ترجمہ:۔ پچوڈبی اور بمبئی ۱۸۳۵) کے صفحہ ۱۱۲ پر محمود کی اس شکست سے متعلق عبارت کا ایک عجیب ٹکڑا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"شاہ محمود پسپا ہوا اور جان بچا کر بھاگ گیا لیکن اس کے ساتھیوں میں سے بہت سے مرد اور عورت گرفتار ہو گئے، ترک افغان اور مغل عورتوں میں سے ایسی

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

محمود ایک مذہبی آدمی ہونے سے کہیں زیادہ ایک سپاہی تھا، اور بہت سے دوسرے فاتحین کی طرح اُس نے بھی مذہب کو ملکی فتوحات کی آڑ بنایا۔ ہندوستان اس کے لئے ایسا ملک تھا جہاں سے وہ اپنے ملک کو دولت اور سامان لے جاسکتا تھا، اُس نے خود ہندو سپاہیوں کی ایک بڑی فوج جمع کی اور اپنے ایک مشہور ہندو سپہ سالار تلک کو سپرد کی۔ اِس فوج کو خود اپنے ہم مذہبوں کے خلاف محمود نے وسط ایشیا میں استعمال کیا۔ وہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) عورتوں کو جو کنواری تھیں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنی بیویاں بنا لیا، باقی عورتوں کی انتڑیاں قے آور دواؤں کے ذریعہ سے اور جلاب دے کر صاف کی گئیں اور اس کے بعد ان قیدیوں کو انھیں کے ہم مرتبہ مردوں سے بیاہ دیا گیا۔ نیچ قسم کی عورتوں کا رشتہ نیچ قسم کے مردوں سے کرایا گیا، جو عزّت دار لوگ تھے اُنھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی ڈاڑھیاں مُنڈائیں اور پھر یہ لوگ راجپوتوں کے شیخوت او ڈھیل قبیلوں میں شامل کر لئے گئے، جو نیچ قسم کے لوگ تھے وہ کولیوں، کھنتوں، ببریوں اور مردوں کے قبیلوں میں شامل کئے گئے۔" میں نے خود تاریخ Tareek - i - Sorath نہیں پڑھی ہے اور نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے مصنف کا بیان کس حد تک قابل اعتبار ہے۔ میں نے یہ عبارت کے ایم منشی کی کتاب " دی گلوری دیٹ واز گُرجر دیس The Glory That was Gurjerdesa "کے تیسرے حصہ کے صفحہ ۱۴۰ سے نقل کی ہے،

میرے لئے اس میں جو چیز دلچسپ ہے وہ راجپوتوں کا یہ طریقہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غیروں کو راجپوت کس طرح اپنے میں شامل کرتے تھے اور اُن کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے تک قایم کر لیتے تھے۔ انتڑیوں کو صاف کرنے کا طریقہ تو واقعی بہت عجیب ہے۔

چاہتا تھا کہ اس کا اپنا شہر غزنی وسطی اور مغربی ایشیا کے بڑے شہروں کی ٹکر کا ہو جائے اور اس غرض کے لئے وہ ہندوستان سے اُس زمانہ کے بہترین صناعوں اور کاریگروں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ دہلی کے قریب متھرا کا فنِ تعمیر اُسے بہت پسند آیا تھا، اس کی بابت وہ لکھتا ہے " یہاں ہزاروں عمارتیں ایسی مستحکم ہیں جیسے مومن کا ایمان، شہر کی اس وقت جو حالت ہے یہ تو لکھو کھا دینار صرف کر کے بھی نہیں حاصل کی جا سکتی اور اس جیسا دوسرا شہر دو سو برس میں بھی نہیں بنایا جا سکتا "

لڑائیوں کے دوران میں جو مہلت مل جاتی تھی محمود اُسے تمدنی سرگرمیوں میں صرف کرتا تھا چنانچہ مشاہیرِ وقت کی ایک بڑی تعداد اُس کے دربار میں جمع ہو گئی تھی، ان میں مشہور ایرانی شاعر فردوسی بھی تھا جس نے شاہنامہ تصنیف کیا اور جو بعد میں محمود سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ البیرونی بھی اسی دور کا عالم اور سیاح ہے، اُس کی کتابوں سے ہمیں اُس زمانہ میں وسط ایشیا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا پتہ لگتا ہے، البیرونی ایرانی النسل تھا اور خیوہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ہندوستان بھی آیا اور بہت سیاحت کی، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اُس زمانہ میں جنوبی ہند میں چولوں کی سلطنت میں آب پاشی کا انتظام بڑے وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا مگر یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ البیرونی نے یہ انتظامات خود اپنی آنکھ سے دیکھے یا نہیں اور وہ جنوبی ہند تک خود پہنچا یا نہیں۔ اُس نے کشمیر میں سنسکرت سیکھی اور ہندوستان کے مذہب، فلسفہ، سائنس اور فنون کا مطالعہ کیا، اُس کی تصانیف محض معلومات کے ذخیرے نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح جنگ، قتل و غارت، اور خونریزی کے بعد خالص علمی مشاغل جاری ہوئے اور کس طرح

ایک ملک والوں نے دوسرے ملک والوں کو سمجھنے کی کوشش کی حالانکہ غم اور غصہ نے آپس کے تعلقات کو بہت کچھ بگاڑ رکھا تھا۔ اس غم و غصہ کا اتنا اثر تو ضرور تھا کہ دونوں فریقوں کی آنکھوں پر تعصب کے پردے پڑے رہے اور ہر فریق اپنی قوم کو دوسری قوم سے برتر سمجھتا رہا، ہندوستانیوں کے متعلق البیرونی کہتا ہے کہ " یہ لوگ مغرور ہیں، خود فریبی میں مبتلا ہیں، کم گو اور ٹھس ہیں" اور ان کا عقیدہ ہے " کہ دنیا میں نہ ان کے ملک جیسا کوئی دوسرا ملک ہے، نہ ان کی قوم جیسی کوئی قوم، نہ ان کے بادشاہ جیسا کوئی بادشاہ اور نہ ان کے علوم جیسے کہیں علوم" غالباً ہندوستانی قوم کے مزاج کا یہ بہت ہی صحیح نقشہ ہے۔

محمود کے حملوں کا سلسلہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے حالانکہ بحیثیت مجموعی ان حملوں کا ہندوستان کی سیاست پر کچھ بھی اثر نہ پڑا کیونکہ حملہ آور ہندوستان کے وسط تک پہنچ ہی نہ سکے۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے شمالی ہندوستان کے تنزل اور ہندوستانیوں کی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیا، اور البیرونی کے بیانات نے تو شمال اور مغرب کے سیاسی انتشار کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا۔ شمال مغرب کی طرف سے یہ بار بار کے حملے ہندوستان کے محدود فکر اور اجتماعی تنظیم میں نئے عناصر شامل کر گئے۔ اور سب پر مستزاد یہ کہ ان کے ساتھ اسلام انہی زبردست عسکری فتوحات کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اب تک تقریباً تین سو برس اسلام مذہب کی حیثیت سے پُر امن طریقہ پر پھیلا تھا اور اُس نے ہندوستان کے مذاہب میں بغیر کسی تصادم اور اختلاف کے اپنی جگہ حاصل کر لی تھی۔ لیکن اب جس نئے طریقہ پر یہ ہندوستان

میں آیا اس کا عوام پر نفسیاتی رد عمل ہوا اور اُن کے دل تلخی سے بھر گئے، انھیں ایک نئے مذہب کے آنے پر اعتراض نہ تھا بلکہ اعتراض ہر ایسی چیز تھا جو بہ جبر اُن کے طریق زندگی میں مداخلت کرے اور اُسے درہم برہم کر دے،

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگرچہ ہندوستان میں ہندو مذہب اپنی مختلف شکلوں میں چھایا ہوا تھا لیکن اسی کے ساتھ دوسرے مذاہب بھی موجود تھے۔ قطع نظر بودھ مت اور جین مت کے جنھیں ہندو مذہب اپنے میں جذب کر چکا تھا ہندوستان میں عیسائیت بھی تھی اور عبرانی مذہب بھی تھا۔ یہ دونوں غالباً پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان پہنچے تھے اور دونوں نے اس ملک میں جگہ پالی تھی، شامی عیسائیوں اور نسطوریوں کی ایک بڑی تعداد جنوبی ہند میں موجود تھی اور وہ سب اسی طرح اس ملک کی آبادی کا ایک حصّہ تھے جیسے دوسرے، یہی حال یہودیوں کا تھا، زرتشتیوں کی چھوٹی جماعت بھی جو ساتویں صدی میں ایران چھوڑ کر ہندوستان آئی اسی طرح رہی تھی خود بہت سے مسلمان جو مغربی ساحل اور شمال مغرب میں بسے ہوئے تھے اسی طرح رہتے چلے آئے تھے،

محمود ایک فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آیا اور پنجاب اُس کی سلطنت کا مشرقی سرحدی صوبہ بن گیا۔ جب اُس نے اپنی حکومت کو پورے طور پر مستحکم کر لیا تو اِس بات کی کوشش کی کہ اپنی پچھلی سختیوں کی کچھ تلافی کرے تاکہ صوبہ کے باشندوں کے دل کسی حد تک اس سے مانوس ہو جائیں چنانچہ اُن کے طور طریقوں میں مداخلت کم ہو گئی اور ہندوں کو فوجی اور انتظامی اونچے عہدوں پر بھی مقرر کیا گیا، محمود کے عہد میں اس نرمی کی محض ابتدار

ہوئی ، البتہ آگے چل کر اس میں اضافہ ہوا۔ محمود نے ۱۰۳۰ء میں وفات پائی ، اس کے بعد ایک سو ساٹھ برس سے زیادہ گزر گئے نہ کوئی حملہ ہندوستان پر ہوا اور نہ ترکی سلطنت کی حدیں پنجاب سے آگے بڑھیں اس کے بعد ایک افغان شہاب الدین غوری نے غزنی فتح کیا اور غزنوی سلطنت کا خاتمہ کیا اُس نے لاہور پر بھی حملہ کیا اور پھر دہلی کی طرف بڑھا ، لیکن دہلی کے بادشاہ پرتھوی راج نے اس کا مقابلہ کیا اور اُسے بُری طرح شکست دی ، شہاب الدین افغانستان واپس چلا گیا اور ایک سال بعد پھر نئی فوج لے کر لوٹا ، اب کی دفعہ اُسے کامیابی ہوئی اور ۱۱۹۲ء میں وہ دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔

پرتھوی راج ہندوستان کا مشہور سورما ہے اور آج تک نظموں اور افسانوں میں اُس کا نام سننے میں آتا ہے کیونکہ مَن چلے عاشق ہمیشہ مقبول ہوتے ہیں ، اُسے والیٔ قنوج جے چند کی لڑکی سے عشق تھا اور یہ لڑکی بھی اُس سے محبت کرتی تھی ، چنانچہ عین سوئمبر کے دن جے چند کے گھر پر شہزادے شادی کا پیام دینے کے لئے جمع ہوئے تھے ، اِس بھرے مجمع میں سے پرتھوی راج دُلہن کو نہایت دلیری سے اُڑا کر لے گیا ، اور تھوڑے عرصہ اُسے بیوی بنا کر رکھنے کے خاطر ایک طاقتور بادشاہ سے جھگڑا مول لیا جس میں دونوں فریقوں کے چیدہ چیدہ بہادر کام آئے ، دہلی اور وسطی ہند کے منتخب سورما اِس خونریز لڑائی میں شامل ہوئے اور دونوں طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہوا ، انجام کارِ محض ایک عورت کی محبت میں پرتھوی راج کی جان بھی گئی اور تخت بھی گیا ، اور دِلی جو اُس وقت سلطنت کی راجدھانی تھی ایک بیرونی حملہ آور کے ہاتھ آگئی۔

لیکن پرتھوی راج کی محبت کی کہانی کے راگ آج تک گائے جاتے ہیں وہ سورما سمجھا جاتا ہے اور جے چند غدّار۔

دہلی کی اس فتح کے معنی کل ہندوستان کی فتح نہ تھے۔ چولوں کی طاقت اب بھی جنوبی ہند میں برقرار تھی، اِن کے علاوہ دوسری آزاد ریاستیں بھی تھیں، فتوحات کے دائرے کو جنوب تک پھیلانے میں افغانوں کو اور ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا، لیکن دِلّی اسی وقت سے نئے نظام کے قیام کی خبر دے رہی تھی اور یہی فتح دہلی کی اہمیّت تھی۔

۴۔ ہندی افغان۔ جنوبی ہند۔ وجے نگر۔ بابر۔ بحری طاقت

عام طور پر ہندوستان کی تاریخ کو انگریزوں نے، اور بعض ہندوستانی مورخوں نے بھی، تین دوروں میں تقسیم کیا ہے، قدیم یا ہندوؤں کا زمانہ، مسلمانوں کا زمانہ اور انگریزوں کا زمانہ، یہ تقسیم نہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ صحیح ہے بلکہ بہت دھوکے میں ڈالنے والی ہے، اس کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں تاریخ کا بہت غلط تصور قائم ہوتا ہے، اس تقسیم نے ہندوستانیوں کی سیاسی، اقتصادی اور تمدّنی ترقیوں سے کہیں زیادہ اُن معمولی تبدیلیوں کو اہمیت دے رکھی ہے جو ہمیں سطح پر نظر آتی ہیں، جسے قدیم زمانہ کہا جاتا ہے وہ بہت وسیع ہے اور گوناگوں تبدیلیوں سے بھرا ہوا ہے، اس میں قوم کی ترقی بھی نظر آتی ہے اور تنزل بھی اور تنزل کے بعد پھر ترقی کا دور آجاتا ہے، جس زمانہ کو مسلمانوں کا زمانہ یا عہدِ وسطیٰ کہا جاتا ہے وہ ایک اور تبدیلی اپنے ساتھ لایا اور واقعی یہ ایک اہم تبدیلی تھی لیکن اس کے باوجود اس تبدیلی کے اثرات کم وبیش

سطحی باتوں تک محدود رہے، ہندوستان کی اصل زندگی کے تسلسل میں ان سے کچھ فرق نہیں آیا، شمال مغرب سے آنے والے حملہ آور بہت سے دوسرے حملہ آوروں کی طرح جو ان سے پہلے آئے تھے ہندوستان کی تہذیب میں اس طرح جذب ہوگئے کہ اُس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ ان کے خاندان ہندوستانی خاندان بن گئے۔

اور آپس کے شادی بیاہ کے ذریعہ بہت وسیع پیمانہ پر نسلی اختلاط رُونما ہوا۔ چند مثالوں کے سوا ان باہر والوں نے دانستہ طور پر یہ کوشش کی کہ اہل ملک کے رسم و رواج میں مداخلت نہ کریں، اُنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا، اور اس ملک کے علاوہ کسی اور ملک کو بھی فتح نہیں کیا، اس طرح ہندوستان کی آزادی بدستور قایم رہی۔

البتہ انگریزوں کے آنے کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ میں جو تبدیلی ہوئی وہ ضرور ایسی تھی جس نے پُرانے نظام کو بہت سے طریقوں سے تہہ و بالا کردیا، انگریز ایک بالکل مختلف جذبہ کے ماتحت ہندوستان میں آئے تھے، یہ جذبہ یورپ کے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح اور انگلستان کے سیاسی انقلاب نے آہستہ آہستہ اُن کے دلوں میں پیدا کیا تھا اور صنعتی انقلاب کی ابتدا میں اس نے انگریزوں کے دلوں میں ایک مستقل جگہ پیدا کرلی تھی۔ امریکہ اور فرانس کے انقلابوں سے اسے اور تقویت پہنچی، چنانچہ انگریز ہندوستان میں اجنبیوں کی حیثیت سے آئے اور ہمیشہ اپنے آپ کو باہر والا ہی تصور کرتے رہے جس کی وجہ سے اس ملک والوں کے ساتھ ان کے ملنے جُلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس کے سیاسی اقتدار اور

اجتماعی نظام کا مرکز ایک ایسی جگہ قائم ہوا جو ہزاروں کوس دور تھی، انگریزوں نے ہندوستان کو موجودہ دور کے مخصوص رنگ کی ایک نوآبادی بنالیا، اور اس طرح یہ ملک اپنی ہزاروں برس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ باہر والوں کا غلام بنا۔

ہندوستان پر محمود کا حملہ کہنے کو تو بیرونی ترکی حملہ تھا جس کی وجہ سے پنجاب تھوڑے عرصہ کے لئے ہندوستان کے باقی حصہ سے جدا ہوگیا۔ اسی طرح افغان جو بارھویں صدی کے ختم پر آئے وہ بھی ہندوستانیوں سے مختلف تھے لیکن یہ سب ہند آریائی نسل سے تھے اور ہندوستان کے بسنے والوں کے ساتھ بہت قریب کا نسلی رشتہ رکھتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ افغانستان مدتوں ہندوستان کا ایک حصہ رہا اور اُسے رہنا بھی چاہیئے تھا، افغانوں کی زبان پشتو کی بنیاد سنسکرت پر تھی، ہندوستانی تمدن کے اور بالخصوص بودھ متی عہد کے قدیم آثار جس تعداد میں افغانستان کے اندر موجود ہیں اتنے نہ خود ہندوستان میں ہیں نہ ہندوستان سے باہر کسی دوسرے ملک میں، نسلی اعتبار سے افغانوں کو ہند افغانی نسل کہنا زیادہ صحیح ہوگا، وہ ہندوستانیوں سے بس اُسی حد تک مختلف تھے جس طرح کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے ہموار اور گرم میدانوں کے بسنے والوں سے مختلف تھے۔ کشمیر باوجود اپنے اس اختلاف کے ہندوستانی علوم اور تمدن کا ہمیشہ ایک بہت اہم مرکز رہا، افغان عربوں اور ایرانیوں سے بھی مختلف تھے جو ان کے مقابلہ میں زیادہ متمدن اور شائستہ تھے، اُن کے ملک کے حالات اس کے مقتضی تھے کہ وہ سخت ہوں اور جنگجو، مذہبی عقائد کے بھی وہ بہت پکے تھے، وہ محض سپاہیانہ حیثیت سے ہندوستان میں آئے اور اُن کے

اندر ذہنی تجسس کی حوصلہ مندیاں بھی بالکل نہ تھیں۔

اس لئے ابتدا میں ان کا برتاؤ ایسا رہا جیسا فاتحوں کا باغی رعایا کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے جبر اور تشدد سے کام لیا، لیکن بہت جلد اُنھوں نے اس روش کو بدل بھی دیا اور ہندوستان اُن کا گھر بن گیا، محمود کے زمانہ میں تو ایک دور دراز مقام یعنی غزنی پائے تخت تھا لیکن اب دہلی دارالسلطنت بنا۔ افغانستان جہاں سے یہ لوگ آئے تھے بس سلطنت کا ایک دُورافتادہ حصہ بن کر رہ گیا، خود اُن پر ہندوستانی تہذیب کا رنگ تیزی کے ساتھ چڑھنے لگا اور وہ اس ملک کی عورتوں سے شادیاں بھی کرنے لگے۔ ان کے حکمرانوں میں علاء الدین خلجی نے تو ایک ہندو خاتون کے ساتھ شادی کی اور ایسا ہی اُس کے لڑکے نے کیا، بعد کے بادشاہوں میں بعض نسل کے اعتبار سے ترک تھے مثلاً قطب الدین ایبک، رضیہ، التمش مگر امرا کا طبقہ اور فوج زیادہ تر افغانوں ہی پر مشتمل تھی، پایۂ تخت کی حیثیت سے دہلی پورے عروج پر پہنچ گیا۔ مراقش کا ایک مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ، جس نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا تھا اور قاہرہ اور قسطنطنیہ سے چین تک بہت سے شہر دیکھے تھے چودھویں صدی میں کسی قدر مبالغے سے دہلی کی بابت کہتا ہے، "دہلی روئے زمین کے سب سے بڑے شہروں میں سے ہے"

دہلی کی سلطنت جنوب کی طرف پھیلتی گئی، چولوں کی سلطنت رو بہ تنزل تھی اور ایک نئی بحری طاقت اُس کی جگہ لے رہی تھی، یہ پانڈوں کی سلطنت تھی اور مشرقی ساحل پر کایَل اس کا بندرگاہ تھا، تھی تو یہ چھوٹی سی سلطنت مگر تجارت کا بہت بڑا مرکز تھی، مارکوپالو دو دفعہ ۱۲۸۸ء اور

سنہ ۱۲۹۳ء میں اس بندرگاہ کو دیکھنے آیا، وہ اسے "ایک بڑا اور شاندار شہر" بتاتا ہے جہاں عرب اور چین سے تجارتی جہاز آکر ٹھہرتے تھے، وہ یہاں کی نہایت باریک ململ کا بھی ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکڑی کے جالے کے تار سے بنی ہوئی ہے" مارکو پولو کے بیان سے ہمیں ایک اور دلچسپ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔

جنوبی ہند میں عرب اور ایران سے گھوڑے بہت بڑی تعداد میں منگائے جاتے تھے، یہاں کی آب و ہوا گھوڑوں کی افزائش نسل کے لئے موزوں نہ تھی۔

گھوڑے اور کاموں میں لائے جانے کے علاوہ جنگی اغراض کے لئے بھی بہت ضروری تھے، چنانچہ ان کی نسل اور تربیت کے لئے وسطی اور مغربی ایشیا کے میدان منتخب کئے گئے، وسطی ایشیا کی نسلوں کو جنگی طریقوں میں جو فوقیت حاصل تھی اُس پر بھی اس حقیقت سے کسی حد تک روشنی پڑتی ہے چنگیز خاں کے منگولی سپاہی بہت اچھے شہسوار تھے اور اپنے گھوڑوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ترک بھی بہت اچھے شہسوار ہوتے تھے اور عربوں کی گھوڑوں سے محبت تو دنیا میں مشہور ہے۔ شمالی اور مغربی ہندوستان میں بعض مقامات پر بالخصوص کاٹھیاواڑ میں، گھوڑوں کی تربیت کے لئے اچھے میدان ہیں اور راجپوت، گھوڑوں کے شائق بھی بہت ہیں، ان کی تاریخ میں ہمیں بہت سی ایسی لڑائیاں نظر آتی ہیں جو محض کسی مشہور گھوڑے کو حاصل کرنے کی خاطر لڑی گئیں، دہلی کے ایک لودی سلطان کی بابت مشہور ہے کہ اُسے ایک راجپوت سردار کا گھوڑا پسند آگیا اور اُس نے وہ گھوڑا مانگا، سردار نے بادشاہ کو جواب دیا "تین چیزیں راجپوت سے کبھی نہ مانگئے، اُس کا گھوڑا،

اُس کی عورت اور اُس کی تلوار" یہ کہتے ہوئے راجپوت نے گھوڑے کو ایڑ دی اور ہوا ہو گیا - بعد میں اُس پر لڑائی ہوئی۔

چودھویں صدی کے آخر میں تیمور جو ترک یا تُرکی منگول تھا شمال کی طرف سے ہندوستان پر بڑھا اور دہلی کی سلطنت کو تاخت و تاراج کر گیا، وہ صرف چند مہینے ہندوستان میں رہا، اس نے دہلی پر حملہ کیا اور واپس چلا گیا واپسی میں اُس نے اپنے سارے راستہ کے جنگل کو اس طرح سجایا تھا کہ مقتولوں کی کھوپڑیوں کے مینار جا بجا نصب کئے تھے، دہلی کو بھی لاشوں سے پاٹ گیا تھا، خوش قسمتی سے وہ آگے نہ بڑھا، بس دہلی کو اور پنجاب کے بعض حصّوں کو اس خوفناک مُصیبت کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

دہلی نے مدّت کے بعد موت کی نیند سے سر اُٹھایا تو دیکھا کہ اب وہ کسی بڑی سلطنت کا پایہ تخت نہیں ہے۔ تیمور کے حملہ نے سلطنت کو پاش پاش کر دیا تھا اور جنوب میں اُس کی جگہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں، اِس سے بہت پہلے دو اور بڑی سلطنتیں بھی وجود میں آ چکی تھیں، ایک گلبرگہ کی سلطنت جو بہمنی سلطنت[۵۷] کے نام سے مشہور ہوئی اور دوسری دجے نگر کی سلطنت - اب گلبرگہ بھی پانچ ریاستوں میں

---

۵۷ جنوبی ہند میں بہمنی سلطنت کے نام اور ابتدا کا واقعہ دلچسپ ہے، اس سلطنت کا بانی ایک افغان مسلمان تھا، شروع زمانہ میں کبھی ایک ہندو برہمن جس کا نام گنگو تھا اس کا مُربّی رہ چکا تھا۔ اُس کی شکر گزاری میں اس نے اپنا نام گنگو رکھا اور اپنی سلطنت کا نام بہمنی۔ (بہمنی لفظ برہمنی کی ایک شکل ہے)

بٹ گیا۔ اُن میں سے ایک احمد نگر کی ریاست تھی، احمد نظام شاہ جس نے
سن ۱۴۹۰ء میں اس کی بنیاد ڈالی بہمنی سلطنت کے وزیر نظام الملک بھیری کا
بیٹا تھا اور نظام الملک بھیرو نام اور ایک برہمن مُحاسب کا بیٹا تھا، اسی لئے
بھیری (بحری) کہلاتا تھا، اس طرح حسب نسب کے لحاظ سے احمد نگر کا خاندان
مخلوط النسل خاندان تھا، اور احمد نگر کی ہیروئن چاند بی بی بھی مخلوط نسل کی
تھی، جنوبی ہند کی تمام ریاستیں نسلی اعتبار سے ملی تھیں، تیمور کے حملہ اور
غارتگری کے بعد شمالی ہندوستان بالکل کمزور ہوگیا اور اس میں پھوٹ پڑ گئی
البتہ جنوبی ہند کی حالت بہتر تھی، جنوبی ہند کی ریاستوں میں وجے نگر کی
سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنت تھی چنانچہ شمال
سے بھاگے ہوئے بہت سے ہندوؤں نے اس ریاست اور اس شہر میں
آکر پناہ لی۔ ہمعصر مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر اس وقت
بہت دولتمند اور خوبصورت تھا۔ وسط ایشیا سے آنے والا ایک مورخ عبدالرزاق
کہتا ہے " کہ اس جیسا شہر ساری دنیا میں نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے
سُنا"، اس کے بازاروں میں خوشنما برآمدے تھے، اور راستے چھت دار تھے
جن کے دونوں جانب دوکانیں تھیں، اور ان سب سے بلند و بالا شاہی محل
تھا" جس کے اردگرد بہت سے چشمے اور نہریں بہتی تھیں، یہ سب پتھر سے
تراشے گئے تھے اور ان پر نہایت عمدہ رنگ روغن تھا" پورا شہر باغوں سے
بھرا ہوا تھا، سن ۱۴۲۰ء میں ایک اطالوی سیاح نلوکو کونتی یہاں آیا اور وہ لکھتا
ہے کہ باغوں کی وجہ سے شہر کا قطر ساٹھ میل کے قریب ہے۔ ایک دوسرا
سیاح پیئز جو پرتگالی تھا اور نشاۃ ثانیہ کے عہد میں اُس نے بہت سے اطالوی
شہروں کو دیکھا تھا سن ۱۵۲۲ء میں وجے نگر آیا، وہ کہتا ہے کہ " وجے نگر

وسعت میں روم سے کم نہیں اور بہت ہی جاذب نظر ہے " اپنی بے شمار جھیلوں، چشموں اور پھلوں کے باغوں کی وجہ سے شہر نہایت ہی حسین اور دلآویز ہو گیا ہے ۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال شہر ہے جہاں ہر چیز کی فراوانی ہے " محلوں کی دیواریں چھتیں ہاتھی دانت کے کام سے پٹی ہوئی تھیں اور ان میں گلاب اور کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے " یہ اس قدر دولتمند اور خوبصورت شہر ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے " یہاں کے بادشاہ کرشن دیورایا کی بابت پیئز لکھتا ہے کہ وہ بڑے عظمت و جلال والا بادشاہ ہے، خوش مزاج اور ہنس مکھ، وہ دوسرے ملک والوں کی عزت کرتا ہے اور ان کے ساتھ تپاک سے پیش آتا ہے، اور ان کی عادت کچھ بھی ہو ان سے بے تکلف بات چیت کرتا ہے اور تمام حالات دریافت کرتا ہے "

جس زمانہ میں دکن میں وجے نگر کی سلطنت عروج پر تھی دہلی کی چھوٹی سی سلطنت کو ایک نئے دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ شمالی پہاڑوں کی طرف سے ایک اور حملہ آور آیا اور اس نے پانی پت کے مشہور میدان میں جہاں اکثر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے ۱۵۲۶ء میں دہلی کے بادشاہ کو شکست دی اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ یہ بابر تھا۔ جو نسل کے لحاظ سے ترکی منگول تھا اور وسطی ایشیا کے تیموری خاندان سے تھا، ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کا بانی یہی ہے۔

بابر کی فتح کا باعث غالباً سلطنت دہلی کی کمزوری تو نہ تھی بلکہ وہ بہتر قسم کا توپ خانہ تھا جس کے استعمال سے ہندوستانی ناآشنا تھے، اس وقت سے ہندوستان جنگ کے ترقی کرنے ہوئے فن میں پیچھے ہو گیا، بلکہ یوں کہنا

چاہیئے کہ ایک ہندوستان ہی کیا سارا ایشیا اس معاملہ میں جہاں تھا وہیں رہا، اس کے برخلاف یورپ اس فن میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، وہ باعظمت مغلیہ سلطنت جو دو سو برس تک ہندوستان میں اپنی طاقت کا سکّہ جمائے رہی سترھویں صدی کے بعد غالباً یورپی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکی، پھر یورپ کی جتنی قومیں ہندوستان میں آئیں وہ سب بحری راستوں پر پورے طور پر قابض تھیں، ان صدیوں میں جو نمایاں تبدیلی وجود میں آئی وہ یورپ والوں کی یہی بحری طاقت تھی جو روز افزوں ترقی کر رہی تھی، سترھویں صدی میں دکن میں چولوں کی سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کی بحری طاقت تیزی سے زوال کی طرف بڑھنے لگی۔ پانڈوں کی چھوٹی سی سلطنت سمندر سے واسطہ تو قریب کا رکھتی تھی لیکن کافی مضبوط نہ تھی، البتہ ہندوستانی نوآبادیاں پھر بھی بحرِ ہند پر قابض رہیں، لیکن پندرھویں صدی میں انھیں بھی عربوں نے سمندر سے نکال دیا اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد عربوں کی جگہ پرتگالی آگئے۔

۵۔ تہذیبوں کا امتزاج اور مشترکہ تہذیب کا ارتقا

پردہ۔ کبیر۔ گرو نانک۔ امیر خسرو

ان حالات کے پیشِ نظر یہ کہنا کہ ہندوستان پر اسلامی حملہ ہوا اور اس ملک کی تاریخ میں ایک اسلامی عہد ہے اتنا ہی غلط اور دھوکہ میں ڈالنے والا ہے جتنا انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کو مسیحی حملہ سے تعبیر کرنا یا انگریزوں کے زمانہ کو مسیحی عہد کہنا، اسلام نے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا، وہ اس سے کئی صدی پہلے یہاں آچکا تھا۔ حملہ ترکوں نے کیا (محمود کا حملہ)، افغانوں نے

کیا، اور پھر تبکی منگولوں یا مغلوں نے کیا، ان حملوں میں بعد کے دو حملے اہم ہیں
افغانوں کو ہندوستان کے سرحدی باشندے سمجھنا چاہیئے جو ہندوستان کے
لئے کوئی اجنبی نہیں تھے، اور ہندوستان میں ان کے سیاسی اقتدار کو ہندافغان
عہد کہنا چاہیئے۔ مغل ضرور باہر کے لوگ تھے اور ہندوستان میں اجنبیوں کی
حیثیت سے آئے لیکن یہ لوگ اس قدر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہندوستانیوں
سے گھلے ملے کہ ایک نیا دور پیدا ہوگیا جسے ہندمغل عہد کہنا چاہیئے۔

اسے حُسنِ اتفاق کہو یا اُن کی اپنی پسند، یا ممکن ہے یہ دونوں
باتیں ہوں، بہرحال افغان حکمران اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ آئے
تھے ہندوستان کے ساتھ ختم ہوگئے، اُن کے خاندان نسلی اعتبار
سے اس ملک میں پیوست ہوکر مکمل طور پر ہندوستانی خاندان بن گئے
یہ ہندوستان کو اپنا وطن اور باقی دنیا کو اپنے ملک سے باہر سمجھنے
لگے۔ باوجود سیاسی تصادم کے، ہندوستانیوں نے بھی عام طور پر انہیں
ہندوستانی ہی سمجھا حتیٰ کہ بہت سے راجپوت راجاؤں نے بھی
ان کی اطاعت قبول کرلی۔ بعض راجپوت سردار ایسے بھی تھے جنھوں
نے مطیع ہونے سے انکار کیا اور ان کے ساتھ سخت قسم کا تصادم بھی
ہوا، دہلی کے مشہور بادشاہ فیروز شاہ تغلق کی ماں ہندو تھی، اسی طرح
غیاث الدین تغلق بھی ہندو ماں کے بطن سے تھا، افغان اور ترکوں
کی ہندوؤں کے ساتھ اس قسم کی شادیاں عام تو نہ تھیں لیکن ہوتی
ضرور تھیں، دکن میں گلبرگہ کے مسلمان حکمراں کی شادی وجے نگر کی شہزادی
کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوئی،

ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وسطی مغربی ایشیا کے اسلامی

ممالک میں ہندوستانیوں کو خاصی شہرت حاصل تھی، گیارھویں صدی کے اوائل میں یعنی افغانوں کے حملہ سے قبل ایک مسلمان جغرافیہ داں ادریسی لکھتا ہے "ہندوستانی بالطبع انصاف پسند ہیں اور اپنے معاملات میں انصاف سے کبھی نہیں ہٹتے، وہ اپنی سچائی ایمانداری اور پاس عہد میں اس درجہ مشہور ہیں کہ ہر طرف سے لوگ ان کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے ان کے ملک میں آتے ہیں[۵]"

اس دور میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ امور سلطنت کا انتظام عمل میں لایا گیا، ذرائع آمد ورفت میں بالخصوص فوجی ضروریات کے ماتحت، خاص ترقی ہوئی، مرکزی حکومت کو زیادہ باا ثر بنایا گیا لیکن حکومت نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ مقامی رسم ورواج میں مداخلت نہ کرے، شیر شاہ جس نے مغلوں کے شروع عہد میں تھوڑے عرصہ کے لئے افغان حکومت دوبارہ قائم کی، افغانوں میں سب سے قابل حکمراں گذرا ہے، اس نے ایک نئے نظام مالگذاری کی بنیاد ڈالی جس کو بعد میں اکبر نے ترقی دی اکبر کے وزیر مالیات راجہ ٹوڈرمل کو پہلے شیر شاہ ہی نے اس کام پر مامور کیا تھا، افغان حکمراں نے انتظام سلطنت میں ہندوؤں کی ذہانت اور قابلیت سے برابر مدد لیتے رہے۔

ہندوستان اور ہندو مذہب پر افغانوں کی فتح کے دُہرے اثرات پڑے اور دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے، فوری اثر تو یہ تھا کہ لوگ افغانوں کی حکومت کے علاقے چھوڑ کر اُن سے دور دکن میں جا بسے،

۵؎ تاریخ ہند، مصنفہ الیٹ، جلد اول صفحہ ۸۸

جو ہیں رہے وہ زیادہ کٹر بن گئے اور الگ تھلگ رہ کر کوشش کرنے
لگے کہ بیرونی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں، انھوں نے ذاتوں
کی تقسیم کے نظام کو اور بھی زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا، اس کے برخلاف
دوسری طرف ہم یہ دیکھتے بھی ہیں کہ بالکل غیر شعوری طور پر یہ لوگ اپنے
خیالات اور زندگی میں رفتہ رفتہ بیرونی اثر قبول کرنے لگے، اور ایک
مشترکہ تہذیب کے عناصر خود بہ خود پیدا ہو گئے۔ فن تعمیر کے نئے طرز
وجود میں آئے، پوشاک اور طعام کے طور طریقے بدل گئے اور ان کی
زندگی نے مختلف طریقوں پر تبدیلی کے اثرات قبول کر لئے۔ اشتراک
امتزاج کا یہ عمل خصوصیت کے ساتھ موسیقی میں نمایاں ہوا، جو اپنی
ہندوستانی کلاسیکی اصلیت پر قائم رہتے ہوئے بھی بہت کچھ بڑھی،
فارسی زبان درباری زبان تھی چنانچہ بہت سے فارسی الفاظ روزمرہ کی
بولی میں شامل ہو گئے، ساتھ ہی ملکی بھاشائیں بھی ترقی کرنے لگیں۔

بعض تبدیلیاں ایسی بھی تھیں جو افسوسناک کہی جا سکتی ہیں۔ ان
میں سے ایک تبدیلی پردہ کا رواج ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ تو معلوم نہیں البتہ
تھی اس ردّ عمل کا جو نئے اور پرانے عناصر کے امتزاج سے وجود میں آیا،
جس طرح قدیم یونان اور بہت سے دوسرے ممالک میں امراء کے طبقہ میں
عورتیں مردوں سے الگ رہتی تھیں اسی طرح ہندوستان میں بھی یہ چیز
امیروں میں بہت پہلے سے چلی آتی تھی، اس قسم کی تفریق قدیم ایران میں
بھی تھی بلکہ مغربی ایشیا کے قریب قریب ہر ملک میں موجود تھی۔ لیکن
کسی جگہ ایسا نہ تھا کہ عورتیں مردوں سے بالکل علیحدہ رہی ہوں۔ غالباً
اس چیز کی ابتدا، بازنطینی دربار سے ہوئی جہاں عورتوں کے حرم سرا

کی حفاظت کے لئے خواجہ سرا مقرر کئے جاتے تھے، بازنطینی اثر روس میں پہنچا چنانچہ پیٹر اعظم کے زمانہ تک وہاں بھی عورتیں مردوں سے بالکل جُدا رکھی جاتی تھیں، تاتاریوں میں یہ رسم بالکل نہ تھی، یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ تاتاری عورتیں مردوں کے ساتھ بلا تکلف ملتی جلتی تھیں عرب ایرانی تہذیب پر بازنطینی رسم و رواج کا اثر ہوا اور یہ ممکن ہے کہ اونچے طبقوں کی عورتوں میں اسی اثر کے تحت کسی حد تک پردہ کا رواج پیدا ہوا ہو، پھر بھی نہ عرب میں سخت قسم کے پردہ نے رواج پایا نہ مغربی اور وسطی ایشیا کے کسی دوسرے ملک میں، افغانوں میں بھی جو دہلی کو فتح کر کے شمالی ہند میں پھیلے پردہ کا رواج نہ تھا، ترک اور افغان شہزادیاں اور دربار کی خواتین اکثر شہسواری اور شکار کے لئے باہر نکلتی تھیں، اور آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بھی باہر آتی جاتی تھیں، یہ ایک پُرانی اسلامی رسم ہے جس کی آج بھی پیروی کی جاتی ہے کہ حج کے موقع پر عورتیں اپنے چہروں سے نقاب اُلٹ دیتی ہیں، ہندوستان میں مغلوں کے عہد میں پردے نے رواج پایا، اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں میں جو باحیثیت اور ذی رتبہ لوگ تھے اُنھوں نے اپنے آپ کو عوام سے ممتاز کرنے کے لئے اپنی بیویوں کو پردے میں رکھنا شروع کیا، یہ رواج اونچے طبقوں کے ساتھ مخصوص رہا اور وہ بھی وسطی اور مشرقی حصہ یعنی دہلی، صوبہ متحدہ، راجپوتانہ، بہار اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کا اثر بہت نمایاں حیثیت رکھتا تھا اگرچہ تعجب کی بات ہے کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے پردے کو اتنا رواج حاصل نہیں ہوا۔ ہندوستان کے جنوب و مغرب میں آج تک مسلمانوں کے سوا دوسری قوموں میں پردے کا رواج نہیں۔

مجھے اس بات کے ماننے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ موجودہ دور میں ہندوستان کے ترقی نہ کرنے کے جو اسباب ہیں اُن میں پردہ کو اور عورتوں کی مردوں سے علیحدگی کو بہت اہمیت حاصل ہے، بلکہ میرا یقین ہے جب تک اس جہالت کی رسم کو دور نہیں کیا جائے گا۔ ہندوستان کی سماجی زندگی میں کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں، پردہ سے عورتوں کو جو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے وہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اس سے اتنا ہی بڑا نقصان مردوں کو اور سماجی زندگی کو پہنچ رہا ہے کیونکہ آنے والی نسلوں کی نشوونما انھیں عورتوں کی گودوں میں ہورہی ہے جو اس طرح پردے میں مقید ہیں۔ خوش قسمتی سے اس رسم کو ہندو تو اب بہت تیزی سے چھوڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی آہستہ آہستہ چھوڑتے جاتے ہیں۔ پردے کی قیود کے ٹوٹنے کا سب سے بڑا سبب کانگریس کی وہ سیاسی اور سماجی تحریک ہے جس نے ہزاروں عورتوں کو کسی نہ کسی قسم کے قومی کام میں لگا دیا ہے، گاندھی جی ہمیشہ سے پردے کے شدید مخالف رہے ہیں اور آج بھی ہیں، اُنھوں نے کسی موقع پر پردے کو ایک ایسی "بری بھیانہ رسم" بتایا ہے جس نے عورتوں کی نشوونما اور ترقی کو روک دیا ہے، "میرے نزدیک ہندوستان کے مردوں نے جہالت کی اس رسم کو اختیار کرکے عورتوں کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، شروع زمانہ میں جب پردہ رائج ہوا اس وقت اس کے فوائد کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں اب تو یہ محض بیکار ہے اور ملک کو اس سے ناقابل قیاس نقصان پہنچ رہا ہے" گاندھی جی نے اس بات پر ہمیشہ زور دیا کہ عورتوں کو بھی ویسی ہی آزادی اور ترقی کے ویسے ہی مواقع ملنے چاہئیں جیسے مردوں کو، "عورت

اور مرد کے تعلقات کی بنیاد عقل وسلیم پر ہونی چاہیئے ، ان دونوں کے درمیان
کسی قسم کی روک پیدا کرنا مناسب نہیں ، ان کا آپس کا برتاؤ فطری ہونا چاہیئے"
گاندھی جی نے اپنی تحریر اور تقریر میں درحقیقت بڑے شد و مد کے ساتھ عورتوں
کے لئے مساوات اور آزادی کی حمایت کی ہے اور ان کی گھریلو غلامی کی
بہت سخت مذمت کی ہے ، میں اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر یکایک
دور جدید پر آگیا ، اب مجھے پھر عہد وسطیٰ کے اس دور کو شروع کرنا چاہیئے
جب کہ افغانوں کی سلطنت دہلی میں مستحکم ہو چکی تھی اور پرانے اور نئے طریقوں
کا امتزاج ہو رہا تھا - ان تبدیلیوں میں سے بہت سی تبدیلیاں ایسی تھیں
جو محض اونچے طبقوں میں رونما ہوئیں ، عوام پر اور بالخصوص دیہات میں
ان کا کچھ بھی اثر نہ ہوا ، ان کی ابتدار درباری حلقوں سے ہوئی اور بس
شہروں یا شہری علاقوں تک ان کے اثرات محدود رہے ، اس شمالی
ہند میں ایک مشترکہ تمدن کے وجود میں آنے کا عمل صدیوں تک جاری رہا ،
اور دہلی اور صوبہ متحدہ جس طرح قدیم آریائی تہذیب کے مرکز رہے تھے اسی
طرح اس مشترکہ تہذیب و تمدن کے مرکز بنے ، آریائی تہذیب کی بہت
کچھ خصوصیات دکن کی طرف منتقل ہو گئیں اور اس نے ہندو تقلید پسندی کے
مرکز کی سی حیثیت حاصل کر لی ، تیمور کے حملہ کی وجہ سے سلطنت دہلی کے کمزور
ہو جانے کے بعد صوبہ متحدہ کے شہر جونپور میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست
قائم ہوئی ، اور یہ ریاست پندرھویں صدی بھر علوم ، تمدن اور مذہبی رواداری
کا مرکز رہی ، ہندی کو جو اس وقت عوام کی زبان کی حیثیت سے بڑھ رہی
تھی فروغ دیا گیا اور یہ کوشش بھی کی گئی کہ ہندو اور اسلامی عقائد کا امتزاج
عمل میں لایا جائے ، اسی زمانہ میں شمال کے دور دراز ملک کشمیر میں ایک

مسلمان بادشاہ زین العابدین کو بھی اپنی رواداری اور قدیم تمدن اور سنسکرت علوم کی سرپرستی کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔

یہ نیا ہیجان پورے ملک پر چھایا ہوا تھا اور نئے خیالات عوام کے دماغوں کو بے چین کر رہے تھے، جہاں تک قدیم تمدن کا تعلق ہے نیم شعوری طور پر ہندوستان کا نئے خیالات پر ردِّ عمل جاری تھا اور ہندوستان کوشش کر رہا تھا کہ اس بیرونی عنصر کو اپنے میں جذب کر لے، اس عمل میں وہ خود بھی کچھ نہ کچھ بدل رہا تھا، اسی ہیجان نے وہ نئی قسم کے مصلح پیدا کئے جنھوں نے اشتراک اور اتحاد کی علانیہ دعوت دی اور ذاتوں کے نظام کی تردید کی یا اُسے نظر انداز کیا، پندرھویں صدی میں جنوبی ہند میں اسی قسم کے ایک ہندو مصلح رامانند گذرے ہیں اور کبیر داس جو ان سے بھی زیادہ مشہور گذرے ہیں انھیں کے چیلے تھے۔

کبیر کے دوہوں اور گیتوں کو آج تک مقبولیت حاصل ہے۔ شمال میں گرُو نانک ہوئے جن کو سکھ مذہب کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان مصلحین کی تعلیم کے اثرات بہت عام تھے، اور محض اُن مخصوص فرقوں تک محدود نہ تھے جو اُن کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں اور اُن کے بعد پیدا ہوئے۔ بحیثیت مجموعی ہندو مذہب نئے اثرات سے متاثر ضرور ہوا، اور ہندوستان کا اسلام بھی دوسرے ممالک کے اسلام سے کچھ نہ کچھ مختلف ہو گیا، اسلام کے عقیدۂ توحید نے ہندو مذہب پر اثر کیا اور ہندوؤں کے وحدت وجود کے عقیدہ نے ہندوستانی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ اس وقت کے ہندی مسلمانوں میں بہت سے ایسے تھے جو نومسلم تھے اور جنھوں نے ہندو روایات کے ماحول میں پرورش پائی تھی، نسبتاً بہت تھوڑے ایسے تھے جو باہر سے

آئے تھے ، چنانچہ اسلامی تصوّف جس کا منبع اِشراقیت ہے ترقی کرنے لگا ، بیرونی عنصر کے ہندوستان کے ساتھ تیزی سے جذب ہونے کی مثال ملکی بھاشا ہے جو فارسی کے درباری زبان ہونے کے باوجود بولی جاتی تھی ، ابتدا میں مسلمانوں نے ہندی زبان میں بہت سی مشہور کتابیں لکھیں ، ان مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور امیر خسرو ہوئے جو ترک تھے اور جن کا خاندان دو تین پُشتوں سے صوبہ متحدہ میں بسا ہوا تھا ، یہ چودھویں صدی میں تھے اور انھوں نے کئی افغان سلاطین کا عہد حکومت دیکھا۔ یہ فارسی کے بہت اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے اور سنسکرت بھی جانتے تھے ۔ انھیں فن موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اور ہندی موسیقی میں انھوں نے بہت سی نئی چیزیں داخل کیں ہندوستان کا مشہور ساز 'ستار' انھیں کی ایجاد بتایا جاتا ہے ۔ انھوں نے بہت سے موضوعوں پر تصانیف چھوڑی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اُن چیزوں کو گنایا ہے جو ہندوستان کی قابلِ تعریف چیزیں ہیں ، ان چیزوں میں مذہب ہے ، فلسفہ اور منطق ہے ، زبان اور قواعد (سنسکرت) ہے ، موسیقی ، ریاضی ، اور سائنس کے علوم ہیں اور آم کا پھل ہے !

لیکن ہندوستان میں اُن کی شہرت کا اصلی باعث اُن کی وہ مقبولِ عام نظمیں ہیں جو انھوں نے اُس زمانہ کی عوام کی بولی ہندی میں لکھی ہیں ، انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ادب کی وساطت میں ڈھونڈھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ادبی مذاق عمائدین کی ایک چھوٹی سی جماعت تک محدود ہے انھوں نے جو کچھ کہا وہ دیہاتیوں کے لئے کہا ، اُنھیں کی زبان میں کہا اور اُنھیں کے رسم ورواج اور رہن سہن کے متعلق کہا ۔ انھوں نے مختلف رُتوں کے گیت لکھے اور ہر رُت قدیم کلاسیکی موسیقی میں اپنے جُدا سُر اور بول رکھتی تھی ،

اُنھوں نے اپنی شاعری میں زندگی اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا، دلہن کی آمد کے گیت گائے، محبوب سے جُدائی کا حال سُنایا، بارش سے مردہ زمین میں جان پڑنے کی کیفیت بیان کی، یہ گیت اب بھی کثرت سے گائے جاتے ہیں، شمالی اور وسطی ہند کے کسی گاؤں یا قصبہ میں ہم امیر خسرو کے گیت آج بھی سُن سکتے ہیں، خاص کر اُس وقت جب برسات کا موسم شروع ہوتا ہے اور ہر گاؤں آم اور پیپل کی شاخوں میں لمبے لمبے جھولے ڈالے جاتے ہیں اور گاؤں کے تمام لڑکیاں اور لڑکے مِل کر خوشیاں مناتے ہیں امیر خسرو نے بہت سی پہیلیاں اور معمے بھی کہے جو بچّوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہیں ان پہیلیوں کی وجہ سے وہ اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو گئے تھے اور وہ شہرت آج تک باقی ہے اور بڑھتی ہی جا رہی ہے، میرے خیال میں تو دنیا میں شاید ہی کوئی اور مثال ایسی ملے کہ چھ سو برس پہلے کے لکھے ہوئے گیت آج تک مقبول ہوں اور عوام اور خواص پر یکساں اثر کرتے ہوں اور جن کے بولوں میں بھی آج تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو۔

۶۔ ہندوستانی سماج

جماعت کی اہمیت

قریب قریب ہر وہ شخص جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتا ہے ذاتوں کے نظام سے ضرور واقف ہوگا اور تقریباً تمام باہر والے اور بہت سے ہندوستانی بھی اس نظام کو بحیثیت مجموعی بُرا کہنے یا اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایسا شخص تو شاید ہی کوئی ہو جو ذاتوں کی ہزار دل

موجودہ تقسیموں کو صحیح تسلیم کرتا ہو، البتہ ایسے بہت سے لوگ اب بھی موجود ہیں جو اس کے بنیادی نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور ہندوؤں میں ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو اپنی زندگی میں اس نظام کی پیروی کرتے ہیں۔ لفظ ذات کا استعمال ذہن کو کسی قدر الجھن میں ڈال دیتا ہے، مختلف لوگوں کے نزدیک اس لفظ کے مختلف معنی ہیں، ایک اوسط یورپی یا وہ ہندوستانی جو اس کا ہم خیال ہے اور معاملہ کو اسی کی نظر سے دیکھتا ہے سمجھتا ہے کہ ذات پات کا نظام در اصل طبقہ داری تقسیم کی ایک جامد شکل طبقوں کے باہمی فرق کو قائم رکھنے یعنی اوپر کے طبقوں کو سماج میں ہمیشہ کے لئے اوپر اور نیچے کے طبقوں کو ہمیشہ کیلئے نیچے رکھنے کی تدبیر ہے، یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے، ابتدا میں ذاتوں کا نظام قائم کرنے میں غالباً یہی مصلحت تھی کہ آریائی فاتحین کو مفتوح اقوام سے الگ رکھا جائے اور اونچا رکھا جائے۔ بے شبہ اپنی نشو و نما کے زمانہ میں اس نظام نے طبقات کی درجہ داری تقسیم قائم کردی گو اس تقسیم میں ابتداً کچھ لوچ اور لچک بھی رہی ہوگی، لیکن یہ خیال اصل میں حقیقت کا صرف ایک جز ہے اس سے ہمیں ذاتوں کے نظام کی قوت اور اس کی مضبوطی کا اندازہ نہیں ہوتا اور نہ وہ سبب واضح ہوتا ہے جس کے ماتحت یہ نظام ہمارے وقت تک زندہ رہا، یہ بودھ مذہب کی طاقت کے ساتھ متصادم ہوا لیکن زندہ رہا، ہندوستان میں کئی صدی تک افغانوں اور مغلوں نے حکومت کی لیکن اس میں فرق نہ آیا، یہاں اسلام پھیلا لیکن یہ بدستور قایم رہا۔ پھر صرف یہی نہیں، خود بے شمار ہندو مصلحین نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی ساری کوشش صرف کردی اس پر بھی یہ نہ مٹا۔

البتہ اب آکر کہیں ایسا ہوا ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے

اور اس کی بنیادیں ہلتی دکھائی دے رہی ہیں ، اس تبدیلی کا اصلی سبب یہ نہیں ہے کہ ہندو سماج میں اپنی اصلاح کا کوئی قوی محرّک پیدا ہو گیا ہے اور نہ محض وہ خیالات ہیں جو مغرب سے اس ملک میں آئے ہیں اور جنھوں نے یہاں کے دماغوں پر اثر ڈالا ہے بلکہ یہ تبدیلی جو ہماری نظروں کے سامنے رونما ہو رہی ہے دراصل نتیجہ ہے اُن معاشی تبدیلیوں کا جنھوں نے ہندوستان کے سماجی نظام کی پوری عمارت کو ہلا دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے ۔ اُسے گرا کر رہیں گی ۔ زندگی کے حالات بدل چکے ، خیالات نیا جامہ پہن رہے ہیں اور یہ تبدیلیاں اس شدت کے ساتھ ظہور میں آ رہی ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ذاتوں کے نظام کا قائم رہنا ناممکن ہے ۔ پرانے نظام کی جگہ آنے والے نئے نظام کی جو صورت ہوگی اس کی پوری تشریح ممکن نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے نہ صرف ذاتوں کا نظام ختم ہوا چاہتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بہت کچھ اور ہے جو خطرے میں نظر آ رہا ہے ۔ اس وقت سماج کی تنظیم کے دو نظریوں میں کشمکش جاری ہے اور دونوں ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں ۔ قدیم ہندو تصور جس میں تنظیم کی بنیاد جماعت پر ہے اور وہ بڑھتی ہوئی مغربی انفرادیت جو فرد کو جماعت پر ترجیح دیتی ہے ۔

یہ کشمکش تنہا ہندوستان ہی میں نہیں ہے بلکہ مغرب اور ساری دنیا میں اس کے اثرات اسی طور پر جاری ہیں البتہ ان ممالک میں اُس نے مختلف شکلیں اختیار کر لی ہیں ، انیسویں صدی کی یورپی تہذیب جو لبرل جمہوریت کی شکل اختیار کرنے کے بعد اقتصادی اور سماجی میدان عمل میں پھیلی انفرادیت کی انتہائی ترقی کی مثال ہے ۔ انیسویں صدی کا یہ تصور مع اپنی سیاسی اور سماجی تنظیم کے بیسویں صدی میں داخل ہوا اور پھیلتا رہا لیکن اب یہ بھی فرسودہ

ہو چکا ہے ، جنگ کے دباؤ اور اس تلاطم کی وجہ سے جو اس وقت دنیا کے سیاسی حالات میں بپا ہے انفرادیت ختم ہوا چاہتی ہے ، اب جماعت کی اہمیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس وقت دنیا کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے جُدا جُدا نظریوں میں مفاہمت کرائی جائے ممکن ہے کہ اس مسئلہ کا حل مختلف ممالک میں مختلف شکلیں اختیار کرے لیکن ایک بنیادی حل ایسا ضرور ہوگا جو سب ملکوں کے درمیان مشترک ہو۔

ذاتوں کا نظام کوئی الگ چیز نہیں وہ تو ایک بڑی سماجی تنظیم کا ایک جزو ہے اور ایک اہم جزو ہے ، ہوسکتا ہے کہ یہ کوشش کی جائے کہ اس کے ظاہری عیوب کو مٹا دئے جائیں ، اور اس کی عصبیت میں کمی کردی جائے اور اس طرح نظام کو بدستور باقی رکھا جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ ان سماجی اور اقتصادی قوتوں کو جو اس وقت بروئے کار ہیں عمارت کے بیرونی حصہ سے کچھ زیادہ سروکار نہیں ، وہ تو براہ راست بنیادوں پر حملہ کررہی ہیں اور ان سہاروں کو ختم کئے دیتی ہیں جنھوں نے اس نظام کو سنبھال رکھا تھا ، دراصل ان سہاروں میں سے بہت سے ختم ہو چکے ، اور جو ہیں وہ تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں اور ذات پات کا نظام ان کی مدد سے محروم ہوتا جارہا ہے ، اب یہ سوال ہی نہیں ہے کہ ہمیں ذاتیں پسند ہیں یا ناپسند ، ہماری پسند اور ناپسندیدگی کے باوجود تبدیلیاں وجود میں آرہی ہیں ، البتہ یہ چیز ہمارے قابو میں ہے کہ ان تبدیلیوں کو ہم ایسے سانچے میں ڈھال لیں جو ہمارے لئے فائدے مند ہو اور اس طرح ہندوستانی قوم کی سیرت اور اس ذہانت سے پورا پورا فائدہ اُٹھالیں جو سماجی تنظیم کو استحکام دینے اور اس کے اجزار کو مربوط رکھنے میں ہمیشہ نمایاں رہی ہے ، سر جارج برڈ ووڈ

نے کسی موقع پر کہا ہے کہ "جب تک ہندوستانی ذاتوں کے نظام پر قائم ہیں ہندوستان ہندوستان ہے۔ جس دن اُنھوں نے اِسے چھوڑ دیا پھر ہندوستان نہ رہے گا، یہ شاندار جزیرہ نما گھٹ کر اینگلو سیکشن سلطنت کا نادار اور پس ماندہ حصّہ رہ جائے گا۔"

ذاتوں کا نظام ہو یا نہ ہو ہمیں تو ویسے ہی مدّت سے برطانوی سلطنت میں یہی ذلّت آمیز حیثیت حاصل ہے، لیکن آئندہ ہماری حیثیت خواہ کچھ بھی ہو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہم اس سلطنت کی حدود کے اندر مقید نہیں رہیں گے، سر جارج برڈ وڈ کے بیان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے اگرچہ ان کا نقطۂ نظر پھر بھی مختلف ہے بہت ممکن ہے کہ جب تک کوئی ایسا دوسرا سماجی نظام وجود میں نہ آجائے جو زمانہ کے حالات اور ہندوستانیوں کے مزاج کے موافق ہو ہندوستان کے قدیم نظام کے ٹوٹنے پر سماجی زندگی میں انتشار پیدا ہو جائے، عوام مصیبت میں مبتلا ہو جائیں اور انفرادی طرزِ عمل میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں جو سماج کے لئے مفید نہ ہوں، غالباً اس قسم کا انتشار درمیانی عرصہ میں ناگزیر ہوا کرتا ہے، یہ چیز دنیا میں ہر جگہ کافی حد تک موجود ہے، اور غالباً اُن مصیبتوں اور تکلیفوں ہی سے جو اس قسم کے انتشار کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں قومیں زندگی کا سبق سیکھتی ہیں اور اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بناتی ہیں۔

بہرحال انتشار پیدا ہونا تو ضروری ہے لیکن ہمیں یہ اُمید نہیں رکھنی چاہیئے کہ اس انتشار کے بعد حالت خود بخود بہتر ہو جائے گی، ہم جس مستقبل کے لئے کوشش میں مصروف ہیں اُس کے حالات کا ہمیں پہلے سے اندازہ ضرور ہونا چاہیئے خواہ یہ اندازہ مبہم ہی کیوں نہ ہو، اگر ہم نے اس کی پروا نہ کی

اور تبدیلیوں کو جس طرح وہ آرہی ہیں آنے دیا تو یقیناً بعد میں ہمیں افسوس کرنا پڑے گا، اپنے تعمیری کاموں کے منصوبوں میں ہمیں اپنے عوام کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جن کے ساتھ ہمارا اصل معاملہ ہے ساتھ ہی ساتھ قوم کے تصورات اور رجحانات کے پس منظر کو بھی نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے اور اس ماحول کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے جن میں ہمیں کام کرنا ہے، ان حالات کو نظر انداز کرنا اور خیالی منصوبوں کے ہوائی قلعے بنانا یا دوسرے ملکوں کو نقل کرنا محض حماقت ہوگی، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے اُس قدیم سماجی نظام کا غور سے مطالعہ کریں جس کا ہمارے عوام کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہے۔

قدیم سماجی نظام کے بنیادی تصور تین تھے، خود مختار دیہاتی برادری ذات، مشترکہ خاندان کا نظام — ان تینوں تصورات میں دراصل جماعت ہی کو اہمیت حاصل ہے، فرد کی حیثیت محض ثانوی ہے، اس نظام میں کوئی ایسی بہت عجیب بات نہ تھی جو ہمیں دوسرے ملکوں میں نہ ملے، عہد وسطیٰ میں اس سے بہت کچھ ملتے جلتے نظام دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی موجود تھے، ہندوستان کی قدیم جمہوریتوں کی مثال اور ملکوں میں بھی ملتی ہے۔ اسی طرح قدیم اشتمالیت کی مثال بھی ہمیں ملتی ہے، قدیم روسی "میر" (Mir) ہندوستانی دیہاتی برادری سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، ذاتیں ہندوستان میں ایک علی چیز تھیں اسی طرح یورپ میں عہد وسطیٰ کی ٹریڈ گلڈ یعنی ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں تھیں جن میں خاندانوں کا نظام ویسا ہی تھا جیسا ہندوستان کا مشترکہ خاندان کا نظام تھا، مجھے ان باتوں کا زیادہ علم نہیں کہ اور زیادہ مقابلہ کی کوشش کروں اور نہ یہ چیز میرے مقصد کے لئے کچھ ایسی زیادہ مفید ہے۔ ہاں بحیثیت مجموعی پورا ہندوستانی نظام ضرور ایک انوکھی

چیز تھا اور جوں جوں ترقی کرتا گیا اس کا انوکھا پن بھی زیادہ ہوتا گیا۔

۷۔ گاؤں کی خود اختیاری حکومت

شکر نیتسار

شکر نیتسار دسویں صدی کی ایک پرانی کتاب ہے جس سے ہمیں ہندوستان کے اس اجتماعی نظام کا اندازہ ہوتا ہے جو ترکوں اور افغانوں کے حملے سے پہلے اس ملک میں رائج تھا، نیتسار کے معنی ہیں اجتماعیات کا علم، یہ کتاب چونکہ شکر اچاریہ کی لکھی ہوئی ہے اس لئے شکر نیتسار کہلاتی ہے۔ اس میں مرکزی حکومت، بادشاہ کی کابینہ، حکومت کے مختلف محکموں اور قصبوں اور دیہات کی زندگی پر بحث کی گئی ہے۔ دیہات کی پنچایت لوگوں کی نمائندہ انجمن ہوتی تھی جس کے انتظامی اور آئینی اختیارات وسیع ہوتے تھے، بادشاہ کے عمّال اس پنچایت کے ممبروں کی بہت عزت کرتے تھے، گاؤں میں زمینوں کی تقسیم پنچایت کرتی تھی اور لگان بھی یہی وصول کرتی تھی، لگان میں سے بادشاہ کا حصہ بھی گاؤں کی طرف سے یہی ادا کرتی تھی، کئی کئی پنچایتوں پر ایک بڑی پنچایت ہوتی تھی جو چھوٹی پنچایتوں کے کام کی نگرانی کرتی تھی اور اگر ضرورت ہوتی تھی تو اس کے کاموں میں مداخلت بھی کرتی تھی۔

پنچایتوں کے ممبر منتخب کئے جاتے تھے۔ بعض پرانے کتبوں سے انتخاب کے طریقہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہر گاؤں میں مختلف کمیٹیاں ہوتی تھیں جن کے انتخابات ہر سال ہوتے تھے اور عورتیں بھی ان میں منتخب کی جاتی تھیں۔ اگر کسی ممبر کا برتاؤ خراب ہوتا تھا تو اسے کمیٹی سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ عزیزوں کے ساتھ

بے جا رعایت کو روکنے کے لئے ایک دلچسپ قاعدہ یہ تھا کہ کمیٹی کے ممبروں کے رشتہ داروں کو پبلک عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔

دیہات کی یہ پنچائتیں اپنی آزادی کی بڑے اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی تھیں، یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ کوئی سپاہی دیہات میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس شاہی اجازت نامہ نہ ہو بیتسار نے لکھا ہے اگر لوگ کسی افسر کی شکایت کرتے تھے۔ تو بادشاہ " اپنے افسروں کا ساتھ نہیں دیتا تھا بلکہ رعایا کا ساتھ دیتا تھا " اگر بہت سے آدمی کسی افسر کی شکایت کرتے تو وہ افسر برخاست کر دیا جاتا تھا " کیونکہ ایسا کون ہے جو عہدے کے نشہ سے سرشار نہیں ہو جاتا " بادشاہ کو رعایا کی اکثریت کے فیصلہ کے مطابق عمل کرنا ہوتا تھا " عوام کی رائے بادشاہ سے بھی زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ کیونکہ رسّی جو بہت سے ریشوں سے بنتی ہے ایسی طاقتور ہوتی ہے کہ شیر کو گھسیٹ لاتی ہے " " عہدوں کو پُر کرتے وقت اُمید واروں کے کام، چال چلن اور اُن کی لیاقت کا خیال کیا جاتا تھا، خاندان اور ذات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی " " اور وہ جذبہ جو ایک برہمن میں ہونا چاہیئے نہ رنگ سے پیدا ہوتا ہے اور نہ اونچے خاندان سے "

ہر بڑے شہر میں بہت سے کاریگر اور سوداگر رہتے تھے اور دستکاروں کی انجمنیں ہوتی تھیں، تجارتی انجمنیں اور ساہوکارہ کارپوریشن قائم تھے، یہ سب اپنے اندرونی انتظامات خود ہی کرتی تھیں " یہ تمام معلومات نامکمل ہیں پھر بھی اِن سے اور بہت دوسرے ذرائع سے بھی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود اختیاری حکومت کا ایک بہت وسیع نظام

قصبوں اور دیہاتوں میں قائم تھا، اور مرکزی حکومت، جب تک اس کو ٹیکس وصول ہوتا رہتا تھا، اس نظام میں ذرا بھی مداخلت نہیں کرتی تھی، رسم و رواج کے قانون کو بہت اہمیت حاصل تھی اور سیاسی اور فوجی طاقت اُن حقوق میں کبھی مداخلت نہیں کرتی تھی جن کی بنیاد رواج پر تھی، اصولاً زراعت کے نظام کی بنیاد مشترکہ اور متعدد دیہات پر تھی، افراد اور خاندانوں کو بعض حقوق ضرور حاصل تھے لیکن ساتھ ہی اُن پر بعض ضروری فرائض بھی عائد ہوتے تھے اور ان دونوں چیزوں کا محافظ رسم و رواج کا قانون تھا۔

قدیم ہندوستان میں مذہبی حکومت کبھی نہیں ہوئی، ہندوستانی اجتماعی نظام میں اس بات کی اجازت تھی کہ اگر بادشاہ نا انصاف اور جابر ہو تو رعایا اُس کے خلاف بغاوت کردے، چین کے فلسفی منسیس نے دو ہزار برس پہلے کہا تھا اور یہ اُس زمانہ کے ہندوستان پر بالکل صادق آتا ہے کہ "اگر کوئی حکمراں اپنی رعایا کو گھاس اور مٹی کے مثل سمجھے تو رعایا کو بھی چاہیئے کہ اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسا کسی ڈاکو اور دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے"، شخصی حکمرانی کا یہ سارا تصور یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے بالکل مختلف تھا۔ یورپ میں بادشاہ کو اپنی رعایا اور اُن تمام چیزوں پر جو اس کی مملکت کی حدود میں تھیں پورا پورا قبضہ اور اختیار حاصل تھا، یہ اختیار وہ اپنی طرف سے امرار اور عمائدین کو سپرد کر دیتا تھا اور یہ لوگ اُس کے سامنے اطاعت کا عہد کرتے تھے، اس کے بعد ملک اور اُس ملک کی رعایا دونوں اس جاگیرداری اور اس کے ذریعہ سے بادشاہ کی ملکیت ہوجاتے تھے، یہ اصل میں حکومت کے اُس تصور کی ترقی یافتہ شکل تھی جس کی ابتدا، روما سے ہوئی تھی، ہندوستان میں اس قسم کا کوئی تصور نہ تھا، یہاں بادشاہ کو بس

مال گزاری وصول کرنے کا اختیار حاصل تھا اور یہی اختیار وہ اپنی طرف سے دوسروں کو سونپ سکتا تھا۔ ہندوستان کا کاشتکار اپنے زمیندار کا غلام نہ تھا، ملک میں زمین وافر تھی اور کسان کو زمین سے بے دخل کرنے میں زمیندار کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا اس طرح ہندوستان میں اس قسم کا زمینداری نظام قائم ہی نہ ہوا جیسا کہ مغرب میں تھا، اور نہ کسان اپنی زمین کا پورا پورا مالک تھا۔ یہ دونوں تصور بہت بعد میں انگریزوں نے اِس ملک میں پیدا کئے جس کے نتائج نہایت ہی خطرناک ثابت ہوئے۔

بیرونی فتوحات اپنے ساتھ جنگ اور بربادی، بغاوتیں اور ان بغاوتوں کے جواب میں جبر اور تشدد لائیں، نئے حکمراں طبقہ نے زیادہ تر مسلح فوج پر تکیہ کیا، اس طبقہ نے اکثر ان آئینی قیود کو بھی نظر انداز کیا جو ملک کے رواجی قانون کا ایک جزء تھیں۔ اِس کے بہت اہم نتائج نکلے، دیہات کی خود مختار جماعتوں کی طاقت گھٹ گئی، بعد میں مال گزاری کے نظام میں بھی مختلف تبدیلیاں ہوئیں۔ اِس سب کے باوجود افغان اور مغل حکمرانوں نے اس بات کا لحاظ رکھا کہ پُرانے رسوم اور روایات میں کوئی مداخلت نہ کی جائے، چنانچہ بنیادی تبدیلیاں بالکل عمل میں نہ آئیں اور ہندوستانی زندگی کی معاشی اور سماجی تنظیم بدستور باقی رہی۔ غیاث الدین تغلق نے عمّالِ حکومت کے نام مخصوص ہدایات جاری کی تھیں کہ رواجی قانون کا تحفظ کیا جائے اور ریاست کے معاملات کو مذہب سے الگ رکھا جائے کیونکہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا تعلق ذاتی پسند یا ناپسندیدگی سے ہے۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات اور باہمی آویزش نے اور ساتھ ہی حکومت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت نے رفتہ رفتہ رواجی قانون کے اُس احترام میں کافی کمی کر دی جو اب تک ملحوظ رہا تھا، دیہات کی

خود مختار جماعت پھر بھی باقی رہی۔ اس کا زوال آگے چل کر برطانوی راج میں شروع ہوا۔

۸- ذاتوں کا نظریہ اور عمل

مشترک خاندان

ہیول کہتا ہے کہ " ہندوستان میں مذہب کو مشکل ہی سے ایک معینہ عقیدہ کہا جا سکتا ہے وہ انسانی افعال کا ایک دستور العمل ہے جسے روحانی ترقی اور زندگی کے مختلف حالات کے مطابق بنایا گیا ہے" قدیم زمانہ میں جب ہند۔ آریائی تہذیب کی پہلے پہل تشکیل ہوئی ہے یہ مذہب ہی تھا جس نے اس وقت انسانوں کی ضروریات کو پورا کیا۔ اس زمانہ میں تہذیبی ذہنی اور روحانی ترقی کے لحاظ سے انسان آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، ان میں قدیم جنگلوں کے رہنے والے بھی تھے اور جادو ٹونے پر ایمان رکھنے والے بھی، ٹوٹم یعنی منظاہر فطرت کی پوجا کرنے والے بھی تھے اور ہر قسم کے توہمات پر ایمان رکھنے والے بھی، پھر ان میں سے ہر گروہ کے اندر عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے مختلف خیالات کے لوگ موجود تھے ایک طرف اگر اعلیٰ فکر رکھنے والے لوگ پائے جاتے تھے تو دوسری طرف ایسے بھی بکثرت موجود تھے جو فکر و نظر سے بالکل بے بہرہ تھے، جوں جوں اجتماعی زندگی ترقی کرتی گئی عقائد میں بھی ایک طرح کی یکسانی پیدا ہوتی گئی۔ تاہم تہذیب میں اور مزاجی کیفیتوں میں بہت کچھ اختلاف باقی رہا، ہند آریائی قوم اس سے بہت بچتی تھی کہ کسی عقیدہ کو جبراً دبائے یا کسی جماعت کے

حقوق کو پامال کرے، اُس نے ہر جماعت کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اپنی سمجھ اور اپنے ذہنی معیار کے مطابق اپنے لئے زندگی کے مقاصد معیّن کرے، اُس نے مختلف جماعتوں کو اپنے میں ملانے کی کوشش تو کی لیکن اس معاملہ میں جبر اور تشدد سے کبھی کام نہیں لیا۔

سماجی تنظیم میں ایک اور مشکل بھی پیش آئی جو اتنی ہی بڑی یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ بڑی تھی، اور وہ اِن متضاد جماعتوں کو ایک سماجی نظام میں اس طرح متحد کرنا تھا کہ ہر جماعت پوری سماج کے ساتھ اشتراک عمل بھی کر سکے اور ساتھ ہی اپنی آزادی کو بھی برقرار رکھ سکے، اور اپنی مخصوص روایات کے ساتھ ترقی بھی کر سکے۔ اگرچہ مثال ذرا دور کی ہے پھر بھی کسی حد تک اس مشکل کا موجودہ زمانہ کے اقلیتوں کے اُن مسائل سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے جو بہت سے ملکوں کے لئے پریشانی کا باعث ہیں اور جن کا آج تک کوئی حل نہیں نکل سکا۔ امریکہ کی ریاستہائے متحدہ نے اپنے اقلیتوں کے مسائل کو اس طرح حل کیا ہے کہ ہر شہری کو سو فی صدی امریکی بنانے کی کوشش کی ہے اور ہر امریکی سے اس کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہو۔ دوسرے ممالک کو جن کی ماضی کی روایات زیادہ قدیم اور اُلجھی ہوئی ہیں اپنے محل وقوع کے لحاظ سے امریکہ کی سی آسانی میسر نہ آسکی، حتیٰ کہ کناڈا میں جو فرانسیسی بستے ہیں وہ اپنی جداگانہ نسل، مذہب اور زبان کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم سمجھتے ہیں اب یورپ کی مثال لیجئے وہاں یہ اختلافات اور بھی زیادہ شدید ہیں پھر بھی یورپ والے محض اپنے مشترک تاریخی پس منظر اور اپنے تمدن کی یکسانی کی وجہ سے یورپ کے اندر بھی اور یورپ سے باہر بھی اپنے آپ کو ایک ہی قوم سمجھتے ہیں اور جب کبھی غیر یورپی لوگ ان میں آ کر مِل جاتے۔

ہیں تو یہ اُن کو ایک جُدا قوم سمجھتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ میں حبشیوں کو سو فی صدی امریکی ہونے کے باوجود ایک علیحدہ نسل ہی سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے وہ بہت سی اُن مراعات سے محروم ہیں جن سے دوسرے لوگ معمولاً فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دنیا میں اور بہت سی مثالیں ہیں جو اِن سے بھی بدتر ہیں البتہ سوویٹ روس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنی قومیتوں اور اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کر لیا ہے اور وہ اس طرح پر کہ اس نے اپنے یہاں ایک ایسی ریاست قائم کر لی ہے جو بہت سی قوموں پر مشتمل ہے۔

آج ہمارے پاس علم ہے اور یہ دور بھی ترقی کا ہے، اس کے باوجود یہ مشکلات اور مسائل ہمیں درپیش ہیں، تو ہندآریائی نسل کو پرانے زمانہ میں ایک ایسے ملک کے اندر جہاں مختلف نسلوں کے لوگ موجود تھے اپنی تہذیب اور اپنے سماجی نظام کے بنانے میں کیا کچھ دشواری پیش نہ آئی ہوگی،

ایسے مسائل کو حل کرنے کا اُس وقت اور بعد میں بھی عام طریقہ تو یہ تھا کہ مفتوحہ آبادی کو غلام بنا کر اُن کے قومی وجود کو بالکل مِٹا دیا جاتا تھا، ہندوستان میں اس طریقہ پر تو عمل نہیں کیا گیا، لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اعلیٰ طبقوں کی برتری کو دائمی بنانے کی ہر طرح کوشش کی گئی۔ اور جب اِس مقصد میں کامیابی ہوگئی تو پھر ایک ایسی ریاست قائم کی گئی جو مختلف جماعتوں پر مشتمل تھی۔ اس ریاست میں ہر جماعت کو آزادی دی گئی کہ وہ چند قیود اور بعض عام قوانین کے ماتحت رہ کر اپنے پیشہ کو ترقی دے اور اپنے رواج اور مرضی کے مطابق اپنی زندگی گذارے۔ اصلی پابندی محض ایک تھی اور وہ یہ کہ اُسے کسی دوسری جماعت کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے اور کسی سے متصادم نہیں ہونا چاہیئے۔ اس نظام میں بڑی لچک تھی اور اسی وجہ

سے اُس کو وسعت دی جا سکی، ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ نئی نئی جماعتیں بنتی رہتی ہیں، یہ جماعتیں جن لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں وہ یا تو نو وارد لوگ ہوتے تھے یا پُرانی جماعتوں کے وہ لوگ جو اختلاف رکھنے کی بنا پر اپنی جماعت سے الگ ہو جاتے تھے، ہر جماعت کے اندر مساوات اور جمہوریت پائی جاتی تھی لیڈروں کو عوام منتخب کرتے تھے اور جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تھا تو یہ لیڈر پوری جماعت کے مشورہ سے کام کرتے تھے۔

یہ جماعتیں دراصل کام کے لحاظ سے تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا ایک مخصوص پیشہ رکھتی تھی گویا یہ ایک طرح کے ٹریڈ یونین یا پیشہ وروں کی انجمنیں تھیں۔ ہر انجمن میں اندرونی اتحاد کا جذبہ موجود تھا، اور اس اتحاد کی وجہ سے محض یہی نہیں کہ انجمن کا تحفظ ہوا بلکہ جس وقت انجمن کا کوئی رکن کسی تکلیف یا کسی مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تھا تو سب اراکین اس کی مدد اور حفاظت کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ ہر جماعت یا ذات کے جتنے مخصوص مشاغل تھے اُن سب کا کچھ نہ کچھ تعلق دوسری ذاتوں سے بھی تھا، اور یہ ربط اس وجہ سے قایم کیا گیا تھا تاکہ ایک طرف ہر جماعت اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے کامیابی کے ساتھ اپنے مشغلوں میں مصروف رہے اور دوسری طرف پوری سماج اپنے مشاغل میں ہم آہنگ رہے، پھر تمام جماعتوں کو متحد اور اُن کے دلوں میں مشترکہ قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اُنھیں یہ محسوس کرایا گیا کہ اُن کی تہذیب ان کی روایات اُن کے مذہبی پیشوا اور اُن کے قومی سورما مشترک ہیں، اور اُن کا ملک ایک ہی ملک ہے جس کے چاروں کونوں میں وہ تیرتھ یاترا کے لئے جاتے ہیں یہ قومی اشتراک قومیت کے اُس تصور سے بالکل مختلف تھا جو آج کل ہے۔ ہندوستانی تصور سیاسی حیثیت سے بالکل کمزور تھا لیکن

تہذیبی اور سماجی حیثیت سے وہ بہت قوی تھا، سیاسی اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کے لئے راستہ بالکل صاف ہو گیا لیکن اپنی سماجی قوت کی وجہ سے دب کر اُبھرنا ہندوستان کے لئے ہمیشہ آسان رہا۔ اسی قوت نے ہندوستان کے سماجی نظام میں یہ خصوصیت پیدا کردی کہ وہ نئے عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا۔

دونوں کا نظام ایک جماعتی نظام تھا جس کی بنیاد خدمت اور عمل پر تھی، اس کا مقصد ایک ہمہ گیر نظام قائم کرنا تھا جس میں ایسا کوئی مقررہ عقیدہ نہ ہو جس کی پیروی سب پر فرض ہو بلکہ ہر جماعت کو اپنے عمل میں پوری آزادی حاصل ہو۔ اس نظام میں ایک شادی کی بھی اجازت تھی اور ایک سے زیادہ کی بھی اور مجرّد رہنا بھی ممنوع نہ تھا، ان تینوں طریقوں کو بالکل اُسی طرح روا رکھا جاتا تھا جس طرح دوسرے عقائد اور رسوم کو، اس طرح زندگی کا ہر معیار صحیح سمجھا جاتا تھا، کسی اقلیت کے لئے اکثریت کی اطاعت ماننا ضروری نہ تھا، ہر جماعت کے حق خود اختیاری کو تسلیم کیا جاتا تھا، بس یہ دیکھ لیا جاتا تھا کہ اس کی تعداد کتنی ہے اور وہ ایک نمایاں جماعت بن کر اپنے فرائض انجام دے سکتی تھی یا نہیں، نسل، مذہب، رنگ تہذیب اور اور ذہنی ارتقا کے لحاظ سے جماعتوں میں باہم کتنا ہی تفاوت ہوتا سب روا تھا،

فرد کو جماعت کا ایک رکن سمجھا جاتا تھا اور جب تک جماعت کے افعال میں اس کی وجہ سے کوئی رخنہ نہ پڑتا اُسے اپنے افعال میں پوری آزادی حاصل تھی، جماعت کے افعال کو درہم برہم کرنے کا اُسے کوئی حق نہ تھا، لیکن اگر وہ کافی طاقت رکھتا تھا اور اس کے ساتھ کافی تعداد میں

ایسے لوگ بھی تھے جو اُس کی حمایت کرتے تو اُسے حق حاصل تھا کہ وہ الگ ایک جماعت بنالے، لیکن وہ اگر کسی جماعت کے ساتھ نباہ نہ کرسکتا تھا تو اس کے یہ معنی سمجھے جاتے تھے کہ جہاں تک دنیا کے سماجی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ ان کے لئے موزوں نہیں، ایسی حالت میں وہ سنیاسی بن جاتا تھا اور ذات، جماعت اور دنیا کے مشاغل کو چھوڑ کر سیر اور گشت کرتا پھرتا تھا اور اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارتا تھا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ گو ہندوستان کی سماج کا مقصد فرد کو جماعت کے ماتحت رکھنا تھا لیکن مذہبی فکر اور روحانی علم نے ہمیشہ فرد ہی کو اہمیت دی، نجات اور حقیقت کے علم کی تلاش کا دروازہ، ہر ذات کے لوگوں کے لئے خواہ وہ اونچے ہوں یا نیچے یکساں طور پر کھلا ہوا تھا۔ نجات یا عرفان جماعت کا معاملہ نہ تھا بلکہ تمام تر ایک شخصی چیز تھی۔ نجات تک پہنچنے کا بھی کوئی مقررہ اُصول نہ تھا بلکہ ہر راستہ سے اس منزل تک پہنچنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔

گو سماجی تنظیم میں جماعت کی حیثیت بالاتر تھی اور اسی چیز نے ذاتیں بھی پیدا کیں پھر بھی ہندوستان میں انفرادیت پسندی کی طرف رجحان ہمیشہ موجود رہا۔ اِن دونوں نظریوں کی آویزش کی مثالیں بھی اکثر ملتی ہیں۔ انفرادیت کی طرف میلان کا ایک سبب وہ مذہبی عقیدہ بھی تھا جو فرد کی حیثیت پر زور دیتا تھا۔ وہ سماجی مصلح جنھوں نے ذاتوں کے نظام کی مخالفت کی عموماً مذہبی مصلح تھے اور اُن کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ ذاتیں روحانی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں اور اُس انفرادیت کے منافی ہیں جس کو مذہب اہمیت دیتا ہے۔ بودھ مت نے اسی وجہ سے ذاتوں سے

انکار کیا اور انفرادیت اور عالمگیر برادری کی تلقین کی ۔ اس انفرادیت نے بودھ مت کو عام سماجی سرگرمیوں سے دور کر دیا ، وہ سماجی نظام میں ذاتوں کا بدل تجویز نہ کر سکا اور اسی وجہ سے ذاتیں نہ اس وقت مٹ سکیں اور نہ بعد میں ۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خاص خاص ذاتیں کون کون سی تھیں ، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اچھوتوں کو الگ کر دیں جو ذاتوں سے باہر سمجھے جاتے تھے تو خاص خاص یہ تھیں ۔ برہمن یعنی پجاری ، معلّم اور مفکر ۔ چھتری یعنی حکمراں اور سپاہی ، ویش یعنی سوداگر ، تاجر اور ساہوکار ۔ شدر یعنی کاشتکار اور دوسرے پیشہ ور ——— ان میں غالباً سب سے زیادہ مربوط اور سب سے الگ تھلگ ذات برہمنوں کی تھی ، چھتری اپنی ذات میں ان لوگوں کو برابر شامل کرتے رہے جو باہر سے آتے تھے اور ملک کے اندر جو لوگ طاقت اور اختیار حاصل کر لیتے تھے ، اُن کو چھتری اپنے ساتھ ملا لیتے تھے ۔ ویش زیادہ تر تاجر اور ساہوکار تھے اور ساتھ اور بھی بہت سے پیشوں میں مصروف تھے ، شدروں کا اصل کام کاشتکاری تھا یا گھریلو خدمتگاری ، ان کے علاوہ ہمیشہ نئی نئی ذاتیں بنتی رہیں ۔ اس کے بہت سے اسباب تھے ۔ ایک سبب نئے نئے پیشوں کا وجود میں آنا بھی تھا ۔ پُرانی ذاتوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ سماج میں اونچی حیثیت حاصل کریں ، یہ عمل آج تک جاری ہے ۔ بعض نیچی ذاتیں دیکھتے دیکھتے گلے میں جنیو پہن لیتی ہیں جو محض اونچی ذاتوں کا نشانِ امتیاز ہے ، لیکن اس سے سماج کے نظام میں کبھی خلل نہ پڑا کیونکہ ہر ذات اپنے کام اور اپنے مشغلہ میں مصروف رہی اور اپنے پیشہ اور کاروبار کو چلاتی رہی ۔ یہ محض ناموری حاصل کرنے کا

ایک طریقہ تھا ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ نیچی ذات کے لوگ محض اپنی ذاتی لیاقت کی بنار پر ریاست میں طاقت اور اختیار کے عہدوں پر بھی پہنچ گئے ہیں لیکن اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔

بحیثیت مجموعی سماج کی تنظیم کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں مسابقت اور مقابلہ نہ تھا اسی وجہ سے ذاتوں کے نظام کی وجہ سے اتنا فرق نہ پڑا جتنا مسابقت اور مقابلہ کی حالت میں پڑتا ۔ برہمن ذات کے اعتبار سے سب سے اونچا تھا ، اُسے اپنے علم اور اپنی عقل پر ناز بھی تھا اور دوسرے اُس کی عزت بھی کرتے تھے لیکن دنیاوی دولت میں اُسے زیادہ حصہ نہیں ملا تھا ، سوداگر دولتمند تھے اور خوشحال لیکن سماج میں مجموعی طور پر اُنھیں کوئی خاص اونچی حیثیت حاصل نہ تھی ۔

آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد کاشتکاری کرتی تھی ، زمینداری کا کوئی نظام نہ تھا اور نہ کسان کو حق ملکیت حاصل تھا ، یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ قانون کے نزدیک زمین کا اصل مالک کون تھا ، کاشتکار کو زمین جوتنے کا حق حاصل تھا ، اس کے بعد جو اصل سوال رہ جاتا تھا وہ زمین کی پیداوار کی تقسیم کا تھا بڑے حصہ کا مالک تو کسان ہوتا تھا ، چھٹا حصہ بادشاہ یا ریاست کا ہوتا تھا ساتھ ہی گاؤں کی ہر اُس جماعت کو جو لوگوں کی ذرا بھی خدمت کرتی تھی حصہ ملتا تھا ۔ ان خدمت کرنے والوں میں برہمن پجاری اور معلّم شامل تھے ، اور گاؤں کے سوداگر ، لوہار ، بڑھئی ، موچی ، کمہار ، راج ، نائی اور بھنگی ، اس طرح یوں سمجھنا چاہیئے کہ ریاست سے لے کر بھنگی تک ہر جماعت زمین کی پیداوار میں شریک تھی ۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ پست اقوام اور اچھوت کون تھے ؟ ”پست اقوام“ ایک بہت مبہم سا لفظ ہے اور بہت سی اُن ذاتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے

جو سماج میں سب سے نیچی ہیں۔ "اچھوت" کی اصطلاح اس کے مقابلہ میں
فسانہ زیادہ واضح ہے، شمالی ہندوستان میں بہت تھوڑے لوگ جو بھنگی ہیں
یا دوسرے میلے کام کرتے ہیں اچھوت خیال کئے جاتے ہیں۔ فاہیان ہمیں
بتاتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ ہندوستان آیا ہے اس وقت وہ لوگ
جو میلا اٹھاتے تھے اچھوت سمجھے جاتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں
اچھوتوں کی تعداد مقابلتہً بہت زیادہ ہے، یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کس طرح
وجود میں آئے اور کس طرح ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی، غالباً وہ لوگ جو
میلے کام کرتے تھے اچھوت سمجھے جاتے ہوں گے بعد میں ایسے مزدور بھی
جو کھیتوں پر کام کرتے تھے اور جن کے پاس خود کوئی زمین نہ تھی وہ اچھوتوں
میں شامل کر لئے گئے۔

ہندوؤں میں رسمی طہارت کا خیال ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے، اس
کا ایک اثر تو اچھا ہوا اور بہت سے خراب، اچھا اثر جسمانی صفائی تھا،
روزانہ غسل کرنا ہندو کی زندگی کا لازمی جزو رہا ہے، ہندوستان ہی سے
یہ عادت انگلستان اور دوسرے ملکوں میں پہنچی، ایک اوسط ہندو، یہاں
تک کہ غریب سے غریب کسان بھی، اپنے چمکدار برتنوں پر ناز کرتا ہے۔
لیکن صفائی کا یہ احساس سائنٹفک احساس نہیں ہے، وہ شخص جو دن میں
دو دفعہ غسل کرتا ہے بے پس وپیش گندا پانی پی لیتا ہے جس میں لاکھوں
جراثیم موجود ہوتے ہیں، صفائی کا احساس جماعتی احساس بھی نہ بن سکا،
گاؤں کا رہنے والا اپنی جھونپڑی کو خوب صاف ستھرا رکھتا ہے لیکن اپنے
گھر کا سارا کوڑا کرکٹ نکال کر پڑوسی کے دروازے کے سامنے گلی میں ڈال
دیتا ہے، گاؤں عموماً گندے ہوتے ہیں جس میں جا بجا کوڑے کے ڈھیر

لگے ہوتے ہیں ۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کو گاؤں والے اس نظر سے دیکھتے ہی نہیں ، بلکہ وہ تو محض اُن موقعوں پر صفائی کا خیال رکھتے ہیں جہاں مذہب کی رو سے صفائی برتنا ضروری ہے ۔ جوں ہی ان کی یہ ضرورت ختم ہوئی طہارت کا معیار بدلا ،

رسمی طہارت کا بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوت چھات کا خیال جڑ پکڑ گیا اور ایک ذات دوسرے ذات کے ساتھ کھانے پینے سے پرہیز کرنے لگی یہ رسم اتنی بڑھی کہ اس کی مثال دنیا میں شاید ہی کہیں ہے اسی کی وجہ سے بعض طبقے اچھوت سمجھے جانے لگے ۔ یہ وہ طبقے تھے جو بدقسمتی سے اُن کاموں میں لگے تھے جو نہایت ضروری ہیں مگر میلے ہیں محض اپنی ذات کے لوگوں کے ساتھ کھانے پینے کی رسم تمام ذاتوں میں پھیل گئی ، یہ چیز سماجی حیثیت کی دلیل سمجھی جانے لگی اور نیچی ذاتیں تو بعض اونچی ذاتوں سے بھی زیادہ اس معاملہ میں شدت برتنے لگیں ، اونچی ذاتوں میں تو اب یہ رسم ٹوٹتی جاتی ہے لیکن نیچی ذاتوں میں جن میں پست اقوام بھی شامل ہیں آج بھی یہ رسم اسی طرح جاری ہے ۔ بعض نیچ ذاتوں کو بھی کبھی ذاتوں کی تقسیم سے باہر سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت کوئی جماعت ، یہاں تک کہ اچھوت بھی ، ذاتوں کے نظام سے باہر نہیں ہیں ۔ پست اقوام اور اچھوت بھی اپنی الگ ذات رکھتے ہیں ، اور ان کے یہاں بھی خود اپنی پنچایتیں ہیں جو ان کے معاملات فیصل کرتی ہیں ، مگر ان باتوں میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو گاؤں کی مشترکہ زندگی سے الگ کر دیا گیا ہے اور یہ درحقیقت ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ یہ نقصان میں رہیں ۔

خود مختار دیہاتی برادری اور ذاتوں کا نظام ”پرانے ہندوستانی سماج کی

دو نمایاں خصوصیتیں تھیں، تیسری خصوصیت مشترکہ خاندان تھا جس کی رو سے خاندان کے تمام افراد کو جائداد پر مشترکہ حق ملکیت حاصل تھا اور میراث خاندان کے تمام زندہ افراد پر تقسیم ہوتی تھی، ہندوستان میں خاندان کا نظام ویسا نہ تھا جیسا قدیم روما میں تھا، وہاں باپ خاندان کی جائداد کا مالک اور مختار ہوتا تھا، یہاں کل انتظام خاندان کے کسی ایک بزرگ کی سپرد ہوتا تھا اور اگر طرفین رضامند ہوتے تھے تو جائداد تقسیم بھی ہوسکتی تھی، جائداد کی آمدنی کا مقصد خاندان کے تمام افراد کی کفالت تھا خواہ وہ کمانے والے افراد ہوں یا بیکار۔ بجائے اس کے کہ خاندان کے محض چند افراد خاندانی ملکیت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں آمدنی کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا تھا کہ سب کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچ سکے، خاندان کے تمام افراد کے لئے یہ ایک قسم کا بیمہ تھا جس کے ذریعہ سے اُن ارکین کی آمدنی کی بھی ضمانت ہوگئی جو جسمانی یا دماغی اعتبار سے ناکارہ تھے۔ اس طرح تحفظ تو سب ارکین خاندان کا ہوگیا لیکن خاندان کے افراد پر خدمت گذاری کے جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کا معیار کچھ گھٹ گیا اور پھر اُس خدمت کا جو معاوضہ ہوتا ہے اُس کا معیار بھی کم ہوگیا۔ ذاتی نفع اور ذاتی خواہشوں کے مقابلہ میں جماعتی نفع کو زیادہ اہمیت دی گئی، ہر اُس بچہ میں جو کسی بڑے خاندان میں پیدا ہوتا اور پرورش پاتا تھا انانیت کا جذبہ کم سے کم رہ جاتا تھا اور قدرتی طور پر اُس کے ذہن کا رجحان اجتماعیت کی طرف ہوجاتا تھا۔

انہی اس خصوصیت کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب مغرب کی اور بالخصوص امریکہ کی موجودہ انفرادیت پسند تہذیب سے بالکل مختلف تھی،

مغربی تہذیب میں فرد کی خواہشات کو بالا تر خیال کیا جاتا ہے اور انفرادی ترقی کو تمام دوسرے مقاصد پر حاوی سمجھا جاتا ہے ۔ اس میں صرف وہی لوگ ترقی کر سکتے ہیں جو طباع ہیں اور جن میں آگے بڑھنے کی امنگ ہے ۔ کمزور، شرمیلے اور گھٹیا درجے کے لوگوں کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ۔ اب ہندوستان میں بھی مشترکہ خاندان کا نظام ختم ہوتا جاتا ہے اور انفرادیت پسندی کی طرف رجحان بڑھتا جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف زندگی کے اقتصادی پس منظر میں ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن کے اثرات دور تک پہنچیں گے بلکہ فرد کے رویہ سے متعلق بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں ۔

ہندوستانی سماج کی ان تینوں خصوصیات کی بنیاد جماعت پر تھی، فرد پر نہ تھی، اس سے مقصد یہ تھا کہ جماعت کے لئے تحفظ، پائیداری اور بقا کا سامان فراہم کیا جائے کیونکہ جماعت کی بقا پر سماج کی بقا کا دارومدار تھا، ترقی کو اس زمانہ میں سماج کے مقاصد میں کوئی دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے ہر جماعت میں، خواہ وہ دیہاتی برادری تھی، یا کوئی مخصوص ذات یا کوئی بڑا مشترک خاندان، ایک قسم کی مشترکہ اجتماعی زندگی پائی جاتی تھی جو مساوات اور جمہوریت کے اصولوں پر مبنی تھی، آج بھی ہر ذات کی پنچائت جمہوریت کے اصول پر کاربند ہے،

ایک دفعہ مجھے ایک ایسے دیہاتی کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا جو سیاسی اور سماجی خدمت کرنے کی غرض سے پنچوں میں منتخب ہونے کا بڑا آرزومند تھا، یہ شخص ایک زمانہ میں بالکل بے پڑھا تھا لیکن جب پنچوں میں آگیا تو کام کے لئے اس قدر مفید ثابت ہوا کہ اس کی جماعت سے متعلق جو مسائل پیش ہوتے تھے ان میں اس کے مشورے کے بغیر کام ہی نہ چلتا تھا اور دوسرے پنچ

اس کو کبھی بے جا دبا نہیں سکتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی جماعتوں میں ہمیشہ آپس میں پھوٹ رہی۔

جمہوریت کے طریقوں کو لوگ نہ صرف پورے طور پر جانتے تھے بلکہ سماجی زندگی، مقامی حکومت، تجارتی انجمنوں اور مذہبی سبھاؤں میں انہیں طریقوں پر کاربند رہتے تھے، ذاتوں کے نظام نے، باوجود اپنی تمام خامیوں کے، ہر جماعت میں جمہوریت کے اصول کو زندہ رکھا، انتخابات اور مباحثوں کے لئے مقررہ قواعد تھے۔ شروع زمانہ کی بودھ متی سبھاؤں کے اصولوں کا ذکر مارکوئس آف زیٹ لینڈ نے کسی جگہ اِن لفظوں میں کیا ہے "بعض لوگوں کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ہندوستان میں آج سے دو تین ہزار برس پہلے کی بودھ متی سبھاؤں میں ہمارے موجودہ پارلیمانی رواج کے مبادیات موجود تھے سبھا کا وقار قائم رکھنے کی غرض سے اُس میں الگ ایک افسر مقرر ہوتا تھا جسے ہمارے دار العوام (ہاؤس آف کامنز) کے "مسٹر اسپیکر" کی ابتدائی شکل سمجھنا چاہیئے۔ ایک اور افسر بھی ہوتا تھا جس کا فرض یہ تھا کہ جب ضرورت پڑے تو وہ اس بات کی جانچ کرے کہ جلسہ کا "کورُم" یعنی اراکین کی وہ تعداد جس کی موجودگی کے بغیر جلسہ کی کارروائی جائز نہیں ہو سکتی موجود بھی تھی یا نہیں۔ یہ ہمارے موجودہ دستور کے "پارلیمنٹری چیف وھپ" سے ملتا جلتا تھا۔ جو رکن جلسہ میں کسی خاص قسم کی کارروائی شروع کرانا چاہتا تھا وہ اس کے لئے جلسہ کے سامنے "تجویز" پیش کرتا تھا جس پر باقاعدہ بحث ہوتی تھی، بعض حالتوں میں تو بحث ایک ہی دفعہ میں ختم ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ بحث تین نشستوں میں ختم ہوتی تھی، اس طرح ہماری پارلیمنٹ کے اُس دستور کا آغاز ہوا جس کی رو سے "بِل" قانون بننے سے پہلے تین مرتبہ اجلاس کے سامنے آتا ہے

بحث سے اگر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ کے متعلق اختلاف رائے ہے تو فیصلہ کے لئے رائے شماری کی جاتی تھی اور اکثریت کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ رائے باقاعدہ پرچی کے ذریعہ ڈالی جاتی تھی[۵۷]

ہندوستان کے پرانے اجتماعی نظام میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور تھی جب تو وہ اتنے عرصہ زندہ رہ سکا۔ اس کی بنیاد محض "تحصیل" پر نہ تھی بلکہ ہندوستانی تمدن کے اُس فلسفیانہ اعلیٰ معیار پر تھی جس کا مقصد انسانی تکمیل تھا اور جو نیکی، حُسن اور صداقت پر زور دیتا تھا، ہندوستان میں اِس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ عزت، طاقت اور دولت ایک جگہ جمع نہ ہوں، فرد اور جماعت کے حقوق پر زور نہیں دیا گیا بلکہ فرائض پر دیا گیا۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں "سمرتیوں" میں مختلف ذاتوں کے دھرم عمل اور فرائض کی فہرستیں دی ہوئی ہیں لیکن ان میں حقوق کا کہیں ذکر نہیں، جماعت کا یا دوسرے لفظوں میں سماج کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکے۔ ہندوستان کا یہ سارا نظام محدود تھا، اگرچہ اِس میں تھوڑی سی مطابقت پذیری، تبدیلی اور آزادی کی بھی گنجائش تھی، لیکن کٹر پن اور علیحدگی کی خواہش اس میں حد سے زیادہ بڑھتی جاتی تھی، ترقی پسند نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بڑھنے اور پھیلنے کی طاقت نہ رہی اور عام انسانوں میں نئی صلاحتیں اُبھار سکا۔ لوگوں کے مخصوص ذاتی اغراض نے اس میں کوئی بڑی تبدیلی بھی نہ ہونے دی، سب طبقوں میں تعلیم پھیلانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ پُرانے توہمات کو باقی رکھا گیا بلکہ اُن میں اور نئے شامل کر دیئے گئے حالانکہ

۵۷۔ "لیگیسی آف انڈیا" مصنفہ پروفیسر رالنسن صفحہ ۱۱ مطبوعہ ۱۹۳۷ء

اِن کے بے حقیقت ہونے کا احساس اونچے طبقوں کے بہت سے لوگوں کو تھا۔ اجتماعی تنظیم اور قومی فکر دونوں پر جمود کی سی حالت طاری ہوگئی سماج میں محض روایت پرستی اور کٹرپن باقی رہ گئے، نہ بڑھنے کی صلاحیت رہی نہ ترقی کرنے کی۔

ذاتوں کے تصور میں طبقۂ اُمراء کا مطمحِ نظر شامل ہوگیا جو جمہوریت کے تصور کے بالکل خلاف ہے، امیروں میں یہ احساس تو تھا کہ عالی خاندانی اور شرافت کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں ہیں لیکن وہ اِن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے صرف اُسی حالت میں تیار رہتے تھے کہ عوام اپنی اس حالت پر قائم رہیں جو اُنھیں ورثہ میں ملی تھی اور مروجہ نظام کی مخالفت نہ کریں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان کی کامیابی اور اُس کے کارنامے اعلیٰ طبقوں میں محدود ہوکر رہ گئے، ادنیٰ طبقوں کے لئے اس کے مواقع بہت ہی کم رہ گئے، یہ اعلیٰ طبقے کوئی کوئی چھوٹی جماعتیں نہ تھیں بلکہ اِن کی تعداد بہت بڑی تھی اور ساتھ ہی طاقت، اختیار اور اثر بھی اِنہیں کے ہاتھ میں تھا، چنانچہ کافی عرصہ تک وہ نظام کو کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے لیکن اخیر میں یہ نظام ناکام رہا اور ہندوستان کی اجتماعی ہیئت بھی کمزور ہوگئی۔ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اعلیٰ طبقوں نے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو نہایت پست حالت میں ڈال رکھا تھا اور انہیں کبھی اِس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنی تعلیمی، تہذیبی اور اقتصادی پستی سے باہر آئیں۔ اُن کی اس پستی کی وجہ سے سماج پر ایسا زوال آیا جس کے اثر سے اونچے طبقے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اور اسی پستی کے باعث ہندوستانی ہیئت اجتماعی اور زندگی جامد ہوکر رہ گئی ماضی اور

حال کی اجتماعی حالتوں میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے لیکن پچھلی چند نسلوں کے وقت سے ساری دنیا میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اُنھوں نے ہماری موجودہ ہیئت اجتماعی کی کمزوریوں کو بھی بہت نمایاں کر دیا ہے، آج سماج کا جو تصور ہے اُس کے پیش نظر ذاتوں کا یہ سارا نظام تمام تر بے آہنگ، رجعت پسند، تنگ نظر اور ترقی کے راستہ میں روڑے اٹکانے والا نظام ہے۔ اِس میں نہ مساوات قائم کی جا سکتی ہے نہ سیاسی جمہوریت، اور اقتصادی جمہوریت کے لئے تو مواقع اس سے بھی کم ہیں۔ اِس وقت ان ہی دو تصورات میں آویزش ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

۹۔ بابر اور اکبر

ہندوستانی بننے کا عمل

آئیے اب واپس چلیں۔ افغان ہندوستان میں بس گئے تھے اور ہندوستانی بن چکے تھے۔ افغان حکمرانوں کے سامنے ابتدا ہی سے یہ مسئلہ تھا کہ کسی طرح رعایا کے دلوں سے عداوت کم کریں اور پھر انہیں اپنی طرف مائل کر دیں۔ چنانچہ اُن کی طرف سے اب ویسی سختیاں بالکل نہیں کی جاتی تھیں جیسی شروع زمانہ میں کی گئی تھیں اُن کی یہ پالیسی تھی کہ رعایا کے ساتھ رواداری برتی جائے، رعایا کو اپنے ساتھ اشتراک عمل کی دعوت دی جائے اور اس طور پر حکومت کا کام چلانے کی کوشش کی جائے کہ رعایا یہ محسوس کرے کہ حکمراں طبقہ کے لوگ کوئی بیرونی عنصر

نہیں ہیں بلکہ اسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں پرورش پائی ہے۔
ابتدا میں تو یہ چیز پالیسی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل ذہنی
کیفیت بن گئی، شمال مغرب کے یہ لوگ جوں جوں ہندوستان کے ماحول
سے متاثر ہوتے گئے ہندوستانی تہذیب انہیں اپنے میں جذب کرتی
گئی، ادھر تو حکمراں طبقہ میں یہ عمل کارفرما تھا اُدھر عوام میں خیالات اور
طرزِ زندگی کے امتزاج کی رو نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی اس
طرح ایک متحدہ تہذیب کا آغاز ہونے لگا اور وہ بنیاد تیار ہوگئی جس پر اکبر
نے عمارت تعمیر کی۔

اکبر ہندوستان میں مغل خاندان کا تیسرا بادشاہ تھا لیکن اصل میں
مغل سلطنت کو مستحکم اسی نے کیا۔ اُس کے دادا بابر نے دہلی کو ۱۵۲۶ء
میں فتح کیا تھا لیکن وہ ہندوستان میں ایک اجنبی تھا اور اپنے آپ کو اجنبی
ہی سمجھتا رہا۔ وہ شمال سے آیا تھا جہاں تیموری نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور ایرانی
آرٹ اور تمدن ترقی پر تھے، دوستوں کی بے تکلف صحبتیں، گفتگو کا لطف
اور زندگی کی وہ لطافتیں اور نزاکتیں جو بغداد اور ایران سے پھیلیں اور جن کا
بابر عادی تھا اُسے ہندوستان میں میسر نہ آئیں، شمالی پہاڑی علاقوں
کی برف اور فرغانہ کے عمدہ گوشت، پھلوں اور پھولوں کی یاد اُسے بے چین
کرتی تھی، ہندوستان میں اُس نے جو کچھ دیکھا اُس سے اُسے مایوسی
ہوئی پھر بھی ہندوستان کے متعلق اُس نے کہا کہ یہ ملک بھی "بہت
خوب ملک ہے" بابر ہندوستان آنے کے چار سال بعد انتقال کر گیا
اور اس کا زیادہ وقت یا تو لڑائی جھگڑے میں صرف ہوا یا آگرہ میں ایک
عالیشان پایہ تخت کی عمارتیں بنانے میں گزرا۔ ان عمارتوں کے لئے اُس نے

قسطنطنیہ سے فن عمارت کے ایک ماہر کو بلایا تھا۔ قسطنطنیہ میں یہ زمانہ سلیمان اعظم کا زمانہ تھا جس میں وہاں بڑی بڑی عمدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

بابر ہندوستان کو زیادہ دیکھ نہ سکا، وہ ایسی رعایا کے نرغے میں تھا جو دل میں اس سے دشمنی رکھتی تھی، اس وجہ سے اُسے موقع بھی نہ ملا کہ وہ ہندوستانیوں کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، اس کے باوجود ہمیں اُس کی لکھی ہوئی تاریخ سے اُس تہذیبی افلاس کا پتہ چلتا ہے جو شمالی ہند پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو وہ بربادی تھی جو تیمور کے حملہ کے باعث ظہور میں آئی اور کچھ یہ بات تھی کہ بہت سے عالم، آرٹسٹ اور صناع شمالی ہند چھوڑ کر جنوب کی طرف چلے گئے تھے، اس تنزل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں کی تخلیقی قوتوں کے سوت خشک ہو گئے تھے،

بابر کہتا ہے کہ اس ملک میں ہوشیار کاریگروں اور صناعوں کی کمی نہیں ہے لیکن یہاں کے مکانیکی اختراعات میں ذہانت اور ہوشیاری بالکل نہیں' یہ چیز بھی واضح ہے کہ زندگی کے تعیش اور نزاکتوں میں ہندوستان ایران سے بہت پیچھے تھا۔ معلوم نہیں اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوستانی ذہن کو بالطبع زندگی کے اس پہلو سے دلچسپی نہ تھی یا زمانے کے حالات۔ غالباً ایرانیوں کے مقابلہ میں اُس زمانہ کے ہندوستانیوں کو اس قسم کے تکلفات اور ان نفاستوں کی طرف زیادہ رغبت نہ تھی ورنہ معمولی سی توجہ سے یہ تمام چیزیں ایران سے حاصل کی جا سکتی تھیں کیونکہ ان دونوں ملکوں کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ تبدیلی عہد متاخر میں پیدا ہوئی ہے اور یہ ہندوستان کے تہذیبی جمود اور زوال کا نشان ہے۔ شروع زمانہ کے کلاسیکی ادب اور مصوری سے پتہ چلتا ہے کہ

اُس زمانہ میں ہندوستان میں کافی نفاست موجود تھی اور اُس زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی زندگی کا معیار بہت اونچا تھا۔ اُس وقت بھی جب کہ بابر ہندوستان آیا ہے جنوب میں وجے نگر کی سلطنت کی بابت بہت سے یورپی سیاحوں نے یہ بتایا ہے کہ وہاں آرٹ اور تہذیب، شائستگی اور نفاست کا بہت اونچا معیار پایا جاتا تھا۔ لیکن شمالی ہند کا تہذیبی زوال بالکل واضح چیز ہے۔ مقررہ عقائد اور کٹر قسم کی اجتماعی ہیئت نے سماجی کوششوں اور ترقیوں کو روک دیا۔ ہندوستان میں اسلام کی اور اُن مختلف قوموں کی آمد نے جو اپنے ساتھ نئے نئے خیالات اور زندگی کے مختلف طرز لے کر آئیں یہاں کے عقائد اور یہاں کی ہیئت اجتماعی کو متاثر کیا۔ بیرونی فتح خواہ کچھ بھی بُرائیاں لے کر آئے اِس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ عوام کے ذہنی اُفق میں وسعت پیدا کر دیتی ہے اور اُنھیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی حصار سے باہر نکلیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دُنیا اُس سے کہیں زیادہ بڑی اور بوقلموں جگہ ہے جیسی کہ وہ سمجھ رہے تھے۔ بالکل اسی طور پر افغان فتح نے ہندوستان پر اثر ڈالا اور بہت سی تبدیلیاں وجود میں آگئیں۔ اس سے بھی زیادہ تبدیلیاں اُس وقت ظہور میں آئیں جب مغل ہندوستان میں آئے کیونکہ یہ لوگ افغانوں سے بھی زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ اُس نفاست کو رائج کیا جو ایران کا حصہ تھی، یہاں تک کہ دربار کی زندگی کو اُنھوں نے اعلیٰ درجے تکلفات کی قیود میں جکڑ بند کر دیا اور اس کا اثر امرار کے طرزِ زندگی پر بہت پڑا۔ جنوب میں بہمنی سلطنت تو کالی کٹ کے راستہ سے ایران کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتی تھی۔

ہندوستان میں بہت سی تبدیلیاں ظہور میں آئیں، نئے جذبات نے آرٹ، فن تعمیر اور دوسرے تہذیبی مشاغل کو تازگی اور زندگی تو بخشی۔ لیکن یہ سب تبدیلی جن دو تہذیبوں کے میل کا نتیجہ تھیں وہ دونوں پرانی ہو چکی تھیں اور اپنی تخلیقی اور تعمیری قوتیں کھو کر جمود کی منزل سے گذر رہی تھیں۔ ہندوستانی تہذیب تو بہت پرانی تھی اور اب تھک چکی تھی۔ عرب ایرانی تہذیب بھی اپنا عروج کا زمانہ ختم کر چکی تھی، اس میں اب وہ پرانا تحقیق کا شوق اور ذہنی تجسس کا ولولہ باقی ہی نہ تھا جس نے عربوں کو دنیا میں ممتاز کیا تھا۔

بابر کی شخصیت اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے، وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس کے اندر صحیح معنی میں نشاۃ ثانیہ کے دور کی روح موجود تھی، وہ بہادر تھا، باہمت تھا اور علوم و فنون اور نفاست آمیز زندگی کا شائق تھا۔ اس کے پوتے اکبر میں اس سے بھی زیادہ خوبیاں تھیں اور اس وجہ سے اس کی شخصیت اپنے اندر اور بھی زیادہ جاذبیت رکھتی ہے، وہ باہمت تھا اور نڈر۔ وہ ایک قابل سپہ سالار تھا مگر نرم مزاج اور رحمدل، وہ محض اونچے مقاصد مقرر کرنے والا اور بلند منصوبے بنانے والا انسان نہ تھا بلکہ عملی آدمی تھا اور انسانوں کا ایسا لیڈر تھا جس نے اپنے پیروؤں کے اندر وفاداری کا گہرا جذبہ پیدا کر دیا۔ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اس نے ہندوستان کا ایک بڑا حصہ فتح کیا لیکن اس کی آنکھیں ہمیشہ ایک ایسی فتح کی طرف لگی رہیں جو اس سے کہیں زیادہ پائدار فتح تھی اور وہ انسانوں کے دلوں اور دماغوں کی فتح تھی۔ اس کی پرتاثیر نگاہیں بقول اکبری دربار کے ایک پرتگالی یسوعی کے اس طرح "متحرک رہتی تھیں جیسے سمندر دھوپ میں لہراتا ہے۔"

متحدہ ہندوستان کا پرانا خواب اکبر کے عہد میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔
ہندوستان محض سیاسی طور پر ایک متحدہ ریاست ہی نہیں بلکہ تہذیب کے لحاظ سے بھی ایک متحدہ قوم بن گیا۔ اپنے پورے دور حکومت میں جو ۱۵۲۶ء سے تقریباً پچاس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے اکبر کے پیش نظر یہی ایک مقصد تھا۔ بہت سے وہ راجپوت سردار جو کسی کے سامنے اطاعت کا سر نہ جھکاتے تھے اکبر کے طرفدار بن گئے۔ اکبر نے ایک راجپوت شہزادی سے شادی بھی کی چنانچہ اُس کا بیٹا اور جانشین جہانگیر آدھا مغل تھا اور آدھا راجپوت۔ جہانگیر کا بیٹا شاہ جہاں بھی راجپوت ماں کے بطن سے تھا، اِس طرح اس ترک منگولی خاندان میں ترکی اور منگولی خصوصیات سے زیادہ ہندوستانی خصوصیات پیدا ہو گئیں، اکبر راجپوتوں کا قدردان تھا اور اُن کے ساتھ قلبی تعلق رکھتا تھا، اُس نے راجپوت راجاؤں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے قائم کئے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے طریقوں سے بھی اس نے راجپوتوں کو اپنا دوست بنا لیا جس سے مغلیہ سلطنت کو بڑی تقویت پہنچی۔ مغلوں اور راجپوتوں کے اس اتحاد نے جو بعد کے عہد حکومتوں میں بھی جاری رہا نہ صرف حکومت، انتظام سلطنت اور فوج پر اثر ڈالا بلکہ آرٹ، تہذیب اور طرزِ معاشرت بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مُغل امرا تبدریج ہندوستانی بننے لگے اور اسی طرح راجپوت اور دوسرے ہندو ایرانی تمدن سے متاثر ہوتے گئے۔

اکبر نے بہت سے لوگوں کو اپنا بنا لیا اور اُن کو قابو میں بھی رکھ سکا لیکن میواڑ کے بہادر اور مغرور رانا پرتاپ کو وہ زیر نہ کر سکا، اِس شخص نے یہ پسند کر لیا کہ بن اور جنگل میں اس کا تعاقب کیا جائے لیکن اُسے

یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک اُس شخص کے آگے جسے وہ بیرونی حملہ آور سمجھا تھا
اطاعت کا سر جھکائے ۔

اکبر نے ایک خاصی بڑی جماعت ایسے لوگوں کی پیدا کرلی جنھیں
اُس کے ساتھ اور اُس کے مقاصد کے ساتھ دلی لگاؤ تھا ۔ ان میں وہ
دو مشہور بھائی تھے جو فیضی اور ابوالفضل کہلاتے ہیں ، بیربل تھے ، راجہ
مان سنگھ تھے اور عبدالرحیم خاں خاناں تھے ، اکبر کا دربار تمام مذاہب کے
پیروؤں کا اور اُن سب لوگوں کا جو ذرا بھی نئے خیالات یا جدت پسند
طبیعتیں رکھتے تھے مرکز بن گیا ۔ دوسروں کے خیالات کے ساتھ رواداری
اور ہر قسم کے عقائد کی ہمت افزائی میں اکبر اس قدر آگے بڑھ گیا کہ بعض وہ
لوگ جو بہت کٹر قسم کے مسلمان تھے اُس سے ناراض ہو گئے ۔ یہاں
تک کہ اُس نے ایک ایسا مذہب جاری کردیا جو تمام مذاہب کے عقائد
پر مشتمل تھا ، اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ یہ سب کی طبیعتوں سے میل
کھا سکے ۔ اُس کے زمانہ میں شمالی ہند میں ہندو مسلمانوں کے تہذیبی امتزاج
نے بہت ترقی کی ، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اکبر ہندوؤں
میں بھی اتنا ہی مقبول تھا جتنا مسلمانوں میں ۔ اس کی وجہ سے مغل خاندان ہندوستان
میں اس طرح جڑ پکڑ گیا گویا کہ یہیں کا خاندان تھا ۔

۱۰۔ میکانیکی ترقی اور تخلیقی قوتوں میں یورپ اور ایشیا کا فرق

اکبر کو تحقیق کا بڑا شوق تھا ، وہ ہمیشہ روحانی اور دنیاوی مسائل کی
تحقیق میں لگا رہتا تھا ۔ اُسے میکانیکی اختراعات اور جنگ کے فن سے
بھی بڑی دلچسپی تھی ۔ جنگی ہاتھیوں کا وہ بڑا شائق تھا ، چنانچہ ہاتھی اس کی

فوج کا ایک اہم جزو تھے، اُس کے دربار کا پرتگالی یسوعی ہمیں بتاتا ہے کہ "اُسے بہت سی چیزوں سے دلچسپی تھی اور اُن کا علم حاصل کرنے کا خواہشمند رہتا تھا، وہ نہ صرف سیاسی اور فوجی معاملات کو بخوبی جانتا تھا بلکہ بہت سے میکانیکی فنون سے بھی واقف تھا۔" علم کے اس شوق میں وہ ہر چیز کو فوراً جان لینے کی اس طرح کوشش کرتا تھا جس طرح ایک بھوکا آدمی چاہتا ہے کہ تمام کھانے کو ایک ہی لقمہ بنا کر حلق سے نیچے اتار لے" اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مقام پر آکر اُس کی جستجو بھی ٹھہر جاتی ہے اور بہت سے اُن راستوں پر اُس کی رہنمائی نہیں کرتی جو بظاہر اس کے لئے کھلے ہوئے تھے، مغل اعظم ہونے کی حیثیت سے اُسے بڑا اثر حاصل تھا، اس کی بری قوت بھی بہت زبردست تھی لیکن سمندر پر اُسے کچھ بھی طاقت حاصل نہ تھی، واسکوڈی گاما کیپ کے راستہ سے ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ پہنچا، البوقرق نے ۱۵۱۱ء میں ملکا پر قبضہ کر کے بحر ہند میں پرتگالیوں کی بحری طاقت قائم کی، ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوا پرتگالیوں کے قبضہ میں آیا، ان سب باتوں کے باوجود پرتگالیوں کا اکبر کے ساتھ تصادم نہیں ہوا۔ اُن حاجیوں کو جو ہندوستان سے مکہ جاتے تھے اور جن میں بعض اوقات شاہی خاندان کے لوگ اور اُمراء بھی ہوتے تھے، پرتگالی اکثر راستہ میں روک لیتے تھے، غرض یہ بات بالکل واضح ہے کہ خشکی پر اکبر کی طاقت ہی کیوں نہ رہی ہو سمندر کے مالک پرتگالی ہی تھے، اس بات کو سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ بری قوت رکھنے والے شہنشاہ سمندری طاقت کو اہمیت کیوں نہیں دیتے تھے حالانکہ ماضی کی تاریخ میں ہندوستان کو جو عظمت حاصل ہوئی تھی وہ بحری راستوں ہی پر قبضہ اور

اقتدار کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی ۔ اکبر کو بہت بڑا خشکی کا علاقہ فتح کرنا تھا ، اُس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ پُرتگالیوں سے سمندر میں نبٹے ۔ اسی وجہ سے وہ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا حالانکہ اُن کی طرف سے برابر نیش زنی ہوتی رہتی تھی ۔ اکبر نے ایک دفعہ جہاز تیار کرانے کا خیال تو کیا تھا لیکن یہ محض تفریح کے لئے تھا ، اس کا مقصد بحری طاقت بڑھانا نہ تھا ۔

ایک بات اور بھی ہے ، توپ خانے کے معاملہ میں اُن دنوں مغل فوجوں کا اور دوسری ہندوستانی ریاستوں کا دار و مدار زیادہ تر بیرونی ماہرِ فن کی خدمات پر تھا ۔ توپچی عموماً عثمانی سلطنت کے ترک ہوتے تھے ۔ توپ خانہ کے افسرِ اعلیٰ کو " رومی خاں " کے لقب سے پکارا جاتا تھا ۔ رُوم سے مراد تھی مشرقی روما یعنی قسطنطنیہ ۔ یہ بیرونی ماہر مقامی آدمیوں کو کام سکھاتے تھے ، لیکن اکبر نے یا کسی دوسرے نے اپنے آدمیوں کو ملک سے باہر کام سیکھنے کے لئے کیوں نہ بھیجا یا پھر ریسرچ یعنی تحقیق کے کام کی ہمت افزائی کرکے اس فن کو خود اپنے یہاں ترقی کیوں نہ دی ؟

ایک اور اس سے بھی زیادہ اہم بات ہے ۔ یسوعیوں نے اکبر کو ایک چھپی ہوئی انجیل اور شاید دو ایک چھپی ہوئی کتابیں اور بھی پیش کیں ، پھر اُسے چھاپے کی جستجو کیوں نہ ہوئی حالانکہ چھاپہ کی کل اگر ایجاد ہو جاتی تو حکومت کے کاروبار میں اور بادشاہ کے اپنے اونچے منصوبوں میں بڑی مدد ملتی ۔

اسی طرح گھڑیوں کو لو ۔ مغل اُمرا بہ کثرت گھڑیاں استعمال کرتے تھے ، پرتگالی اور بعد میں انگریز ہندوستان میں گھڑیاں لاتے تھے ۔ گھڑیوں کا استعمال اُمرا کے تکلفات میں شامل تھا ، عام آدمی یا دھوپ کی گھڑی سے کام چلاتے تھے یا ریت کی گھڑی اور پانی کی گھڑی سے ، ہندوستان میں

نہ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کمانی کی گھڑیاں کیسے بنتی ہیں نہ ایسی گھڑیاں کبھی یہاں بنیں۔ ہندوستان میں ہمیں میکانیکی رجحان کی یہ کمی نمایاں طور پر نظر آتی ہے حالانکہ اُس زمانہ میں یہاں بہت عمدہ قسم کے کاریگر اور صناع موجود تھے۔

تخلیقی قوت اور اختراعی مادّہ کی یہ کمی اُس زمانہ میں تنہا ہندوستان ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی پورے مغربی اور وسطی ایشیا کا بھی حال تھا بلکہ وہاں تو حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ مجھے چین کی بابت ٹھیک طور پر معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں بھی جمود کا یہی حال تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان اور چین دونوں نے شروع زمانہ میں سائنس کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی کی تھی، جہاز بنانے کی صنعت اور وسیع بحری تجارت کی وجہ سے میکانیکی ترقی کی طرف بھی لوگوں کا رجحان ہمیشہ بڑھتا رہا۔ البتہ کوئی بڑی میکانیکی ترقی اس زمانہ میں نہ ان ملکوں میں وجود میں آئی نہ دوسرے ملکوں میں۔ اس لحاظ سے پندرھویں صدی کی دنیا ایک ہزار یا دو ہزار برس بعد کی دنیا سے بالکل مختلف تھی۔

عرب جنھوں نے عملی سائنس کو اُس کے ابتدائی زمانہ میں کافی ترقی دی اور جنھوں نے عہد وسطیٰ کی تاریکی میں یورپ میں بہت سے طریقوں سے علم کی روشنی پھیلائی اب بالکل غیر معروف اور پست قوم ہو چکے تھے، کہا جاتا ہے شروع زمانہ کی بعض گھڑیاں سترھویں صدی میں عربوں ہی کی ایجاد تھیں۔ دمشق میں ایک بڑی مشہور گھڑی تھی، اسی طرح ہارون رشید کے زمانہ میں بغداد میں بھی ایک بہت مشہور گھڑی تھی۔ لیکن عربوں کے زوال کے ساتھ گھڑیاں بنانے کا فن بھی ان ملکوں سے رخصت ہوا، حالانکہ یورپ کے بعض ملکوں میں یہ فن

کافی ترقی کر رہا تھا اور وہاں گھڑی کوئی نادر چیز نہیں سمجھی جاتی تھی۔

گٹنبرگ سے بہت پہلے اسپین کے مور عرب لکڑی کا چھاپہ استعمال کرتے تھے[۵۱] حکومت کے دفاتر ی احکام چھاپنے کے لئے یہ کل استعمال کی جاتی تھی، لیکن چھپائی کا کام بلاک کی منزل سے آگے نہ بڑھا اور لبعد میں وہ بھی ختم ہوگیا، عثمانی ترک کافی عرصہ تک یورپ اور مغربی ایشیا میں برسر اقتدار مسلم طاقت رہے لیکن اُنھوں نے بھی صدیوں تک چھپائی کی صنعت کی طرف کوئی توجہ نہ کی، حالانکہ اُس زمانہ میں یورپ میں ترکوں کے پڑوسی ملکوں میں چھپی ہوئی کتابیں بکثرت شائع ہورہی تھیں۔ اس کا علم ترکوں کو بھی ضرور ہوگا، لیکن اس علم سے خود ان کے اندر یہ تحریک کبھی پیدا نہ ہوئی کہ اس بڑی ایجاد سے خود بھی فائدہ اُٹھائیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک قرآن کو چھاپنا خدا کی کتاب کی بے حرمتی کرنا تھا کیونکہ ممکن تھا کہ چھپے ہوئے ورق کسی دوسرے استعمال میں آتے، یا پیروں میں آجائے یا کوڑے میں پھینک دئے جاتے۔ پہلا شخص جس نے مصر میں چھاپہ کو رواج دیا نپولین تھا وہاں سے یہ فن رفتہ رفتہ دوسرے عرب ممالک میں پہنچا۔ ایشیا تو ماضی کی درخشندہ کوششوں کے بعد اب خواب کی حالت میں تھا، لیکن یورپ میں حالات اب بدل رہے تھے۔ گو اب تک وہ بہت سی باتوں میں ایشیا سے پیچھے رہا تھا

۵۱۔ مجھے علم نہیں کہ چھپائی کا یہ طریقہ اسپین میں عربوں کو کیسے معلوم ہوا۔ غالباً مغربی اور شمالی یورپ میں پہنچنے سے بہت قبل منگولوں کے ذریعہ یہ فن چین سے اسپین پہنچا۔ منگولوں کے منظر پر آنے سے بھی بہت پہلے عرب دنیا، قرطبہ سے قاہرہ، دمشق اور بغداد تک، چین کے ساتھ بہت کافی ربط ضبط رکھتی تھی۔

لیکن اب وہاں کے لوگوں میں ایک نئی روح پیدا ہو رہی تھی اور ایک نیا جوش اُبھر رہا تھا، اُس کے بہم جو سمندروں کو چھانتے پھرتے تھے، اُس کے مفکروں کا فکر نئے نئے راستے اختیار کر رہا تھا، لیکن نشاۃ ثانیہ نے سائنس کی ترقی کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ اُس نے تو کسی حد تک لوگوں کو سائنس سے دور کر دیا۔
ہیومانسٹ تعلیم نے جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہوئی مروجہ سائنفک خیالات کی ترقی کو بھی روک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک انگریزوں میں اکثریت ایسی تھی جو اس بات کو ماننے سے قطعی انکار کرتے تھے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے حالانکہ کوپرنیکس، گیلیلو اور نیوٹن کی تحقیقات دنیا کے سامنے آ چکی تھی اور ایک عمدہ قسم کی دوربین بھی ایجاد ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی ذہنی تربیت چونکہ یونان اور روما کی ادبیات کے زیر اثر ہوتی تھی اس لئے بطلیموس کے اُس نظام شمسی سے جس کا مرکز زمین تھی وہ ہٹ نہیں سکتے تھے۔ انیسویں صدی کے مشہور مدبر مسٹر ڈبلیو ای گلیڈ اسٹون باوجود اپنے علمی تبحر کے نہ سائنس کو سمجھتے تھے نہ اس کے ساتھ انھیں کوئی رغبت تھی، آج بھی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں بھی غالباً بہت سے مُدبر اور پبلک لیڈر سائنس اور سائنٹفک طریقوں سے ناواقف ہیں، حالانکہ وہ ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں سائنس کا عمل جاری ہے اور خود بھی وہ انسانوں کی خونریزی اور بربادی کے لئے سائنس کو کام میں لا رہے ہیں۔
بہرحال نشاۃ ثانیہ نے یورپ کے دماغ کو بہت سی اُن زنجیروں سے آزاد کر دیا جن میں وہ اب تک جکڑا ہوا تھا اور بہت سے اُن ذہنی بتوں کو توڑ دیا جن کی اب تک پوجا ہوتی رہی تھی، نشاۃ ثانیہ کو بالواسطہ اس میں دخل ہو یا نہ ہو یورپ میں بہرحال خارجی تحقیقات کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ جذبہ تمام اُن باتوں کا

جو قدیم سے سند مانی جاتی تھیں اور جن کی بنیاد محض خیال اور قیاس پر تھی شدید مخالف تھا۔ فرانسس بیکن نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ "انسان کے فکر و عمل کی راہیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور دونوں تقریباً یکساں ہیں۔ پھر بھی ہم محض خیالی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ عادت بہت پرانی ہو چکی اور بڑی تباہ کن ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہمیں چاہیئے کہ اپنے علوم کی عمارت ایسی بنیادوں پر قائم کریں جن کا تعلق عمل کے ساتھ ہو اور ہمارے علوم کا عملی حصّہ ایسا ہو جیسے مُہر ہوتی ہے کہ اس سے جو نقش کاغذ پر چھپتا ہے وہی نقش خیال کی شکل میں چھاپنے والے کے ذہن میں بھی محفوظ ہوتا ہے۔" اس کے بعد سترھویں صدی میں سر طامس براؤن نے لکھا "ہم نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ جو چیزیں قدیم سے چلی آتی ہیں اُن کو سند سمجھیں یہ چیز علم کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی ہے اور اس نے حقیقت کا ہمیشہ گلا گھونٹا۔ اس کی مضرت اس وقت اور بھی زیادہ ہو گئی جب ہم نے اپنے عقائد کی بنیاد قدامت پرستی پر رکھی۔ جو ذرا بھی سوچنے کا عادی ہے وہ یہ حقیقت پا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اندھا دھند ماضی کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس اندھی تقلید کے خلاف خواہ عقلی دلائل کتنے ہی کیوں نہ ہوں وہ انہیں ماننے کو تیار نہیں۔ جو لوگ ہمارے زمانہ سے بہت دور ہیں اُن کی تصانیف پر خود اُن کے زمانہ کے لوگوں نے بھی تنقید کی اور اُن کے فوراً بعد جو لوگ ہوئے وہ بھی اُن پر تنقید کرتے رہے لیکن ہمارے وقت میں اب وہ تنقید سے بالاتر سمجھی جانے لگی ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ جو چیز موجودہ زمانہ سے جتنی زیادہ دور ہے حقیقت سے اُتنی ہی زیادہ قریب سمجھی جاتی ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور حقیقت کے راستے سے بہت دور جا پڑے ہیں"

اکبر کا عہد سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے جیسا کہ یورپ والے فطرت کی طاقتوں کو مسخر کرنے میں مصروف تھے اور فطرت کی اس تسخیر کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک انقلاب انگیز ترقی رونما ہو رہی تھی، اپنی نئی تحقیقات کی وجہ سے یورپ آگے بڑھنے لگا، ابتدا میں قدم آہستہ آہستہ بڑھا لیکن رفتار برابر تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ انیسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گئی اور یورپ والوں نے ایک نئی دنیا پیدا کر دی، اس وقت جبکہ یورپ قدرت کی طاقتوں سے اس طرح فائدہ اُٹھا رہا تھا اور نئی نئی طاقتیں معلوم کرتا جا رہا تھا ایشیا جمود اور سکوت کی حالت میں تھا۔ یہاں اب بھی وہی قدیم رسمی طریقہ جاری تھا جس میں بس انسان کی جسمانی محنت اور مشقت پر ہر چیز کا دارومدار تھا۔

ایسا کیوں تھا؟ ایشیا کی وسعت پر نظر کرتے ہوئے اس سوال کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا، اس کے ہر ملک پر اور خصوصاً ایسے بڑے ملکوں پر جیسے چین اور ہندوستان ہیں، ہمیں الگ الگ نظر ڈالنی چاہیئے، چین یقیناً اس زمانہ میں بھی بہت تہذیب یافتہ تھا اور بعد میں بھی رہا، یورپ کا کوئی ملک بھی ایسا نہ تھا جو اس وقت چین سے زیادہ مہذب ہو، ہندوستان بھی اپنی آب و تاب دکھا رہا تھا، صرف یہی نہیں کہ یہاں ایک پُر شوکت دربار تھا بلکہ یہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت بھی ترقی پر تھیں، ایک ہندوستانی سیّاح کو بہت سی باتوں میں یورپ کے ملک ہندوستان کے مقابلہ میں پست اور نامہذب معلوم ہوتے، اس کے باوجود یورپ میں ایک ایسی خوبی

تھی جو ہندوستان میں نہ تھی ، اور وہ یورپ کی فطرت کو مسخر کرنے کی کوشش تھی جو یورپ میں ہر جگہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

کسی تہذیب کے زوال کا اصلی سبب خود اس کی اندرونی کمزوریاں ہوتی ہیں ، بیرونی حملے نہیں ہوتے۔ اُس کی ایک کمزوری یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کوششوں کے سلسلہ میں وہ اپنا سارا سرمایہ ختم کرچکی ہو اور بدلتی ہوئی دنیا میں پیش کرنے کے لئے اُس کے پاس کوئی نئی چیز باقی نہ ہو، یا وہ لوگ جو اس تہذیب کے حامل ہوں اپنی خوبیاں کھوچکے ہوں اور اپنے اندر اُس تہذیب کا بوجھ اُٹھانے کی صلاحیت ہی نہ رکھتے ہوں ۔ یا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کی سماجی تہذیب اس قسم کی ہو کہ ایک خاص مقام تک تو وہ ترقی میں مدد دے اور اُس کے بعد رکاوٹ پیدا کرتی ہو اور جب تک اس رکاوٹ کو دور نہ کردیا جائے یا خود اس تہذیب کی نوعیت میں کچھ ضروری تبدیلی نہ کی جائے ترقی ناممکن ہو۔ ہندوستان کا زوال تو ترکوں اور افغانوں کے حملوں سے پہلے ہی شروع ہوچکا تھا ، کیا ان حملہ آوروں کی آمد اور اُن نئے خیالات نے جو ان کے ساتھ آئے اور پرانے ہندوستان سے بغلگیر ہوئے کوئی نئی اجتماعی ہیئت پیدا کی اور قوم کے ذہن کو آزاد کرکے اس کے قوائے عملی کو تحریک دی ؟ کسی حد تک تو یہ ہوا ، آرٹ ، فن تعمیر ، مصوری ، موسیقی اور طرز معاشرت میں تبدیلی واقع ہوئی لیکن یہ تبدیلیاں سماج کی گہرائیوں تک نہ پہنچیں ، کم وبیش سطح ہی پر رہیں اور ہیئت جیسی تھی اجتماعی ویسی رہی ۔ بلکہ بعض باتوں میں تو اور بھی زیادہ بے لوچ ہوگئی ۔ افغان اپنے ساتھ ترقی کے کوئی نئے عناصر نہیں لائے ، اُنھوں نے جو نظام پیش کیا وہ ایک فرسودہ جاگیری اور قبائلی نظام تھا ۔ ہندوستان کا جاگیری نظام اُس قسم کا تو نہ تھا

جیسا یورپ میں تھا پھر بھی یہاں راجپوت قبیلوں کی جو ملک کے دفاع کے سلسلہ میں ہندوستان کی جان تھے کسی حد تک جاگیری طریقہ ہی پر تنظیم ہوئی تھی۔ مغل نیم جاگیری نظام لے کر آئے۔ لیکن ان کی مرکزی مطلق العنانی بہت مستحکم تھی۔ یہی مطلق العنانی راجپوتانہ کے مبہم جاگیری نظام پر فتحیاب ہوئی، البتہ اکبر کا متلاشی اور رسا ذہن اگر ادھر متوجہ ہوتا اور وہ اُن واقعات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا جو دنیا کے دوسرے حصّوں میں رونما ہو رہے تھے تو عجب نہ تھا کہ سماجی تبدیلی کی بنیاد پڑ جاتی۔ لیکن وہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش میں حد سے زیادہ مصروف رہا اور سب سے بڑا مسئلہ اُس کے سامنے یہ تھا کہ کسی طرح اسلام جیسے تبلیغی مذہب کا رعایا کے قومی مذہب اور رسم و رواج سے سمجھوتہ کرائے اور اس طرح قومی اتحاد پیدا کرے۔ اُس نے مذہب کی تعبیر عقلی دلائل سے کی اور تھوڑی دیر کے لئے تو ہندوستانی منظر میں اُس نے قابلِ تعریف تبدیلی پیدا کر دی، لیکن اُس کا یہ عملی طریقہ اسی طرح ناکامیاب رہا جس طرح یہ دنیا میں ہمیشہ ناکامیاب رہا ہے۔

غرض اکبر بھی ہندوستان کی ہیئت اجتماعی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا اور اس کے بعد تو ذہنی تجسّس اور تبدیلی کی وہ فضا جو اُس نے پیدا کی تھی ختم ہی ہو گئی۔ اور ہندوستان پھر اپنی اُسی سکون و جمود کی حالت پر آ گیا ہے[۵۷]

---

[۵۷] ابوالفضل ہمیں بتاتا ہے کہ کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کا حال اکبر کو معلوم تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں تمباکو امریکہ سے یورپ ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ اور باوجودیکہ جہانگیر نے اس کا رواج روکنا چاہا یہ نہایت حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ملک میں رائج ہو گئی مغلوں کے پورے عہد میں ہندوستان وسطی ایشیا کے ساتھ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

۱۱۔ مشترکہ تہذیب کی نشو و نما

اکبر نے بنیادیں ایسی مضبوط رکھی تھیں کہ اُس کے جانشینوں کے نااہل ہونے کے باوجود سلطنت کی عمارت سو برس تک قائم رہی، ہر مغل بادشاہ کے عہد حکومت کے بعد اُس کے جانشینوں میں تخت کے لئے جنگ ہوتی تھی اور اس طرح مرکزی حکومت کمزور ہوتی جاتی تھی۔ لیکن دربار کی شان و شوکت وہی تھی یہاں تک کہ مغلیہ دربار کی شہرت سارے ایشیا اور یورپ میں پھیل گئی آگرہ اور دہلی میں خوشنما عمارتیں بنیں جن میں ہندوستان کی قدیم طرز کے ساتھ ایک نئی سادگی اور لطافت کی آمیزش کی گئی۔ یہ ہندی مغل آرٹ شمالی اور جنوبی ہند کے طرز سے بالکل مختلف تھا، ہندوؤں کے مندروں اور دوسری عمارتوں میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ پر) تعلقات قائم رہے۔ یہ تعلقات روس تک پھیلے اور ایسے تاریخی حوالے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان سے سیاسی اور تجارتی سفارتیں بھی روس بھیجی گئیں ۱۵۲۵ء میں بابر کا سفیر خواجہ حسین روس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنے ماسکو گیا، زار مائیکل فی ڈورووچ (۱۶۱۳ء ۔ ۱۶۴۵ء) کے عہد حکومت میں ہندوستانی تاجر والگا کے میدان میں آباد ہوئے۔ ۱۶۲۵ء میں استراخاں میں وہاں کے گورنر کے حکم سے ایک ہندوستانی سرائے قائم ہوئی ہندوستان سے دستکار بالخصوص جولاہے ماسکو بلائے گئے۔ ۱۶۹۵ء میں ایک روسی تجارتی عامل سی مین ملنکی دہلی آیا اور اورنگ زیب نے اُس سے ملاقات کی، ۱۷۲۲ء میں پیٹر اعظم نے استراخاں کا دورہ کیا اور وہاں ہندوستانی تاجروں سے ملاقات کی، ۱۷۴۵ء میں ہندوستانی سادھوؤں کی ایک جماعت جنہیں جوگی کہا جاتا ہے استراخاں پہنچی، ان میں سے دو سادھو روس ہی میں بس گئے اور روسی رعایا بن گئے۔

طرزِ تعمیر بہت پُر تکلف ہوتا تھا جس میں ہر تفصیل کو اتمام تک پہنچانے کی حد سے زیادہ کوشش کی جاتی تھی اور عمارت کے چپّہ چپّہ پر نقش و نگار اور آرائش کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہندی مغل آرٹ کی مثال آگرہ کا تاج محل ہے جو اپنے بنانے والوں اور بنوانے والوں کی تخلیقی تحریک کا پتہ دیتا ہے۔

بڑے مغل شہنشاہوں میں اورنگ زیب آخری شاہنشاہ ہے۔ اس نے متحدہ قومیت کی مخالفت کی اور اس کوشش کی وجہ سے قومی اتحاد ختم ہوگیا مغل بادشاہ اُسی وقت تک فتنور رہے جب تک اُنھوں نے قوم کی فطری قابلیت کو نظر انداز نہیں کیا اور ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے اور ملک کے مختلف عناصر کو متحد کرنے کی کوشش کرتے رہے، جب اورنگ زیب نے اِس تحریک کی مخالفت کی اور اسے دبانا چاہا اور ہندوستانی بادشاہ ہونے سے زیادہ اپنے آپ کو مسلمان بادشاہ سمجھا تو مغلیہ سلطنت پر زوال آنے لگا۔ اکبر اور کسی حد تک اُس کے جانشینوں کی کوششوں کو برباد کر دیا گیا، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام وہ طاقتیں جو اکبر کی پالیسی کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کی مدد اور معاون رہی تھیں اب اس کی مخالفت میں سرگرم عمل ہوگئیں۔ ایسی نئی تحریکیں وجود میں آنے لگیں جن کا مطمح نظر گو تنگ تھا لیکن اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ قومیت پھر زندہ ہورہی ہے۔ اور گو یہ تحریکیں عارضی تھیں اور حالات ان کے لئے سازگار نہ تھے پھر بھی مغلیہ سلطنت کو برباد کرنے کے لئے کافی تھیں۔

شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کی اور اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اُس نے اُن خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اسلام کے اُخوّت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات

نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نئے تصور نے ملک میں بہت سی ایسی تحریکیں پیدا کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو اپنے مذہب میں ملا لیا جائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب میں شامل ہوگئے لیکن ان شامل ہونے والوں میں اکثریت نیچ ذات والوں کی تھی، بنگال میں خصوصیت کے ساتھ یہی ہوا۔ بعض اونچی ذات والوں نے بھی نیا مذہب اختیار کیا، ان میں بعض تو ایسے تھے جن کے خیالات میں فی الحقیقت تبدیلی پیدا ہوئی تھی لیکن زیادہ تر ایسے تھے جنھوں نے سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر مذہب تبدیل کیا تھا۔ حکمراں طاقت کا مذہب قبول کر لینے میں جو فائدہ تھا وہ ظاہر ہے۔

باوجودیکہ بہت سے ہندوؤں نے اپنا مذہب تبدیل کیا لیکن مجموعی طور پر ہندویت کی مختلف شاخیں ملک میں اُسی طرح مقبول رہیں۔ یہ مذہب بدستور مضبوطی اور خود اعتمادی سے اپنی جگہ پر قائم اور دوسروں سے بیگانہ اور بے نیاز رہا۔ اونچی ذاتوں کو عقائد اور خیالات میں اپنی برتری کا یقین تھا، اور وہ سمجھتی تھیں کہ ان کے مقابلہ میں فلسفہ اور مابعدالطبیعات کے مسائل سے مسلمانوں کو بہت کم مس ہے ان کے خیال میں اسلام کی توحید بھی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اور وحدت الوجود کا عقیدہ بھی پایا جاتا تھا۔ اس عقیدے پر اُن کے سارے فلسفہ کی بنیاد تھی۔ ہندو مذہب کے ہر پیرو کو آزادی تھی کہ وہ عبادت کا جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔

وہ ویشنوی بھی ہو سکتا تھا اور جس دیوتا کو پسند کرتا اُس کی پوجا کر سکتا تھا اور اگر اُس کا رجحان فلسفہ کی طرف ہوتا تو مابعدالطبیعات اور فلسفہ کی راہیں بھی

اُس کے لئے کھلی تھیں۔ گو ہندوؤں کی ساری اجتماعی ہیئت کی بنیاد جماعت پر
تھی مگر مذہب کے معاملہ میں انفرادیت ہی کو اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ دوسروں
کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کے قائل نہ تھے اور انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ
اُن کے کچھ لوگ کسی دوسرے مذہب کے پیرو بن جائیں، البتہ اُن کو یہ ناپسند
تھا کہ اُن کی اجتماعی ہیئت یا اُن کے طرزِ معاشرت میں مداخلت کی جائے۔ اگر کوئی
جماعت اپنا راستہ الگ اختیار کرنا چاہتی تھی تو اُس پر بھی اُن کو کوئی اعتراض
نہ ہوتا تھا۔ یہاں پر ایک چیز خاص طور پر قابلِ غور ہے: عام طور پر پوری پوری
جماعتیں ہندو سے مسلمان ہوتی تھیں۔ اس سے ہمیں اُس اثر کا پتہ چلتا ہے
جو اُن دنوں جماعت کو حاصل تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں سے تو فرداً فرداً بھی لوگ
تبدیلِ مذہب کرتے تھے لیکن نیچی ذاتوں میں ایک مقام کی کوئی پوری برادری
سارے کا سارا گاؤں اسلام قبول کرتا تھا۔ اس طرح اُن کی جماعتی زندگی اور
اُن کے کاموں میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا بس عبادت وغیرہ کے طریقہ میں معمولی سی
تبدیلی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بعض پیشے اور دستکاریاں ایسی ہیں
جو کلیتہً مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہیں، چنانچہ جولاہوں کے طبقہ میں اکثریت
اور بعض بڑے بڑے علاقوں میں جلاہوں کی پوری تعداد مسلمان ہے۔ یہی حال
چونوں کی تجارت کرنے والوں اور قصابوں کا ہے، درزی بھی بالعموم مسلمان ہی
ہوتے ہیں، مختلف قسم کی دستکاریاں اور صنعتیں بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہیں۔
جماعتی نظام کے کمزور پڑ جانے کی وجہ سے ایک جماعت کے فرد دوسری جماعت
کا پیشہ بھی اختیار کرنے لگے ہیں اس وجہ سے وہ فرق اب مٹتا جا رہا ہے
جس سے پیشہ ور جماعتیں اب تک آسانی سے پہچانی جاسکتی تھیں۔ دستکاریاں
اور دیہاتی صنعتیں اب ختم ہو چکی ہیں۔ برطانوی راج کے ابتدائی دور میں تو ان کو

حکومت نے دانستہ طور پر برباد کیا اور بعد میں ان کی بربادی کا باعث وسائل دولت کی وہ نئی تنظیم ہوئی جو نوآبادیات میں جاری کی گئی۔

اس وجہ سے بے شمار دستکار اور ہنرمند، بالخصوص جلاہے بے روزگار ہو گئے۔ جو بچ رہے انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے اصل پیشے چھوڑ دیئے اور زراعت میں لگ گئے، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو زمین کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں کے مالک ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے پاس زمین تو نام کو نہیں، کھیتوں پر مزدوری کر کے روٹی کما لیتے ہیں۔

اس زمانہ میں لوگوں نے خواہ انفرادی طور پر اسلام قبول کیا یا جماعتی طور پر، ہندو قوم نے اس کی مخالفت نہیں کی، البتہ اگر مسلمانوں کی طرف سے تبدیل مذہب کے سلسلہ میں جبر اور تشدد سے کام لیا گیا تو ضرور مخالفت ہوئی۔ لیکن یہ مخالفت بھی مذہب تبدیل کرنے والے کے احباب، اعزا اور بڑے وسیلے کی طرف سے تھی ہندو قوم کی طرف سے اسے بظاہر کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

پرانے زمانہ میں تو یہ حال تھا لیکن آج کل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام یا مسیحیت قبول کر لیتا ہے تو ہر طرف غم اور غصہ کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ آج کل کا یہ شور و غوغا سیاسی اسباب کے ماتحت ہے، بالخصوص جداگانہ مذہبی انتخابات نے یہ فضا بہت زیادہ پیدا کی ہے، اگر ایک شخص بھی کسی دوسری جماعت کا مذہب اختیار کر لیتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اس جماعت کو تقویت پہنچی، اس کی تعداد میں اضافہ ہوا اور سیاسی اختیارات میں اس کی نیابت کے حقوق بڑھے۔ اسی مقصد کے ماتحت مردم شماری میں بھی غلط اعداد و شمار لکھائے جاتے ہیں۔ ان سیاسی وجوہ

کے علاوہ ہندو مذہب میں بھی اب یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ دوسرے مذہب والوں کو شدھی کے ذریعہ ہندو بنایا جائے، یہ اُن بالواسطہ اثرات میں سے ایک اثر ہے جو اسلام نے ہندو مذہب پر ڈالے ہیں حالانکہ اس کی وجہ سے خود ہندو مذہب اسلام کا مخالف بن کر میدان میں آجاتا ہے۔ کٹر قسم کے ہندو اب بھی شدھی کو جائز نہیں سمجھتے۔

کشمیر میں مدت سے ہندو اسلام قبول کر رہے ہیں؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہاں کی آبادی میں نوّے فی صدی مسلمان ہیں حالانکہ ان کے رسم و رواج آج بھی ہندوانہ ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں ریاست کے حکمراں نے یہ محسوس کیا کہ ان نومسلموں میں بہت سے ایسے ہیں جو ہندو مذہب میں واپس آنا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک وفد بنارس کے پنڈتوں کے پاس بھیجا اور یہ دریافت کرایا کہ مذہب کی رو سے یہ جائز ہے یا ناجائز۔ پنڈتوں نے فتویٰ دیا کہ اس طرح مذہب کی تبدیلی جائز نہیں ہے چنانچہ معاملہ ختم ہو گیا۔

باہر سے آنے والے مسلمان اپنے ساتھ کوئی سیاسی یا اقتصادی نظام لے کر نہیں آئے، اسلامی اخوّت پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے اور جاگیری مطمح نظر رکھتے تھے، طریق پیداوار اور صنعتی تنظیم کے لحاظ سے اُن کا نظام اس وقت کے رائج الوقت نظام سے بہت کمتر تھا، اسی وجہ سے ہندوستان کی اقتصادی زندگی اور اجتماعی ہیئت پر اُن کا اثر بہت کم پڑا۔ ہندوستان کی زندگی کا یہ پہلو بدستور باقی رہا اور ہندو یا مسلمان اور دوسری قومیں، سب اس میں کھپ گئیں۔

عورتوں کی حیثیت اس زمانہ میں بہت گر گئی۔ وراثت اور خانگی

حیثیت کے لحاظ سے قدیم قانون میں بھی عورتوں کے ساتھ ناانصافی برتی گئی تھی، پھر بھی یہ قانون انیسویں صدی کے برطانوی قانون سے بہتر تھا۔ ہندوستان کا یہ قدیم قانون وراثت مشترکہ خاندان کے نظام پر مبنی تھا اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مشترکہ جائداد ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل نہ ہوسکے۔ شادی کے بعد عورت ایک خاندان سے دوسرے خاندان کو بدل جاتی تھی۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے عورت کو باپ، خاوند یا بیٹے کا دست نگر سمجھا جاتا تھا، لیکن وہ خود بھی جائداد کی مالک بن سکتی تھی اور ہوا بھی کرتی تھی۔ غرض عورت کا کافی احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا اُسے کافی آزادی بھی حاصل تھی اور وہ سماجی اور تہذیبی کاموں میں حصّہ بھی لے سکتی تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی مشہور عورتوں کے نام موجود ہیں جن میں مفکر بھی تھیں اور فلسفی بھی، حکمراں بھی تھیں اور سپاہی بھی۔ یہ آزادی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اسلامی قانون میں عورتوں کے ساتھ کافی رواداری برتی گئی تھی لیکن اس کا اثر ہندو عورت پر بالکل نہ پڑا۔ جس چیز کا اثر پڑا وہ مسلمان عورتوں کی خلوت نشینی تھی جس نے ہندو عورتوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو بہت بڑا نقصان پہنچایا اگرچہ مجموعی طور پر زیادہ نقصان مسلمان عورتوں کا ہوا۔ پردہ کا رواج شمالی ہند اور بنگال میں بہت عام تھا لیکن جنوب اور مغربی ہندوستان اس تباہ کن رواج کے اثرات سے محفوظ رہے۔ شمالی ہند میں بھی صرف اونچے طبقوں نے یہ رسم اختیار کی؛ خوش قسمتی سے عوام یہاں بھی اس کی مضرتوں سے بچ گئے۔ اس کی وجہ سے عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہوگئے اور اُن کے مشاغل زیادہ تر خانگی رہ گئے[۱] چونکہ ایسی تمام چیزوں سے وہ محروم کردی

---

[۱] پھر بھی اس زمانہ میں بھی اور بعد کے زمانہ میں بھی بہت سی مشہور عورتیں (بقیہ آیندہ صفحہ پر)

گئی تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ممتاز سمجھتیں اور اُن کی زندگی مقید اور محدود تھی اس لئے ان کو یہ بتایا گیا کہ عورت کے لئے سب سے بڑا ثواب یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت کو محفوظ رکھے اور سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ عصمت کو کھو دے، یہ تھا عورت کے لئے مرد کا بنایا ہوا عقیدہ لیکن خود مرد پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں تلسی داس نے اپنی مشہور اور قابلِ قدر ہندی نظم راماین میں عورت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ درحقیقت عورت کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔

کچھ تو اس وجہ سے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت ایسی تھی جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے اور کچھ مدتوں کے ربط ضبط کی وجہ سے، دونوں میں بہت سی مشترک خصوصیتیں، عادتیں، رہن سہن کے طریقے اور فنی ذوق پیدا ہو گئے۔ موسیقی، مصوری، فن تعمیر، غذا، لباس اور عام روایات میں بہت کچھ یکسانی ہو گئی۔ یہ اثرات شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ رونما ہوئے، ہندو مسلمان دونوں صلح اور امن کے ساتھ مل جُل کر ایک قوم کی طرح رہتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے تیوہاروں اور خوشیوں میں شریک ہوتے تھے، ایک زبان بولتے تھے، کم و بیش ایک طریقہ پر رہتے سہتے تھے، اور سب کے اقتصادی مسائل بھی یکساں تھے۔ امرار اور زمینیں رکھنے والے شرفار اور ان کے دست نگر لوگ دربار کی تقلید کرتے تھے۔ (یہ لوگ نہ زمیندار تھے، نہ زمینوں کے مالک اس لئے انھیں لگان وصول کرنے کا حق نہیں تھا بلکہ ایک مقررہ علاقے کی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) گزری تھیں جن میں عالم بھی تھیں اور حکمراں بھی۔ اٹھارویں صدی میں لکشمی دیوی نے عہد وسطیٰ کی ایک مشہور قانون کی کتاب متکشرا کی ایک بڑی قابلِ قدر شرح لکھی ہے۔

سرکاری مالگذاری وصول کرتے تھے اور اُس کو اپنے صرف میں لاتے تھے، یہ حق عموماً زندگی بھر کے لئے ہوتا تھا) اس طبقہ کی معاشرت بہت پیچیدہ اور پُرتکلف تھی، ان کی ایک مشترک تہذیب تھی، یہ ایک ہی لباس پہنتے تھے ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے تھے، ان کی فنّی دلچسپیاں، فوجی تفریحی مشغلے، شکار بہادری اور کھیل کود ایک ہی طرح کے ہوتے تھے پولو ان کا پسندیدہ کھیل تھا اور ہاتھیوں کی لڑائی کا ان سب کو شوق ہوتا تھا۔

باوجودیکہ ذاتوں کا نظام موجود تھا اور وہ آپس کے اِتحاد کو روکتا تھا پھر بھی ملک میں ہندو مسلمانوں کا میل جول عام ہوتا گیا اور مشترک رہن سہن بڑھتا گیا۔ ہندو مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ نہیں ہوتے تھے اور اگر اتفاق سے کبھی کوئی اس قسم کی شادی ہو جاتی تھی تو وہ قومی اِتحاد کا سبب نہیں بن سکتی تھی بلکہ اس کی حیثیت محض یہ ہوتی تھی گویا ایک عورت ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ ہندو مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے بھی نہ تھے، لیکن اس معاملہ میں بہت زیادہ شدّت نہیں برتی جاتی تھی، عورتوں کی خلوت نشینی نے سماجی ترقی کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس کا اثر مسلمان عورتوں پر زیادہ ہوا کیونکہ پردہ کا رواج اُن میں بہت زیادہ تھا۔ ہندو مسلمان مرد تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے تھے لیکن دونوں قوموں کی عورتوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے اتفاقات بہت کم ہوتے تھے، امراء اور اونچے طبقوں کی یہ عورتیں آپس میں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتی تھیں اور اس طرح دونوں میں سے ہر ایک کا اپنا الگ مطمح نظر بن گیا، اور ایک جماعت دوسری جماعت کے حالات سے بالکل بے خبر ہوگئی۔

دیہات کے عوام میں یعنی آبادی کی اکثریت میں اس سے زیادہ مشترک

زندگی پائی جاتی تھی ۔ گاؤں کے محدود حلقہ میں ہندو مسلمانوں میں بہت گہرے
تعلقات ہوتے تھے ۔ ذاتیں اس معاملہ میں کچھ رکاوٹ پیدا نہیں کرسکیں ، ہندو
مسلمانوں کو بس ایک خاص ذات سمجھتے تھے ۔ بہت سے مسلمان نومسلم ہوتے تھے
ان کے رسم و رواج وہی پرانے تھے ۔ یہ ہندوپس منظر ، ہندو دیو مالا ۔ اور ہندو دور کی
کی رزمیہ کہانیوں سے خوب واقف ہوتے تھے ۔ اس وجہ سے یہ اسی قسم کے
مشاغل پسند کرتے تھے جیسے ہندو پسند کرتے تھے ، اسی طریقہ پر زندگی بسر
کرتے تھے ، ویسا ہی لباس پہنتے تھے اور وہی زبان بولتے تھے ۔ یہ ایک
دوسرے کے تیوہاروں میں شریک ہوتے تھے اور بعض نیم مذہبی تیوہار ایسے
بھی تھے جو دونوں میں مشترک تھے ، ان کے گھریلو گیت بھی ایک ہی سے
تھے ، زیادہ تر یہ لوگ کسان تھے ، یا پیشہ ور یا دستکار ۔

امرا اور کسانوں دستکاروں کے بیچ میں تیسری بڑی جماعت تاجروں
اور سوداگروں کی تھی ، اس جماعت میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور گو انھیں سیاسی
اختیار حاصل نہ تھا لیکن ملک کا اقتصادی نظام انہیں کے زیر اثر تھا ۔ اس طبقہ
سے اوپر اور نیچے جو طبقے تھے وہ تو مسلمانوں کے ساتھ میل جول رکھتے تھے
لیکن خود اس طبقہ کے تعلقات مسلمانوں سے بہت کم تھے ۔

مسلمان چونکہ باہر سے آئے تھے اور اُن کا مطمح نظر جاگیری تھا اس لئے
تجارت کے ساتھ انھیں کوئی خاص ہمدردی بھی نہ تھی ۔ اسلام میں سود لینے کی
جو ممانعت ہے وہ بھی تجارت کے راستے میں رکاوٹ بنی ۔ اُمرا اپنے آپ کو
حکمراں طبقہ سمجھتے تھے ۔ اور ریاست کے افسروں کی حیثیت رکھتے تھے ، یا اُن
کے پاس جاگیریں تھیں جو فوجی خدمات انجام دینے کے صلہ میں ان کو ملی تھیں ۔
بہت سے علماء بھی تھے جو یا تو دربار سے تعلق رکھتے تھے یا دینی اور دوسری

قسم کی علمی انجمنیں چلا رہے تھے۔

مغلوں کے عہد میں بہت سے ہندوؤں نے فارسی میں کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی اُس زمانہ کی سرکاری زبان تھی۔ ان کتابوں میں سے بعض تو آج تک کلاسیکی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی مسلمان عالموں نے سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کئے اور ہندی میں کتابیں تصنیف کیں، ملک محمد جائسی جس نے پدماوت تصنیف کی، اور عبدالرحیم خان خاناں جو اکبر کے دربار کا ایک ممتاز امیر اور اس کے اتالیق کا بیٹا تھا، ہندی کے مشہور شاعروں میں گذرے ہیں۔ خان خاناں عربی، فارسی اور سنسکرت کا عالم تھا اور ہندی میں بہت اعلیٰ درجے کے شعر کہتا تھا۔ وہ کسی زمانہ میں شاہی افواج کا سپہ سالارِ اعظم بھی رہا تھا پھر بھی اُس نے رانا پرتاب کی تعریف میں بہت کچھ لکھا۔ رانا پرتاب مدتوں اکبر سے لڑتا رہا اور اُس نے مغلوں کی اطاعت قبول نہ کی۔ خان خاناں اپنے حریف کے حُبِ وطن، خود داری اور شجاعت کو بہت سراہتا ہے۔

یہ تھا وہ مروّت اور دوستی کا طریقہ جس پر اکبر نے اپنی پالیسی کی بنیاد رکھی تھی اور یہی طریقہ اُس کے درباریوں اور وزیروں نے اختیار کیا۔ اکبر کو راجپوتوں کے ساتھ ایک خاص وابستگی تھی، اُسے اُن کے اندر وہ صفات نظر آتی تھیں جو خود اُس میں موجود تھیں۔ دلیری، خود داری، شجاعت اور آن بان راجپوتوں کی خصوصیت تھی اور انھیں خوبیوں کی اکبر قدر کرتا تھا، اکبر نے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملا یا لیکن وہ باوجود اپنی تمام قابلِ قدر خوبیوں کے عہد وسطیٰ کے سماجی نظام کے حامل تھے، یہ نظام اب پرانا ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نئی قوتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکبر بھی ان نئی قوتوں کو

محسوس نہ کر سکا کیونکہ وہ خود اُسی سماجی نظام کا شیدائی تھا جو اُس نے اپنے باپ دادا کے ورثہ میں پایا تھا۔

اکبر کی کامیابی واقعی حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ اُس نے شمال اور وسطی ایشیا کے مختلف عناصر میں قومی وحدت کا احساس پیدا کر دیا۔ اِس راستہ میں بہت سی رُکاوٹیں تھیں، حکمراں طبقہ جو نسلی اعتبار سے بیرونی تھا اس اتحاد میں حائل ہو رہا تھا، مذہب اور ذات کے اختلافات بھی اِسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ ایک تبلیغی مذہب کا مقابلہ اس نظام سے تھا جو ساکن اور جامد تھا مگر بڑی قوتِ برداشت رکھتا تھا۔ ان رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی قومی وحدت کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ محض اس وجہ سے نہ تھا کہ لوگوں کو اکبر کی ذات کے ساتھ وابستگی تھی دراصل وہ اس نظام سے وابستہ تھے جو اکبر نے قائم کیا تھا۔ اُس کے جانشینوں میں جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی اس نظام کو قبول کیا اور اس کی پیروی کی۔ یہ دونوں کوئی غیر معمولی قابلیت کے حکمراں نہ تھے پھر بھی ان کے عہدِ حکومت کامیاب رہے، وجہ اس کی محض یہ تھی کہ اُنھوں نے اکبر ہی کی پیروی کی اور جو دستور وہ بنا گیا تھا اُسی پر چلتے رہے۔ ان کے بعد اورنگ زیب آیا۔ یہ ان دونوں سے زیادہ قابل تھا لیکن طبیعت کے لحاظ سے بالکل مختلف تھا، اُس نے اکبر کے راستے کو پامال سمجھ کر چھوڑ دیا اور اس کی روش سے بالکل ہٹ گیا۔ اس کے اِس رویہ سے اکبر کے کام کو نقصان تو ضرور پہنچا لیکن وہ مٹا نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اورنگ زیب کی اس پالسی کے اور باوجود اُن کمزور بادشاہوں کے جو اُس کے بعد تخت نشین ہوئے ہندوستانیوں کے دلوں میں اکبری نظام کی وہی عزت رہی، لیکن یہ احساس شمالی اور وسطی ہند تک محدود رہا، جنوب

اور مغرب میں نہیں پھیلا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر جو حملہ ہوا وہ مغرب کی طرف سے ہوا۔

۱۲- اورنگ زیب کی رجعت

ہندو قومیت کا نشو ونما

سیواجی شاہ جہاں فرانس کے "حکمرانِ اعظم" لوئی چہار دہم کا ہمعصر تھا۔ اس زمانہ میں وسطی یورپ میں تیس سالہ جنگ جاری تھی۔ وہاں وارسائی کا شہر وجود میں آیا یہاں آگرہ میں تاج محل اور موتی مسجد اور دہلی میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے دیوان عام، دیوانِ خاص اور شاہی محل تعمیر ہوئے یہ حسن میں بے نظیر عمارتیں مغلوں کی عظمت کا پتہ دیتی ہیں۔ دہلی کا دربار اور وارسائی سے زیادہ شاندار تھا اور عیش و عشرت میں بھی اس سے بڑھا ہوا تھا۔ وارسائی کی طرح یہاں کے عیش کی قسمت بھی رعایا کا افلاس اور تباہ حالی تھی۔ دکن اور گجرات میں زبردست قحط تھا۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی بحری طاقت کو عروج حاصل ہوا۔ اکبر کے زمانہ میں صرف پرتگالی ہندوستان میں آئے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں ہندوستانی سمندروں میں انگریزی بیڑے نے پرتگالیوں کو شکست دی اور ۱۶۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول کا سفیر سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا۔ اس نے شہنشاہ سے تجارتی کوٹھیاں کھولنے کی اجازت لے لی سورت میں انگریزی کوٹھی قائم ہوگئی اور ۱۶۳۹ء میں مدراس کی بنیاد پڑ گئی۔ کچھ اوپر سو برس تک ہندوستان میں انگریزوں کو کسی نے اہمیت نہ

دی ، برطانیہ کا سمندری راستوں پر اقتدار اور اس کا پرتگالیوں کو سمندر سے نکال دینا مغل حکمرانوں اور ان کے مشیروں کے نزدیک کوئی اہم بات نہ تھی ۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب مغلیہ سلطنت کی کمزوری ظاہر ہونے لگی تو انگریزوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس بات کی منظم کوشش کی کہ جنگ کے ذریعہ ہندوستان میں اپنے مقبوضات بڑھائیں اگرچہ اورنگ زیب کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی اور دشمن اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے پھر بھی وہ انگریزوں کو سخت سزا دینے میں کامیاب ہوا ۔ اس سے بھی پہلے فرانسیسی ہندوستان میں قدم جما چکے تھے ۔ ادھر ہندوستان کا سیاسی اور اقتصادی انحطاط تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا ادھر یورپ کی پرجوش قوتیں ہندوستان اور مشرق میں پھیلتی جاتی تھیں ۔

فرانس میں لوئی چہاردہم کا طول طویل عہد حکومت ابھی جاری تھا اور لوئی آنے والے انقلاب کا بیج بو رہا تھا انگلستان میں اوسط طبقہ جس کی قوت بڑھتی جاتی تھی اپنے بادشاہ کو قتل کر چکا تھا ، کرامویل کی چند روزہ جمہوریت بھی اپنی آب و تاب دکھا چکی تھی ۔ چارلس دوئم کی بادشاہت قائم ہو کر اور ختم ہو چکی تھی ۔ جیمس دوئم بھی فرار کی راہ اختیار کر چکا تھا ۔ پارلیمنٹ جو زیادہ تر تجارتی طبقہ پر مشتمل تھی بادشاہ کے اثر کو ختم کر چکی تھی اور اس کا اپنا اقتدار قائم ہو چکا تھا ۔ یہ تھا وہ زمانہ جب اورنگ زیب خانہ جنگی کے بعد اپنے باپ شاہ جہاں کو قید کر کے مغلیہ تخت پر بیٹھا ۔ صرف اکبر ہی اس موقع کی نزاکت کو سمجھ سکتا تھا اور نئی قوتوں پر قابو پا سکتا تھا ، اور اگر وہ بھی تلاش اور جستجو سے کام نہ لیتا اور ان عام حالات اور اقتصادی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتا جو اس وقت پیدا ہو رہی تھیں تو سلطنت کو مستحکم کرنا اس کے لئے بھی

ناممکن ہو جاتا۔ بہرحال شاید تباہی کچھ دنوں کے لئے رُک جاتی، اورنگ زیب حال کو سمجھنے سے تو کوسوں دور تھا وہ اُس ماضی کو بھی نہ سمجھ سکا جو اُس سے بالکل قریب تھا۔ اُس نے غلط پالیسی اختیار کی اور باوجودیکہ اُس میں قابلیت بھی تھی اور مستعدی بھی، اُس نے باپ دادا کے کام کو بگاڑ دیا۔ اپنے کٹرپن اور مذہبی شدت کی وجہ سے اُسے نہ آرٹ سے محبت تھی نہ ادب سے۔ اُس نے ہندوؤں پر وہ ٹیکس لگایا جسے جزیہ کہتے ہیں اور جس کے ساتھ لوگوں کو ہمیشہ سے نفرت ملی آتی تھی، اُس نے ہندوؤں کے بہت سے مندر مسمار کرادیئے۔ اُس کی اُن باتوں پر ہندو برہم ہوگئے، راجپوت بھی جو اب تک مغلیہ سلطنت کے ستون رہے تھے اس سے خفا ہوگئے۔ شمال میں اُس نے سکھوں کو بھڑکا دیا۔ یہ جماعت اب تک پُرامن طریقہ پر زندگی گزار رہی تھی اور اُن کا مذہب بھی ہندو مسلمانوں کے عقائد کا امتزاج تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی سختی اور تشدد نے ان کو بھی ایک فوجی برادری میں تبدیل کردیا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر اُس نے جنگ جو مرہٹوں کو جو قدیم راشٹرکوٹوں کی اولاد سے تھے ناراض کردیا اور یہ ناراضگی ایسے وقت ہوئی کہ اُن میں ایک نہایت بہادر سپہ سالار پیدا ہوچکا تھا۔

وسیع مغلیہ سلطنت میں چاروں طرف تجدید کا جذبہ پھیل رہا تھا تھا جو مذہبیت اور قومیت پر مشتمل تھا۔ اُس زمانہ کی قومیت موجودہ سیاسی قومیت سے یقیناً مختلف تھی اور سارے ہندوستان میں نہیں پھیل سکی۔ اس پر جاگیری نظام اور مقامی اور فرقہ واری جذبات کا رنگ تھا۔ راجپوت جن پر جاگیری نظام کا سب سے زیادہ اثر تھا قبیلہ پرستی سے آگے نہ بڑھے، اِسی طرح

سکھ جو پنجاب میں بسے ہوئے تھے اور تعداد میں نسبتاً کم تھے بس اپنے ہی تحفظ میں مصروف رہے اور پنجاب سے باہر انہیں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ پھر بھی مذہب بذات خود ایک تاریخی پس منظر تھا جس کی تمام روایات ہندوستان کے ساتھ وابستہ تھیں۔ پروفیسر میکڈانل لکھتا ہے۔

"صرف ایک ہندوستانی قوم ہی ایسی نکلی جو ہند یورپی خاندان سے الگ ہو کر دو بڑے مذہب پیدا کر سکی ان میں ایک قومی مذہب تھا جسے برہمنی مذہب کہتے ہیں اور دوسرا عالمگیر مذہب تھا جو بودھ مذہب کہلاتا ہے۔ باقی قومیں اس معاملہ میں کوئی جدت نہ دکھا سکیں اور مدت ہوئی کسی نہ کسی بیرونی مذہب میں ختم ہو گئیں۔" مذہب اور قومی روایات ہندو کی قومیت کی بنیاد تھی۔ انہیں دونوں عناصر سے ہندو قومیت کو تقویت حاصل ہوئی اور یہی دونوں آخر میں اس کی کمزوری اور کوتاہی کے ذمہ دار ہوئے۔ کیونکہ انھوں نے ایک محدود اور جزوی قومیت پیدا کی جو اپنے اندر ہندوستان کے ان دوسرے عنصر کو نہ ملا سکی جو ہندو مذہب کے دائرے سے باہر تھے۔ ہندوستان کی سرزمین پر ہندو قومیت کی نشو و نما ایک قدرتی چیز تھی لیکن یہ قومیت لامحالہ اس بڑی قومیت کی راہ روکتی تھی جو مذاہب اور عقائد کے اختلافات سے بالاتر ہے۔

یہ سچ ہے کہ انتشار کے اس زمانہ میں جب کہ ایک بڑی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی اور ویسی اور یورپی مہم جو اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے قومیت اپنے اصلی معنی میں کہیں رونما نہ ہوئی، جو لوگ انفرادی طور پر قسمت آزمائی میں مصروف تھے ان کے سامنے محض اپنی غرض تھی اور جو جماعتیں اس مقصد

سکے لئے کوشاں تھیں اُن کے پیش نظر بھی بس اپنا ہی مفاد تھا۔ یہ تاریخ جو آج ہم پڑھتے ہیں ہمیں ایسے ہی لوگوں کے حالات بتاتی ہے اور ان کو اہم تحریکوں سے زیادہ اہمیت دیتی ہے جو سطح کے نیچے پھیل رہی تھیں پھر بھی ہم کہیں کہیں یہ حقیقت پا لیتے ہیں کہ گو بہت سے مُہم جو ایسے تھے جو سبقت لے گئے پھر بھی یہ سارا کا سارا کھیل محض مہم جوئی اور قسمت آزمائی کا نہ تھا۔ بالخصوص مرہٹوں کا مطمحِ نظر کافی وسیع تھا اور جوں جوں اُن کی طاقت بڑھتی گئی یہ مطمحِ نظر بھی اور زیادہ وسیع ہوتا گیا۔ سنہ ۱۷۸۴ء میں وارن ہسٹنگز نے لکھا تھا "سارے ہندوستان اور دکن کی قوموں میں بس مرہٹے ہیں جن میں قومیت کا اصول پایا جاتا ہے اور سب افراد کے دماغوں پر اُس کا گہرا نقش ہے، اگر کبھی مرہٹہ ریاست کو کسی بڑے خطرے کا سامنا ہوا تو عجب نہیں کہ کُل راجپوت حکمراں مرہٹہ طاقت کو بچانے کے لئے متحد ہو جائیں"

غالباً مرہٹوں کا یہ قومی جذبہ بھی مرہٹی بولنے والے علاقہ ہی تک محدود تھا، اس کے باوجود مرہٹے اپنے سیاسی اور فوجی نظام میں اور اپنی عادتوں میں بے تعصب تھے۔ اُن کے یہاں کسی حد تک اندرونی جمہوریت بھی موجود تھی۔ اِن سب چیزوں نے انہیں کافی تقویت پہنچائی۔ سیواجی اورنگ زیب سے لڑتا تھا مگر اس نے اپنی فوج میں بہت سے مسلمان ملازم رکھے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ مغلوں کا اقتصادی نظام بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ جا بجا کسانوں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں ان میں سے بعض بڑے پیمانہ پر ہوئیں۔

۱۶۶۹ء کے بعد جاٹ کسان جو دار السلطنت سے کچھ دور نہ تھے حکومت دہلی کے خلاف بار بار شورش کرتے رہے، غریب طبقہ کی ایک اور بغاوت وہ تھی جسے ستنامیوں کی بغاوت کہا جاتا ہے۔ ستنامیوں کے متعلق ایک مغل امیر لکھتا ہے کہ "یہ ذلیل اور حقیر باغیوں کی ایک جماعت تھی، جس میں سنار، لہار، بھنگی، چمڑہ رنگنے والے اور دوسرے کمینے لوگ شامل تھے" اب تک بغاوتیں صرف شہزادوں، امیروں اور دوسرے اونچے مرتبہ والوں کی طرف سے ہوتی تھیں لیکن اب اس میدان میں ایک اور طبقہ بھی آ رہا تھا۔

ادھر تو سلطنت لڑائی جھگڑوں اور بغاوتوں کی وجہ سے کمزور ہوتی جاتی تھی اُدھر مغربی ہندوستان میں مرہٹہ طاقت بڑھ رہی تھی اور اپنے آپ کو مستحکم کرتی جاتی تھی۔ سیواجی جو ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا تھا ان مضبوط پہاڑیوں کا بے مثل سردار نکلا۔ یہ چھاپہ بازی کی لڑائی لڑتا تھا۔ اس نے اپنے شہسوار دور دور بھیجے۔ ایک دفعہ سورت کے شہر کو لوٹا جہاں انگریزوں کی تجارتی کوٹھی تھی، وہ مغلیہ سلطنت کے دور افتادہ حصوں سے ایک ٹیکس وصول کرتا تھا جو چوتھ کہلاتا تھا۔ سیواجی دوبارہ زندہ ہونے والی ہندو قومیت کی آواز تھا، اس نے قدیم کلاسیکی ادب سے روحانی اثر لیا تھا وہ بہت باہمت انسان تھا اور اُس میں تمام وہ خوبیاں موجود تھیں جو ایک اعلیٰ درجہ کے لیڈر میں ہونی چاہئیں۔ اُس نے مرہٹہ قوم کو متحد کر کے ایک لڑنے والی قوم بنا دیا اور ان میں قومیت کا جذبہ پیدا کر گئے ایسی زبردست قوت بنا دیا جس نے مغلیہ سلطنت کو پاش پاش کر دیا۔ سیواجی نے ۱۶۸۰ء میں انتقال کیا۔ لیکن مرہٹہ طاقت اُس کے بعد بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ مرہٹے

پورے ہندوستان پر چھا گئے۔

۱۳۔ اقتدار کے لئے مرہٹوں اور انگریزوں کی کشمکش

انگریزوں کی جیت

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد سو سال تک مختلف طاقتیں ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے آپس میں دست و گریباں رہیں۔ مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی اور مغل نائب اور صوبیدار نیم آزاد حکمراں بنتے جا رہے تھے لیکن دہلی کے مغلیہ تخت و تاج کے وارث کی اب بھی یہ عزت تھی کہ یہ صوبیدار اُسی کی رسمی اطاعت بجا لاتے تھے حالانکہ وہ خود بالکل بے اختیار تھا اور دوسروں کا قیدی تھا۔ ان صوبیداروں کے ہاتھ میں کوئی بڑی طاقت نہ تھی۔ ان کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ اُنھوں نے طاقت کے لئے لڑنے والے فریقوں کو یا تو مدد دی یا اُن کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ حیدر آباد کی ریاست اپنے محل وقوع کے اعتبار سے فوجی اہمیت رکھتی تھی، اس وجہ سے ابتدا میں نظام حیدر آباد کو کسی قدر اہمیت حاصل رہی لیکن یہ بات جلد ظاہر ہوگئی کہ یہ اہمیت محض خیالی تھی اور ریاست بالکل بے جان تھی جو کٹھ پتلی کی طرح بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر ناچتی تھی دورنگی اس کی نمایاں خصوصیت تھی، دوسروں کی مصیبت سے خود فائدہ اُٹھانا اور اپنے آپ کو خطرے سے بچائے رکھنا اس کا شعار تھا۔ سرجان شور نے اس کی بابت کہا ہے کہ " اس کی حالت اتنی بگڑ چکی ہے کہ اب اصلاح کی گنجائش ہی نہیں، نہ اس میں اب جان باقی ہے

لہٰذا یہ اسی قابل ہے کہ ماتحت ریاست بن کر رہے" مرہٹے بھی نظام حیدرآباد کو اپنے اُن ماتحت حکمرانوں میں سمجھتے تھے جو اُن کو ٹیکس ادا کرتا تھا۔ ایک دفعہ نظام نے کوشش کی کہ مرہٹوں کو ٹیکس ادا نہ کرے، اس کا نتیجہ اس کے حق میں بہت بُرا ہوا اور حیدرآباد کی کمزور اور ناکارہ فوجوں کو مرہٹوں کے مقابل میں پسپا ہونا پڑا نظام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سایہ میں پناہ لی اور وہ کمپنی کا ماتحت بن کر اپنی ریاست کو قائم رکھ سکا۔ حیدرآباد نے بغیر کسی خاص کوشش کے اپنی سلطنت کی حدود کو بھی کافی بڑھا لیا اور یہ محض اُن فتوحات کی وجہ سے تھا جو برطانیہ کو ٹیپو سلطان والئی میسور پر حاصل ہوئیں۔ ۱۷۸۴ء میں وارن ہسٹنگز اپنی ایک تحریر میں نظام کے متعلق لکھتا ہے" اس کی مملکت کی وسعت بہت قلیل ہے اور اس کا مالیہ بھی بہت کم ہے۔ اُس کی فوجی طاقت بھی نہایت حقیر ہے، یہ شخص اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی ذاتی ہمت اور ترقی کا کوئی ولولہ نہ دکھا سکا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا اصول ہی یہ رہا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑاتا رہے اور ان کی کمزوری اور اُن کے مصائب سے فائدہ اُٹھاتا رہے، اُن کی لڑائیوں میں خود کسی کا ساتھ نہ دے اور اگر کہیں خود لڑائی میں پھنس جانے کا ڈر ہو تو ہر قسم کی شرائط خواہ وہ کتنی ہی ذلیل کرنے والی کیوں نہ ہوں مان لے[۵]"

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی اقتدار کے لئے اصلی نبرد آزما

---

[۵] تھامسن کی کتاب " دی میکنگ آف دی انڈین پرنسیز" (۱۹۴۳ء) کے صفحہ ۱ سے منقول۔

چار تھے جن میں دو ہندوستانی تھے اور دو بیرونی۔ سلطان حیدر علی اور مرہٹے تو ہندوستانی تھے اور انگریز اور فرانسیسی بیرونی۔ صدی کے پہلے نصف حصّہ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان چاروں فریقوں میں سے ہندوستان کی حکومت صرف مرہٹوں کے حصّے میں آئے گی۔ اور یہی مغلیہ سلطنت کے جانشیں ہوں گے۔ ۱۷۳۸ء میں اُن کی فوجوں نے دہلی فتح کرلیا اور کوئی اُن کا مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ ٹھیک اُسی وقت (۱۷۳۹ء میں) شمال مغرب میں ایک نئی آفت رونما ہوئی۔ ایران کا بادشاہ نادرشاہ یکبارگی دہلی پر ٹوٹ پڑا۔ اور قتل و غارت کے بعد بے شمار مال و دولت جس میں تخت طاؤس بھی شامل تھا لوٹ کرلے گیا۔ نادر کے لئے یہ حملہ کوئی مشکل چیز نہ تھا۔ دہلی کے بادشاہ ناکارہ ہوچکے تھے اُن میں نسوانیت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور جنگ کی تو اُنھیں عادت ہی نہ تھی۔ مرہٹوں سے نادرشاہ کا مقابلہ نہیں ہوا۔ ایک لحاظ سے نادرشاہ کے حملہ نے مرہٹوں کے لئے اور زیادہ آسانیاں پیدا کردیں چنانچہ آنے والے چند سال کے عرصہ میں وہ پنجاب تک پھیل گئے اور یہ نظر آنے لگا کہ ہندوستان کے اقتدار کے مالک مرہٹے ہی ہوں گے۔

نادرشاہ کے حملہ کے دو نتیجے ہوئے۔ اُس کے حملہ کے بعد مغل حکمرانوں کے لئے اس کی گنجائش نہیں رہی کہ وہ طاقت اور سلطنت کا جھوٹا دعویٰ بھی کرسکیں۔ اس کے بعد جو طاقت اُن پر قبضہ کرسکی اُسی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے۔ نادرشاہ سے پہلے بھی اُن کی حالت بڑی حد تک یہی تھی۔ جو کچھ کمی تھی وہ نادر نے پوری کردی، پھر بھی روایات اور دستور کا یہ اثر تھا کہ پلاسی کی جنگ تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری طاقتیں بطور خراج کے اُن کو تحفے تحائف بھیجتی رہیں۔ اور اس کے بعد بھی ایسٹ انڈیا کمپنی تو مدّت تک اپنے

آپ کو دہلی کے شہنشاہ کا عامل ہی کہتی رہی اور اسی حیثیت سے کام کرتی رہی، چنانچہ ۱۸۳۵ء تک کمپنی کے سکّہ پر شہنشاہ دہلی ہی کا نام کندہ ہوتا تھا۔

نادرشاہ کے حملہ کا دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ افغانستان ہندوستان سے جُدا ہو گیا۔ افغانستان جو مدّت سے ہندوستان کا ایک حصّہ چلا آتا تھا، ہندوستان سے الگ ہو کر نادرشاہ کی مملکت کا جزو بن گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد جب ایک مقامی بغاوت کے سلسلہ میں نادرشاہ اپنے بعض افسروں کے ہاتھ سے مارا گیا تو افغانستان ایک خود مختار ریاست بن گیا۔

مرہٹوں کی طاقت کو نادرشاہ کی وجہ سے کچھ نقصان نہ پہنچا اور وہ بدستور پنجاب میں پھیلتے رہے۔ لیکن ۱۷۶۱ء میں ایک دوسرے افغان حملہ آور نے جس کا نام احمد شاہ دُرّانی تھا اور جو افغانستان کا حکمران تھا اُنھیں پانی پت کے میدان میں شکست دی۔ مرہٹہ فوجوں کے تمام سُورما اِس معرکہ میں کام آئے، اور مرہٹہ سلطنت کے وہ سب خواب تھوڑے عرصہ کے لیے ختم ہو گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ مرہٹے پھر اُبھرے۔ اُنھوں نے اپنی بہت سی آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔ اور ان سب ریاستوں نے اپنا ایک جتھا بنا لیا جس کا سردار پونا کا پیشوا قرار دیا گیا۔ گوالیار کا سندھیا، اندور کا ہولکر، ناگپور کا بھونسلا اور بڑودہ کا گائکواڑ بڑے حکمرانوں میں تھے۔ مرہٹوں کے اس جتھے کو پھر مغربی اور وسطی ہندوستان میں اقتدار حاصل ہو گیا۔ لیکن مرہٹوں کی پانی پت والی شکست نے اُنھیں ایسے موقع پر کمزور کیا تھا کہ جب انگریزی کمپنی ہندوستان میں ایک ملکی طاقت کی حیثیت سے رونما ہو رہی تھی۔

بنگال میں کلائیو بہت تھوڑی سی لڑائی اور بہت زیادہ دغا اور فریب سے کام لے کر پلاسی کی جنگ جیت چکا تھا۔ یہ جنگ ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔

اور یہ وہ تاریخ ہے جس کی بابت بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ہندوستان
میں برطانوی حکومت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ ابتدا بہت تلخ
تھی اور وہی تلخی آج تک اس حکومت کے ساتھ وابستہ ہے۔ بہت جلد
انگریزوں نے پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا اور اُن کی حکومت کا سب
سے پہلا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۷۷۰ء میں ان دونوں صوبوں میں ایسا قحط پڑا کہ
اس زرخیز، وسیع اور گھنی آبادی والے علاقہ کے ایک تہائی لوگ موت کی
نذر ہو گئے۔

جنوبی ہند میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ جاری تھی
اور یہ اُس بڑی جنگ کا ایک جزو تھی جو ان دونوں قوموں کے درمیان ساری
دنیا میں ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی جنگ میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی
اور فرانسیسی ہندوستان سے قریب قریب خارج کر دیے گئے۔

فرانسیسیوں کے ہندوستان سے نکل جانے کے بعد اب تین فریق باقی
رہے۔ مرہٹوں کا جتھا، انگریز اور جنوب میں حیدر علی۔ باوجودیکہ انگریزوں کو
پلاسی کی جنگ میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی اور بنگال اور بہار میں وہ پھیل چکے
تھے پھر بھی ہندوستان میں بہت کم لوگ یہ سمجھ سکتے تھے کہ انگریز سب
طاقتوں پر غالب رہیں گے اور ہندوستان کی فرمانروائی ان کی قسمت میں ہو گی،
ملک کی ظاہری حالت کو دیکھنے والا تو پہلی جگہ مرہٹوں ہی کو دیتا جو دہلی تک
پورے مغربی اور جنوبی ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور جو مردانگی اور
سپاہیانہ صفات میں بھی کافی مشہور تھے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان بھی انگریزوں
کے ایسے حریف تھے جن کا مغلوب کرنا آسان نہ تھا، پھر یہ دونوں ان کو
ایسی سخت شکستیں بھی دے چکے تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت ختم

ہوتے ہوتے بچی۔ لیکن ان کی کوششیں بس وکن تک محدود تھیں اس لئے بحیثیت مجموعی ہندوستان کی قسمت کے بننے بگڑنے پر اثر نہ ڈال سکیں۔ حیدرعلی ہندوستان کی تاریخ کی ایک قابل قدر اور مشہور شخصیت ہے اُس کے پیشِ نظر ایک قسم کا قومی مقصد تھا اور اُس کے اندر وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اولوالعزم لیڈر میں ہونی چاہئیں۔ باوجودیکہ اُس کی صحت خراب تھی اور وہ ایک بڑی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا تھا اُسے اپنے اوپر پورا پورا قابو حاصل تھا اور اس میں کام کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود تھی۔ اب تک کسی دوسرے کی نگاہیں بحری طاقت کی اہمیت تک نہ پہنچی تھیں اور نہ کسی نے انگریزوں کی اُس بڑھتی ہوئی طاقت کے خطرہ کو محسوس کیا تھا جس کی بنیاد بحری طاقت پر تھی۔ حیدرعلی وہ پہلا شخص تھا جو ان دونوں چیزوں کو بہت مدت سے محسوس کررہا تھا۔ اُس نے ایک متحدہ کوشش کے ذریعہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہا اور اس مقصد کے لئے مرہٹوں، نظام اور شجاع الدولہ والئی اودھ کے یہاں سفارت بھیجی۔ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اپنا بحری بیڑہ بھی بنانا شروع کیا تھا اور مالدیپ کے جزائر کو فتح کرکے اس کو جہاز بنانے کے لئے اور اپنی بحری جدوجہد کے لئے اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ لیکن اُس کی زندگی نے وفا نہ کی، وہ اپنی فوج کے ساتھ کسی مقام کا کوچ کررہا تھا، راستہ میں انتقال کرگیا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو بھی بحری بیڑے کو مضبوط بنانے کی کوشش میں لگا رہا۔ ٹیپو کی نپولین اور سلطان ترکی کے ساتھ بھی خط و کتابت رہی۔

شمال میں سکھوں کی ریاست رنجیت سنگھ کے زیرِ حکومت پنجاب میں پھیل رہی تھی اور بعد میں کشمیر اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ تک پہنچی۔ لیکن

یہ بھی ایک کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے اُس اصلی کشمکش پر اثر نہ ڈال سکی جو سیاسی اقتدار کے لئے ہندوستان میں جاری تھی۔ اٹھارویں صدی کے ختم تک یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ یہ کشمکش اصل میں صرف دو ہی فریقوں کے درمیان تھی ۔ مرہٹے اور انگریز ۔ باقی جتنی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں وہ سب انھیں دو کی ماتحت یا معاون تھیں۔

۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو آخری شکست دی، اس کے بعد انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور مرہٹوں کا آخری معرکہ باقی رہ گیا۔ چارلس مٹکاف نے جو ہندوستان کے سب سے قابل افسروں میں سمجھا جاتا ہے ۱۸۰۶ء میں لکھا ہے " ہندوستان میں بڑی طاقتیں صرف دو ہیں ، مرہٹے اور انگریز — باقی طاقتیں انھیں دو میں سے کسی ایک نہ ایک کے زیر اثر ہیں۔ ہم جتنا پیچھے ہٹیں گے مرہٹے اتنا ہی آگے آجائیں گے "، لیکن مرہٹہ سرداروں میں اتفاق نہ تھا ، وہ انگریزوں سے لڑے تو مگر ایک ایک کر کے شکست کھائی ۔ بعض مشہور لڑائیوں میں وہ جیتے بھی۔ ۱۸۰۴ء میں آگرہ کے قریب اُنھوں نے انگریزوں کو بڑی سخت شکست دی تھی ، لیکن ۱۸۱۸ء تک مرہٹوں کی طاقت کو انگریزوں نے پورے طور پر کچل دیا وسطی ہند کے بڑے مرہٹہ سرداروں نے شکست مان لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطیع ہوگئے ۔ اس کے بعد انگریز ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کے مالک ہوگئے اور اب اُن کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہا ۔ اب قریب قریب سارے ملک پر تو ان کی براہ راست حکومت تھی یا اُن راجاؤں نوابوں کے ذریعہ سے جو اُن کے معاون بن گئے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتے تھے ۔ پنجاب اور بعض دور افتادہ علاقے اُن کے

قبضہ سے باہر تھے لیکن ہندوستان میں، برطانوی سلطنت ایک مسلمہ حقیقت بن چکی تھی۔ بعد میں سکھوں کے ساتھ اور برما میں گورکھوں کے ساتھ جو لڑائیاں ہوئیں اُن سے محض اتنا ہوا کہ نقشہ پر برطانوی سلطنت کی حدود متعین ہو گئیں۔

۱۴۔ تنظیم اور طریق کار میں ہندوستان کی پستی اور انگریزوں کی برتری

اگر ہم ان پچھلے واقعات پر نظر ڈالیں تو یہ بات قریب قریب واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کو بڑے موافق حالات ملتے چلے گئے اور یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے واقعات پیش آتے رہے جو اُن کے مفید مطلب نکلے۔ انھیں جو کامیابی ہوئی اُس کے مقابلہ میں اُن کی کوشش بہت تھوڑی تھی۔ اسی تھوڑی سی کوشش میں اُنھوں نے ایک بڑی سلطنت حاصل کر لی اور اُنھیں کثیر دولت ہاتھ آ گئی کہ دنیا کی قوموں میں پیش پیش نظر آنے لگے اگر واقعات میں ہلکی سی بھی تبدیلی ہو جاتی تو اُن کی ساری اُمیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ ہو جاتا حیدر علی اور ٹیپو نے، مرہٹوں نے، سکھوں نے اور گورکھوں نے اُنھیں بہت سے موقعوں پر شکستیں دیں لیکن خوش نصیبی نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس میں ذرا سی بھی کمی رہ جاتی تو بس ان کے پاؤں ہندوستان کی سرزمین سے اُکھڑ جاتے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ محض ساحلی علاقوں پر ان کا قبضہ باقی رہ جاتا۔

اس کے باوجود ہم اگر اس وقت کے حالات پر تحقیق کی نظر ڈالیں تو یہ حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ جو کچھ وقوع میں آیا ناگزیر تھا۔ خوش قسمتی نے

اُنھیں موقعے تو واقعی بہم پہنچائے لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان میں ان موقعوں سے فائدہ اُٹھانے کی قابلیت موجود تھی۔ ہندوستان مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد محض انتشار کے دور سے گزر رہا تھا، ورنہ کئی صدی تک کچھ ایسا کمزور اور بے بس نہیں ہوا۔ چونکہ مرکزی طاقت پر زوال آچکا تھا اس لئے میدان قسمت آزماؤں کے لئے اور سلطنت کے دعویداروں کے لئے صاف تھا۔ ان قسمت آزماؤں اور دعویداروں میں اُس وقت تنہا انگریز ہی ایسے تھے جن میں وہ بہت سی خوبیاں موجود تھیں جو کامیابی کے لئے ضروری تھیں۔ اُن کی سب سے بڑی دشواری بس یہ تھی کہ وہ بدیسی تھے اور ایک دور دراز ملک سے آئے تھے۔ لیکن اسی دشواری سے اُن کو فائدہ بھی پہنچا کیونکہ کسی نے اُن کو اہمیت نہ دی اور نہ کسی کا یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے اقتدار کے لئے یہ بھی ایک فریق بن سکتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پلاسی کے بعد بھی مدت تک لوگ اسی دھوکے میں رہے انھیں اس وجہ سے اور بھی زیادہ دھوکا ہوا کہ کل رسمی معاملات میں انگریز دلی کے نام نہاد شاہنشاہ کے عامل کی حیثیت سے کام کرتے رہے اُس مالِ غنیمت کی وجہ سے جو یہ بنگال سے لے گئے اور اُن مخصوص طریقوں کی وجہ سے جن سے یہ تجارت کرتے تھے لوگوں کو یہی یقین رہا کہ اُن کو حکومت کی اتنی خواہش نہیں ہے جتنی مال و دولت کی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مصیبت تو ہے مگر عارضی ہے۔ یہ اجنبی بھی تیمور اور نادر شاہ کی طرح ثابت ہوں گے کہ آئے لوٹا مارا اور اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی اور اُس کے پاس جو فوج تھی وہ تجارت کے تحفظ کے لئے تھی۔ رفتہ رفتہ اور ایسے پوشیدہ طریقے پر کہ

دوسرے اسے نہ دیکھ سکے، اس نے اپنے مقبوضات بڑھا لئے۔ اس ترقی کا بڑا سبب یہ ہوا کہ کمپنی نے مقامی جھگڑوں میں حصہ لیا، کبھی ایک فریق کا ساتھ دیا کبھی دوسرے کا، کمپنی کے سپاہی بہتر تربیت پائے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جس فریق کا ساتھ دیا اس کے لئے مفید ثابت ہوئے اور کمپنی نے اس مدد کے عوض میں خوب روپیہ وصول کیا۔ اس طرح کمپنی کی طاقت بھی بڑھتی رہی اور اُس کی فوجیں بھی بڑھتی رہیں۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ فوجیں کرایہ کی فوجیں ہیں، جو چاہے روپیہ دے کر اُنھیں کام میں لائے، یہ حقیقت کہ انگریز کسی دوسرے کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ خود اپنے لئے لڑ رہے ہیں اُس وقت کھلی جب اُن کی طاقت ملک میں خوب مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکی تھی۔

غیر ملکیوں کی طرف سے دلوں میں نفرت کا جذبہ موجود تو پہلے ہی سے تھا اب وہ بڑھنے لگا لیکن یہ کوئی عام قومی احساس نہ تھا اس کا پس منظر بھی جاگیرداری تھا اور وفاداری محض مقامی حکمراں کے ساتھ تھی۔ چین میں جنگی سرداروں کے زمانہ میں لوگ اپنی مفلوک الحالی کی وجہ سے ہر اُس فوجی سردار کے سپاہی بن کر لڑنے کو تیار رہتے تھے جو انھیں تنخواہ دیتا اور جس کے ساتھ رہ کر اُنھیں لوٹ مار کے موقعے ملتے۔ یہی حال اس وقت ہندوستان کا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کے سپاہی اکثر ہندوستانی تھے۔ صرف ایک مرہٹہ قوم ایسی تھی جس میں کچھ قومی جذبہ پایا جاتا تھا اور یہ جذبہ محض اپنے سردار کے ساتھ وفاداری تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ اس پر بھی ہم اس میں وہ ہمہ گیری اور وسعت نہیں پاتے جس کی ضرورت تھی۔ مرہٹوں نے راجپوتوں

کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کی وجہ سے وہ ان سے برافروختہ ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ یہ راجپوتوں کو اپنا دوست بناتے اُنھوں نے اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جیسا مخالف کے ساتھ یا اس ماتحت جاگیردار کے ساتھ کیا جاتا ہے جو ہمیشہ غیر مطمئن اور شاکی رہتا ہے۔ خود مرہٹہ سرداروں میں آپس میں بڑی رقابت تھی اور کبھی کبھی خانہ جنگی تک نوبت پہنچتی تھی یوں کہنے کو وہ باہم متفق تھے اور اُن سب کا ایک مشترک لیڈر بھی تھا جس کا نام پیشوا تھا۔ نازک موقعوں پر اُنھوں نے کبھی ایک دوسرے کی نہیں کی اور اسی وجہ سے فرداً فرداً اُن کو شکست کھانا پڑی۔

تاہم مرہٹوں میں بہت سے لائق مدبر، اور سورما پیدا ہوئے۔ ان میں نانا فرنویس، پیشوا باجی راؤ اول، گوالیار کا مادھوجی سندھیا، اندور کا جسونت راؤ ہلکر اور اہلیہ بائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرہٹے سپاہی بھی اچھے ہوتے تھے، وہ میدان جنگ میں کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے تھے اور بڑی بہادری کے ساتھ جان دیتے تھے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ صلح کی حالت میں بھی اور جنگ کے موقع پر بھی اُن کی بہادری کی تہہ میں اکثر مہم جوئی کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا اور وہ محض شوقیہ لڑتے تھے۔ دنیا کے حالات اور واقعات سے وہ بالکل بے خبر تھے یہاں تک کہ ہندوستان کے متعلق اُن کی جغرافی معلومات بھی بس واجبی ہی واجبی تھی۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ وہ کبھی یہ معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتے تھے کہ اُن کے قرب وجوار میں کیا واقعات رونما ہو رہے ہیں اور اُن کے دشمن کیا کر رہے ہیں۔ اِن کمزوریوں کے ہوتے

ہوئے یہ ناممکن تھا کہ اُن میں دور اندیشی اور تدبر پیدا ہوتا یا کوئی موثر فن حرب نشو و نما پاتا۔ نقل و حرکت میں اُن کی تیز رفتاری سے اکثر دشمن کے ارمان جلتے رہتے تھے لیکن اصل میں اُن کے نزدیک جنگ کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ دلیری سے دشمن پہ پیہم حملے کرتے رہیں۔ بعد میں اُنھوں نے اپنی فوجوں کی تنظیم مقررہ ضوابط کے مطابق کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بہتر ہتھیاروں سے کام لینے لگے لیکن ان کی وہ تیز رفتاری اور حرکت پذیری باقی نہیں رہی۔ اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ بنا سکے۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے تھے اور ایک حد تک تھے بھی، لیکن صلح کی حالت ہو یا جنگ کی اُنھیں دھوکا دینا کوئی مشکل کام نہ تھا کیونکہ اُن کے خیالات کی دنیا بہت تنگ تھی اور وہ اس کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

ہندوستانی حکمراں بہت پہلے یہ محسوس کر چکے تھے کہ بیرونی ممالک کی تربیت یافتہ فوجیں ضبط اور فنی قابلیت کے اعتبار سے ہندوستانی فوجوں سے برتر ہیں۔ اُنھوں نے اپنی فوجوں کو تربیت دلانے کے لئے فرانسیسی اور انگریز افسر نوکر رکھے اور ان دونوں کی آپس کی رقابت کی وجہ سے ہندوستانی فوج کو ترقی ہوئی۔ حیدر علی اور ٹیپو کو بحری طاقت کی اہمیت کا بھی کچھ اندازہ تھا اور اُنھوں نے سمندر میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جہازی بیڑا تیار کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن یہ کوشش بہت دیر سے شروع کی گئی تھی اور کامیاب نہ ہوسکی۔ مرہٹوں نے بھی اس سلسلہ میں خفیف سی کوشش کی تھی۔ ہندوستان میں جہاز تو بنتے تھے لیکن تھوڑے وقت میں حریفوں کی مسلسل مخالفت کے باوجود ایک

بڑا بحری بیڑہ تیار کر لینا آسان کام نہ تھا۔ فرانسیسی ہندوستان سے جا چکے
تھے۔ اس وجہ سے ہندوستانی طاقتوں کی فوجوں میں بہت سے اچھے
افسر کم ہو گئے تھے۔ جو بیرونی افسر باقی تھے وہ انگریز تھے اور ان کی
حالت یہ تھی کہ لڑائی کے نازک ترین موقعوں پر اپنے آقا کا ساتھ
چھوڑ دیتے تھے اور بعض اوقات غداری کر کے اس کے دشمن (یعنی انگریز)
کے آگے مع اس کی فوج اور خزانے کے ہتھیار ڈال دیتے تھے۔

غیر ملکی افسروں پر ہندوستانی طاقتوں کا یہ بھروسا ان کی اپنی فوجی تنظیم
کی کمزوری کا ثبوت تھا اور ان کے حق میں ایک مستقل خطرہ تھا اس لئے کہ
یہ غیر ملکی افسر بالکل ناقابل اعتبار تھے۔ اکثر انگریزوں کی طرف سے
ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں اور سلطنت کے کام کرنے والوں میں
ایک طاقتور پانچواں کالم موجود ہوتا تھا۔

مرہٹے، باوجودیکہ ایک قوم تھے اور اپنے اندر قومی جذبہ بھی رکھتے
تھے، پھر بھی ان کا ملکی اور فوجی انتظام پست تھا، دوسری ریاستوں
کی حالت تو اور بھی زیادہ خراب تھی، راجپوت باوجود اپنی شجاعت اور
مردانگی کے ابھی پرانے جاگیری طریق پر کاربند تھے وہ خیالی دنیا میں
رہنے والے لوگ تھے اور عملی قابلیت سے محروم تھے اسی کے ساتھ
ذاتی جھگڑوں کی وجہ سے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی تھی۔ ان میں
بہت سے کچھ تو اکبر کی گذشتہ پالیسی کی وجہ سے اور کچھ احساس وفاداری
کی وجہ سے جو جاگیرداری نظام میں فرمانروا کے ساتھ ہوا کرتا ہے دہلی کی مٹتی
ہوئی طاقت کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن دہلی کی سلطنت اس قدر
کمزور ہو چکی تھی کہ اسے راجپوتوں کی حمایت سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور

بالآخر وہ سندھیا کے زیر اثر آ گئی، راجپوت کمزور ہوتے چلے گئے اور دوسروں کا آلۂ کار بن گئے البتہ بعض راجپوت سردار ایسے بھی نکلے جو اپنے بچاؤ کے لئے بہت ہوشیاری سے چالیں چلتے رہے اور اپنے آپ کو بچا لے گئے۔ شمالی اور وسطی ہند کے بہت سے مسلمان حکمران اور سردار بھی راجپوتوں ہی کی طرح جاگیری مطمح نظر رکھتے تھے۔ اس زمانہ کی تاریخ میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں سوائے اس کے کہ عوام کی تباہ حالی اور ملک کے انتشار میں ان کی وجہ سے اور اضافہ ہو گیا۔ ان میں سے بعض نے مرہٹوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

نیپال کے گورکھے بڑے اعلیٰ درجہ کے قواعد داں سپاہی تھے۔ اور اگر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں سے برتر نہ تھے تو کچھ کم بھی نہ تھے۔ گو ان کے یہاں بھی وہی جاگیری تنظیم تھی مگر انھیں اپنے وطن سے بڑی محبت تھی اور اس کی حفاظت کے لئے جان توڑ کر لڑتے تھے۔ انگریز اُن سے ڈرتے تھے لیکن ہندوستان میں جو اصل کشمکش تھی اس پر وہ اثر انداز نہ ہو سکے۔

مرہٹے شمالی اور وسطی ہند کے بڑے علاقوں میں پھیل چکے تھے لیکن یہاں اُنھوں نے اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی، اُن کی سلطنت کو پائیداری نصیب نہ ہوئی، وہ ادھر قائم ہوئی اور اُدھر ختم ہو گئی۔ اس وقت پائیداری اور استحکام تو کسی کو بھی حاصل نہ تھا، کیونکہ جنگ میں قسمت بہت جلدی جلدی پلٹا کھاتی تھی، کبھی ہار ہوتی تھی اور کبھی جیت۔ بہت سے علاقوں میں انگریزوں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ یہ علاقے اُن کے قبضہ میں تھے یا اُن کے مطیع

ہو چکے تھے لیکن یہاں نہ اُن کی اپنی جڑیں مضبوط ہوئی تھیں نہ اُن کے نظامِ حکومت کی۔

مرہٹوں کے طریقِ کار کی خصوصیت بہم جوئی اور شوقیہ نبرد آزمائی تھی دوسری ہندوستانی طاقتیں اس خصوصیت میں مرہٹوں سے بھی بڑھی چڑھی تھیں لیکن انگریز اس معاملہ میں ان سے بالکل مختلف تھے وہ خالص پیشہ ور سپاہی تھے۔ کمپنی کے بہت سے انگریز عامل ذاتی طور پر مہم جوئی کرتے تھے لیکن ان کی مجموعی پالیسی میں مہم جوئی کو کوئی دخل نہ تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے دائرے میں اس پالیسی پر عمل کرتا تھا۔ ایڈورڈ تھامسن لکھتا ہے "ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے دیسی راجاؤں اور نوابوں کے دربار میں جو عامل بھیجے گئے وہ ایسے منتخب اور چیدہ اشخاص تھے کہ خود برطانوی سلطنت کو بھی شاید ہی کبھی ایسے کار گزار میسر آئے ہوں" ہر دربار میں برطانوی ریزیڈنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ حکومت کے وزیروں اور افسروں کو خوب رشوت دے۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ ان کا جاسوسی نظام بھی بڑا مکمل تھا۔ اُن کو دربار کی اور اپنے حریف کی فوجوں کی پوری پوری خبر رہتی تھی بہ خلاف اس کے ان حریفوں کو ذرا پتہ نہ چلتا تھا کہ انگریز کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنے والے ہیں۔

برطانوی پانچویں کالم کی کارروائیاں جاری رہتی تھیں اور نازک موقعوں پر اور ایسے وقت جب کہ جنگ اپنی انتہا پر پہنچی ہوتی تھی خود ریاستوں کے لوگ اپنے آقاؤں کے ساتھ غداری کر کے اِن سے آملتے تھے یہ غداریاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ بہت سی لڑائیاں ایسی تھیں جو دشمن کے خلاف باقاعدہ لڑائی لڑنے سے پہلے ہی انگریزوں نے جیت لی تھیں۔ پلاسی

کی جنگ میں یہی معاملہ پیش آیا اور سکھوں کی لڑائیوں تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ غداری کی ایک نمایاں مثال گوالیار کا یہ واقعہ ہے کہ سندھیا کے ایک بڑے افسر نے عین لڑائی کے وقت انگریزوں سے ساز باز کر لیا اور ایک پوری فوج سمیت ان سے جا ملا۔ اُسے اِس غداری کا صلہ یہ ملا کہ انگریزوں نے سندھیا سے جو علاقے جیتے ان میں سے ایک علاقہ کا اُسے آزاد حکمراں بنا دیا۔ وہ ریاست آج بھی ہے لیکن اس آدمی کا نام غداری اور دغا بازی کے لئے بالکل اُسی طرح ضرب المثل ہے جس طرح موجودہ زمانہ میں کوئزلنگ کا نام۔

اس طرح انگریزوں نے جو سیاسی اور فوجی نظام قائم کیا وہ ہندوستان کے نظام سے بہت بہتر تھا اس نظام کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے اور اس کے چلانے والے لیڈر بھی بہت قابل تھے۔ وہ اپنے مخالفوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ باخبر تھے اور اُنھوں نے ہندوستانی طاقتوں کی نااتفاقی اور باہمی رقابت سے بھی خوب فائدہ اُٹھایا، سمندر پر اُنھیں جو اقتدار حاصل تھا اس کی وجہ سے اُن کے پاس محفوظ بحری اڈے موجود تھے اور اُنھیں بہت سی آسانیاں میسر آ گئیں تھیں اور اُن کے جنگی وسائل بہت بڑھ گئے تھے یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی طاقتیں ان سے ایک دفعہ شکست کھا کر ایسی تباہ ہوتی تھیں کہ پھر پنپ نہ سکتی تھیں۔

جنگوں اور فتوحات کے اِس زمانہ میں وسطی ہند، راجپوتانہ جنوب اور مغرب کے بعض حصّے ایسے لاوارث علاقے بن گئے جن میں ظلم، دکھ اور مصیبت کے سوا کچھ نہ تھا، پہلے تو ان علاقوں کو فوجوں نے روندا،

پھر لٹیروں اور ڈاکوؤں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ یہاں کے باشندوں کی بپتا کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ جو تھا وہ ان کے مال و دولت کو تکتا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے حصّوں کی وہ حالت ہوگئی۔ جو تیس سالہ جنگ کے زمانہ میں وسطی یورپ کی ہوگئی تھی۔ یوں تو حالات سبھی جگہ خراب تھے مگر اُن علاقوں میں جو انگریزوں کے قبضہ میں تھے یا ان کے مطیع تھے حالت اور بھی زیادہ خراب تھی ایڈورڈ تھامسن اس حالت کو یوں بیان کرتا ہے " دکھ، مصیبت، تباہی اور بربادی کی جیسی انوکھی تصویر مدراس میں اور اودھ اور حیدر آباد کی ماتحت ریاستوں میں ملتی ہے شاید ہی کہیں ملے۔ اس کے مقابلہ میں وہ علاقے ہیں جہاں مرہٹہ مدبر نانا فرنویس حکومت کر رہا ہے، ان کو یوں سمجھو کہ یہ سکون اور امن کا ایک خوشنما گلستان ہے "

اس دور سے پہلے دور میں گو مغلیہ سلطنت منتشر ہو چکی تھی مگر ہندوستان کا بڑا حصہ انتشار اور ابتری سے محفوظ تھا۔ بنگال میں مغلوں کے نیم آزاد وائسرائے علی وردی کے طویل عہد میں ایک پُر امن اور باضابطہ حکومت قائم تھی۔ تجارت اور کاروبار ترقی پر تھے اور صوبہ کی دولت بڑھ رہی تھی۔ علی وردی کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ہوئی، اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دہلی کے شاہنشاہ کے ...ں کی حیثیت سے عمل دخل ہوگیا۔ کمپنی کو تو وہ عامل تھی، لیکن حقیقت میں بالکل آزاد اور تمام سیاہ و سپید کی مالک تھی۔ اس قبضہ کے بعد کمپنی کے عاملوں اور گماشتوں نے بنگال کو خوب لوٹا۔ پلاسی کی جنگ کے چند سال بعد وسطی ہند میں

اندور کی رانی اہلیہ بائی کا عہد حکومت شروع ہوا اور تیس سال (۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۵ء) تک جاری رہا۔ اہلیہ بائی کے عہد میں ایسا مکمل امن و امان اور اعلیٰ انتظام حکومت تھا اور لوگ اس قدر خوش حال تھے کہ اس دور کی خوبیاں آج تک قصہ کہانیوں میں مشہور ہیں۔ اہلیہ بائی بڑی قابل حکمراں اور منتظم عورت تھی اُس کی زندگی میں رعایا اُس کا بڑا احترام کرتی تھی اور مرنے کے بعد تو رعایا نے شکر گذاری کے جذبہ کے ماتحت اُسے ولایت کے مرتبے پر پہنچا دیا۔ اس طرح عین اس وقت جب کہ بنگال اور بہار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظام میں ابتری پھیلی ہوئی تھی اور قحط پڑ رہا تھا وسطی ہند اور ملک کے بہت سے دوسرے حصے خوش حال تھے۔

انگریزوں کے پاس طاقت بھی تھی اور دولت بھی، لیکن انھوں نے اچھا انتظام حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری کبھی محسوس نہ کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کو تو بس ملک کی دولت سے اور اپنے منافع کی رقموں سے سروکار تھا۔ انھیں ملک کی حالت بہتر بنانے کی کوئی پروا نہ تھی یہاں تک کہ انھیں رعایا کی حفاظت کا بھی خیال نہ تھا خصوصیت کے ساتھ اُن ریاستوں میں جو انگریزوں کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ حکومت اور ذمہ داری دو بالکل جُدا چیزیں تھیں آج ہمیں بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو ابتری اور طوائف الملوکی سے نجات دلائی۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ انھوں نے اس زمانہ کے بعد جسے مرہٹوں نے "دہشت کا زمانہ" بتایا ہے ملک میں ایک باقاعدہ نظام حکومت قائم کر دیا۔ لیکن خود اس ابتری اور طوائف الملوکی کا ایک سبب ایسٹ انڈیا کمپنی اور کمپنی کے ہندوستانی نمایندوں کی پالیسی تھی،

یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اقتدار کے لئے جو جنگ جاری تھی اُس کے ختم ہونے کے بعد انگریزوں کے دخل در معقولات بغیر بھی ملک میں باقاعدہ نظام حکومت قائم ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کی پانچ ہزار سال کی تاریخ میں اس قسم کی ترقیاں پہلے بھی ہوتی رہی تھیں، اور ایک ہندوستان ہی کیا دوسرے ملکوں میں بھی ہمیشہ ایسا ہوا ہے۔

۱۵ - رنجیت سنگھ اور جے سنگھ

یہ بات بالکل صاف ہے کہ دو وجہوں سے ہندوستان بیرونی فتوحات کا شکار بنا۔ ایک تو یہ کہ خود ہندوستانیوں کی اندرونی حالت ابتر تھی اور دوسرے یہ کہ انگریزوں نے جو اجتماعی نظام پیش کیا وہ ہندوستانی کے نظام سے زیادہ بلند اور ترقی یافتہ نظام تھا۔ دونوں طرف کے لیڈروں میں نمایاں فرق تھا۔ ہندوستانی ہر قسم کی قابلیت رکھتے تھے لیکن ان کے خیال اور عمل کی دنیا تنگ اور محدود تھی۔ اُنھیں کچھ خبر نہ تھی کہ دوسرے مقامات پر کیا واقعات رونما ہو رہے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہ بنا سکے۔ اگر کبھی افراد میں تجسس کا جذبہ اُبھرا بھی تو وہ اس حصار کو نہ توڑ سکے جس میں وہ اور اُن کی قوم مقید تھی بہ خلاف اس کے انگریزوں کو دنیا میں کامیاب ہونے کا ڈھب ان سے کہیں زیادہ آتا تھا، خود ان کے اپنے ملک میں اور فرانس اور امریکہ میں جو حالات رونما ہوئے تھے اُنھوں نے اُن کو جھنجھوڑ کر چونکا دیا اور غور و فکر سے کام لینے پر مجبور کر دیا۔ مغرب میں اب تک دو انقلاب رونما ہو چکے تھے۔ فرانس کی انقلابی فوجوں اور نپولین کے حملوں نے فن جنگ

کی کایا پلٹ دی تھی۔ ناواقف سے ناواقف انگریز بھی جو ہندوستان آتا تھا اپنے سفر میں دنیا کے مختلف حصّوں کو دیکھتا ہوا آتا تھا خود انگلستان میں بڑے بڑے انکشافات ہو رہے تھے جو صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ تھے گو اُس وقت بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ ان انکشافات کی کیا اہمیّت ہے اور ان کے اثرات کہاں تک پہنچیں گے۔ لیکن تبدیلی نہایت زور کے ساتھ ظہور میں آ رہی تھی اور لوگ اس کا اثر لے رہے تھے۔ اس سب کی آڑ میں وہ قوّت تھی جس نے انگریزوں کو دور دراز ملکوں میں بھیجا۔

جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے اُن کے دماغوں پر اُس زمانہ کی جنگیں ہنگامے سیاسی اور فوجی لیڈر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے ہمیں اُن تبدیلی کا بہت تھوڑا حال بتایا ہے جو اس وقت ہندوستانیوں کے دماغوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے اُن اقتصادی اور اجتماعی عمل کا جو بروئے کار آ رہا تھا کہیں پورا پورا ذکر نہیں کیا ہے اس ناقص تاریخ میں بس کہیں کہیں ان واقعات کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے عام لوگ اس دہشت کے زمانہ میں بالکل پامال کر دئے گئے تھے اور اُن کی قوّت سلب ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بدقسمتی پر قانع ہو چکے تھے۔ تجسّس سے بیزار تھے اور اسی لئے محروم بھی تھے۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے ہوں گے جن میں تجسّس کا مادّہ ہو گا اور جنھوں نے اُن نئی قوتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گی جو بروئے کار آ رہی تھیں لیکن واقعات کے سیلاب نے اُن پر غلبہ پا لیا اور وہ خود ان واقعات پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔

اس قسم کے لوگوں میں ایک شخص مہاراجہ رنجیت سنگھ ہوا ہے وہ ایک جاٹ سکھ تھا جس نے پنجاب میں ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ آگے چل کر

اس کی سلطنت کا دائرہ کشمیر اور صوبہ سرحد تک جا پہنچا۔ اس میں کوتاہیاں اور برائیاں بھی تھیں پھر بھی وہ ہندوستان کی تاریخ کی ایک ممتاز شخصیت ہے۔ فرانسیسی ژاک ماں اس کو "حد درجہ کا شجاع" بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں نے جتنے ہندوستانی دیکھے اُن میں وہ پہلا تحقیق پسند ہندوستانی ہے۔ اور اس کی جستجو پسندی پوری قوم کی بے حسی کی تلافی کرتی ہے۔ اُس کی گفتگو ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی خواب پریشان دیکھ رہا ہو"[۵۰]

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستانی عموماً خلوت پسند لوگ ہیں اور یہ خصوصیت اِن کے ذی فہم لوگوں میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگوں نے اُن غیر ملکی فوجی لیڈروں سے ملنا پسند کیا ہوگا جو اس وقت ہندوستان میں تھے اور جن کی حرکتوں نے اُن کے دلوں میں دہشت پیدا کر دی۔ یہ ذی فہم لوگ اپنی خودداری کو محفوظ رکھنے کے لئے جہاں تک ہو سکا بیرونی عنصر سے دور ہی رہتے تھے اگر ملتے بھی تھے تو صرف رسمی موقعوں پر جہاں حالات ان کو ان غیر ملکی لوگوں کے ساتھ ملنے پر مجبور کرتے تھے۔ جن ہندوستانیوں سے انگریزوں اور دوسرے غیر ملکیوں کا میل جول تھا اُن میں یا تو وہ مصلحت پرست اور خوشامدی لوگ تھے جو اِن کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے یا ہندوستانی ریاستوں کے وہ وزیر جو بالعموم رشوت خور اور سازشی ہوتے تھے۔

رنجیت سنگھ نہ صرف ذہنی تجسس رکھنے والا اور تحقیق پسند شخص تھا بلکہ اُس زمانہ میں جب کہ ہندوستان اور ساری دنیا میں بے رحمی اور سنگدلی کا

---

[۵۰] تھامسن صفحہ ۱۵۰ سے منقول

دور دورہ تھا وہ اپنی کریم النفسی کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اُس نے ایک وسیع سلطنت قائم کی اور ایک زبردست فوج تیار کی مگر اس کے باوجود اُسے خونریزی پسند نہ تھی۔

پرنسیپ کہتا ہے "کبھی ایسا نہ ہوا ہوگا کہ کسی ایک شخص نے اتنی کم خونریزی کے ساتھ اتنی بڑی سلطنت قائم کی ہو۔" اُس نے سخت سے سخت جرم کے لئے بھی موت کی سزا نہیں رکھی تھی۔ اوسبرن جو اُس کے دربار میں باریاب ہوا لکھتا ہے " جنگ کے میدان کے سوا اُس نے کبھی کسی کی جان نہیں لی حالانکہ خود اُس کو قتل کرنے کی بارہا کوشش کی گئی ہیں اُس کے عہد حکومت میں ظلم اور تشدد کے واقعات نہیں ملتے اور اس معاملہ میں وہ اُن بادشاہوں سے کہیں بہتر ہے جو اُس سے زیادہ مہذب ہیں"[۵۱]

راجپوتانہ میں جے پور کا راجہ جے سنگھ بھی ایک اچھا مدبر گزرا ہے مگر اپنی خصوصیات میں وہ رنجیت سنگھ سے مختلف تھا۔ اُس کا زمانہ بھی کچھ پہلے تھا۔ اس نے ۱۷۴۳ء میں انتقال کیا۔ وہ اُس زمانے میں تھا جب اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اپنی ہوشیاری اور مصلحت شناسی کی بدولت وہ تغیرات اور حوادث کے سیلاب سے بچ نکلا۔ پہلے تو اُس نے دہلی کے شاہنشاہ کی اطاعت قبول کی اور جب دیکھا کہ مرہٹوں کی طاقت کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے تو اُس نے دہلی کے شاہنشاہ کی طرف سے اُن کے ساتھ صلح کر لی۔ مجھے اس کی شخصیت کے ساتھ دلچسپی ہے

---

۵۱ تھامسن صفحہ ۱۵۷-۱۵۸ سے منقول

وہ اس کی سیاسی اور فوجی زندگی کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک بہادر سپاہی اور منجھا ہوا سیاست داں تھا لیکن اس کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ وہ ریاضی اور ہیئت کا عالم تھا، سائنس داں تھا، تعمیر بلدہ کا ماہر تھا اور تاریخ کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ جے سنگھ نے جے پور، دہلی، اجین، بنارس اور متھرا میں بڑی بڑی رصد گاہیں بنوائیں۔ اُس نے پرتگالی مشنریوں سے سنا کہ پرتگال میں علم ہیئت نے بڑی ترقی کی ہے۔ چنانچہ ایک مشنری کے ساتھ اُس نے پرتگال کے بادشاہ ایمینوئل کے دربار میں اپنے آدمی بھیجے۔ ایمینوئل نے جے سنگھ کے پاس اپنے سفیر زےویردی سلوا کو بھیجا جو اپنے ساتھ دی لاہیر کی بنائی ہوئی جدولیں لایا۔ جے سنگھ نے ان کا مقابلہ اپنے ہاں کی جدولوں سے کیا تو معلوم ہوا کہ پرتگالی نقشے اتنے صحیح نہیں ہیں اور ان میں متعدد غلطیاں ہیں۔ اُس نے ان غلطیوں کی وجہ یہ بتائی کہ حساب لگانے کے لئے جو آلات استعمال کئے گئے تھے اُن کے "قطر ادنیٰ درجہ" کے تھے۔ جے سنگھ ہندوستانی ریاضی سے خوب واقف تھا۔ اُس نے قدیم یونانی کتب کا مطالعہ کیا تھا اور یورپ کے جدید ریاضیاتی نظریات سے بھی واقف تھا۔ اُس نے کچھ یونانی کتابوں مثلاً اقلیدس وغیرہ کا اور بعض یورپی تصانیف کا جو سطحی اور کروی علم مثلث اور لوگارتھم کے بنانے اور استعمال کرنے کے متعلق تھیں سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ اُس نے ہیئت کی عربی کتابوں کے بھی ترجمے کرائے۔

جے سنگھ نے جے پور کے شہر کی بنیاد ڈالی۔ اُسے تعمیر بلدہ کے فن سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے یورپ کے بہت سے شہروں کے

نقشے منگائے اور اُن کو دیکھ کر اپنا نقشہ تیار کیا۔ پُرانے یورپی شہروں کے یہ نقشے آج تک جے پور کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ جے پور کا نقشہ اِس عمدگی اور ہوشیاری کے ساتھ بنایا گیا تھا کہ یہ شہر آج تک تعمیر بلدہ کی ایک عمدہ مثال سمجھا جاتا ہے۔

جے سنگھ کی عمر نسبتاً تھوڑی ہوئی لیکن اس قلیل مدت میں اس نے یہ سب کچھ کیا اور اِس کے سوا اور بھی بہت کچھ کیا حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگ کے بادل ہر طرف منڈلا رہے تھے، درباری سازشوں کا بازار گرم تھا۔ جن کی لپیٹ میں اکثر وہ خود بھی آجاتا تھا۔ نادر شاہ کا حملہ جے سنگھ کی موت سے صرف چار سال پہلے ہوا۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ ایسے زمانہ میں جو ہندوستان کی تاریخ کے تاریک ترین زمانوں میں سے ہے اور انتشار، ہنگامہ اور جنگ کے واقعات سے بھرا ہوا ہے، اور ایک ایسے علاقہ میں جو جاگیری نظام کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا جے سنگھ جیسا سائنس داں پیدا ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی تحقیق کا جذبہ ہندوستان میں ذرا نہیں ہوا تھا۔ اگر اسے بروئے کار آنے کا موقع ملتا تو بہت اچھے نتائج حاصل ہوتے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جے سنگھ کوئی تاریخی اعجوبہ یا اپنے زمانہ کا تنہا مفکر تھا جو ایک ناسازگار اور مخالف احول میں پیدا ہوا۔ درحقیقت وہ اپنے زمانہ کی پیداوار تھا۔ اور اُس نے علمی کام کرنے کے لئے اور بھی بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر لیا تھا۔ انھیں میں سے چند آدمیوں کو اُس نے سفارت میں پرتگال بھیجا۔ اور اس معاملہ میں وقت کے سماجی رواج اُس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ اس زمانے میں لوگ سائنس کے نظری اور عملی کام کی کافی استعداد رکھتے تھے مگر انھیں اس کے استعمال کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آگے چل کر بھی مدتوں تک وہ اس موقع سے محروم رہے۔ سورشوں اور ہنگاموں کے ختم ہو جانے کے بعد بھی حکومت کی طرف سے سائنٹفک تحقیقات کی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔

۱۶۔ ہندوستان کا اقتصادی پس منظر

انگلستان کی زندگی کے دو پہلو

جس وقت یہ اہم سیاسی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں ہندوستان کا اقتصادی پس منظر کیا تھا؟ وی۔ اینسٹے لکھتا ہے کہ "اٹھارہویں صدی کے آخر تک ہندوستان کے پیداوار کے طریقے اور صنعتی اور تجارتی تنظیم ویسی ہی تھی جیسی دنیا کے دوسرے حصوں کی صنعتی اعتبار سے ہندوستان ایک بہت ترقی یافتہ ملک تھا اور اس کی مصنوعات یورپ اور دوسرے ممالک کو جاتی تھیں۔ ہندوستان کا صرافہ سارے ملک میں اس قدر ترقی یافتہ اور منظم تھا کہ بڑی کاروباری کوٹھیوں سے جو ہنڈیاں جاری ہوتی تھیں وہ سارے ہندوستان بلکہ ایران، کابل، ہرات، تاشقند اور وسطی ایشیا کے دوسرے ممالک میں بھی بھنائی جا سکتی تھیں۔ سوداگروں کا سرمایہ بڑھ رہا تھا اور ملک میں ہر جگہ ایجنٹوں، بیچ کے بیوپاریوں اور دلالوں کا سلسلہ موجود تھا۔ جہاز بنانے کی صنعت ترقی پر تھی۔ نپولین کی جنگ میں ایک برطانوی امیر البحر کے بیڑے کا ایک جہاز

ایک ہندوستانی کارخانے کا بنا ہوا تھا۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ہندوستان بھی اپنی صنعت، تجارت اور اپنے مالیہ کے اعتبار سے اتنا ہی ترقی یافتہ تھا جتنا کوئی دوسرا ملک، یہ ساری ترقی ممکن ہی نہ تھی اگر ملک میں مدّت تک ایک مستحکم اور پُرامن حکومت قائم نہ رہی ہوتی اور آمد و رفت اور تجارت کے راستے ہمیشہ محفوظ نہ رہے ہوتے۔ غیر ملکی مہم جو ابتداءً اسی وجہ سے ہندوستان آئے تھے کہ اُن کے ملک میں ہندوستانی مصنوعات کی بڑی مانگ تھی۔ اپنے ابتدائی دور میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصلی کاروبار یہی تھا کہ وہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں یورپ کے بازاروں میں بیچتی تھی۔ اور یہ کاروبار درحقیقت بہت نفع بخش تھا کمپنی کے شریکوں کو منافع کی بہت بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ پیداوار کے ہندوستانی طریقے اس قدر کامیاب اور منظم تھے اور ہندوستانی صنّاع اور کاریگر اتنے ہوشیار تھے کہ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ پیداوار کی ان اعلیٰ طریقوں کا مقابلہ کر سکتے تھے جو اس زمانہ میں انگلستان میں نشو و نما پا رہے تھے۔ اس وقت بھی جب انگلستان میں مشینوں کا بڑا عہد شروع ہوا ہے ہندوستان کی بنی ہوئی بے شمار چیزیں انگلستان میں بکتی تھیں۔ ایسے بڑے بھاری محصول لگا کر روکا گیا اور بعض اوقات تو انگلستان میں ہندوستانی مال کے بکنے کی بالکل ہی ممانعت کردی گئی۔ ۱۷۵۷ء میں جس سال جنگ پلاسی ہوئی ہے کلایو نے بنگال کے شہر مرشدآباد کے متعلق لکھا تھا کہ "یہ شہر اتنا ہی وسیع، آباد اور دولتمند ہے جتنا کہ لندن فرق بس یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے مال و دولت میں بہت زیادہ ہیں" مشرقی بنگال کا شہر ڈھاکہ اپنی ململ کی

وجہ سے مشہور تھا۔ یہ دونوں شہر ہندوستان کے سرحدی علاقے میں واقع تھے۔ ملک کے اندر تو ان سے بھی بڑے بڑے شہر موجود تھے۔ ان کے علاوہ صنعت اور تجارت کے بہت سے مرکز ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور بازار کی قیمتوں کی خبر رسانی کا ایسا عمدہ نظام قائم تھا کہ خبریں بہت جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی تھیں اُس زمانہ میں جو جنگیں ہوا کرتی تھیں اُن کی اطلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو تو بعد میں پہنچتی تھیں مگر تجارتی کوٹھیوں کو اُن سے پہلے خبر ہو جاتی تھی۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ہندوستان کا اقتصادی نظام اپنی پوری نشو و نما کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد یہ ترقی نہ کر سکی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں اور زیادہ آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی یا اس کی ترقی محض اس وجہ سے رک گئی کہ وہ کٹر قسم کے سماجی نظام کے ساتھ وابستہ تھا اگر حالات مساعد ہوتے تو ممکن تھا کہ اس میں تبدیلی واقع ہوتی اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو نئے صنعتی حالات کے مطابق بنا لیتا۔ مگر باوجود اس کے کہ اس میں تبدیلی کی صلاحیت تھی، یہ تبدیلی اسی وقت ہو سکتی تھی جب خود اس کے اندر سے ایک انقلاب پیدا ہو۔ شاید کسی ایسے عامل کی ضرورت تھی جو خود کوئی اثر نہ ڈالے بلکہ صرف اندرونی عمل میں مدد دے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے ہندوستان کا اقتصادی نظام خواہ کتنا ہی منتظم اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو پھر بھی زیادہ عرصہ تک اُن ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، جو صنعتی بن چکے تھے۔ اُسے یا تو اپنے آپ کو بھی صنعتی بنانا پڑتا یا بیرونی طاقتوں کے اقتصادی اثر کے آگے جھکنا پڑتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پھر ان طاقتوں کی طرف سے سیاسی

مداخلت بھی ہوتی۔ یہاں اتفاق یہ ہوا کہ سیاسی تسلط پہلے آیا اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی اپنی اقتصادی تنظیم جو اس نے مدّت میں قائم کی تھی، تیزی کے ساتھ برباد ہونے لگی، اور اس کی جگہ کوئی مثبت اور تعمیری شکل پیدا نہیں ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں برطانیہ کی سیاسی طاقت کی بھی نمائندگی کرتی تھی اور اس کی اقتصادی طاقت اور مستقل تجارتی مفاد کی بھی۔ کمپنی مطلق العنان تھی اور چونکہ تاجروں کی جماعت تھی اس لئے محض روپیہ کمانے پر تلی ہوئی تھی۔ اُسی زمانہ میں جب کہ کمپنی حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ بے شمار دولت کما رہی تھی ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے اس کی بابت "ویلتھ آف نیشنز" میں لکھا تھا کہ "کسی ملک میں ایک تجارتی کمپنی کی فرمانروائی شاید حکومت کی بدترین شکل ہے۔"

گو ہندوستانی سوداگر اور صنعتی طبقے دولت مند تھے۔ سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور ملک کے اقتصادی نظام پر قابض تھے مگر ان کے پاس سیاسی طاقت نہ تھی۔ مُلک کی حکومت مطلق العنان تھی اور بڑی حد تک جاگیری۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت جاگیری خصوصیات میں یہ حکومت ہندوستان کی تاریخ کے بعض پچھلے دوروں سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اُس زمانہ میں بیچ کا طبقہ اتنا طاقتور نہ تھا کہ یورپ کے بعض ملکوں کی طرح سیاسی قوت پر قبضہ کر لیتا۔ یہاں کے لوگ تو بے حس ہو چکے تھے اور غلامی پر قانع تھے اس طرح ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا تھا جس کو پُر کئے بغیر کسی انقلاب کا رونما ہونا ناممکن تھا، یہ خلاء غالباً اس وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ ہندوستانی سماج پر جمود طاری ہو گیا تھا اور وہ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ بدلنے پر تیار نہ تھی۔ جو تہذیب اس طرح

تبدیلی سے بچتی ہے اس کا زوال لازمی ہے۔ اُس وقت کی سماج اپنی ساخت
کے اعتبار سے ایسی تھی کہ اس کے لئے اب کوئی تخلیقی کام باقی ہی نہ رہا
تھا۔ اس میں ایک شدت سے تبدیلی کی ضرورت تھی۔

اُس زمانہ میں انگریز سیاسی اعتبار سے بہت آگے تھے۔ اُن کے
یہاں سیاسی انقلاب ہوچکا تھا اور اُنھوں نے بادشاہ کے مقابلے میں پارلیمنٹ
کی طاقت کی برتری تسلیم کر لی تھی اُن کے بیچ کے طبقوں کو اپنی طاقت کا
احساس ہوچکا تھا اور وہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے خواہشمند تھے۔ وہ
قوت اور جوش جو کسی سماج کے ترقی پسند ہونے کی دلیل ہوتا ہے
ہمیں انگلستان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، اس کا اظہار بہت سے
طریقوں سے ہوا مگر سب سے زیادہ اُن ایجادوں اور انکشافوں کی شکل
میں جنھوں نے صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی یہ سب کچھ تھا مگر ذرا اس پر
تو غور کیجئے کہ برطانیہ کا حکمراں طبقہ اُس وقت کیسا تھا۔ امریکہ کے مشہور
مورخ چارلس اور میری بیرڈ نے امریکی انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع
پر برطانوی حکمراں طبقہ کے وہ حالات بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے انھیں
امریکا سے ہٹنا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس طبقہ کے فوجداری کے قوانین وحشیانہ
تھے۔ ان کے یونیورسٹیوں کے نظام میں تنگ نظری اور تعصب تھا۔ ان
کے نزدیک حکومت نام تھا عہدوں پر قبضہ کرنے اور امتیازی مراعات حاصل
کرنے کا۔ ان کے دل کھیتوں اور دکانوں میں کام کرنے والے مردوں
اور عورتوں کی نفرت سے معمور تھے۔ ان کے یہاں عوام تعلیم سے محروم
تھے۔ ایک مقررہ مذہب تھا جو کیتھولک لوگوں اور آزاد پروٹسٹنٹ فرقوں،
سے زبردستی طور پر منوایا جاتا تھا۔ دیہات میں پادریوں کی حکومت تھی، فوج اور

بڑی بڑی جاگیروں والے بے درد اور ظالم تھے۔ حکومت کی طرف سے یہ نظام مقرر کر دیا گیا تھا کہ وراثت میں صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک اور قابض ٹھہرایا جائے تاکہ جاگیر دار طبقہ کو سہارا ملے، نوکریوں کے بھوکے بادشاہ کی خوشامدیں کرتے رہتے تھے اور اپنی چاپلوسی کے صلہ میں عہدے پاتے تھے۔ پینشنیں پاتے تھے اور ایسی نوکریاں پاتے تھے جن میں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کلیسا اور ریاست دونوں کا دستور العمل ایسا مرتب کیا گیا تھا کہ عوام پر اس عظیم الشان لوٹ اور اس زبردست خود پسندی کا تسلط برقرار رہے۔ امریکی انقلابیوں نے برطانوی تاج کی نوآبادیوں کی رعایا کو اس ظلم کے بوجھ سے نجات دلائی۔ دس ہی بیس سال کے اندر انقلابیوں نے قانون اور پالیسی میں بھی اصلاحیں کر لیں، وہ اصلاحیں جو انھیں انگلستان میں سو برس کے ہنگامہ کے بعد بھی مشکل ہی سے میسر آتیں۔ ان اصلاحوں کے لئے جن مدبروں نے جد و جہد کی اُن کا نام برطانوی تاریخ میں غیر فانی ہو گیا[۵۱]۔"

امریکہ کے اعلان آزادی پر ۱۷۷۶ء میں دستخط ہوئے۔ یہ اعلان حریت کی تاریخ کا ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ اس کے چھ سال بعد نوآبادیوں نے اپنے آپ کو انگلستان سے بالکل جدا کر لیا اور اس کے بعد اُن کے یہاں صحیح معنی میں ذہنی، اقتصادی اور سماجی انقلاب رونما ہوا۔ اراضیات کا وہ نظام جو انگلستان کے نمونہ پر برطانوی حکام نے بنایا تھا بالکل بدل دیا گیا۔ بہت سی مراعات ختم کر دی گئیں۔ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور

---

۵۱ دی رائز آف امریکن سیوی لائی زیشن (۱۹۲۸ء) جلد اوّل صفحہ ۲۹۲۔

اُن کے چھوٹے چھوٹے حصے کر دئے گئے ۔ اس کے بعد ایک عام علمی بیداری پیدا ہوگئی اور ذہنی اور اقتصادی سرگرمیاں وجود میں آنے لگیں ، اس کے بعد آزاد امریکہ جاگیری نظام اور بیرونی تسلط سے چھٹکارا پاکر ترقی کے میدان میں حیرت انگیز طریقہ پر آگے بڑھا ۔

فرانس میں بیسٹیل قدیم نظام کا نشان تھا اُسے انقلاب عظیم نے ختم کردیا اور بادشاہ اور جاگیری نظام کا خاتمہ کرکے دنیا میں "انسان کے حقوق" کا اعلان کردیا ۔ اُس وقت انگلستان کا کیا حال تھا ؟ امریکہ اور فرانس کے اِن انقلابوں کو دیکھ کر انگلستان سہما جاتا تھا چنانچہ وہ اور بھی زیادہ رجعت پسند ہوگیا اور اس کا غضبناک اور جابرانہ قانون تعزیرات اور بھی زیادہ وحشیانہ ہوگیا ۔ سن ۱۷۶۰ء میں جب جارج سوئم تخت پر بیٹھا ہے اس وقت ایک سو ساٹھ جرائم ایسے تھے جن کی پاداش میں مردوں ، عورتوں اور بچوں کو سزائے موت دی جاتی تھی ۔ سن ۱۸۲۰ء میں جب جارج سوئم کا طول طویل عہدِ حکومت ختم ہوا تو اُس وقت تک جرائم کی فہرست میں جن پر سزائے موت دی جاتی ہے سو نئے جرائم کا اور اضافہ ہوچکا تھا ۔ برطانوی فوج میں معمولی سپاہی کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا تھا جو جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے ، اُن کے ساتھ ایسا ظلم اور بے دردی کا سلوک ہوتا تھا کہ آج تک اس کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔ سزائے موت عام تھی اور اس سے بھی زیادہ عام کوڑے مارنے کی سزا تھی جو مجمع عام میں دی جاتی تھی ۔ ملزم کے کئی کئی سو کوڑے مارے جاتے تھے یہاں تک کہ اکثر تو وہ سزا کے دوران ہی میں مرجاتا تھا اور اگر زندہ رہ گیا تو بس اس لئے کہ اُس کا زخمی جسم حکومت کے ظلم کی شہادت دے ۔

اس معاملہ میں اور اُن بہت سے معاملوں میں جو فرد اور جماعت کے احترام سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب تھا۔ گو اُس زمانہ میں ہندوستان میں جس تعلیم کا رواج تھا وہ رسمی تھی پھر بھی انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اس ملک کے اندر خواندہ آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ غالباً اس زمانہ میں یہاں لوگوں کو شہری حقوق بھی زیادہ حاصل تھے۔ یورپ کے عوام کی عام حالت نہایت پست اور قابلِ رحم تھی، اس کے مقابلہ میں ہندوستانی عوام کی حالت بہت بہتر تھی۔ یورپ اور ہندوستان کے درمیان اصلی فرق یہ تھا کہ نئی طاقتیں اور زندگی کے نئے میدان یورپ میں پوشیدہ طریقہ پر کام کر رہے تھے اور ان کی وجہ سے تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوستان اپنی حالت کی یکسانی پر رضامند تھا اور اسی وجہ سے یہاں جمود طاری تھا۔ انگلستان کے قدم ہندوستان میں آئے۔ جس وقت سنہ ۱۶۰۰ء میں ملکہ ایلزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو چارٹر دیا ہے شیکسپیر زندہ تھا اور اپنی تصانیف میں مصروف تھا۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں انجیل کا مُصدقہ برطانوی ایڈیشن شائع ہوا۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں ملٹن پیدا ہوا۔ اس کے بعد ہمپڈن اور کراموِیل آئے اور پھر سیاسی انقلاب ہوا۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں رائل سوسائٹی آف انگلینڈ جس کا مقصد سائنس کو ترقی دینا تھا وجود میں آئی۔ سو برس بعد سنہ ۱۷۶۰ء میں فلائنگ شٹل ایجاد ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے کاتنے کی کل، اسٹیم انجن اور میکانکی طاقت رکھنے والے کرگھے۔

انگلستان کی زندگی کے اِن دو پہلوؤں میں سے کس پہلو نے ہندوستان پر اثر ڈالا؟ اُس انگلستان نے جس میں شیکسپیر اور ملٹن تھے، اعلیٰ تقریر اور تحریر تھی، بہادری کے کارنامے تھے۔ سیاسی انقلاب تھا۔ آزادی کی جنگ تھی،

سائنس اور ہنرمندی کی ترقی تھی، یا اُس انگلستان نے جس میں سزا کے وحشیانہ قوانین تھے اور رجعت پسندی اور جاگیری نظام کا ظالمانہ طریقِ عمل تھا جس طرح دنیا کے ہر ملک میں قوم، تہذیب اور قومی سیرت کے دو پہلو ہوتے ہیں اسی طرح انگلستان میں بھی تھے۔ ایڈورڈ تھامسن لکھتا ہے معیاری تہذیب کے اعلیٰ معیار اور ادنیٰ معیار میں ہمیشہ سے زبردست فرق چلا آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں کسی دوسری جگہ اس کی مثال ہمیں ڈھونڈے نہ ملے گی اور یہ فرق اس قدر آہستہ آہستہ گھٹتا ہے کہ اس کا گھٹنا محسوس نہیں ہوتا[۵۱]

یہ دونوں پہلو دوش بدوش چلتے ہیں، آپس میں ایک کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے اور دونوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ہندوستان کا ایک پہلو کے ساتھ سابقہ ہوتا اور دوسرے سے نہ ہوتا۔ ہر بڑے کام میں دونوں میں سے کسی ایک پہلو کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اور یہ پہلو دوسرے پہلو پر غالب رہتا ہے۔ ہندوستان میں حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اُس پہلو کو غلبہ حاصل ہوا جس میں برائی تھی۔ اور اُس نے ہندوستان کی زندگی کے بُرے پہلو سے مل کر اُسے تقویت پہنچائی۔

امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا آزاد ہونا اور ہندوستان کی آزادی کا سلب ہونا کم و بیش ایک ہی زمانہ کے واقعات ہیں۔ ایک ہندوستانی جب پچھلے ڈیڑھ سو برس کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے اور اُس ترقی کا جو امریکہ کی متحدہ ریاستوں نے اس زمانہ کی ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کرتا ہے تو اُس کے دل میں کسی حد تک یہ حسرت پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم نے بھی اتنی ہی ترقی کی ہوتی۔

---

۵۱ میکنگ آف انڈین پرنسیز (۱۹۴۳)، صفحہ ۲۶۴

اُس میں شک نہیں کہ امریکیوں میں بہت سی وہ خوبیاں ہیں جو ہم میں نہیں، یہ بھی سچ ہے کہ امریکہ ایک نیا ملک تھا اور وہاں عمل کے لیئے نیا اور وسیع میدان تھا۔ اس کے برخلاف ہم اپنی قدیم تاریخ اور پرانی روایات کے بوجھ میں دبے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود شاید یہ بات قیاس سے دور نہیں ہے کہ اگر برطانیہ نے ہمارا بوجھ اپنے سر نہ لیا ہوتا اور ہمیں اتنی مدت تک خود اختیاری حکومت کا وہ مشکل طریقہ جس سے بقول اس کے ہم ناآشنا تھے سکھانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو ہم نہ صرف کہیں زیادہ آزاد اور خوشحال ہوتے بلکہ علوم و فنون اور اُن تمام چیزوں میں بھی جو زندگی کو زندگی بناتی ہیں، کہیں زیادہ آگے بڑھ گئے ہوتے۔